

شاہ ولی اللہؒ کے معاشی نظریات کا تحقیقی مطالعہ
(پاکستان کے معاشی مسائل کے حوالے سے)

مقالہ برائے پی ایچ ڈی

محقق
محمد عبداللہ

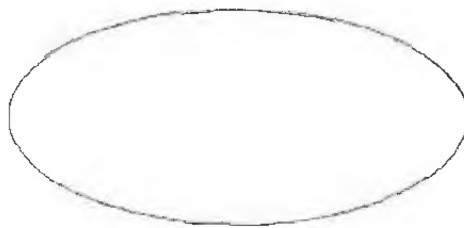
نگران تحقیق
ڈاکٹر حسام الدین منصوری

شعبہ اصول الدین
کلیہ معارف اسلامیہ جامعہ کراچی



حَسْبُنَا كِتَابُ اللّٰہ

ہمارے لئے اللہ کی کتاب کافی ہے



Phone: 479001-7



DEPARTMENT OF USOOL UDDIN

Dr. Hisamuddin Mansoori

UNIVERSITY OF KAR
UNIVERSITY ROA
KARACHI-75270 (Paki

تصدیق نامہ

تصدیق کی جاتی ہے کہ طالب علم محمد عبد اللہ ولد علی محمد نے

شاہ ولی اللہ کے معاشی نظریات کا تحقیقی مطالعہ

(پاکستان کے معاشی مسائل کے حوالے سے)

کے موضوع پر اپنا تحقیقی کام برائے پی۔ایچ۔ڈی مکمل کرلیا ہے۔

کام کی نوعیت اور مواد صحیح معنوں میں تحقیقی ہے لہذا امیدوار کو مقالہ جمع کرانے کی اجازت دی جاتی ہے۔

Dr. HISAMUDDIN MANSOORI
Associate Professor
CHAIRMAN
Deptt. of Usool-ud-Din
University of Karachi
KARACHI.

حسام الدین منصوری
نگران تحقیق

۲۰۰۴ء۔۲۰۰۵ء

باب اول۔ فصل اول

عنوان | صفحہ نمبر

باب اول۔ فصل دوم

باب اول۔ فصل سوم

باب اول۔ فصل چہارم

باب اول- فصل پنجم

باب دوم- فصل اول

باب دوم - فصل دوم

باب دوم - فصل سوم

باب دوم - فصل چہارم

باب سوم ۔ فصل اول

باب سوم ۔ فصل دوم

باب سوم ۔ فصل سوم

باب چہارم - فصل اول

باب چہارم - فصل دوم

باب چہارم - فصل سوم

باب چہارم - فصل چہارم

باب چہارم - فصل پنجم

باب چہارم ۔فصل ششم

باب پنجم ۔فصل اول

باب پنجم ۔ فصل دوم

باب پنجم ۔ فصل سوم

باب پنجم ۔ فصل چہارم

باب پنجم ۔ فصل پنجم

باب پنجم ۔ فصل ششم

باب پنجم ۔فصل ہفتم

باب ششم ۔فصل اول (الف)

باب ششم۔ فصل اول (ب)

باب ششم ۔فصل دوم (الف)

باب ششم۔ فصل دوم (ب)

باب ہفتم۔فصل اول (الف)

باب ہفتم۔فصل اول (ب)

باب ہفتم۔فصل اول (ج)

باب ہفتم - فصل اول (د)

باب ہفتم - فصل اول (ھ)



اظہار تشکر !

میں سب سے پہلے اپنے پروردگار کا شکرادا کرتا ہوں کہ جس نے محض اپنے فضل وکرم سے اس ناچیز کو یہ توفیق بخشی کہ میں یہ مقالہ تحریر کرسکوں ، اور اس کے بعد میں اپنے استاد محترم جناب ڈاکٹر عبدالرشید صاحب رئیس کلیہ معارف اسلامیہ کا تہہ دل سے ممنون ہوں جنہوں نے اپنا انتہائی قیمتی وقت نکال کر میرے اس مقالہ میں نظر کرم کیا اور مجھے اپنے قیمتی مشوروں سے مجھے نوازا۔

جس کے باعث یہ ناچیز اپنے اس مقالہ کی تکمیل کرسکا اور اس کے ساتھ ساتھ میں اپنے ہر دل عزیز استاد محترم جناب پروفیسر ڈاکٹر حسام الدین منصوری کا بھی بہت ممنون ہوں جن کی اس مقالہ نگاری و معاونت احقر کے لئے بہت بڑا اعزاز اور سرمایہ افتخار ہے۔

آخر میں میں دعا گوں ہوں کہ رب العزت میرے اس مقالہ کو شرف قبولیت عطا فرمائے اور اس ناچیز کے لئے ذخیرہ آخرت اور قارئین کے لئے مفید بنے۔

آمین ثمن آمین

والله الحمد اولاً و آخراً

محمد عبداللہ

ABSTRACT

Now a days some people have suspicion that Islam merely consists of ethics. It has no social and economical system, which may empliment practical system in this wide society.

it is obvious from human history that in every age man has created his own econom cal and social improved systems and he has been busy in efforts to solve these issues. But it can be said firmly that the system which carried out, by human has ever failed to solve this human problem. Because man has ever failed to create any prefect system, which bring prosperity, pleasure, justice and equality

A system which covers all over the human life expect may only be created by Allah almighty. The system of Allah is ranging over the all human life problems and issues.

Imamul Hinds charming and perfect personality bound many expects but still it is difficult to open up about his brilliant personality, because the work of re-search. We see its effects in our literature, social economical and cultural in

heritance.

I don't claim that I have covered up all the sides of the theme where as I only can my best efforts to think over and ponder over educational efforts of our elderly people.

I agree with the opinions of the teacher of this assignment that is dr.hassameuddin Mansoori the assignment which is under discussion it is obvious that this assignment has shah sahib's thoughts which are presented of verynicely so,it's clear that shah sahib.s thoushts show the concept of Islamic economics and it's total ideology of life and philosophy of Islam.

The second feafure of this assignment is prersented in sucha way that the present time;s economical problem is solved in the light of Islamic philosiply of economics .thirdly ,it has been connected with common shariat -e- Islami and it;s command , ments of economy . so; it s cleared that shah saib,s ideas of economic are not only fulfils the need of modern economics but also incorporates the general shariat -e-Islamia Shah Sahib who led his life from 1703 to 1764. Presented his thaughts when it was the age of machine in Europe.

The People are astonished to know the "Social Justice" which has been introduced by him. While the Whole Europe was unaware and came to know after a century. Because of some reasons he could not get renown.

For instance his communications could not get propaganda wnile the others nad.

The Second tragedy with Shah Sahib was that his thoughts were presented at tne age when whole of Europe was running of the matters,They prefer war to any creative ideas.

At that moment entire world has been divided into the caste of rich, poor, labourer and owner earning of wealth was only their aims. All poor and m'ddle class people were prey of this nasty and selfish system Pakistan also has the same circumstance at the moment.

It is crystal c ear tnat Islam had neverencouraged the matter loving system mean whi e Islam gave a perfect system of wealth by fixing the difference between Haram and Halal (Lawful and unlawful)

This was a perfect and implimentable system which

can easily he followed by man and led a peaceful life not only in this world but also on the judgment day.

Imamu Hind wno is Islamic Philosopher who also presents the solution of this problem, which is the theme of this assignment.

At the end I would like to thank the all scholars and Specially I would like to thank Dr.Abdur-Rashid who gave me some useful points that proved very helpful to me.

I humbly pray to Allah Almighty to grant this one of my efforts.

Muhammad Abdullah

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقدمہ

آج بعض لوگوں کے ذہنوں میں یہ شکوک وشبہات پیدا ہورہے ہوں گے کہ اسلام صرف ایک ضابطہ اخلاق ہے اس کے دامن میں کوئی معاشی اوراقتصادی نظام نہیں جو عملی طور پر آج کے وسعت پذیر معاشرہ اور سوسائٹی میں نافذ کیا جاسکے۔

انسانی تاریخ اس نظریئے کی تکذیب کرتی ہے انسان نے ہر دور میں اپنی معاشی واقتصادی فلاح وبہبود کیلئے مختلف نظام اور طریقے ترتیب دیئے، اپنے معاشی مسائل حل کرنے کیلئے وہ ہمیشہ کوشش کرتا رہا،

لیکن یہ بات پورے وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ انسان کا لایا ہوا کوئی بھی نظام اس انسانی مسئلہ کو صحیح اور مکمل طریقے پر حل نہیں کرسکا کیونکہ انسان کے بنائے ہوئے قوانین قدیم وجدید نظاموں میں آج تک کوئی ایسا نظام نہیں بن سکا جو انسانیت کو خوش حالی اور مسرت عدل ومساوات اور امن وسلامتی کا واضح راستہ دکھا سکا ہو۔

یہ بات صرف خدا کے بنائے ہوئے نظام ہی میں ہوسکتی ہے جو انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرسکے اسکی افادیت اور ہمہ گیری زمان ومکان اور حال ومستقبل کے قیود سے بالاتر ہے۔

جسکا امام الہندؒ کے ہمہ جہت شخصیت کے کئی پہلوؤں کا احاطہ کرتی ہے مگر ابھی ان کے قد وقامت کے کئی خدوخال نکھرنے باقی ہیں تحقیق وجستجو ایک جاوداں عمل ہے اور اس کے ثمرات ہمارے عملی، ادبی ثقافتی سیاسی اور معاشی ورثے کی دریافت کی صورت میں ظاہر ہوتے رہتے ہیں۔

مجھے یہ دعویٰ تو نہیں کہ میں نے موضوع کے تمام پہلوؤں کا احاطہ بطریق احسن کرلیا تاہم

بساط بھر کوشش کرنے کے بعد میں اپنی فکر وجستجو کے اس حاصل کو صاحبان علم وفضل میں پیش کرنے کی جسارت کرتا ہوں۔

اس مقالہ کی نوعیت وحقیقت کے بارے میں مقالہ کے نگران جناب ڈاکٹر حسام الدین منصوری کی رائے پر اکتفاء کرتا ہوں۔

پیش نظر مقالہ کی خوبیوں میں یہ بات نمایاں ہے کہ اس میں شاہ صاحب کے افکار کی ماہیت کو دکھانے کی مستحسن کوشش کی گئی ہے اس لئے شاہ صاحب کا تصور اسلامی معیشت ان کے مجموعی نظریہ حیات اور فلسفہ دین ہی سے مستنبط ہوتا ہے۔

مقالہ کی دوسری نمایاں صفت یہ ہے کہ اس کو اس انداز میں تحریر کیا گیا ہے کہ موجودہ زمانہ معاشی مسائل کے اسلامی حل کی تلاش میں اس سے مدد لی جا سکتی ہے۔

اس کی تیسری قابل ذکر بات یہ ہے کہ اسلامی شریعت کے عمومی احکام معیشت سے بھی اس کتاب کے مباحثہ کو مربوط کیا گیا ہے اس طرح یہ بات سامنے لانے کی کوشش کی گئی ہے کہ شاہ صاحب کی معاشی نظریات اپنی جدت اور تعمیق کے ساتھ ساتھ شریعت اسلامیہ کے عمومی مقاصد وہدایات سے مقابر نہیں ہیں بلکہ انہی کی توضیح وتشریح ہے۔

شاہ صاحب جن کا عرصہ حیات ۱۷۰۳ھ تا ۱۷۶۴ھ (اکسٹھ سال) تک محیط ہے نے اپنا نظریہ فکر اس وقت پیش کیا جب یورپ میں مشینی دور کا آغاز ہو رہا تھا۔

دنیا حیران ہے کہ جس ''عمرانی عدل'' کا پہلی بار آپ نے تعارف کرایا یورپ میں پوری ایک صدی بعد اس کی بازگشت معاشرتی حقوق جمہوری آزادی اور معاشرتی عدل کی صورت میں سنائی دی گئی آپ کے فکر کو اس وقت پذیرائی حاصل نہ ہو سکی اس کی کئی وجوہ تھیں:

مثلاً آپ کی فکر کو یہ المیہ پیش آیا کہ اسے پروپیگنڈا کی وہ قوت میسر نہ آسکی جو دیگر اہل فکر کو حاصل رہی۔

دوسرا المناک پہلو یہ تھا کہ شاہ صاحب نے ایسے دور میں آنکھ کھولی جس وقت یورپ کی نظریں ایشیاء پر لگی ہوئیں تھیں اور وہ اپنے استعماری ہتھکنڈوں سے اسکے باشندوں کا استحصال کر رہا تھا ہذا نظریئے کی اشاعت سے زیادہ بقاء کی جنگ کا مسئلہ مدنظر تھا۔

اس وقت پوری دنیا امیر غریب، مزدور اور سرمایہ دار کی اساس پر منقسم ہو کر بھیانک قسم کی طبقاتی نظام پروان چڑھ رہا تھا ارتکاز دولت کا مرض پورے معاشرے کو دیمک کی طرح چاٹ رہا تھا، اب جبکہ یہ استحصالی نظام تن ومند ہو کر عفریت کی شکل اختیار کر چکا اور اپنے استبدادی پنجوں کو غریب اور متوسط الحال سماج پر گاڑ چکا ہے یہی حال اس وقت پاکستان کا ہے۔

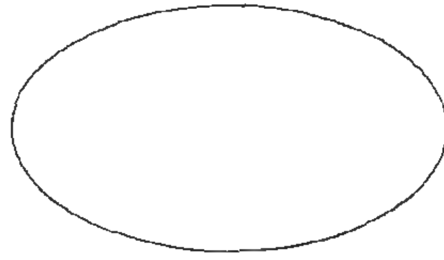
یہ واضح ہے کہ اسلام نے مادیت کو مقصود نہیں گردانا تاہم مقصود کا ذریعہ تسلیم کر کے نظام مالیات کا منضبط حلال وحرام پر مبنی ایک قابل عمل نظام دیا ہے جس پر ایک انسان چل کر دنیا وآخرت میں سرخرو ہو سکتا ہے۔

امام الہندؒ جو اسلامی حکیم ہیں، کی نظر میں اس مذکورہ مسئلہ کا حل کیا ہے یہی اس مقالہ کا موضوع ہے۔

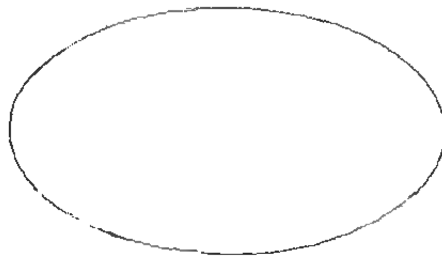
میں ان جملہ اہل علم کا جنہوں نے کسی بھی انداز سے میری معاونت کی، شکریہ ادا کرتا ہوں خصوصاً جناب ڈاکٹر عبدالرشید صاحب نے کارگر اشارے دیئے جنہوں نے تسویدی واشاعتی سلسلہ میں مدد دی۔

میں رب العزت کی بارگاہ الٰہی میں دعاگو ہوں کہ وہ میری اس جسارت کو قبول فرمائے۔

محمد عبداللہ



باب اوّل



باب اوّل

فصل اول

نام ونسب:

ولی اللہ قطب الدین احمد بن عبد الرحیم بن وجیہہ الدین الشہید بن معظم بن منصور بن احمد بن محمود بن قوام الدین عرف قواذن بن قاضی قاسم بن قاضی کبیر عرف قاضی برھان بن عبد الملک بن قطب الدین بن کمال الدین بن شمس الدین المفتی بن شیر ملک بن محمد عطا ملکبن ابو الفتح ملک بن عمر الحاکم ملک بن عادل ملک بن قارون بن جرجیس بن احمد بن محمد شہریار بن عثمان بن ھامان بن ھمایون بن قریش بن سلیمان بن عفان بن عبد اللہ بن محمد بن عبد اللہ بن حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ۔

(ھکذا ذکرہ فی الامداد فی مآثر الأجداد) [۱]

پس نسب آپ کا خلیفہ ثانی حضرت عمر رضی اللہ عنہ تک تیس واسطے سے پہنچتا ہے۔ خود آپ نے اپنا حال برکت اشتمال جز لطیف نامی رسالے میں لکھا ہے۔

ولادت:

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ بتاریخ ۴/شوال ۱۱۱۴ھ (۱۰/فروری ۱۷۰۳ء) بروز چہارشنبہ بوقت طلوع آفتاب (قصبہ پھلت میں) پیدا ہوئے۔

''عظیم الدین'' سے تاریخ ولادت نکلتی ہے۔ (۲)

....

شاہ صاحب کا سلسلہ نسب والد کی طرف سے تمیں واسطوں سے حضرت فاروق اعظمؓ تک اور والدہ کی طرف سے امام موسی کاظم تک پہنچتا ہے۔

چودھویں سال آپ کی شادی ہوئی اور مختصر عرصہ ہی میں اہلیہ کا انتقال ہوگیا یہ شاہ صاحب کی ماموں زاد بہن سے ہوئی تھی جوان کے بڑے ماموں شیخ عبداللہ پھلتی کی صاحبزادی اور شاہ محمد عاشق کی ہمشیرہ تھیں۔

شاہ صاحب کے ایک صاحبزادے شیخ محمد ان ہی کے بطن سے ہیں ان کے بطن سے ایک صاحبزادی امۃ العزیز بھی پیدا ہوئیں جن کی شادی شاہ محمد عاشق کے صاحبزادے محمد فائق سے ہوئی تھی۔

شاہ صاحب نے دوسرا عقد ۱۱۵۷ھ میں مولوی سید ثناء اللہ سونی پتی کی صاحبزادی سے کیا جن کے بطن سے شاہ عبدالعزیز، شاہ رفیع الدین، شاہ عبدالقادر اور شاہ عبدالغنی پیدا ہوئے ہیں۔ (۳)

تحصیل علم:

شاہ صاحب پانچ سال کی عمر میں مکتب میں بیٹھے اور غالباً ساتویں سال قرآن کریم ختم کیا اسی سال فارسی کتابیں اور مختصرات پڑھنا شروع کیں۔ دسویں سال شرح ملا پڑھی اور اس نوبت پر پہنچ کر مطالعہ کی راہ کشادہ ہوگئی۔

پندرہویں سال بیضاوی کا کچھ حصہ پڑھا اور اس موقع پر شاہ عبدالرحیم نے خواص وعوام کی دعوت کی جس پر اجازت درس کی فاتحہ دی گئی۔

ہندوستان کے اس وقت کے رواج کے مطابق شاہ صاحب نے پندرہویں سال میں تعلیم سے فراغت حاصل کرلی شاہ صاحب نے مختلف علوم وفنون کی جو کتابیں پڑھیں اس کی تفصیل ان کی اپنی تحریر کے مطابق حسب ذیل ہے:

حدیث: (۱) مشکوۃ، کتاب البیوع تا کتاب آداب کے سوا پوری کتاب، اور جو حصہ نہیں پڑھا تھا اس کی بھی اجازت دیدی گئی، اس طرح اس کی تدفی ہوئی۔

(۲) صحیح بخاری کم وبیش کتاب الطہارت تک۔

(۳) شمائل النبی (ترمذی) کامل۔

تفسیر: (۱) بیضاوی کچھ حصہ۔ (۲) مدارک کچھ حصہ۔

اس کا موقع بھی ملا کہ وہ قرآن کریم کے معانی اور شان نزول میں کتب تفسیر کی مراجعت کے ساتھ ساتھ مدرسہ میں متعدد بار اس غرض سے اپنے والد کی خدمت میں حاضر ہوئے۔

فقہ: (۱) شرح وقایہ، کامل باستثناء قدر قلیل، (۲) ہدایہ کامل باستثنائے قدر قلیل۔

اصول فقہ: (۱) حسامی۔ (۲) توضیح وتلویح معتد بہ حصہ۔

منطق: (۱) شرح شمسیہ کامل۔ (۲) خیالی کچھ حصہ۔ (۳) شرح موافق کچھ حصہ

کلام: (۱) شرح عقائد کامل۔ (۲) خیالی کچھ حصہ۔ (۳) شرح موافق کچھ حصہ۔

سلوک: (۱) عوارف کچھ حصہ۔ (۲) رسائل نقشبندیہ کچھ حصہ۔

حقائق: (۱) شرح رباعیات مولانا جامی (۲) لوائح (۳) مقدمہ وشرح لمعات

(۴) مقدمۃ نقد النصوص۔

خواص اسماء وآیات شاہ عبدالرحیم کا مرتب کردہ خاص مجموعہ جس کی انھوں نے چھ بار شاہ صاحب کو اجازت دی۔

طب: موجز القانون۔

حکمت: شرح ہدایۃ الحکمۃ وغیرہ۔

نحو: (۱) کافیہ۔ (۲) شرح ملا۔

معانی: (۱) مطول۔ (۲) مختصر المعانی بقدر حاشیہ ملازادہ۔

ہندسہ وحساب: بعض رسائل مختصرہ۔

شاہ صاحب لکھتے ہیں کہ ان کتابوں کے پڑھنے کے دوران دل میں بلند خیالات آتے تھے اور جتنی کوشش کی جاتی تھی، کشادکار اتنی ہی زیادہ نظر آتی تھی۔ (۴)

تحصیل علم سے فراغت کے بعد کا مشغلہ:

تحصیل علم سے فراغت کے بعد شاہ صاحب نے کم وبیش بارہ سال تک اپنے والد کے قائم کردہ مدرسہ میں درس دیا۔ تدریس کی اس مدت میں انھوں نے معقولات ومنقولات ہر قسم کی کتابیں پڑھائیں اور انھیں ہر علم میں غور وفکر کا موقع ملا۔

اسی عرصہ میں مذاہب اربعہ کی علم فقہ اور اصول فقہ کی کتابوں اور جن احادیث سے وہ استدلال کرتے ہیں انکے مطالعہ اور ان میں تدبر کا اثر شاہ صاحب پر یہ ہوا کہ فقہائے محدثین کی روش پر ان کا دل مطمئن ہوا۔

بیعت:

پندرہویں برس والد سے بیعت کی اور اشغال صوفیہ خصوصاً نقشبندیہ میں مشغول ہوا۔ اور اسی سال کچھ بیضاوی پڑھی والد نے بہت سا کھانا تیار کیا اور خاص وعام کی دعوت کی اور فاتحہ اجازت درس پڑھی فنون متعارفہ سے حسب رسم ادا کی۔

شاہ عبدالرحیم کا انتقال اور بیعت اور ارشاد کی اجازت

سترہویں برس والد صاحب بیمار ہوکر انتقال فرما گئے بیعت اور ارشاد کی اجازت دیدی اور مکرر یدہ کیدی کا کلمہ فرمایا، سب سے بڑی نعمت یہ ہے کہ والد نے نہایت رضامندی میں فقیر سے انتقال فرمایا، اور ان کی توجہ طرف فقیر کے اس توجہ کے مانند نہیں ہے جو آباء کو ابناء کے ساتھ ہوتی ہے۔

بارہ برس کی کتب درسیہ کی تعلیم دینا

والد ماجد کی وفات کے بعد بارہ سال کم وبیش کتب دینیہ وعقلیہ کے درس وتدریس کا موقعہ ملا۔

فقہاء محدثین کی روش کا حاصل ہو جانا:

کتب مذاہب اربعہ اور ان کے حصول .وران حدیثوں کے جو ان کا متمسک ہیں بمدد وفور غیبی روش فقہائے محدثین قرار داد خاطر ہوئے۔(۵)

سفر حجاز:

۱۱۴۳ھ میں مشرف بحج ہوا اور ایک سال مجاورت حرمین وروایت حدیث شیخ ابو طاہر مدنی ورمشائخ سے موفق ہوا اور ہمراہ متوطنان حرمین علماء وغیرہم کی رنگین صحبتوں کا اتفاق ہوا۔

شیخ ابو طاہر سے خرقہ جامعہ کا ملنا:

خرقہ جامعہ ابو طاہر کا پہننا کہ جس کو تمام خرقہ ہائے صوفیہ … کہہ سکتے ہیں اس سال کے آخر میں حج ادا کر کے اوائل ۱۱۴۵ھ میں متوجہ وطن کا ہوا، بروز جمعہ چودھویں رجب کو صحیح وسالم وطن پہنچے۔

نعمت عظمیٰ:

نعمت عظمیٰ اس صفت پر دہ ہے کہ اس کو فاتحیت کا خلعت دیا اور دوبارہ زیں کا فتح اس کے ہاتھ پر کیا۔

اسرار ومصالح احکام کی تدوین

مرضی فقہ میں اس کو جمع کر کے فقہ حدیث کی سرے سے بنیاد کی اور اسرار حدیث ومصالح احکام وترغیبات اور اس سب کو جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ سے لائے ہیں۔

اور یہ وہ فن ہے کہ اس فقیر سے پہلے اس فقیر کی بات سے مضبوط تر بات اس کو کسی نے ادا نہیں کیا ہے۔
باوجود جلالت اسی فن کے اگر کسی کو اس حرف میں شبہ ہو تو اس سے کہہ کر قواعد کبریٰ کو دیکھ کر شیخ عزیز الدین نے اس جگہ کیا کچھ جہد کیا ہے۔ اسی فن عشر عشیر کو نہیں پہنچے۔

طریقہ سلوک کا الہام کیا جانا:

طریقہ سلوک کا الہام فرمایا جو کہ اس زمانے میں مرضی حق ہے اور اسی دور میں فائز ہوتا ہے اس کو ہمعات، الطاف القدس میں ضبط کیا ہے اور قدمائے اہل سنت کے عقائد، دلائل وحجتوں سے اثبات کیا اور اس کو معقولیوں کے خس وخاشاک سے پاک کیا اور ایسے طور پر مقرر کیا کہ بحث کا محل نہ رہا۔

علم کمالات اربعہ:

علم کمالات اربعہ، یعنی ابداع وخلق وتدبیر وتدلی کے باوجود اس عرض وطول کے اور علم استعدادات نفوس انسانیہ کا بہ جمعیہا اور کمال ومآل ہر شخص کا افاضہ فرمایا اور یہ علم جلیل ہیں۔ اس فقیر سے پہلے کسی نے اس پر بحث نہیں کی۔

حکمت عملی کا افادہ:

حکمت عملی کا جس میں اس دورے کی صلاح ہے، بوسعت تمام افادہ کی اور توفیق اس کے مضبوط کرنے کے ساتھ کتاب وسنت وآثار صحابہ کی ہے اور علم دین کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہے اور جو محرف ومدخول ہے اور جو سنت ہے اور جو کچھ ہر فرقے نے بدعت نکالی ہے ان سب کی تمیز پر افادہ کیا۔

فلو ان لی فی کل منبت شعرۃ لسانا لما استوفیت واجب حمدہ (۲)

☆ ☆ ☆

باب اوّل

فصل دوم

شاہ ولی اللہ کے حالات:

شاہ ولی اللہ دہلوی کی ایک جامع ومبسوط سوانح حیات محققانہ اور جدید اسلوب پر ترتیب دینے کی ضرورت ہے "حیات ولی" کے اولین مآخذ تو خود شاہ صاحب ہی کی تحریریں ہوں گی، "انفاس العارفین، فیوض الحرمین، الدرر الثمین اور الانتباہ فی سلاسل اولیاء اللہ و اسانید وارثی رسول اللہ" میں بہت سا مواد مل جائے گا۔ الجزء اللطیف فی ترجم العبد الضعیف کے نام سے تو ایک رسالہ ہی شاہ صاحب نے اپنے احوال وسوانح کے طور پر تحریر فرمایا تھا، اس کے بعد سب سے زیادہ اہمیت "القول الجلی فی مناقب الولی" کی ہے جو شاہ صاحب کی حیات ہی میں ان کے نسبی بھائی، دوست ہم درس، شاگرد اور خلیفہ شاہ محمد عاشق پھلتی نے تحریر فرمایا تھا، خود شاہ صاحب نے "الجزء اللطیف" میں اس کا ذکر فرمایا ہے۔ نواب صدیق حسن خان اور مولوی رحمان علی نے اپنی کتابوں میں اس سے اقتباس واستفادہ کیا تھا۔

شاہ عبدالعزیز کے آخری چند سالوں کے ملفوظات ان کے ایک حاضر باش مرشد نے ۱۲۳۳ھ میں مرتب کئے تھے اور ایک ارادت کیش قاضی بشیر الدین میرٹھی نے ۱۳۱۴ھ میں پہلی بار مطبع مجتبائی (میرٹھ) سے شائع کئے تھے۔

جامع کا نام معلوم نہ ہونے کے باوجود ہماری رائے میں ان ملفوظات کی نسبت شاہ صاحب کی طرف بالعموم صحیح ہے کیونکہ اولاً تو مطبوعہ نسخے کے علاوہ ایک قریب العہد مخطوطہ بھی پیش نظر ہے، ملفوظات کے اکثر مشتملات کی دوسرے مآخذ سے بھی تصدیق وتصویب ہوتی ہے۔

....

مؤلف کی دیانت کا ایک ثبوت یہ ہے کہ جب بھی کسی ملفوظ کو بروقت قلم بند نہیں کر سکے ہیں انھوں نے اس کا اظہار کر دیا ہے۔ مثلاً ایک مقام پر نصف ملفوظ نقل کر کے بقیہ نصف نقل کرنے سے پہلے لکھتے ہیں۔

یہاں سے اس قصے کو تین ماہ کے بعد لکھتا ہوں اپنے حافظہ کے بھروسے پر، میں نے یہاں جگہ چھوڑ دی تھی۔ اس سے معلوم ہوا کہ وہ ملفوظ کو بروقت لکھ لیا کرتے تھے۔

ایک مقام پر شاہ صاحب کی ایک تاریخی تحقیق کا صرف خلاصہ نقل کیا ہے:

اس وقت فرصت نہ ہونے کی وجہ سے پوری گفتگو نہیں لکھ رہا ہوں مگر گفتگو یاد ہے، اللہ نے چاہا تو بشرط فرصت لکھ دوں گا۔

اس سے بھی اس قیاس کو تقویت ہوتی ہے کہ جامع دن کے دن ہر بات لکھ لینے کا اہتمام کرتے تھے۔ یہ ضروری ہے کہ ملفوظات کے انداز بیان سے جامع کے صاحب علم ہونے کا اظہار نہیں ہوتا، انداز بیان علمی و ادبی نہیں ہے زبان (فارسی) مقامی اور غیر معیاری تو ہے ہی مگر اغلاط سے بھی خالی نہیں ہے۔

علمی ذوق کے فقدان ہی کے نتیجہ میں زیادہ تر اشعار، لطیفے اور قصص و حکایات نقل کیے ہیں، علمی موضوعات پر جن تقاریر کو نگاہیں ڈھونڈتی ہیں وہ نہیں ملتیں حالانکہ شاہ صاحب کی مجلس میں زیادہ دینی و علمی موضوعات معرض کلام میں آتے ہوں گے اور شاہ صاحب ان پر داد تحقیق دیتے ہوں گے۔ جامع کو اگر علمی ذوق ہوتا تو وہ ان تقریروں کو محفوظ کر لیتے اور آج ہمارے لئے یہ سرمایہ منفعت بخش ہوتا۔ بعض ملفوظات کی صحت نسبت کو تسلیم کرنے کی اجازت ہماری عقیدت کسی طرح نہیں دیتی۔

سند حدیث:

والد ماجد چودہ مہینے حرمین میں رہے اور سند حاصل کی بعض مقام پر استاد فرماتے تھے اس حدیث کے

معنی تم بیان کر واور سند میں لکھا کہ انہوں نے مجھ سے سند حاصل کی ہے اگر چہ یہ مجھ سے بہتر ہیں۔

تقسیم کار:

حضرت والد ماجد نے ہرفن کے لئے ایک شخص (شاگرد) تیار کر دیا تھا اور ہرفن کے طالب علم کو اس کے فاضل کے سپرد کر دیتے تھے اور حقائق ومعارف بیان کرنے ورتحریر کرنے میں مشغول رہتے تھے حدیث پڑھتے تھے اور مراقبہ کے بعد جو کچھ کشف کے ذریعہ معلوم ہوتا تھا لکھ لیتے تھے بیمار بھی کم ہوتے تھے۔ آپ کی عمر اکسٹھ سال چار ماہ ہوئی۔

منبسط اوقات:

دیگر علوم وکمارات کے علاوہ ضبط اوقات میں بھی والد ماجد کی طرح کم ہی کوئی آدمی نظر آیا، اشراق کے بعد جو بیٹھتے تھے تو پہلو بھی نہیں بدلتے تھے، نہ کھجاتے تھے نہ تھوکتے تھے۔

شفقت پدری:

والد ماجد میرے بغیر کھانا نہیں کھاتے تھے۔ ابتداء میں جد امجد کی طرح والد ماجد پر بھی نسبت چشتیت غالب تھی بعد میں انقلاب ہوا۔

گمان تشیع:

ایک شخص متعصب روہیلہ نے والد ماجد سے شیعی کے کفر کے متعلق سوال کیا آپ نے اس کی مرضی کے خلاف اس باب میں احناف کا اختلاف بیان کیا یعنی اس فرقے کے کفر پر اتفاق نہیں ہے۔ اس نے دوبارہ دریافت کیا اور یہی جواب پایا تو میں نے سنا کہنے لگا کہ یہ خود شیعی ہیں۔

ہمارے بعض قریبی اعزہ غالی شیعی ہیں۔ میں لڑکپن میں بیمار تھا، ایک حکیم صاحب نے علاج کیا میں صحت یاب ہوگیا والد ماجد نے اپنی عادت کے برخلاف ان سے کہا آپ نے میرا دل خوش کردیا۔ بتایئے آپ کے حق میں کیا دعا کروں؟ حکیم صاحب نے کہا یہ دعا کیجئے کہ میں نوکر ہو جاؤں، اس زمانے میں بکہ اسی رات سو روپیہ تنخواہ (مع سواری) پر نوکر ہوگئے، جب حکیم صاحب نے آکر بتایا تو حضرت نے زبان مبارک سے فرمایا آپ کا حوصلہ ہی پست تھا کہ دنیا اور وہ بھی اس کے حقیر حصے پر کفایت کی۔ (۷)

طب:

ہمارے خاندان میں طب کا بھی مشغلہ تھا چنانچہ والد بزرگوار شاہ عبدالرحیم اور میرے چچا شاہ اہل اللہ مطب کیا کرتے تھے والد ماجد اور میں نے یہ سلسلہ موقوف کیا۔ اگرچہ والد ماجد نے کسی مصلحت سے علاج اور طب کرنے سے ہمیں منع کردیا تھا لیکن یہ طب بے خوب چیز بلکہ بعض حالات میں تو گویا جان بخشی ہے۔ فرمایا: والد ماجد کا رسالہ وصیت نامہ نقل کرکے رکھیں، بہت مفید چیز ہے۔

مسلک فقہی:

اس تقلید کے مسئلہ میں والد بزرگوار کا مسلک خوب ہے کہ اگر ائمہ مجتہدین میں سے کسی ایک نے بھی اس حدیث پر عمل کیا ہے تو ترجیح حدیث کو دی جائے گی ورنہ حدیث کے بجائے قول مجتہد پر عمل کیا جائے گا اس لئے کہ تمام ائمہ مجتہدین کا سلوک بے سبب نہیں ہوسکتا اور اس قسم کی احادیث جن پر کسی ایک امام کا بھی عمل نہ ہو شاید تعداد میں چار ہوں گی۔

ایک فتویٰ:

(اس سوال پر کہ کھانے کے بعد آنے سے ہاتھ دھونے کا کیا حکم ہے؟) آپ نے فرمایا ابوداود نے

حدیث بیان کی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ایک عورت کو خون حیض سے آلودہ کپڑوں کو نمک سے دھو کر صاف کرنے کا حکم دیا تھا، اور چونکہ نمک بھی محترم چیز ہے اور کھانا بھی اس لئے آٹے وغیرہ سے چاہے وہ گیہوں کا آٹا ہی کیوں نہ ہو ہاتھ دھونا درست ہے لیکن کھانے کی چیزوں کے علاوہ جو اس کام میں لائی بھی جاتی ہیں ہاتھ دھونا بہتر ہے ورنہ آٹا بھی جائز ہے۔

ایک شخص نے حضرت قبلہ گاہی سے عرض کیا کہ میں ایک جزیرے میں گیا تھا وہاں کھوپرے اور مچھلی کے علاوہ کھانے کی اور کوئی چیز دستیاب نہیں ہوتی تھی۔ الا یہ کہ کسی دوسرے مقام سے لے آئیں چنانچہ اس شخص کو بیاسی کھانے انہیں دو چیزوں سے پکانا آتے تھے۔

چین میں بلی:

چین میں بلی بہت کم ہوتی ہے اور چوہے بڑے دلیر ہوتے ہیں، ایک شخص نے والد ماجد سے بیان کیا کہ میرے ساتھ سفر میں ایک بلی تھی اور چین میں جہاں تک جا سکتے ہیں میں گیا میں نے دیکھا کہ چوہوں کی کثرت کی وجہ سے راجہ کے کھانے کے وقت گلوہ باز چوہوں کو بھگانے کے لئے کھڑے رہتے ہیں میں نے کہا ہندوستان میں ایک جانور پانچ سو روپیہ میں آتا ہے اس کی آواز سے چوہے بھاگ جاتے ہیں چنانچہ میں نے بلی وہیں فروخت کر دی اور اس کی آواز سے چوہے بھاگ گئے۔

عذاب قبر:

عجیب قصہ ہے ایک شخص کشمیری حضرت قبلہ کے سامنے قسمیں کھا کھا کر کہتا تھا کہ میں جنوبی ہند میں ایک راجہ کے یہاں باورچیوں کے زمرہ میں ملازم ہو گیا تھا راجہ کے مرنے کے بعد وہاں کے دستور کے مطابق راجہ کی لاش کو اس کے خدام کے ساتھ جن میں میں بھی شامل تھا ایک مخصوص کمرہ میں بند کر دیا گیا کیا دیکھتا ہوں کہ رات کو وہ مہیب فرشتے جیسا کہ حدیث میں آیا ہے آئے میں ان کے خوف سے ایک کونے میں دبک گیا مجھے نہیں

معصوم راجہ سے کیا سوال و جواب ہوئے آخر فرشتوں نے اس کو مارنا شروع کیا اور اتنا مارا کہ اس کے اعضا ریزہ ریزہ ہو گئے ہم لوگ دہشت سے بے ہوش ہو گئے بلکہ بعض تو مر گئے میں کلمہ پڑھ رہا تھا فرشتوں نے میری طرف دیکھا اور یہ کہا کہ یہاں کیوں آ گیا تھا مجھے کشمیر پہنچا دیا، فرشتوں کی مار سے راجہ کی لاش کے جو ریزے میرے بدن پر اچھٹ کر لگ گئے تھے ان کی سوزش محسوس ہوتی تھی۔ بہت علاج کیے مگر فائدہ نہیں ہوتا تھا، میں نے دہلی آ کر اطبا اور بزرگوں سے رجوع کیا مگر سوزش نہیں گئی ہاں تمہارے چچا ابوالرضا محمد نے درود پڑھ کر میرے ہاتھ پر دم کر دیا تھا جب تک ہاتھ متاثر حصہ پر پھیرتا رہتا ہوں سکون رہتا ہے۔ (٨)

شاہ ولی اللہ کے تجدیدی کارنامے:

حضرت شاہ ولی اللہ کی قدر و منزلت ایک دنیا پر آشکارا ہے، یہ شاہ صاحب کا فیضان ہے جو ہمیں تحریک آزادی ہند تحریک شہید، تحریک خلافت اور تحریک اقامت دین اور تحریک پاکستان کی شکل میں مسلسل جاری وساری نظر آتا ہے، اسلامی نظام حیات اور خلافت علی منہاج النبوۃ کی وہ دل آویز تصویر جو اس دہلوی شیخ نے کھینچ دی، مسلمانان ہند و پاک کے دل و دماغ میں پوری طرح رچ بس چکی ہے اور آج تک اسی آواز کی بازگشت سنائی دے رہی ہے، تحریک پاکستان میں جان اسی تصویر نے ڈالی اور اسلامی نظام حیات کے قیام کی یہی آرزو تھی جس کے باعث ایک زمانہ کی سوئی ہوئی قوم ایک آواز پر اٹھ کھڑی ہوئی اور آج سرزمین پاک کی شکل میں آرزوں بھر خطہ ارض نظر فروز ہے یہ وہی آرزو تھی جس کی بازگشت ہم ہر جہاد ستمبر میں داد سرفروشی کی شکل میں دیکھتے ہیں، ہر یہی کلمہ دل نواز تھا وہی سرفروشی تھی نتیجہ سامنے ہے۔ (٩)

ایسا زبردست مفکر اس قدر اعلیٰ درجہ کا قائد و محسن جس کی آواز پوری قوم کو ایسا انمٹ درس حیات دی گئی ہے اسے اپنے محسن کا بہرحال شکر گزار ہونا چاہئے تھا، جگہ جگہ اکیڈمیاں قائم ہوئیں تعلیم کو عام کرنے کا بندوبست کیا جاتا، جامعہ ولی اللہی کا قیام عمل میں آیا لیکن افسوس ایسا نہ ہو سکا، مقام شکر ہے کہ اب چند ادارے اس عظیم کام کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے لئے وجود میں آ چکے ہیں اللہ تعالیٰ ان اداروں کو توفیق

بخشے کہ وہ شاہ صاحب کے پیش کردہ افکار وخیالات کو جدید اسلوب بیان اور زبان میں پیش کرسکیں اس لئے یہ کام فی الوقت نہایت ضروری ہے نئی نسل جس زبان وبیان سے مانوس ہے وہ گذشتہ زمانے سے بڑی حد تک مختلف ہے۔

شاہ صاحب کے کارنامے:

شاہ صاحب کے کارناموں کی فہرست طویل ہے میں چند کو نمبر وار درج کررہا ہوں:

۱۔ یہ ہے کہ شاہ صاحب نے ژرف نگاہی کے ساتھ جہاد ونقصۃ کے کام میں غلط جہاد کے دروازے کو بند کیا۔ اور اس شاہ راہ کو زیادہ واضح اور صاف شکل میں پیش فرمایا۔

۲۔ کار تجدید کی وضاحت کی اور اس طرح تجدد کی کامیابی اور مسلمانوں میں درآنے کا راستہ بند کیا۔

۳۔ علوم حدیث کی تجدید وترویج کا کام۔

۴۔ قرآن مجید کے ترجمہ کو جاری کیا۔

۵۔ اسلامی نظام سیاست کی تصویر کشی کی۔

۶۔ تصوف کی حتی المقدور اصلاح کی۔

۷۔ اسلامی نظام حیات کی تدوین کا انجام دیا۔

اب میں ان میں سے ایک ایک پر اپنے مطالعہ کے نتائج کو پیش کرنے کی سعی کروں گا۔

اجتہاد:

اس فہرست میں سب سے مقدم یہ ہے کہ شاہ صاحب نے اجتہاد ونقصۃ کے کام میں غلط اجتہاد کے دروزے کو بند کرنے کی سعی کی آپ نے مجتہد کے دائرہ کار کو متعین طور پر واضح کیا۔ اجتہاد کی شرائط بیان کیں۔ اور مجتہدین کے درمیان فرق مراتب قائم کئے پھر یہ بھی واضح کیا کہ کونسا دروازہ کھلا ہوا ہے اور کونسا بند ہے، اجتہاد کی پوری تاریخ اور اسکے اختلافات کو بیان کیا اور یہ بھی بتادیا کہ مسلک اعتدال کیا ہے۔

یہ پوری بحث چونکہ نہایت اہم مباحث پر مستمل ہے اس لئے میں اس کو قدرے تفصیل سے بیان کرنے کی کوشش کروں گا۔ اس تفصیلی تذکرہ کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ تقریبا یہی شرائط تجدید کے کام کی بھی ہیں اس طرح اجتہاد و تجدید کے پورے کام کی مکمل تصویر سامنے آجائے گی، اس پوری بحث کو سمجھنے کے لئے سب سے پہلے ہمیں یہ دیکھنا چاہئے کہ اجتہاد کیا ہے۔

اجتہاد کیا ہے؟

اس کو سمجھنے کے لئے دو بنیادی امور کو وضاحت کے ساتھ سامنے رہنا چاہیئے پہلی بات حاکمیت الٰہی کا تصور ہے اس لئے اسلامی اجتہاد و تقصتہ کے فہم میں اس حیثیت سرستہ کی ہے اسلام میں حاکمیت مطلقہ صرف اللہ تعالی کے لئے تسلیم کی گئی ہے وہ صرف عام مذہبی معنوں میں معبود نہیں ہے بلکہ خالص قانونی مفہوم میں حاکم مطاع قانون بنانے والا اور دینے والا اور امر و نہی کا اصل سر چشمہ بھی ہے وہ صرف قانون فطرت کا خدا نہیں ہے بلکہ وہ ہمیں صفائی سے بتاتا ہے کہ الٰہی قانون میں شریعت بھی شامل ہے اور اس شرعی قانون کو ماننے اور اس کے مقابلے میں اپنے اختیارات سے دست بردار ہو جانے کا نام اسلام ہے وہ ہمیں وضاحت سے بتاتا ہے کہ جن معاملات میں اللہ اور رسول نے جب کوئی فیصلہ کر دیا ہو تو اس میں کسی کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ اپنی رائے اور مصلحت کے پیش نظر کوئی فیصلہ کرے ارشاد ربانی ہے:

﴿وما كان لمؤمن ولا مؤمنة اذا قضى الله ورسوله امرا ان يكون لهم الخيرة من امرهم ومن يعص الله ورسوله فقد ضل ضلالا مبينا﴾ (الاحزاب: ۳۶)(۱۰)

ترجمہ: (اور کسی مومن اور مومنہ کے لئے جائز نہیں ہے کہ وہ ان معاملات میں اللہ اور اس کے رسول کے کسی فیصلے میں میں انہیں اختیار نہیں جو وہ فیصلہ کر دیں اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے گا وہ کھلی گمراہی میں جا پڑے گا)(۱۱)

دوسری بات جو پہلی بات کی طرح قطعی بنیادی اہمیت کی حامل ہے یہ ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری نبی ہیں یہی عقیدہ ہے جس کی بنیاد پر مجرد روح اسلام مادی جامہ اختیار کرتی ہے اس امتیاز پر اسلامی تخیل پر محسوس مادی عمارت تعمیر ہوتی ہے اسلامی نظام میں محمدی تعلیم بالاتر قانون (Supreme Law) کی حیثیت رکھتی ہے اور یہی تعلیم حاکم اعلیٰ کی مرضی کی نمائندگی کرتی ہے۔

تعلیم کی دو شکلیں

ہمیں یہ تعلیم دو شکلوں میں ملی ہے ایک قرآن دوسرے آپ کا عمل بھی قرآن کی اصطلاح میں اسوۂ حسنہ ہے جو قرآن کی توضیح وتبیین کرتا ہے ارادہ الٰہی جب عمل رسول کے ساتھ آمیز ہوتی ہے تب شریعت ہی وقوع میں آتی ہے روح اسلام یعنی ارادہ الٰہی اور آپ کے عمل کا تعلق چولی دامن کا تعلق ہے۔ جس طرح روح اسلامی لازوال ہے اس طرح اس کا قالب بھی غیر مبدل ہے یہی شریعت ہے اور اس شریعت پر عمل ارادہ الٰہی کی تکمیل ہے اس کے علاوہ کسی اور طریقہ سے ارادہ الٰہی کی تکمیل ناممکن ہے یہ ساری بحث شاہ صاحب نے اپنی بیشتر تصنیفات میں اپنے مخصوص پیرائیہ بیان میں ظاہر کی ہیں، اس سلسلہ میں خاص طور پر حجۃ اللہ الانصاف، عقد الجید اور تفہیمات کو نیز بدور البازغہ کو سامنے رکھتے ہے۔

اجتہاد کی ضرورت

اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ شریعت الٰہی کی تکمیل میں اجتہاد کی ضرورت کب اور کیوں پیش آتی ہے۔

انسان چونکہ مدنی الطبع پیدا ہوا ہے اس لئے اس کی شرست میں تمدن وتہذیب داخل ہے تمدن وتہذیب کوئی جامد شے نہیں ہے بلکہ ترقی پذیر ہے ترقی جن احوال واسباب کی مرہون منت ہے ان احوال واسباب کے تغیر سے ترقی بسا اوقات تنزل میں تبدیل ہوجاتی ہے اس کے علاوہ ہر آن تغیر پذیر زندگی میں احوال وظروف کے ان ہی تغیر وتبدل کے باعث شریعت کے انطباق کی ضرورت ہر دور اور ہر زمانے میں پیدا ہوتی رہتی ہے اور ان کے کسی نسل کو مفر نہیں ہے۔

اس بات کو شاہ صاحب تفہیمات میں اس طور پر بیان فرماتے ہیں.

امت را ہیچ وقت از عرض مجتہدات بر کتاب وسنت استغناء حاصل نیست۔

ترجمہ: (امت کو کسی وقت بھی کتاب اور سنت پر اجتہادات کو پیش کرنے سے استغناء حاصل نہیں ہے) (۱۲)

مصفی میں تحریر فرماتے ہیں:

تفصیل ایں مجمل آنست کہ اجتہاد در ہر عصر فرض بالکفایہ است ومراد اینجا نہ اجتہاد مستقل است مثل اجتہاد شافعی مسائل کثیر الوقوع غیر محصور اند۔ ....وانچہ مسطور شدہ است غیر کافی۔

(اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ اجتہاد ہر زمانے میں فرض کفایہ ہے لیکن اس جگہ مراد اجتہاد مستقل نہیں ہے جیسا کہ اجتہاد شافعی مسائل کثیر الوقوع بے شمار ہیں اور جو کچھ لکھا جا چکا ہے وہ ناکافی ہے) (۱۳)

ایک غلط فہمی کا ازالہ:

اجتہاد کے معاملے میں ایک عرصہ سے شور سننے میں آرہا ہے کہ اس کا دروازہ جو عرصہ سے بند پڑا ہوا ہے کھولا جائے، موافق ومخالف دونوں غالباً اس بات پر متفق ہیں کہ دروازہ بند ہے حالانکہ امر واقعہ یہ ہے کہ یہ دروزاہ ایک دن کے لئے بھی بند نہیں ہوا ہے۔ اجتہاد ہر دور میں اور ہر زمانے میں کیا جاتا رہا ہے فرق صرف اجتہاد مطلق اور اجتہاد مقید میں رہا ہے۔

اجتہاد کی دو قسمیں:

شاہ صاحب الانصاف میں لکھتے ہیں

اجتہاد دو طرح کا ہوتا ہے ایک مطلق اور دوسرا مقید، شاہ صاحب نے اس پر بڑی تفصیلی گفتگو کی

ہے میں امام شاطبی کی تعریف کو نقل کر رہا ہوں اس کی غرض اختصار کے علاوہ تائید بھی ہے۔

چنانچہ امام شاطبی اپنی کتاب موافقات کے باب اجتہاد میں لکھتے ہیں۔

الاجتهاد على ضربين احدهما لايمكن ان ينقطع اصل التكليف وذلك عند قيام الساعة والثانى يمكن ان ينقطع قبل فناء الدنيا اما الاول فهو الاجتهاد المطلق، وهو الذى لا خلاف بين الامة فى قبوله.

(اجتہاد مطلق کی دو قسمیں ہیں ایک وہ جس کا انقطاع ممکن نہیں، حتی کہ انسان کی سہولیت ہی ختم ہو جائے اور یہ قیامت سے قبل ممکن نہیں دوسرا وہ ہے جس کا انقطاع دنیا کے فنا سے قبل ممکن ہے پہلا اجتہاد مطلق ہے اور اس کی قبولیت کے معاملے میں امت میں کوئی اختلاف نہیں ہے) (۴)

یہی اجتہاد مطلق ہے جس کے بند ہونے پر امت کا اتفاق ہے۔

شاہ صاحب علامہ جلال الدین سیوطی کا قول تائید میں نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

وان المطلق كما ذكر فى كتاب آداب الفتياء النووى فى شرح المهذب نوعان مستقل وقد فقد من رأس اربع مائة فلم يكن وجوده.

(چنانچہ خود ابن صلاح نے اپنی کتاب کتاب آداب الفتیاء اور امام نووی نے شرح المہذب میں اس کی تصریح کی ہے ان میں سے پہلی قسم کے اجتہاد کا دروازہ چوتھی صدی ہجری کے اوائل ہی میں ہمیشہ کے لئے بند ہو گیا جس کے کھلنے کا اب کوئی امکان نہیں ہے۔ (۱۵)

اس بات کی تائید میں ائمہ اربعہ کے اجتہادات سے باہر نہ جانے کے بارے میں اپنی کتاب فیوض الحرمین میں لکھتے ہیں:

وثانیھا الوصاۃ بالتقلید بھذہ المذاھب الاربعۃ لا اخرج منھا والتوفیق ماستطعت.

(مجھے حضور نے جو تین وصیتیں فرمائیں ان میں سے دوسری یہ تھی کہ مذاہب اربعہ کی تقلید کروں اور اس دائرہ سے قدم باہر نہ نکالوں اور حتی المقدور ان کے اجتہادات کی موافقت کروں)(۱۶)

اس کی حکمت بتاتے ہوئے لکھتے ہیں:

ان فی الاخذ بھذہ المذاھب الاربعۃ مصلحۃ عظیمۃ من وجوہ ان الزمان لما طال وبعد العھد وضیعت الامانات لم یجز ان یعتمد علی اقوال العلماء السوء.

ان مذاہب اربعہ میں دائر رہنے میں دوسری باتوں کے علاوہ ایک عظیم مصلحت یہ بھی ہے کہ عہد رسالت کو گذرے ہوئے مدت گزر چکی ہے امانتیں ضائع ہوچکی تو اب یہ جائز نہیں کہ علماء سوء کے اقوال آراء پر اعتماد کیا جائے۔

اس کتاب میں ایک جگہ پر تصریح بھی کرتے ہیں کہ اجتہادات میں اولین طریقہ یہ ہونا چاہیئے کہ مذہب حنفی کے تینوں شیوخ (یعنی ابوحنیفہ، محمد وابو یوسف) کے اقوال دیکھا جائے اور جو اقرب ان السنۃ ہو اسے اختیار کرلیا جائے۔(۱۷)

اجتہاد مطلق کے بند ہونے کا سبب:

اس سلسلے میں شاہ صاحب مختلف مقامات پر بحث کرتے ہیں اس کا خلاصہ ابوزہرہ مصری کی زبانی سنئے سیرت ابن تیمیہ کے مقدمہ میں لکھتے ہیں:

چوتھی صدی ہجری میں اجتہاد مطلق کے دروازے کے بند ہونے پر جو اتفاق ہوا اس کی وجوہات حسب ذیل ہیں.

۱۔شریعت الہی کے دائمی اصول وکلیات مدون ہو چکے تھے، اورانہیں پر مختلف مذاہب کی کتابیں مدون ہوچکی تھیں، اوراب اصول وکلیات میں کسی نئے اجتہاد کا کوئی موقع باقی نہیں رہا ہے۔

۲۔اجتہاد کے لئے متعلقہ علوم میں جس مجتہدانہ بصیرت کی ضرورت ہے اس سے لوگ دور ہو چکے ہیں۔

۳۔اجتہاد مطلق کی صلاحیتیں مفقود ہوچکی ہیں۔

اجتہاد مفید:

جہاں تک مفید کا تعلق ہے تو اس کا دروزاہ ہردور میں کھلا رہا ہے اور آج بھی بند نہیں ہے پانچویں صدی ہجری میں سود کے اشکال سے بچنے کے لئے بیع الوفاء کے احکام وضع کئے گئے اورتمام متاخرین فقہائے قرض خواہوں کی رضامندی کے بغیر قرضدار کے تمام تصرفات جیسے وقف، ہبہ وغیرہ ممنوع قرار دیتے، اس طرح ہر دور میں جو اجتہادات کئے گئے ہیں ان سب کے نظائر موجود ہیں، اس موجودہ دور میں بھی اجتہاد کے نظائر نہ صرف یہ کہ ملتے ہیں بلکہ کثیر ہیں، نماز میں لاؤڈ اسپیکر کا استعمال، رویت ہلال سے متعلق شریعت کے مقاصد کو توضیح، عورت کی امارت وقضاء کے استثناء کا مسئلہ بندش ولادت کے بارے میں شرعی احکام بینکنگ اورانشورنس اوران جیسے دوسرے مالی معاملات میں شریعت کے احکامات کی تشریح الحیلۃ الناجزۃ یعنی مفقود الخبر شوہر کی عدت وانتظار کے بارے میں فتوی کی تبدیلی یہ سب باب اجتہاد وقضاء اورفتوے سے تعلق رکھنے والے ہیں۔

اجتہاد مقید کی شاہ صاحبؒ نے بھی اور دوسرے فقہاء مجتہدین نے اپنے فہم کے مطابق منقسم کی ہے اس کی قسمیں خواہ کتنی ہی ہوں بہرحال سب میں ہمت وصلاحیت کے بقدر اجتہاد کا دروازہ کھلا ہوا ہے، بلکہ شاہ صاحب الانصاف میں تو یہاں تک کہتے ہیں کہ اگر کسی دور میں مجتہدین مطلق منتسب (جو اجتہاد مقید کا سب سے اعلیٰ مرتبہ ہے) کی ذمہ داریوں کو ترک کر دیا جائے تو پوری امت گنہگار ہوگی۔ (۱۷)

اجتہاد کے بنیادی اصول:

اب ہمیں یہ دیکھنا چاہیئے کہ اجتہاد کا کون سا دائرہ ہے جس کے اندر رہ کر ہی اجتہاد کیا جا سکتا ہے اس سلسلے میں پہلا اور بنیادی اصول یہ ہے کہ عبادات اور مابعد الطبیعاتی امور میں اجتہاد کی قطعی گنجائش نہیں ہے، جس کی بنیاد پر کوئی رائے قائم کی جا سکے اس میں تو بس رسول کی تقلید کے سوا چارہ نہیں، البتہ معاملات میں جہاں اللہ ورسول کی کوئی ہدایت نہ ملتی ہو اجتہاد کی اجازت ہے لیکن یہ اجازت بھی غیر مشروط نہیں ہے، مقاصد شریعت الٰہی کی مجموعی اسکیم اس کا مزاج اور اس کی روح سب کو ملحوظ رکھنا ہوگا۔ تاکہ ایسا نہ ہو کہ اس طرح کا اجتہاد کر ڈالا جائے جو دوسرے سے شریعت کی مجموعی اسکیم یا اس کی مزاج وروح کے خلاف ہو۔

چنانچہ اس سلسلہ میں شاہ صاحب اسباب اختلاف الصحابہ والتابعین فی الفروع کے ذیل میں لکھتے ہیں:

> وان لم یجد فیما حفظه واستنبطه ما یصلح للجواب اجتهد برائی وعرف العلة امتی اوله رسول المصطفی صلی الله علیه وسلم علیها الحکم فی منصوصا فیه فطر والحکم حیثیت ما وجدها ولا یالوا اجهدوا فی موافقه غیر خبر علیه الصلاة والسلام.

> اگر کسی صحابی کو اپنے معلومات واستنباط میں کوئی چیز ایسی نہ ملتی جس سے وہ مسئلہ کا جواب دے سکتا تو انہیں رائے سے اجتہاد کرنا اور اس علت کو

معلوم کرنا جس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے منصوص احکام کی بنیاد رکھی ہے پھر جس مقام پر اس کو وہی علت نظر آتی ہے وہاں وہ وہی حکم لگا دینا، مگر ایسے قیاسات کرتے وقت یہ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقصد کا لحاظ کرنے میں اپنے مقدور بھر کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھتے ہیں۔ (۱۸)

اجتہاد کے شعبہ ہائے کار:

اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ اجتہاد کے شعبہ کون کون سے ہیں جن سے اپنے فرائض انجام دیتے ہیں۔ معاملات میں اجتہاد کے چار شعبے قرار دیئے گئے ہیں:۔

۱۔ نصوص کے معنی، مفہوم اور منشاء کو متعین کرنا۔

۲۔ جن معاملات میں شارع نے کی تو حکم نہیں دیا ہے لیکن اس سے ملتے جلتے معاملات میں جو حکم دیا گیا ہے ان میں علت کی تشخیص کر کے دوسرے معاملات میں جاری کرنا۔

۳۔ شریعت کے بیان کردہ کلی اصولوں کو جزوی مسائل پر منطبق کرنا اور یہ دیکھنا کہ نصوص کے اشارات و دلالتوں اور اقتضائات کے اعتبار سے جزوی معاملات کو شریعت کے کلی مزاج سے ہم آہنگ ہیں یا نہیں۔

۴۔ جن معاملات میں شارع کی کوئی ہدایت نہیں ملتی اور نہ کسی کلیے کے تحت وہ آسکتے ہوں ایسے معاملات میں شریعت کے وسیع تر مقاصد و مصالح اور مزاج کو ملحوظ رکھ کر ایسے قانون وضع کرنا اور ضابطے بنانا جو اسلام کے مجموعی نظام کی روح اور اس کی کلی اسکیم کے خلاف نہ ہو۔ ایسی قانون سازی اور اجتہاد کو اصطلاح میں استحسان مصالح مرسلہ اور استحباب کا نام دیا گیا ہے۔

شرائط اجتہاد:

اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ شاہ صاحب وہ کیا شرائط بیان کرتے ہیں جو ایک شخص کے مجتہد بننے کے لئے

ضروری ہیں یہ وہ شرائط ہیں جن کو شاہ صاحب نے پہلی مرتبہ پیش نہیں کیا ہے بلکہ یہ تقریباً یک ہزار سال سے امت کے نزدیک مسلمہ شرائط کی حیثیت رکھتی ہیں۔

یہ بحث شاہ صاحب نے الانصاف میں مفصل بیان کی ہے، تفہیمات الٰہیہ میں اشارے ملتے ہیں ان شرائط کو عنوان پنجگانہ کے نام سے موسوم فرماتے ہیں اور اس کے وجوب پر بھی اچھی بحث کرتے ہیں میں صرف خلاصہ پیش کرنا مقصود ہے۔

پہلا اصول: یہ ہے کہ آدمی اس زبان کو اور اس کے قواعد محاوروں کو اور ادبی نزاکتوں کو اچھی طرح سمجھتا ہو جو قرآن وسنت اور شریعت اسلام کی اپنی زبان ہے۔

دوسرا اصول: یہ ہے کہ آدمی نے قرآن مجید کا اور ان حالات کا جن میں قرآن نازل ہوا ہے گہرا مطالعہ ہو۔

تیسرا اصول: یہ ہے کہ سنت کا تحقیقی مطالعہ کیا ہو اور اس کے تمام ریکارڈ سے براہ راست ہو اور نقد حدیث میں اسے اچھی مہارت ہو۔

چوتھا اصول: یہ ہے کہ آدمی شریعت الٰہی کی عملی تطبیق اس کے ادوار، اجتہاد کے زمانی تسلسل اور اس سلسلے کے تمام ریکارڈ سے براہ راست واقف ہو اور یہ واقفیت ارتقائے تسلسل کو باقی رکھنے کے لئے نہایت ضروری ہے۔

پانچواں اصول: یہ ہے کہ آدمی ایمانداری کے ساتھ اسلامی اقدار، طرز فکر اور خدا اور رسول کے احکام کی صحت کا معتقد ہو۔

ان شرائط واصول کو ملحوظ رکھے بغیر کوئی اجتہاد آخر امت کو کس طرح قابل قبول ہوگا، اور تاریخ شاہد ہے کہ ان شرائط کا لحاظ کیے بغیر جب بھی کوئی اجتہاد کیا گیا تو مسلم معاشرے نے ہرگز قبول نہیں۔ اگر ڈنڈے کے زور سے اب کوئی اجتہاد مسلط کیا گیا تو ڈنڈے کے ساتھ ہی وہ بھی رخصت ہوگیا۔

فقہی مسالک میں اعتدال کی راہ:

اب میں اس مسئلہ کی طرف آتا ہوں کہ اجتہاد کی تاریخ میں جو اختلاف ہے اس میں شاہ صاحب نے کیا کارنامہ انجام دیا ہے۔

اس سلسلہ میں شاہ صاحب نے اپنی کتاب الانصاف میں بڑی حکیمانہ گفتگو فرمائی ہے اور تو پوری کتاب اس نقطہ نظر کے تحت لکھی گئی ہے لیکن آخری باب میں نقطہ عدل پر انگلی رکھ دی ہے وہ سب سے حیرت انگیز ہے اس باب میں شاہ صاحب نے شریعت الہٰی کے مزاج فہمی کے جس بلند مقام پر نظر آتے ہیں وہ بہت کم لوگوں کو نصیب ہوا ہے۔

سید سلیمان ندوی نے ایک جگہ لکھا ہے کہ عالم اسلام میں تین شخصیتیں اتنی نمایاں ہیں کہ مینارہ نور نظر آتی ہے، ایک ابن حزم اندلسی دوسرے ابن تیمیہ اور تیسرے شاہ ولی اللہ محدث دہلوی، اور شاہ صاحب تو ان سب میں بازی لے گئے ہیں،

اس سلسلے میں اہل فقہ ورائے اور اہل حدیث دونوں کے لئے جائز شرعی طرز عمل کی تعیین کی ہے، اس میں کوئی شک نہیں کہ نقطہ عدل کو پا لینے کے بعد قدیم اختلافات قطعی ختم تو نہیں ہوئے لیکن جن لوگوں کی تاریخ اجتہاد نقطہ پر نظر ہے وہ گروہی عصبیتوں میں کمی ہے۔

تحریک شہید کے واقعات میں ہم مسلک اعتدال کی پوری جھلک پاتے ہیں افسوس کہ تحریک کے خاتمہ سے اس مقصد کو بڑا نقصان پہنچا ہے اور وہ کام جس کی توقع بجا طور پر کی جا سکتی تھی پایہ تکمیل تک نہیں پہنچ سکا۔

دوسرا کارنامہ

شاہ صاحب کا دوسرا کارنامہ کار تجدید پر ان کی مکمل بحث ہے اس ذیل میں تجدید کی ضرورت مجددین کی صفت کار تجدید کی شرائط اور اپنے تجدیدی کام کی ضرورت اور حدود کار کو بڑی وضاحت سے پیش کیا ہے اور اس طرح مجدد و متجدد کے فرق کو واضح کر دیتے ہیں اور تجدد کے راستہ کو قطعی بند کر دینے کی سعی کرتی ہیں۔

کارتجدید کی ضرورت کیوں:

اس کارعالم میں کسی قوم وگروہ کو دوام حاصل نہیں ہے جس طرح شخصی حالات وکیفیت بدلتی رہتی ہیں اسی طرح قوموں میں بھی ترقی ومنزل کے ادوار آتے رہتے ہیں یہ دنیا مختلف صحیح وغلط نظامہائے حیات کے رزم گاہ ہے کبھی کوئی قوم غالب آتی ہے، اور کبھی دوسری ترقی وتنزل کی جگہ نظام حیات ٹکراؤ کے نتیجہ میں ہوتا ہے۔ اس لئے قوموں میں ذہنی پرگندگی اور اضمحلال پیدا ہوتا ہے غالب قوم کی ہمیشہ یہ خواہش ہوتی ہے کہ مغلوب قوم کبھی اس کے پنجہ اقتدار سے باہر نہ جا سکے، اس کے لئے وہ اس نظام حیات کو بھی جس پہ مغلوب قوم اپنی زندگی بسر کررہی ہوتی ہے حملہ آور ہوجاتی ہے ذہن وفکر سے لیکر کردار وعمل تک ہر جگہ نفوذ کی کوشش کرتی ہے۔ اور ہر جگہ شکست وریخت کے آثار ابھر آتے ہیں قوم کا مغلوب ومتاثر عنصر غالب تمدن کی ہر صحیح وغلط باتوں کو اپنے نظام میں کھپانے کی کوشش شروع کرتا ہے اور اس طرح اگر کوئی نظام کمزور ہوتو جد پیوند زمین ہوجاتا ہے ورنہ کچھ کچھ تغیرات تو بہرحال ہوجاتے ہیں۔

تجدید حق:

ایسی حالت میں ایک مجدد برحق کا کام یہ ہے کہ اسلامی نظام حیات کی شکل وروح میں جو بگاڑ آیا ہو، اس کے توازن میں اختلال واقع ہوا ہو، اسے ان تمام خرابیوں سے پاک کرکے اجتہاد وتجدید کی غیر معمولی صلاحیتوں کے ساتھ نئے سرے سے انسانوں کے ذہن وعمل میں غالب اور جاری وساری کردے۔

شاہ صاحب اس پر بڑی تفصیل سے گفتگو کی ہے تجدید کے شرائط بیان کئے اس کے حدود کار کو بتایا ہے، اور خود اپنی اصلاح کے نقاط کو واضح کیا ہے اس طرح آئندہ کے لئے تجدید کی صاف اور سیدھی راہ کھولی ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلامی تاریخ میں یہ کام انتہائی دوررس نتائج کا حامل ہے۔

تیسرا کارنامہ

علم حدیث کی تجدید:

تجدید واجتہاد کے کام کیلئے علوم حدیث کی قدر ضرورت ہے وہ اظہر من الشمس ہے فی الحقیقت اس علم کے بغیر اجتہاد وتجدید کے باب میں ادنیٰ کام بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اسی اہمیت کے پیش نظر شاہ صاحب نے باقاعدہ اس علم کی توسیع کا پروگرام بنایا۔

اس سے قبل عالم اسلام کا جو حال تھا اس کی داستان علامہ رشید رضا مظہری فرماتے ہیں

''اگر ہمارے بھائی علمائے ہند نے اس اخیر زمانے میں حدیث نبوی پر اتنی توجہ نہ مبذول کی ہوتی تو علم حدیث کا خاتمہ ہو چکا ہوتا، کیونکہ دسویں ہجری ہی میں مصر و شام، عراق وحجاز میں علم حدیث کا چرچا کم ہو چکا تھا اور چودھویں صدی کے اوائل تک تو منزل وانحطاط کی انتہا ہو چکی تھی''۔ (۲۰)

چوتھا کارنامہ

ترجمہ قرآن مجید:

عوام الناس کے ذہن کو اسلامی سانچے میں ڈھالنے کیلئے ضروری تھا کہ وہ قرآن کو سمجھ کر پڑھ سکیں شاہ صاحب دیکھ رہے تھے کہ عربی کو اب مقام شاہد حاصل نہ رہتے ہوا اس کا حق ہے چنانچہ انہوں نے علمائے عصر کے اختلاف کے باوجود ترجمہ قرآن کی ابتدا کر دی، غنڈوں نے شاہ پر مسجد فتحپوری کو قتل کے ارادے سے گھیر لیا لیکن ترجمہ مکمل ہوا اور صرف یہی نہیں بلکہ اصول تفسیر میں فوز الکبیر جیسی معرکۃ الآراء تصنیف یادگار چھوڑی، جس میں اصول تفسیر کی ایسی نئی اور دلاء تیر شاندار اصول جو شریعت کی روح اور مزاج سے پوری طرح ہم آہنگ ہے۔

پانچواں کارنامہ

اسلامی نظام سیاست کی نقشہ کشی:

شاہ صاحب کا یہ کارنامہ بھی تاریخ کے صفحات پر انمٹ نقش ہے کہ انہوں نے اسلامی نظام سیاست کی سچی اور صحیح تصویر کھینچی ہے خلافت راشدہ کے سقوط کے بعد جابر حکومتوں کے طویل دور عروج کے باعث مسلمانوں کے ذہن سے صحیح نظام سیاست کا نقشہ محو ہو چکا تھا، وہ خلافت علی منہاج النبوۃ اور دوسرے نظام سیاست میں فرق نہیں کر سکتے تھے۔

شاہ صاحب نے ازالۃ الخفاء میں اس پر سیر حاصل بحث کی ہے، نہایت عمدہ استدلال سے یہ ثابت کر کے رکھ دیا ہے کہ اصل نظام سیاست خلافت راشدہ کے دور میں پیش کردہ ہی نظام سیاست ہے، یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات کے عین مطابق ہے باقی نظام سیاست نہیں ہیں، خلافت کی حقیقت اسلام میں نظام حکمرانی حضرت عمر کے اجتہادات وفیصلے کے نظائر یہ سب کچھ ذکر کر کے گویا آئندہ کیلئے نقشہ کار رکھ دیتے ہیں یہ وہی نقشہ کار رکھ دیتے ہیں یہ وہی نقشہ ہے جس کے قیام کی خاطر برصغیر ہند و پاک میں تحریک اٹھتی رہی ہیں۔

چھٹا کارنامہ

تصوف میں اصلاح:

شاہ صاحب کے زمانے میں تصوف کو جو مقام ومرتبہ حاصل تھا اس سے شاہ صاحب صرف نظر نہیں کر سکتے تھے اور نہ اس کے خلاف کی بہت بڑا اقدام اٹھا سکتے تھے، اس لئے اس میں صرف اصلاح کی کوشش کی ہے، مسلمانوں میں صوفیت کے لوازمات میں ایذائے جسمانی اور ملامت میں مبتلا کرنے کو داخل سمجھا جاتا تھا برہم چآرگی کے اس طریقہ کے خلاف شاہ صاحب نے وصایا میں سیر بحث گفتگو کی ہے۔

ساتواں کارنامہ

اسلامی نظام حیات کی تدوین:

شاہ صاحب کا سب سے اہم اور اثر آفرین کارنامہ حجۃ اللہ البالغہ، بدر البازغہ ہے یہ وہ کام ہے جو بڑے دوررس اثرات کا حامل ہے اس کی شہرت بھی پورے عالم اسلام میں ہے دین الٰہی اکبرشاہی کے فتنہ سے متاثر ہوکر اور دوررس نگاہوں سے یہ بات محسوس کر کے کہ آئندہ نظامہائے حیات کا ایک پورا جنگل اگنے والا ہے، جس کا اشارہ شاہ صاحب تفہیمات میں بھی کر چکے ہیں۔ اس بات کا ارادہ کیا کہ اسلام کے متوازن اور عادلانہ نظام کو مربوط شکل میں مدون کر دیا جائے۔

چنانچہ آپ یہ کام شروع کرتے ہیں مابعد الطبیعاتی مسائل سے بنیادیں اٹھاتے ہیں آہستہ آہستہ حکمتوں کے اظہار کے ساتھ ساتھ نہایت حسین انداز میں ایک ایسی عمارت کھڑی کر دیتے ہیں جو اپنے حسن ترتیب اور تناسب یگانہ روزگار ہے ارتفاقات کے عنوان سے اس دہلوی شیخ نے جو کارنامہ انجام دیا ہے وہ سب سے زیادہ دل آویز اور متاثر کن ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ کا اسلامی نظام حیات کی تدوین کا یہ کارنامہ اتنا عظیم الشان ہے کہ آج تک اس کے اثرات سے عالم اسلامی خالی نہیں ہے ان شاء اللہ آئندہ صدیوں تک اس کے اثرات زندہ پائندہ رہیں گے اس کارنامہ کی موجودگی میں اسلام کے اندر کسی جاہلیت کو گھس آنے کا موقع باقی نہیں رہا ہے۔ یہی وہ کارنامہ ہے جس نے عالم اسلام کے مجموعی دین کو ذہنا دیا ہے تمام عالم اسلام اس کی بدولت احیائے اسلام اور اقامت دین کی تحریکوں سے بھر گیا ہے شاہ صاحب کا صرف یہ ایک کارنامہ ہی انہیں مجدد کے بلندترین منصب پر رونق افروز کرنے کیلئے کافی ہے۔

☆☆☆

باب اوّل

فصل دوم

حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کی قرآنی خدمات

حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی تصنیفات پر غائر نظر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ رب العزت نے آپ کی ذات گرامی کو قرآن پاک کی خدمت کے لئے ہی پیدا فرمایا تھا چنانچہ جب آپ نے عمر کے ابتدائی مراحل طے کرتے ہوئے پانچویں سال میں قدم رکھا تو قرآن پاک پڑھنے کے لئے مکتب میں بٹھائے گئے چونکہ روز ازل سے آپ کے ضمیری جوہر ربانی تجلیوں سے آراستہ اور درخشاں ہو چکے تھے لہذا فقط دو سال کے عرصہ میں یعنی عمر عزیز کے ساتویں سال میں قرآن مجید ختم کرلیا۔ ہندی مثل کے مطابق ''پوت کے پاؤں پالنے میں پہچانے جاتے ہیں'' یہ اللہ تعالی کا ایک عظیم عطیہ تھا کہ شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا نونہال ہفت سالہ بچہ پورے قرآن پاک کی تلاوت کا حامل ہو کر اپنے شفیق اور فرشتہ صفت والدین کریمین کے ساتھ نماز تہجد میں شریک اور بارگاہ خداوندی میں کبھی دست بستہ اور کبھی دست دراز کئے ہوئے دعاؤں کا لطف حاصل کرتے ہوئے نظر آرہے ہیں۔ (۲۱)

حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے اپنے والدین کریمین کی صحبت کیمیا آثر میں سوز و گداز کی لذت کا مزہ پایا اور ساتویں سال میں اپنے والدین کی معیت میں شب بیداری و دعائے نیم شبی کا ذوق حاصل کیا۔ اس کا نتیجہ تھا کہ ساتویں ہی سال میں فارسی کی کتابیں بھی شروع کیں اور ایک ہی سال میں فارسی کی کتابیں ختم کرلیں۔

یہ اسی شب خیزی و دعاء نیم شبی کا اثر تھا کہ حضرت قبلہ شاہ ولی اللہ صاحب اپنی عمر عزیز کے ابھی چودہ

منزل ہی طے کرنے پائے تھے کہ علوم درسیہ سے فراغت حاصل کی اور دستار فضیلت سے آراستہ ہو کر میدان عمل میں گامزن ہوئے اور معلم کی حیثیت سے درس وتدریس میں مشغول ہوئے۔ فی الحقیقت اگر دیکھا جائے تو شاہ صاحب کے قرآنی خدمات کی یہ تیسری منزل ہے جس کو اس کمسنی میں طے کرر ہے ہیں۔

لیکن بقول ہر کسے را بہر کار ساختند معلوم ہوتا ہے قدرت نے شاہ صاحب کی طبیعت میں خدمات قرآنی کے وہ جواہر ودیعت رکھے تھے کہ جس کی بے بہائی مسلم ہے اور یہ اتنی بطی اسیر طے منزل اسی جوہر کے بے تابی و بے قراری کی بین علامت ہے۔

اس درس وتدریس کے منزل کو اس خوش اسلوبی سے انجام دیتے ہیں کہ دہلی واطراف دہلی میں دھوم ہو جاتی ہے۔ اور یہ سحر بے کنار ایک مدرسہ کے چہار دیواری میں کہاں تھم سکتا تھا اس کو تو اطراف عالم میں اپنے موجوں کے تھپیڑوں سے صدیوں کے سوئے ہوئے انسانوں کو بیدار کرنا اور ایک عظیم قرآنی انقلاب کو منظر عام پر لانا تھا۔

اب اس سریع السفر سیر فی بحر القرآن کا دور ختم کرتے ہوئے اسی بحر بے کنار کے اعماق میں درہائے مخفیہ کی طلب دامن گیر ہوتی ہے اور تبہ در تبہ غوطہ زنی کا دور شروع ہوتا ہے جس کو تصویر نقوش دینے کے لئے شاہ صاحب نے حکومت ہند کی زبان جو اس وقت فارسی تھی ورمتبول عام بھی یہی زبان تھی۔ لہذا کلام الٰہی کو عام فہم کرنے کے لئے اسی مروج زبان میں ترجمہ کیا حالانکہ حالات نا مساعد تھے کیونکہ شاہ صاحب کی پیدائش ۱۱۱۴ھ اور وفات ۱۱۷۶ھ جو سن ہجری کے اعتبار سے آپ کی عمر ۶۲ سال جو سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم کے عمر میں ہم رنگی کا پتہ دے رہی ہے جس طرح رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے دور کی نقاشی کرتے ہوئے لطیف سائیں فرماتے ہیں۔

بالکل اسی طرح فرخ سیر، محمد شاہ رنگیلے اور شاہ عالم کے ہندوستان کو کون نہیں جانتا اس تاریک زمانہ

میں نشو ونما پا کر ایسے آزاد خیال مفکر و مبصر منظر عام پر آتا ہے کہ جو زمانہ اور ماحول کی ساری بندشوں سے آزاد ہو کر سوچتا ہے اور اپنے فکر جدید سے منتشر ذہنوں میں ایک تخریب فاسد و تعمیر صالح کی تحریک سے تعمیر نو کا ایک اور دل آویز نقشہ پیدا کر دیتا ہے۔(۲۲)

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے

بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

خود شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں کہ 'درایں زمانہ کہ ما درآنیم و دریں اقلیم کہ ما ساکن آنیم نصیحت مسلمانان اقتضائی کند کہ۔ ترجمہ قرآن عظیم بزبان فارسی سلیس و روزمرہ متداول ست تحریر کردہ شود اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ملک العلماء جناب شہاب الدین دولت آبادی جنہوں نے ۸۴۹ھ میں وفات پائی ہے۔ اور وہ شیر شاہ سوری کے استاد بھی تھے ان کی فارسی زبان میں تفسیر بحر امواج کے نام سے پہلے ہی سے موجود تھی، لیکن وہ زیادہ تر قرآن مجید کی شرح اور تفسیر ہے۔

اور حضرت مخدوم نوح ہالائی رحمۃ اللہ علیہ المتوفی ۹۹۸ھ نے برصغیر پاک و ہند میں سب سے اول فارسی ترجمہ کیا ہے جو اس دور کے بعد شائع ہوا۔

لیکن سید عبدالحق الحسنی الثقافۃ الاسلامیہ فی الہند میں شاہ صاحب کی پہلی فارسی زبان میں ترجمہ کے متعلق فرماتے ہیں۔

''وھذہ الترجمۃ من أحسن التراجم لم یر نظیرھا فیما قبل ولا فیما بعد''(۲۳)

ترجمہ: یہ قرآن پاک کے تراجم میں سے ایک بہترین ترجمہ ہے جو اس کی مثل نہ پہلے تراجم میں دیکھی جاتی ہے نہ بعد والوں میں۔

مختصر کلام کہ شاہ صاحب کی یہ پہلی خدمت صفحہ قرطاس میں ہے'' ترجمہ قرآن بفارسی زبان موسوم فتح الرحمن ۱۱۵۰ھ میں شروع کی اور ۱۱۵۱ھ میں اس کی تکمیل کی اور ۱۱۵۶ھ میں آپ نے فتح الرحمٰن کی تدریس بھی شروع کی مزید برآں شاہ ولی اللہ صاحب رحمہ اللہ نے مختصر طور پر تشریحی فوائد بھی لکھے۔

شاہ ولی اللہ کے قرآنی خدمات فکر ونظر کا انداز اور اس کی اہمیت کا معیار معلوم ہو سکے۔ مثال اور شاہ صاحب قبلہ آیت مبارکہ: ﴿کتب علیکم القصاص فی القتلی ﴾کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ قصاص سے یہاں مراد مساوات اور مماثلت ہے، قصاص کی یہ تعبیر غالباً آپ کو کسی تفسیر میں نہیں ملے گی۔

شاہ صاحبؒ کا کہنا یہ ہے کہ قرآن کریم نے اس آیت میں انسانی مساوات کو بنائے حیات قرار دیا ہے اور کتب علیکم القصاص فی القتلی الحر بالحر والعبد بالعبد والأنثی بالأنثی الخ یعنی مساوات فرض اور ضروری ہے نیز اسی میں زندگی ہے اور حصول تقوی کا انحصار بھی اسی پر ہے۔ (۲۴)

حضرت قبلہ شاہ ولی اللہ صاحب نے اپنے فارسی ترجمہ فتح الرحمٰن کے تشریحی فوائد میں جن اعلی مطالب اور بلند افکار کی طرف نشان دہی فرمائی:

﴿اولم یروا انا نأتی الارض ننقصها من اطرافها واللہ یحکم لا معقب لحکمه واللہ سریع الحساب﴾(۲۵)

کے حاشیہ پر ملتی ہے مورخین عموماً رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مدنی عہد سے اسلامی ریاست کی ابتداء مانتے ہیں ان کے نزدیک مکے میں مسلمانوں کی جماعتی زندگی کی کوئی باقاعدہ سیاسی حیثیت نہ تھی، یہی وجہ ہے کہ وہ رعد کی باقی تمام سورت کو تو مکی کہتے ہیں لیکن اس آیت کو مکی کے بجائے مدنی قرار دیتے ہیں،

شاہ صاحب قبلہ کے قرآن مجید کی خدمت بذریعہ تعلیم پر غور وفکر کرنا اور ان سے زندگی کے لئے شاہراہ ہدایت ڈھونڈنا پھر ان کی نشر واشاعت کے لئے تعلیم گاہ بنانا اور اس میں راسخین فی العلم کی جماعت تیار کرنا یہ

پہلا میدان ہے جہاں شاہ صاحب نے اپنی عقل اور وجدان کی تکمیل شدہ قوتوں کو سب سے پہلے استعمال کیا ہے اس کا نتیجہ ہے کہ شاہ صاحب قبلہ کبھی عقد الجید میں بیضاوی جیسے مفسر پر بھی اعتراض کر جاتے ہیں۔ اصول تفسیر کے بیان میں شاہ صاحب نے قرآنی مطالب اور علوم کو پانچ علوم میں تقسیم کیا ہے آپ کی یہ تحقیق ہمیں تفسیر کی بڑی کتابوں میں بھی نہیں ملتی چنانچہ آپ فرماتے ہیں کہ قرآن پاک کے مفہوم اور معنی پانچ علوم سے باہر نہیں اور قرۃ العینین میں شاہ صاحب قبلہ خود فرماتے ہیں کہ:

''جمیع کتاب اللہ تتبع کردیم زیادہ از پنج علم نیافتیم''

ترجمہ کہ وہ پانچ علوم جن کا قرآن عظیم نے تخصیص سے بیان فرمایا ہے کہ معلوم ہونا چاہئے کہ قرآن کے معنی ومفہوم پانچ علوم سے باہر نہیں (۲۶)

۱۔علم احکام جس میں واجب مستحب مباح ومکروہ وحرام آجاتے ہیں یہ احکام خواہ عبادات میں سے ہوں یا معاملات میں سے، تدبیر منزل سے متعلق ہوں یا سیاست مدن سے۔ اس علم کی تفصیل فقہا کے ذمہ ہے۔

۲۔علم مناظرہ چاروں گمراہ فرقوں سے یہود ونصاریٰ مشرکین اور منافقین اس علم کی وضاحت متکلمین کے ذمہ ہے۔

۳۔علم تذکیر بآلاء اللہ مثلاً زمین وآسمان کے پیدا کرنے اور بندوں کو ان کی ضروریات کا الہام کرنے اور نیز خداوند تعالیٰ کی صفات کاملہ کا بیان کرنا ہے۔

۴۔ چہارم علم تذکیر بایام اللہ سبحانہ وتعالیٰ یعنی ان واقعات کا بیان جن کو خداوند تعالیٰ نے ایجاد فرمایا ہے مثلاً اطاعت کرنے والوں کو انعام وجزا سے نوازنا اور نافرمانوں کو تعذیب وسزا کا مزہ چکانا۔

۵۔پنجم علم تذکیر موت اور اسکے بعد کے واقعات کا بیان مثلاً حشر ونشر حساب میزان ودوزخ وجنت ان عوم کی تفصیل کو محفوظ رکھنا اور انکے مناسب احادیث وآثار کا ملحق کرنا ناصحوں اور واعظوں کا کام ہے۔

واقعی ایسی جامع ومانع وضاحت بیک جا بڑے بڑے تفاسیر میں بھی دکھائی نہیں دیتی، ایسی حد بندی سے حضرت شاہ صاحب ولی اللہ رحمہ اللہ کا ہی حصہ ہے کہ گویا سمندر کو کوزہ میں سمو دیا ہے، اپنی کمال فراست سے قرآن فہمی کا ایک جدید طریقہ ایجاد کیا ہے جو قرآنی خدمات کا ایک عظیم کارنامہ ہے۔

شاہ صاحب نے اپنی بے نظیر اصول تفسیر کی کتاب فوز الکبیر میں مسئلہ ناسخ ومنسوخ کو متقدمین ومتاخرین کے اصطلاحی ولغوی اختلاف کے جھنجٹوں سے بالکل علیحدہ کر دیا ہے مثلاً

قال الامام جلال الدین سیوطی موفقا لابن العربی

فهذه احدی وعشرین آیة منسوخة علی خلاف فی بعضها.

یعنی امام جلال الدین سیوطی اور ابن العربی کے نزدیک بعض آیات میں اختلاف رکھتے ہوئے ۲۱ آیتوں کو منسوخ قرار دیتے ہیں۔

لیکن امام ولی اللہ کا نیا مکتب فکر سب آیات کا حل نکال کر باقی پانچ آیتوں کو منسوخ کہتے ہیں ایک عزیمت پر دلالت کرتی ہے تو دوسری رخصت پر دلالت کرتی ہے غرض کہ مندرجہ بالا قاعدوں کی رو سے نسخ کے وہ معنی نہیں رہتے جو متاخرین نے اختیار کیے ہیں اور جن کی رو سے منسوخ شدہ آیتوں پر عمل کرنا مطلقاً جائز نہیں بہر کیف امام ولی اللہ نسخ کے مسئلہ کو ایک اجتہادی امر سمجھتے ہیں اور اس میں متاخرین کی رائے سے اختلاف رکھتے ہیں۔

دوسرا اہم مسئلہ قرآن پاک میں آیات محکمات ومتشابہات کا ہے چونکہ قرآن پاک میں ان کا تعین نہیں ہے لہذا ایک بڑی الجھن اور مشکل پیدا ہو جاتی ہے اس کو بھی شاہ صاحب نے بہت حسن وخوبی سے واضح کیا ہے

راسخین فی العلم کی تعریف کرتے ہوئے معاملہ ختم کر دیا ہے۔

المختصر کہ شاہ صاحب کی مشہور عالم کتاب حجۃ اللہ البالغہ، فوز الکبیر یا خیر کثیر ہمعات وغیرہ جتنی کتابیں ہیں گویا شاہ صاحب کے الفاظ میں قرآنی خدمت انجام دے رہی ہیں۔

گوئی سعادت درمیان افتادہ اند

کس بمیدان درنمی آید سوارارا چہ شد (۲۷)

حضرت شاہ ولی اللہ اور علوم نقلیہ:

علوم نقلیہ میں حضرت شاہ صاحب کی وسعت نظر صابت فکر اور جامعیت کا شاید ہی کوئی ہو جو انکار کر سکے وہ جس مسئلے پر بحث کرتے ہیں اس کے تمام پہلوؤں کا پورا احاطہ فرماتے ہیں ان میں الجھے ہوئے مطالب کی اس طرح وضاحت ہوتی ہے اور اختلافات میں یوں تطبیق دی جاتی ہے کہ قاری کو پورا اطمینان ہو جاتا ہے علوم نقلیہ کے اہم شعبوں میں شاہ صاحب کی جو شاندار خدمات ہیں اب میں مختصراً ان کو بیان کروں گا۔

علوم القرآن

سرزمین پاک وہند میں شاہ صاحب پہلے بزرگ ہیں جنہوں نے قرآن مجید کا ترجمہ کیا یہ ترجمہ فارسی میں ہے اور اس پر مختصر فوائد بھی ہیں آپ نے اپنے مجوزہ نصاب تعلیم میں قرآن مجید کا ترجمہ لازمی قرار دیا اور اس کی تشریح کیلئے قرآن کی مختصر ترین تفسیر جلالین کا اضافہ کیا۔ قرآن مجید کے جملہ مطالب کا جمالی تعارف کرانے کیلئے شاہ صاحب نے الفوز الکبیر لکھی اور فتح الخبیر تصنیف فرما کر تفسیر بالرائے کے بجائے تفسیر بالروایات کی طرف متوجہ کیا دراصل شاہ صاحب کے پیش نظر یہ تھا کہ تعلیم کے ابتدائی مرحلے ہی میں طالب علم کا قرآن

کریم سے براہ راست تعلق ہو جائے اور وہ ہر شعبہ علم میں روایت میں بھی اور درایت میں بھی قرآن ہی کو اپنی بنیاد بنائے اور ہر مسئلے میں سب سے پہلے اس کی توجہ قرآن کی طرف مبذول ہو اور اس سے حل ڈھونڈے۔

قرآن مجید کے غامض اور مشکل مباحث کی تشریح شاہ صاحب نے اپنی مختلف کتابوں میں بڑی وضاحت سے کی ہے قرآن کریم کا اکثر حصہ حضرات انبیاء علیہم السلام کے قصص و واقعات پر مشتمل ہے شاہ صاحب نے تاویل الاحادیث میں ان کی حکمت بیان کی ہے اور حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم تک سلسلہ نبوت کے ارتقاء میں جو تدبیر تھی اسے بیان کیا ہے۔

علوم حدیث:

علوم دینیہ میں علم حدیث کا درجہ بڑا بلند ہے۔ قرآن کریم کی تفسیر و تشریح اس کے بغیر غیر معتبر ہے علم فقہ کی بنیاد اسی پر ہے علم اصول دین و معتقدات اسی کا محتاج ہے اور تاریخ اسلام اس کے بغیر نا تمام رہتی ہے برصغیر میں عمومی فتوحات اسلامیہ غزنوی سلاطین سے شروع ہوئیں اور ان کے مراکز لاہور اور ملتان میں زیادہ تر علماء کا وہ گروہ وارد ہوا۔

جس پر عقلیت اور اس کے بعد فقہ حنفی غالب تھی ان کے شاگردوں میں سے مولوی عبداللہ اور مولوی عزیز اللہ برادران تلمیہ نواح ملتان سے دہلی پہنچے اور اپنے استادوں کے طرز پر وہاں مسند درس و تدریس بچھائی۔ ان کے حلقہ درس میں ہندوستان کی ہر طرف سے طالب علم شریک ہونے لگے۔ اور اس طرح یہ سلسلہ بر صغیر میں رواج پا گیا۔

یہ ان دیار کی خوش قسمتی تھی کہ ۹۵۸ھ شیر شاہ سوری کے عہد میں شیخ سیف الدین ترک کے ہاں ایک لڑکا پیدا ہوا، جو بعد میں شیخ عبد الحق محدث دہلوی کے نام نامی سے مشہور ہوا۔ آپ اڑتیس سال کی عمر میں حج کیلئے تشریف لے گئے اور حجاز میں کئی سال رہے اور وہاں علم حدیث کی تحصیل کی۔ حج سے واپسی پر دہلی میں

آپ نے حدیث کا درس شروع کیا اور اس طرح ان دیار میں تدریس حدیث کی طرح پڑی۔

گرچہ اس عہد میں حاجی محمد افضل سیالکوٹی کا بھی علم حدیث کا اپنا سلسلہ تدریس تھا، لیکن زیادہ شہرت حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی ہی کی ہوئی آپ نے مشکوۃ المصابیح کی دو شرحیں ایک فارسی اور ایک عربی میں لکھی آپ کو فقہ حنفی میں بڑا غلبہ تھا۔ یہاں تک کہ ان ضعیف حدیثوں کو جو فقہ حنفی کے مطابق ہوتیں احادیث صحیحہ پر ترجیح دیا کرتے ان کے بارے میں حضرت مجدد الف ثانی کا یہ مقولہ مشہور ہے: سنی ست حنفی چست۔ (۲۸)

شاہ ولی اللہ نے علم حدیث اپنے والد سے پڑھا جن کا سلسلہ تلمذ حاجی محمد افضل سے ملتا ہے بعد میں آپ حجاز تشریف لے گئے اور وہاں کے اساتذہ کاملین سے نئے سرے سے اسی علم کو حاصل کیا وطن واپس آ کر آپ نے تعلیم حدیث کا طرز بدل دیا اور بجائے مشکوۃ کے موطا امام مالک کی تدریس پر زور دیا۔ اپنے المسوی اور المصفی اسی کی عربی اور فارسی شرحیں ہیں۔ جس طرح آپ نے قرآن کریم کی تعلیم اپنے فارسی ترجمے فتح الرحمٰن سے شروع کرنے کی تلقین کی اس طرح علم حدیث کے درس میں المسوی اور المصفی کو ابتداء، اور حجۃ اللہ البالغہ کو تکمیلی کتاب قرار دیا۔

موطا امام مالک کے بعد صحت روایت حدیث اور استنباط مسائل میں صحیح بخاری کا مرتبہ ہے اس کے ابواب کے متعلق مشہور ہے کہ بڑے دقیق اور مشکل ہیں شاہ صاحب نے اس سلسلے میں تراجم ابواب البخاری تالیف فرمائی عوام کیلئے چہل حدیث کے نام سے ایسی چالیس حدیثیں جمع کیں جو بہت مختصر ہیں اور پُر معنی ہیں آپ کے فرزند اکبر کے نواسے شاہ محمد اسحاق نے مشکوۃ کی اردو میں چار ضخیم جلدوں میں مظاہر الحق کے نام سے شرح لکھی۔

اصول حدیث

شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے علم حدیث کی تدریس کے سلسلے میں علم اصول حدیث پر ایک رسالہ لکھا تھا

موصوف نے حدیث کی متون کو معین کرنے کا طریقہ بتایا ہے شاہ ولی اللہ صاحب نے اس میں اصلاح کی اور متونِ حدیث کے انتقاد کا محققانہ طریقہ وضع کیا اس سلسلے میں ایک انتباہ ملحوظ رہے اور وہ یہ کہ محدثین کرام کی ایک جماعت کی یہ رائے رہی ہے کہ جتنی بھی زیدہ سے زیادہ حدیثیں جمع ہوسکیں، جمع کی جائیں، تاکہ ان سے زیدہ سے زیدہ شرعی مسائل اخذ کئے جائیں۔ یہ جماعت نیک نیتی سے یہ رائے رکھتی ہے کہ احادیث ضعیفہ بھی قابل عمل ہیں، اس لئے کہ ممکن ہے پہلے زمانے میں (صحابہ کرامؓ اور تابعینؒ کے زمانے میں) یہ حدیثیں مشہور اور صحیح ہوں بعد میں ان کے سلسلۂ اسناد میں ضعیف وغیر معتبر راویوں کے آنے سے زمانہ تدوین حدیث میں انہیں ضعیف قرار دیا گیا ہو، یہ طریقہ شیخ عبدالرحمٰن سیوطی مصری کا ہے شیخ علی متقی مکی اور شیخ عبدالحق محدث دہلوی بھی یہی رائے رکھتے تھے۔

محدثین کرام کی دوسری جماعت وہ ہے جو احادیث صحیحہ کا ذخیرہ بہت کم تسلیم کرتی ہے لیکن اس کے نزدیک وہ دین کے استنباط کیلئے کافی ہے یہ رائے امام محی الدین نووی مصری، حافظ زین الدین عبدالرحیم عراقی (حافظ ابن حجر عسقلانی) شیخ عبدالرحمن سخاوی مصری اور دیگر محدثین و محققین کی ہے۔ (۲۹)

حضرت شاہ ولی اللہ اسی دوسری جماعت کے ہم خیال ہیں۔ آپ نے اپنے اس نقطہ نظر کی اشاعت کے لئے مستقل تصنیفات کیں المصفیٰ کا مقدمہ الانتباہ فی سلاسل اولیاء اللہ کا حصہ حدیث و فقہ اور حجۃ اللہ البالغہ کا باب طبقات کتب الحدیث اس ضمن میں آتے ہیں۔ اسی طریقہ تحقیق کی مزید وضاحت شاہ عبدالعزیزؒ نے اپنی مبسوط کتاب بستان المحدثین اور مختصر رسالے عجالہ نافعہ میں کی۔

شاہ صاحب کے نزدیک اس وقت بھی مجتہد بہ مشق کرنے کے بعد ائمہ محدثین کی مرویات کی تحقیق کرنے کی قابلیت پیدا کی جاسکتی ہے۔ اور علم حدیث کا ایک طالب علم اسناد کی آزادانہ تحقیق کر کے ایک حدیث کے متعلق وہی حکم لگا سکتا ہے جو کہ مثال کے طور پر امام ترمذی نے ہر ایک متن اور سند پر اپنی کتاب جامع ترمذی میں لگایا ہے اکثر احادیث صحیحہ موطا اور صحاح خمسہ میں موجود ہیں، اور جو تھوڑی بہت باہر سے ملیں پڑیں گی وہ

مسند امام احمد میں مروی احادیث ثابتہ صحیحہ سے لی جا سکتی ہیں،

مسند امام احمد میں تین قسم کی مرویات ہیں:

ایک مرویات امام احمد۔

دوسری مرویات عبداللہ بن امام احمد۔

تیسری مرویات کتعی (امام احمد) ان میں سے مرویات امام احمد کا درجہ اعلیٰ ہے اس کے علاوہ روایات کا ذخیرہ ہے، وہ علم حدیث کے صرف متبحرین کی بحث وجستجو اور مشق ومہارت کیلئے کارآمد ثابت ہوسکتا ہے وہ نہ تو اثبات احکام شرعیہ کے کام آ سکتا ہے اور نہ یہ علم حدیث کے مبتدی طالب علموں کیلئے کارآمد ہے۔

جیسا کہ الفیہ عراقی میں صحیح حدیث کے بیان میں امام نووی کے قول کو اس مصرعے میں بیان کیا گیا ہے۔

ولم یفت الخمسة الا النذر پانچ کتابوں سے کوئی شاذونادر ہی صحیح حدیث رہ گئی ہے۔ (۳۰)

تصوف:

تصوف کا رجحان انسانی ذہن کا ایک نوعی جوہر ہے بعض طبیعتوں کو قدرت کی طرف سے اس جوہر کا وافر حصہ ملتا ہے اور بعض کو کم اور پھر بعض کو اس ملکہ کی نشوونما کے لئے سازگار ماحول نصیب ہو جاتا ہے اور بعض اس سے محروم رہتے ہیں، بہرحال یہ جذبہ کسی نہ کسی حد تک ہر انسان میں ہونا ضروری ہے لیکن آخر یہ جذبہ تصوف ہے کیا؟ اور انسانی زندگی میں کس طرح اثر انداز ہوتا ہے؟

بات یہ ہے کہ انسان محض گوشت پوست کا نام نہیں، اس گوشت پوست کے اندر ایک چیز ہے جو بولتی ہے، سوچتی ہے اور جوارح سے کام لیتی ہے، یہ انسان کا ''میں'' یا ''انا'' ہے، اسے نفس کہہ لیجئے یا روح کا نام دیجئے اس ''انا'' یا میں کا کام کیا ہے؟ یہ سوچتا ہے، یہ کچھ کہتا ہے اور پھر اس کیلئے جدوجہد کرتا ہے۔

تصوف انسان کے اس ''میں'' میں ایک ہیجان پیدا کرتا ہے، اسے ایک ولولہ دیتا ہے اس میں حرکت پیدا کرتا ہے، کہ وہ سوچے، کچھ چاہے اور اس کے لئے مصروف عمل ہو، یہ ایک برقی رو ہے جو انسان کے اندر دوڑ جاتی ہے، دھرم اور شریعت، پوجا پاٹ، ورنماز روزے کا نام تصوف نہیں، جذبہ تصوف ان کاموں کو خلوص سے عقیدت سے اور دل و جان سے کرنے کی تلقین کرتا ہے۔تصوف زندگی میں کوئی خاص راہ عمل متعین نہیں کرتا، بلکہ راہ عمل پر ہمت اور استقامت سے چلانے والا جذبہ ہے۔

یوں تو انسان سب ایک ہیں، سب میں قدرت نے کم وبیش ایک سے خصائص ودیعت عطا کیے ہیں، اختلاف ہوتا ہے، صرف ان خصائص سے کام لینے نہ لینے سے تصوف ان انسانی خصائص کو ابھارنے،

سنوارنے اور ان سے مفید کام لینے کا ذمہ لیتا ہے اس لحاظ سے تصوف کا قیام سب کیلئے ہے کسی شریعت میں اس کی تخصیص نہیں، اس کا یہ معنی نہیں کہ شریعت کی ضرورت نہیں، تصوف تو ان کی روح کو اپنانے کی تلقین کرتا ہے، وہ ایمان پر زور دیتا ہے اور اعمال نیک کی ضرورت بتاتا ہے صوفی شریعت کے بتائے ہوئے رستوں پر چلتا ہے، لیکن اپنی دھن سے اپنے جذبہ وامنگ سے، اس دھن اور جذبہ وامنگ کو پیدا کرنا تصوف کا کام ہے تصوف انسانی انا (خودی) کو بیدار کرنے کی کوشش کرتا ہے جب انسان میں یہ باطنی شعور بیدار ہوجاتا ہے تو وہ اس وقت یہ محسوس کرتا ہے کہ یہ انا کسی اور وجود برتر کا پرتو ہے، یا یہ انسانی انا کسی بڑے ''انا'' کا فیضان ہے۔

شاہ ولی اللہ کی تعلیمات کا فیض تھا کہ انقلاب کے ان طوفانوں کے مقابلہ میں ہمیں محض تصوف کی برکت سے اسلام پر ثابت قدم رہے۔ شاہ صاحب کے تصوف میں باطنی شعور کو سنوارنے اور ابھارنے کا ایک ایسا نظام ملتا ہے جو خالص اسلامی ہے اور انسانیت عامہ سے بھی ہم آہنگ ہے۔ نیز شاہ صاحب کا یہ تصوف موجودہ لادینی فکر کا صحیح مصلح ہے اور مسلمان ان کی وجہ سے ''یورپین ازم'' یورپ کی ترقیات کو اختیار کرنے کے بعد بھی اپنے مذہب سے وابستہ رہ سکتے ہیں۔

یہ ہے تصوف ! تصوف کا لفظ سن کر عام طور پر قدامت پسندی اور رجعت پسندی کا خیال آتا ہے اور تصوف کو عموماً عمل اور اقدام کی ضد سمجھا جاتا ہے لیکن تصوف ''نہایت اندیشہ و کمال جنون'' کا مجموعہ ہے۔ اور ہمارے عمل کے سوتے اسی سے پھوٹتے ہیں، اس تصوف ہی نے ہمیں ہر خطرے اور ہر مصیبت میں خدا کے دامن سے وابستہ رکھا اور اسی کا احسان ہے کہ ہمارا خدا پر عقیدہ اس قدر وسیع اور ہمہ گیر تھا کہ اس میں ساری قومیں سما گئیں، سارے ادیان آ گئے، کل کی کل انسانیت اس کے اندر جذب ہو گئی اور ساری کائنات کا اس نے احاطہ کر لیا اور یہ عقیدہ ان تمام قیود و حدود سے پھر بھی بلند و برتر رہا۔

تصوف نے ایک طرف ہمارے ذہن و فکر میں اس قدر وسعت و ہمہ گیری پیدا کی اور دوسری طرف ہمیں اتنا یقین اور استقامت بخشی کہ ہم اس باطنی شعور کو خارج میں لانے کیلئے ہمیشہ جد و جہد کرتے رہے۔ اور ناسازگار حالات اور مادی مشکلات کی کبھی پرواہ نہ کی ہمارا کہنا یہ ہے کہ مسلمانوں کا عہد اقبال تھا اور ان کے قومی میں جان تھی تو ان کا تصوف کا جذبہ تمام تر عمل پر مرکوز رہا بعد میں جب قوم کے قومی مضمحل (کمزور) ہو گئے تو جمہور کا تصوف محض اندھا دھند عقیدت بن کر رہ گیا۔

لیکن اس سے یہ سمجھنا کہ تصوف نہ تھا تو مسلمان برسر عروج تھے۔ تصوف کا دور دورہ ہوا تو ان کا زوال شروع ہو گیا، تصوف کی اصل حقیقت سے ناواقفیت کی دلیل ہے، ارباب تصوف کی بے عملی کا باعث تصوف نہ تھا بلکہ اس زمانے کے حالات نے ان میں جمود اور بے عملی پیدا کر دی تھی۔

جہاں تک برصغیر کا تعلق ہے حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اس تصوف کے ارتقاء کی آخری کڑی ہیں، انہوں نے اس تصوف کی جو تعبیر کی ہے وہ صحیح معنوں میں ہماری ذہنی زندگی کی اساس بن سکتی ہے۔

☆☆☆

باب اوّل

فصل سوم

سیاسی حالات

شاہ صاحب نے حسب ذیل گیارہ بادشاہوں کا زمانہ پایا

۱۔ عالمگیر، محی الدین محمد اورنگ زیب ۲۔ شاہ عالم (اول) بہادر قطب الدین محمد ۳۔ جہاندار شاہ معزالدین ۴۔ فرخ سیر، معین الدین محمد ۵۔ رفیع الدرجات، شمس الدین محمد، ابوالبرکات ۶۔ شاہ جہاں ثانی، شمس الدین، محمد، رفیع الدولہ ۷۔ محمد شاہ، روشن اختر، ناصرالدین، ۸۔ احمد شاہ، بہادر، مجاہد الدین، ۹۔ عالمگیر ثانی، عزالدین، محمد ۱۰۔ شاہ جہاں ثالث ۱۱۔ شاہ عالم ثانی، جلال الدین محمد۔ (۳۱)

بادشاہوں میں انقلاب

شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کی وفات، سلطنت مغلیہ کے خاتمہ اور ہندوستان کی سیاسی اور معاشرتی تباہ حالی کا نقطہ آغاز تھی اورنگ زیب کی وفات کے وقت شاہ صاحب کی عمر تقریباً چار سال تھی اور شاہ عالم ثانی کی حکومت کو ابھی تقریباً ڈھائی سال ہی گزرے تھے کہ شاہ صاحب کا انتقال ہوگیا۔

اورنگ زیب اور شاہ عالم ثانی کے درمیان جتنے بادشاہ بھی گزرے ان میں سے پورے اختیار کے ساتھ حکومت کا موقع کسی کو بھی میسر نہ ہوا اور محمد شاہ بھی عرصہ تک بھی حکومت نہ کرسکا، بیشتر تو قید ہوئے یا قتل کئے گئے جہاندار شاہ قتل ہوا، فرخ سیر اندھا کر کے قید اور پھر قتل کیا گیا، رفیع الدرجات چار ماہ بھی حکومت نہ کرسکا تھا کہ مرگیا، رفیع الدولہ کی حکومت بھی تقریباً چار ماہ رہی احمد شاہ اندھا کر کے قید کیا گیا اور عالمگیر ثانی قتل ہوا۔

اس تیزی کے ساتھ اور اس نہج پر بادشاہوں کی تبدیلی سے یہ نتیجہ نکالنا غلط نہیں کہ یہ سلطنت مغلیہ کی جانکنی کا عالم تھا مرکز کی کمزوری، اندرونی طوائف الملوکی اور بیرونی حملوں کو دعوت دیتی ہے چنانچہ مرکز دہلی کی کمزوری سے اندرون ملک صوبیداروں نے خودمختاری کا اعلان کر دیا، بنگال اور بہار پر علی وردی خاں نے قبضہ کر لیا، اودھ پر برہان الملک اور صفدر جنگ قابض ہو گئے اور دوآبے میں روہیلے اور بنگش متصرف ہو گئے اور نظام الملک نے دکن میں اپنی حکومت قائم کر لی، مرہٹوں، جاٹوں اور سکھوں کو بھی سر اٹھانے بلکہ حکومتیں قائم کرنے کے مواقع مل گئے۔ بیرونی طاقتوں میں سے پہلے نادرشاہ اور اس کے بعد ابدالی نے حملے کئے اور بنگال میں انگریزوں نے قدم جما لئے۔

تورانی اور ایرانی امراء کی مخاصمت

غوریوں سے لودھیوں تک تمام حکمران خانوادے سنی حنفی تھے، مغل شہنشاہ ہمایوں کے بعد سے جس نے سوریوں کے مقابلے میں ایرانیوں کے مدد سے فتح حاصل کی تھی، ہندوستان کی ملکی سیاست میں ایرانی دخیل ہو گئے، رفتہ رفتہ ان کا اقتدار بڑھا اور تورانی اور ایرانی دو مخالف بلکہ متحارب گروہ بن گئے اور ان کے باہمی نزاعات مرکز کو کمزور سے کمزور تر کرتے گئے۔

مولانا مناظر احسن لکھتے ہیں

> ''سارے فتنوں کی بنیاد اگر سچ پوچھئے تو ہندوستان میں بھی وہی مسئلہ رہا جس سے ہر جگہ حتی کہ پہلی صدی ہجری میں فتنوں کی ابتدا ہوئی تھی یعنی وہی شیعیت اور سنیت کا جھگڑا۔'' بقول جادو ناتھ سرکار ''آخری مغلیہ دور کی تاریخ انہی دو گروہوں کے جنگ و جدال کی تاریخ ہے۔'' (۴۲)

سادات بارہہ:

سادات بارہہ نے فرخ سیر کے برسراقتدار آنے کے بعد سے محمد شاہی عہد تک، سلطنت مغلیہ کو نو سال تک نقصان پہنچایا اور اپنا اقتدار بچانے کی کوشش کرتے رہے، انہوں نے تورانیوں کے مقابے میں قوت اپنے ہاتھ میں رکھنے کے لئے مرہٹوں تک سے معاہدہ کیا۔ یہ وطناً ایرانی نہ تھے، چونکہ مسلکاً شیعہ تھے اس لیے ان کا سہرا بھی ایرانی گروہ کی تقویت کا سبب بنا اور یرانیوں کی طاقت اتنی مستحکم ہوگئی کہ وہ عالمگیر ثانی کے دربار پر چھائے رہے۔

روہیلے:

روہیلے، جو کابل وقندھار پر نادر شاہ کے تسلط کی وجہ سے ہندوستان میں پناہ لے کر رفتہ رفتہ دوآبہ میں رہیلکھنڈ بنا چکے تھے انہوں نے خصوصیت کے ساتھ ابدالی کے حملہ کے بعد نجیب الدولہ روہیلہ کے امیر الامراء ہو جانے کی وجہ سے حکومت میں بہت دخل حاصل کرلیا تھا، بقول ہاشمی آفریدی: ''یہ ایک جنگ جو بے تابو عنصر تھا جس نے آئندہ سلطنت کی بوسیدہ عمارت کی اینٹیں اکھاڑنے اور اسے ملبہ کا ڈھیر بنانے میں حصہ لیا۔''

مرہٹہ تحریک:

جنوبی ہند کی مرہٹہ تحریک، سیوا جی کی سرکردگی میں ابتدا ہی سے سیاسی تحریک تھی، اس کا رخ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف تھا اور ان کا مقصد ہندوستان کو ہندو تہذیب کی طرف لے جانا تھا، مرہٹوں نے اورنگ زیب کے بعد جس نے پچیس سال کی کوشش میں، ان کی مرکزیت ختم کردی تھی، پھر سر اٹھایا، امراء نے باہمی عناد اور فریق مخالف کو شکست دینے کی خاطر، مرہٹوں سے امداد لی، اس سے ان کے حوصلے اور بڑھے اور جنوب مغربی علاقوں پر قبضہ کرلینے کے بعد رفتہ رفتہ ان کا اقتدار دہلی کے گردونواح تک پہنچ گیا۔

انہوں نے اگست ۱۷۵۷ء میں جاٹوں کی مدد سے دہلی پر حملہ کیا اور نجیب الدولہ کو مجبور ہو کر صلح کرنی پڑی، پھر مرہٹوں نے اپریل ۱۷۵۸ء میں لاہور پر قبضہ کرلیا۔ ۹ ذی الحجہ ۱۱۷۳ھ کو مرہٹوں کے سپہ سالار بھاؤ نے لال قلعہ پر قبضہ کرلیا اور شاہی حرم سرا کے ساتھ ساتھ سلطنت کے تمام کارخانے ان کے تصرف میں آ گئے لیکن مغلیہ تخت پر بسواس راؤ کے بٹھائے جانے کو ابدالی سے جنگ کا فیصلہ ہونے تک ملتوی کر دیا بالآخر ابدالی نے ۱۴ جنوری ۱۷۶۱ء میں پانی پت کے میدان میں ان کا خاتمہ کیا تقریباً دو لاکھ مرہٹوں کے ساتھ ساتھ بھاؤ اور بسواس بھی مارے گئے۔ (۳۴)

سکھ تحریک:

یہ تحریک شمال مغربی سے اٹھی، ابتداء یہ ایک مذہبی فرقہ تھا جس کے پہلے مرشد بابا نانک نویں صدی کے آخر اور دسویں صدی کے اوائل میں گزرے ہیں، شہزادہ خسرو کی امداد کی وجہ سے جہانگیر نے ان کے پانچویں گرو ارجن کے ساتھ سختی کی اور اسی وقت سے یہ فرقہ درویشی چھوڑ کر سیاست کے میدان میں نکل آیا۔ عالمگیر کے عہد میں گرو تیغ بہادر نے بغاوت کی اور مارے گئے۔

گرو گوبند کے جانشین بندا بیراگی کے زمانہ سے اس تحریک کی سیاسی سرگرمیوں میں بڑی شدت پیدا ہوگئی، اس نے سرہند سے لوٹ مار کا آغاز کیا اور اس پر قبضہ کرنے کے بعد سہارنپور اور سلطان پور تک کے پہاڑی علاقوں کو لوٹتا رہا، شہزادہ رفیع الشان نے اسے شکست دی اور فرار ہو کر روپوش ہوگیا۔ فرخ سیر کے زمانے میں پھر نمودار ہوا اور نہتی رعایا پر پہلے سے زیادہ ظلم توڑے، بالآخر لاہور کے صوبیدار عبدالصمد خاں تورانی نے اس کا قصہ تمام کیا۔ مسلمانوں سے سکھوں کو بڑی دشمنی تھی، آواز بلند اذان نہیں ہونے دیتے تھے، مسجدوں میں اپنے تخت لے کر ان میں گرنتھ پڑھتے تھے اور اس کا نام مست گڑھ رکھتے تھے۔

جاٹ :

جاٹ دلی اور آگرہ کے درمیان آباد تھے اور متھرا اور دتی کی سڑک پر گویا ان کی علمداری تھی، عہد زوال میں وہ جب چاہتے اس سڑک کو ناقابل گزر بنادیتے تھے، شاہ صاحبؒ کے ایک مکتوب میں جاٹوں کا حال تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے۔

شاہ صاحب احمد شاہ ابدالی کو جاٹوں کے حالات سے مطلع کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''غیر مسلموں کی ایک قوم جاٹ ہے جس کے بود و باش دہلی وآگرہ کے درمیان ہے، یہ دونوں شہر بادشاہوں کے لئے دو حویلیوں کے مانند رہے ہیں، مغل بادشاہ کبھی آگرہ میں رہتے تھے تاکہ ان کا دبدبہ اور رعب راجپوتانہ تک پڑے اور کبھی دہلی میں فروکش ہوتے تھے کہ ان کی شوکت و ہیبت سہرند اور نواحی سہرند تک اثر ڈالے۔ دہلی اور آگرہ کے درمیان کے مواضعات میں قوم جاٹ کاشتکاری کرتے تھے،

زمانہ شاجہاں میں اس قوم کو حکم تھا کہ گھوڑوں پر سوار نہ ہوں، بندوق اپنے پاس نہ رکھیں اور اپنے لئے گھڑی نہ بنائیں، بعد کے بادشاہوں نے ان کے حالات سے غفلت اختیار کرلی اور اس قوم نے فرصت کو غنیمت جان کر بہت سے قلعے تعمیر کر لئے اور اپنے پاس بندوق رکھ کر لوٹ مار کا طریقہ شروع کر دیا۔

اورنگ زیب اس وقت دکن میں قلعہ بیجاپور وحیدرآباد کے فتح کرنے میں مشغول تھا، دکن ہی سے ایک فوج جاٹوں کی تادیب کیلئے اس نے روانہ کی اور اپنے پوتے کو فوج کا سردار مقرر کیا۔ رئیسان راجپوتانہ نے اس شہزادے سے مخالفت کر لی، لشکر میں اختلاف واقع ہوا، جاٹوں کی تھوڑی سی عاجزی پر اکتفا کر کے فوج شاہی واپس ہوگئی۔ محمد فرخ سیر کے زمانے میں اس جماعت کی شورش پھر جوش میں آئی۔ قطب الملک وزیر نے زبردست فوجیں ان کی طرف بھیجیں، چورامن جو اس قوم کا سردار تھا صلح پر راضی ہوگیا اس کو بادشاہ کے سامنے لائے اور تقصیرات کی معافی دلوائی یہ کام بھی خلاف مصلحت عمل میں آیا۔

پھر عہد محمد شاہ میں اس قوم کی سرکی حد سے تجاوز کر گئی اور چورامن کا چچا زاد بھائی سورج مل اس جماعت کا سردار ہو گیا اور فساد کا راستہ اختیار کیا۔ چنانچہ شہر بیانہ جو کہ اسلام کا قدیم شہر تھا اور جہاں پر علماء ومشائخ سات سو سال اقامت پذیر تھے، اس شہر پر قہراً وجبراً قبضہ کر کے مسلمانوں کو ذلت وخواری کے ساتھ وہاں سے نکال دیا۔ اس کے عہد سے سرکشی برابر بڑھتی گئی۔ بادشاہوں اور امیروں کے اختلاف وغفلت کی بناء پر کوئی بھی اس جانب متوجہ نہ ہوا۔ اگر بالفرض ایک امیر اس کی تنبیہ کا قصد کرے تو سورج مل کے کارکن دوسرے امراء کی جانب رجوع کرتے ہیں اور اس طرح بادشاہ کے مشورے کو پلٹ دیتے ہیں۔

پسر محمد شاہ کے عہد میں صفدر جنگ ایرانی نے خروج کیا اور سورج مل سے سازش کر کے پرانی دہلی پر حملہ کر دیا اور تمام باشندگان شہر کہنہ کو لوٹ لیا۔ پسر محمد شاہ نے شہر کے دروازوں کو بند کر کے جنگ توپخانہ شروع کی، محض خدا کے فضل سے صفدر جنگ اور سورج مل دو تین ماہ کے بعد ناکامیاب واپس ہوئے اور صلح موافقت کی داغ بیل ڈالی۔

چونکہ بادشاہ کے آدمی جنگ سے تھک چکے تھے اس لئے انہوں نے صلح کو غنیمت شمار کیا، اس کے بعد سے سورج مل کی شوکت ترقی پا گئی۔ دہلی سے دو کوس فاصلہ سے لے کر آگرہ کے آخر تک طول میں اور میوات کی حدود سے فیروز آباد وشکوہ آباد تک عرض میں سورج مل قابض ہو گیا۔ کسی کی طاقت نہیں کہ اذان ونماز جاری کر سکے۔

ایک سال ہوا کہ قلعہ الورجہ کہ تمام میوات کی خبر گیری کیلئے ایک جائے بند تھی، سورج مل اس کو بھی اپنے قبضہ میں لے آیا، ارکان سلطنت میں سے کسی کی مجال نہ ہوئی کہ وہ اس کام سے روک دیتا، ہندوستان کے محصولات سات آٹھ کروڑ سے کم نہیں ہیں، بشرطیکہ غلبہ وشوکت موجود ہو ورنہ ایک کوڑی بھی ملنی مشکل ہے جیسا کہ اس وقت دیکھا جا رہا ہے جس علاقہ پر جاٹ قابض ہیں وہ ایک کروڑ روپیہ محصول کی جگہ ہے۔

جاٹوں کی شوکت کو درہم برہم کرنا بھی تدبیر کے نزدیک آسان کام ہے، انہوں نے جو علاقے اپنے قبضہ میں کر لئے ہیں، وہ ان کے نہیں ہیں بلکہ غصب کئے ہوئے ہیں، ان کے مواضع کے مالک ابھی تک زندہ موجود ہیں، اگر کوئی صاحب شوکت وعدالت بادشاہ مہربانی کا ہاتھ ان مالکوں کے سر پر رکھے تو وہ لوگ سورج مل کے مقابے کے لئے اٹھ کھڑے ہوں گے۔'' (۳۴)

جاٹوں کے ہاتھوں دہلی کے لوٹے جانے کا ذکر شاہ صاحب نے اپنے ایک اور مکتوب میں بھی کیا ہے، حافظ جار اللہ (پنجابی) کو لکھتے ہیں:

> ''دہلی میں ایک حادثہ عظیم واقع ہوا۔ قوم جاٹ نے دہلی کے شہر پناہ کو لوٹا اور حکومت اس فساد وشرارت کو دفع کرنے سے عاجز رہی۔ انہوں نے مال لوٹے، عزت وناموس کو برباد کیا اور مکانات کو آگ لگائی۔ اللہ تعالیٰ نے مجھ کو بمع اہل وعیال ومکانات کے ان کے دست ستم سے محفوظ رکھا۔ اور یہ لوٹ مار کا حادثہ اوائل رجب ۱۱۶۷ھ میں ہوا اور آخر شعبان تک باقی رہا۔'' (۳۵)

نادر شاہ کا حملہ:

نادر شاہ نے ۱۷۳۹ء میں حملہ کیا۔ صوبیداروں کی خودمختاری اور مرہٹہ، سکھ اور جاٹوں کی سرکشی نادری حملہ کے بعد مرکز کی کمزوری ہی کا نتیجہ تھے۔ سید برادران کے خاتمہ کے بعد ایرانی گروہ کی حالت چونکہ کمزور پڑ گئی تھی، اس لئے کہتے ہیں کہ انہوں نے نادر کو حملہ کی دعوت دی تھی۔ نادر شاہ محمد شاہی عہد میں ۹ ذی الحجہ کو دہلی میں داخل ہوا۔

دوسرے دن عید الاضحیٰ کے خطبہ میں محمد شاہ کے ساتھ نادر شاہ کا نام آتے ہی شہر میں کہرام مچ گیا۔ شہریوں نے نادر کے سپاہیوں کے ساتھ کچھ بدسلوکی کی اور نادر کو قتل عام اور غارت گری کا موقع مل گیا۔ عید قرباں کے تیسرے روز یا چوتھے روز نادر نے قتل عام کی چنگیزی سنت ادا کی، قتل عام تو آٹھ نو گھنٹے جاری رہا جس میں کم از کم تیس ہزار اور زیادہ سے زیادہ ایک لاکھ آدمی مارے گئے لیکن لوٹ مار کا سلسلہ کئی ہفتوں تک جاری رہا۔

دلی کے شرفا نے نادر سے خوف زدہ ہو کر جوہر کی رسم کا ارادہ کر لیا تھا لیکن شاہ صاحب نے انہیں واقعہ کربلا، اس کے مصائب اور مصائب کے باوجود اہل بیت کا جوہر جیسی کوئی غیر اسلامی حرکت نہ کرنا۔

نادر شاہ کے حالات شاہ صاحب کے قلم سے:

احمد شاہ ابدالی کو ہندوستان پر حملہ کی دعوت دیتے اور اسے نصیحت کرتے ہوئے شاہ صاحب لکھتے ہیں:

> ''خدا سے پناہ مانگتا ہوں اس بات سے کہ نادر شاہ کی طرح عمل ہو
> کہ وہ مسلمانوں کو زیر و زبر کر گیا اور مرہٹہ اور جاٹ کو سالم و غانم چھوڑ کر چلتا
> بنا۔ نادر شاہ کے بعد سے مخالفین قوت پکڑ گئے، اور لشکر اسلام کا شیرازہ بکھر گیا
> اور سلطنت دہلی بچوں کا کھیل بن گئی، پناہ بخدا، اگر قوم کفار اسی حال پر رہے
> اور مسلمان ضعیف ہو جائیں تو اسلام کا نام بھی کہیں باقی نہ رہے گا۔''

احمد شاہ ابدالی کے حملے:

احمد شاہ ابدالی (وفات ۲۰ رجب ۱۱۸۶ھ) نے ۱۷۴۷ء سے ۱۷۶۹ء تک نو بار ہندوستان پر حملے کیے، ۱۷۶۰ء میں اس نے جو حملہ کیا، اس کا سبب خود ہندوستان کے لوگوں کی دعوت تھی، جو مرہٹوں سے تنگ آ چکے

تھے، شاہ ولی اللہؒ نے حملہ کی دعوت دی تھی، شاہ صاحب نے حملہ کی دعوت دیتے ہوئے ابدالی کو جو خط لکھا ہے وہ ان کے اعلیٰ سیاسی تدبیر کی ناقابل انکار شہادت ہے۔

شاہ صاحبؒ نے اگر چہ اپنے خط میں احمد شاہ ابدالی کو یہ نصیحت بھی کی تھی کہ مسلمانوں کو نہ لوٹا جائے لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس کی فوجوں نے دہلی کو بلا امتیاز ہندو مسلم خوب لوٹا ''الحمد للہ کہ اس حادثہ عامہ میں عافیت نصیب ہوئی، اس محلہ کو معلوم نہیں ہوا کہ مخالف کی فوج آئی تھی یا نہیں، نہ تو لوٹ ڈالنے والوں کی لوٹ سے کوئی اذیت پہنچی اور نہ اس تاوان وجرمانہ (تعزیری ٹیکس) سے جو جو بیوں پر ڈالا گیا تھا کوئی زیر بار ہوا۔

سابق میں عالمگیر نے جو کچھ کہہ دیا تھا کہ اس فتنہ میں تم کو سلامتی رہے گی وہ بھی ظہور میں آیا۔ اکثر کی جائیدادوں کی سندیں (دستاویزیں) ضبط ہوگئیں مگر میری سندیں واپس کر کے مجھ کو واپس کر دی گئی ہے۔

اہل شہر اپنے قتل ہونے سے تو محفوظ رہے لیکن دولت کا وہ فاسدہ جن لوگوں کے مزاجوں میں پیدا ہوگیا تھا اس کا تنقیہ پورے طور پر ہوگیا چنانچہ عبرت کی چیز ہے کہ جو لوگ جاہ وحشمت میں اس قدر زیادہ تھے قید وضرب وسزا بھگتنے میں بھی وہی آگے آگے رہے مگر جس کو اللہ تعالیٰ نے محفوظ رکھنا چاہا وہ محفوظ رہا۔ (۳۵)

انگریزوں کی عملداری:

مختلف مذکورہ حالات کی وجہ سے مرکز اور مسلمانوں کی کمزوری کے نتیجے میں ۱۷۵۷ھ میں سراج الدولہ کے مقابلہ میں میر جعفر کی غداری سے انگریزوں نے پلاسی کا معرکہ جیتا اور بنگال پر قابض ہوگئے۔

یہ تھے اس دور کے سیاسی حالات جنہیں شاہ ولی اللہ نے اپنی آنکھوں سے دیکھا اور جن میں انہوں نے اپنی دینی بصیرت اور قوت تدبر سے کام لے کر تحفظ ملت اسلامیہ کی خاطر عملی طور حصہ بھی لیا۔

حضرت شاہ ولی اللہ کے

عہد کے اخلاقی اور مذہبی حالات

اورنگ زیب عالمگیر کے بعد مسلمانوں کا جو اخلاقی اور مذہبی زوال شروع ہوا اور پھر اپنی انتہا کو پہنچ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ یہ مسلمانوں کے سیاسی زوال کا نتیجہ تھا، حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ سیاسی زوال نتیجہ تھا مسلمانوں کے اخلاقی اور مذہبی زوال کا۔ البتہ جب سیاسی زوال آیا تو اخلاقی اور مذہبی زوال بھی اپنی انتہا کو پہنچ گیا۔

یہ خیال بھی صحیح نہیں کہ مغلیہ حکومت کے زوال کی تاریخ عالم گیر اورنگ زیب کے بعد شروع ہوتی ہے جن حضرات نے عہد مغلیہ کی تاریخ کا مطالعہ کیا ہے وہ اس رائے کی سطحیت کا اندازہ کر سکتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ جن مصائب اور فتن نے عالمگیر کے جانشینوں کی عزت وحشمت کو خاک میں ملایا ملک کے امن وامان کو تہ وبالا کیا اور بالآخر میں آتش فتن نے مغلیہ حکومت کی حشمت وسطوت کو جلا کر خاک کا ڈھیر بنا دیا تھا اس کی پہلی چنگاری عہد عالم گیر ہی میں سلگی تھی،

مغلیہ حکومت کا زوال عالمگیر اورنگ زیب کے عہد ہی میں شروع ہو چکا تھا لیکن عالمگیر کے تدبر، بصیرت، حکمت عملی اور بروقت اقدامات نے حکومت کے شیرازہ کو بکھرنے سے بچا لیا، لیکن وہ ان اسباب کا پوری طرح قلع قمع نہ کر سکا جو مسلمانوں کے دلوں میں پوری طرح گھر کر چکے تھے اور رفتہ رفتہ مسلم سماج اور ریاست کو گھن کی طرح کھائے جا رہے تھے یہ امراض وخصائل جو مسلمانوں میں پیدا ہو رہے تھے اور پرورش پا رہے تھے جنہوں نے مغلیہ حکومت کو مرہٹوں کی فوجی طاقت، جاٹوں کی بغاوت، سکھوں کی سرکشی اور دکن کی مرکز دشمن ریاستوں سے زیادہ نقصان پہنچایا، آرام طلبی، غداری، فرض ناشناسی، خود غرضی، جبن موت سے خوف

حتی کہ میدان جنگ سے فرار، دشمن کو پیٹھ دکھانا اور میدان جنگ میں دشمن کی ضربات سے صاف بچ کر نکل آنے کو ایک فن سمجھنا اور اسے اپنے معیوب اور شرمناک نہ سمجھنا وتیرہ تھے۔

''مغل فوج میں صرف آرام طلبی اور محنت سے جی چرانے کا مرض نہ تھا بلکہ ان میں غدار اور نمک حرام بھی بہت تھے۔ جس کثرت سے مغل سپہ سالار مرہٹوں کے ساتھ مل جاتے تھے اس کی مثال ہندوستان کی تاریخ میں مشکل سے ملے گی اور تو اور مغل شاہزادے اور اورنگ زیب کے بیٹے اس سے بالاتر نہ تھے۔ جنجی کے محاصرے کے وقت شاہزادہ کام بخش نے جو ذوالفقار خان کے ساتھ فوج کا سپہ سالار تھا، راجہ رام کے ساتھ اپنے باپ کے خلاف ساز باز کرنا شروع کیا اور وہ اپنی فوج کے ساتھ مرہٹوں کے ساتھ ملنے والا ہی تھا کہ ذوالفقار خان اور اس کے باپ اسد خان کو پتہ لگ گیا اور انہوں نے اسے گرفتار کر کے زیر حراست اورنگ زیب کے پاس بھیج دیا۔ ستارہ میں مرہٹوں نے شاہزادہ محمد اعظم کو رشوتیں دے کر یہ طے کر لیا تھا کہ وہ ان کی رسد رسانی میں مخل نہ ہوگا چنانچہ وہ قلعہ جس میں محاصرہ کے وقت دو ماہ کی رسد تھی، چھ ماہ تک فتح نہ ہوا۔''(۳۶)

جو کیفیت سپہ سالاروں کی تھی وہی حالت قلعہ داروں منصب داروں، مناصبوں اور معمولی سپاہیوں کی اور امیروں وزیروں کی تھی اور جن قلعوں کی فتح میں کئی مہینے صرف ہوتے تھے وہ ان کی نالائقی یا نمک حرامی سے دنوں میں دشمن کو، بغیر کسی کشت وخون کے واپس مل جاتے جب ۱۷۰۴ء میں اورنگ زیب جنوبی دکن کو چھوڑ کر داکن کھیڑ دکی طرف متوجہ ہوا تو تھوڑے ہی عرصے میں اس طرح ستارہ پرنالہ اور پاؤ گڑھ کے قلعے، مغلوں کے ہاتھ سے نکل گئے۔

دشمنوں سے ساز باز کرنے اور اپنی نالائقی اور غفلت شعاری سے ان کا ہاتھ بٹانے کے علاوہ مغلوں نے اب ایک نئی بات یہ سیکھی تھی کہ لڑنے سے جی چراتے اور اگر انہیں کہیں خطروں کا سامنا کرنا پڑتا تو بجائے ان کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کے راہ فرار اختیار کرتے اور لطف یہ ہے کہ اس فن کثیف میں بادشاہ کے بھائی بند تورانی بد مذہب ایرانیوں سے بڑے ہوئے تھے ایک دفعہ اورنگ زیب سے تورانی امیر میر محمد امین نے شکایت کی کہ فوج کے اعلیٰ عہدے بدمذہب اور دیوثیرت ایرانیوں کو مل رہے ہیں تو بادشاہ نے لکھا:

> ''جماعت تورانیاں کہ برادران، ہمشہری بزرگان ما اند بہ مضمون: ولا تلقوا بایدکم الی التهلکة یعنی میندازید خود را بدستہائے خود در ہلاکت درعین گیرودار، مراجعت را معیوب نمی دانند۔ اگر درآوردن کسے ایں حالت او ہر چنداں مضائقہ ندارد، لیکن درعین کارزار سخت مشکل است اگر عیاذاً باللہ از ہمراہیاں حضور ایں صورت واقع شود، در یک لحظہ مقدمہ تمام حکایت بانجام برسد''۔

اگر دریں امر مجرب و آزمودہ انکارے داشتہ باشد، مفصل معروض دارد و جماعت ایرانیاں، خواہ ولایت زا، خواہ ہندوستان زا کہ بجہل مرکب مشہور اند بصد مرحلہ ازیں حرکت دور اند۔''

انصاف بدہ کہ چہل آں مردم زشت
بہتر ز ہزار عقل روباد سرشت (۳۷)

اس دور کے علماء و مشائخ کی حالت کیا تھی وہ کن بحثوں میں الجھے ہوئے تھے اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے:

> ''مشائخیت روحانیت پر غالب آ گئی اور تجدیدی تحریک قومیت کے

گرداب میں گم ہوگئی جب خواجہ محمد معصوم کی وفات ہوئی تو ان کے وارثوں میں سے ہر ایک نام نہاد قیومیت کا دعویدار تھا سبھی آپس میں لڑ رہے تھے کہ قیوم میں ہوں اور دنیا میرے سر پر قائم ہے حضرت خواجہ محمد معصوم نے اپنے بیٹے سیف الدین کو اورنگ زیب کے پاس امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے لئے بھیجا تھا لیکن جس انداز سے وہ رہتے تھے اس کا بیان ایک معتقد کی زبانی سنئے آپ کی بارگاہ عالی اطلس کی بنی ہوئی جس میں جواہرات جڑے ہوئے تھے اس بارگاہ میں سنہری کرسی جواہرات سے جڑی رکھی جاتی جس پر آپ بیٹھتے تھے۔ اس کے گردونواح امراء بادشاہ نہایت ادب سے دست بستہ کھڑے رہتے تھے''

یہ تھے حالات۔ جب دہلی کے ایک نامور کے گھر، آخر عمر میں ایک فرزند ارجمند تولد ہوا جس کی قسمت میں لکھا تھا کہ وہ ان حالات کی اصلاح میں ہاتھ پاؤں مارے اور اس اخلاقی اور روحانی انحطاط کا سدباب کرے'' (۳۸)

اورنگ زیب جب تک زندہ رہا وہ اپنے تدبر، بیدار مغزی، حکمت عملی اور مضبوط نظم وضبط سے ان حالات کا مقابلہ کرتا رہا اورنگ زیب کے بعد اگرچہ مغلیہ تخت وتاج کو اس کا جانشین مل گیا لیکن سیاسی بصیرت، تدبر، بیدار مغزی اور حسن انتظام سلطنت میں اورنگ زیب کا کوئی جانشین پیدا نہیں ہوا۔ اورنگ زیب کے بعد مسلمانوں کے سماجی اور اخلاقی حالات اور بھی خراب ہوگئے۔

''آرام کی عادت اور تن پروری کے اسباب نے جسم کو محنت وزحمت اٹھانے کے قابل نہ رہنے دیا۔ سپہ سالار پالکیوں میں بیٹھ کر فوجیں لڑانے جاتے تھے سواروں کے سازوبرق دیکھ کر لشکر پر برات کا دھوکہ ہوتا تھا کئی

فرنگی سیاحوں نے اس زمانے کے سفرنامے لکھے ہیں۔ مقامی تاریخوں سے بھی تصدیق ہوتی ہے کہ بادشاہی اردو، ایک متحرک شہر معلوم ہوتا تھا اور ان کے بازاروں میں ہر قسم کا سامان راحت جس کی شہری اقامت میں دولت مندوں کو تلاش رہتی ہے، مہیا کیا جاتا تھا۔

اس اعتبار سے وہ آج کل کے بڑے جہازوں سے جن میں مسافروں کی عیش و تفریح کے لوازم فراہم کیے جاتے ہیں، معنوی مماثلت رکھتا ہے جو قوم زمانہ جنگ وسفر میں یہ آسائش ڈھونڈتی ہو حالت اقامت میں ان کی جس قدر خوگرفتہ اور پابند ہوگی، وہ ظاہر ہے ان تعیشات میں زیادہ زور خواب گاہ اور دسترخوان کی وسعت پر دیا جاتا تھا بہتر سے بہتر باورچی اور پکوانی ہنرمندی کے کمال دکھاتے اور نئی نئی قسم کے کھانے پکاتے طرح طرح کے مصالحوں سے ان کو بامزہ بناتے تھے۔ اطباء کی مدد سے یہ غذائیں نہایت مقوی تیار کی جاتی تھیں اور عیاشی کی لاگ سے بہت سی ادویہ اور منشیات امیروں کی خوراک کا ضروری حصہ بن گئی تھیں۔

عالمگیر دور کو چھوڑ کر مغلیہ درباروں میں شراب کا دور خاص طرح عام تھا نفسانی جذبات کو زیادہ مشتعل کرنے کی غرض سے ارباب نشاط کی بارہویں صدی ہجری (اٹھارہویں صدی عیسوی) میں افراط پائی جاتی ہے کہ رنڈیوں کی پوری ایک قوم پرورش پاتی تھی۔ بڑے شہروں میں ان کے محلے کے محلے آباد تھے اور مشکل سے شمالی ہند کا کوئی قصبہ ایسا ہوگا جہاں ان کے اڈے نہ بن گئی ہوں، ان کے جلوس میں سازندوں، مرداییوں، ڈوموں،

ڈفالیوں کی فوج کی فوج اپنی زندگی خراب کرتی اور دوسروں میں گندگی
پھیلاتی پھرتی تھی۔ یہ لوگ اخلاق کے حق میں کئی جراثیم تھے جو عموماً آہستہ
آہستہ ملت کی رگ دپے میں تیر جاتے تھے''۔(۳۹)

مذکورہ بالا خط میں شاہ صاحب نے صوفیوں کے بارے میں مختصر الفاظ میں اشارہ کیا ہے لیکن وصیت میں اس طبقے کے افعال واخلاق سے بالکل پردہ اٹھادیا ہے فرماتے ہیں:

''اس زمانے کے مشائخ کے ہاتھ میں ہاتھ نہ دینا چاہیئے اور کبھی ان
کا مرید نہ ہونا چاہیئے کیونکہ آج کل یہ لوگ طرح طرح کی بدعات ورسومات
میں مبتلا ہیں شہرت، رجوع خلق مریدوں کی کثرت دیکھ کر دھوکا نہ کھانا چاہیئے
اور نہ ہی ان کی کرامتوں سے دھوکا کھانا چاہیے عوام کا رجحان اور غلو رسم
ورواج کے کرامت پرستوں نے عام طور پر طلسمات اور شعبدہ بازی کو
کرامت سمجھ رکھا ہے الا ماشاء اللہ انہیں شعبدہ بازیوں کو وہ کرامت کہہ کر
مخلوق کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ ان لوگوں کے نزدیک سب سے بڑی
کرامت یہ ہے کہ دل کا حال بتادیا جائے اور آئندہ پیش آنے والے
واقعات معلوم ہوجائیں اور یہ امر بہت آسان ہے''۔(۴۰)

حضرت شاہ صاحب نے امت کے مختلف طبقات کو خطاب فرمایا ہے اس خطاب کے پس منظر میں ہم اس دور کے صوفیان ومشائخ کی اخلاقی اور ایمانی حالت کو اچھی طرح دیکھ سکتے ہیں اس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ صوفیاء ومشائخ ایمان واخلاق کی دولت سے تہی دامن رسوم آباء کے پرستار، باپ دادا اور بزرگان دین کے نام کے تاجر، ٹکڑیوں میں بٹے ہوئے، اپنے اصل مقصد اور نصب العین قطعاً غافل، خدا کے احکام او ررسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کی جانب دعوت دینے کے بجائے اپنی پرستش کے داعی اور اپنی پیشوائی

کے مدعی، خود گم کردہ راہ اور دوسروں کو بھٹکانے والے، اہل دین کی شکل وصورت میں حرص وہوس کے بندے، دنیا کے پرستار دولت کے بھوکے تھے۔ صرف مال ودولت کے لئے لوگوں کو مرید کرنا، ایک علم شریف واتصوف کو بیچنا اور اس کے ذریعہ دنیا سمیٹنا ان کا شیوہ تھ۔

شاہ صاحب فرماتے ہیں:

''اور اپنی مرضی کی پابندی کا لوگوں کو حکم دیتے ہیں۔ یہ لوگ بٹا مار اور راہزن ہیں، ان کا شمار دجالوں، کذابوں فتنوں اور ان لوگوں میں ہے جو خود فتنہ اور آزمائش کا شکار ہیں''۔

پھر اسی خطاب میں عوام کو نصیحت فرماتے ہیں۔

''خبردار خبردار! ہرگز اس گروہ کی پیروی نہ کرنا جو اللہ کی کتاب اور رسول اللہ کی سنت کی طرف دعوت نہ دیتا ہو اور اپنی طرف بلاتا ہو کہ زبانی جمع وخرچ صوفیہ کرام کے اشاروں کے متعلق عام مجلسوں میں نہ کیا جائے کیونکہ مقصد تو (تصوف) سے صرف یہ ہے کہ آدمی کو احسان کا مقام حاصل ہو جائے''۔ (۴۱)

عالموں، زاہدوں اور واعظوں کی اخلاقی اور مذہبی حالت بھی نام نہاد صوفیاء ومشائخ سے قطعاً مختلف نہ تھی۔ حضرت شاہ صاحب نے امت مسلمہ کے ان طبقات سے بھی خطاب فرمایا ہے اور اسی خطاب اور ہدایت ونصیحت کے پس منظر میں ان طبقات کے اخلاق وخصائل، عادات، اطوار کی تصویر دیکھی جا سکتی ہے۔

علماء فلسفہ یونان میں ڈوبے ہوئے تھے، صرف نحو اور منطق وکلام کو تم دین سمجھ رکھا تھا۔ قرآن مجید اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم وتدریس سے شغف نہ تھا۔ علوم یونانیاں میں درک علم کی معراج سمجھا

جاتا تھا۔حضور کی روش کی پیروی اور آپ کی سنت پرعمل سے یکسر عاری اور سیرت طیبہ اور قرآن کے وہ احکام زندگی میں جن کی واقعی ضرورت تھی۔جن سے زندگی سنورتی ہے،اخلاق درست ہوتے ہیں اور افکار کو جلا ملتی ہے ان سے قطعاً غافل تھے۔

اس خطاب کے آخر میں فرماتے ہیں:

''جن علوم کی حیثیت صرف ذرائع آلات کی ہے تو ان کی حیثیت آلہ اور ذریعہ ہی کی رہنے دو نہ کہ خود ان ہی کو مستقل علم بنا بیٹھو،علم کا پڑھنا تو اس لئے واجب ہے کہ اس کو سیکھ کر مسلمانوں کی بستیوں میں اسلامی شعائر کو رواج دو،لیکن تم نے دینی شعائر اور اس کے احکام کو تو پھیلایا نہیں اور لوگوں کو زائد از ضرورت باتوں کا مشورہ دے رہے ہو۔تم نے اپنے حالات سے عام مسلمانوں کو یہ باور کرادیا ہے کہ علماء کی بڑی کثرت ہوچکی ہے''۔(۴۲)

حضرت شاہ صاحب کے خطاب کا مندرجہ ذیل ٹکڑا سلاطین و امراء اور ارکان دولت کی اخلاقی و مذہبی حالت کی تصویت کشی کیلئے کفالت کرتا ہے۔

''اے امیرو! کیا تم خدا سے نہیں ڈرتے،دنیا کی فانی لذتوں میں ڈوبے جارہے ہو اور جن لوگوں کی نگرانی تمہارے سپرد ہوئی ہے ان کو تم نے چھوڑ دیا ہے تاکہ ان میں سے بعض بعض کو کھاتے اور نگلتے رہیں۔کیا تم علانیہ شرابیں نہیں پیتے اور پھر اپنے اس فعل کو تم برا بھی نہیں سمجھتے۔کیا تم نہیں دیکھ رہے ہو کہ بہت سے لوگوں نے اونچے اونچے محل اس لئے کھڑے کئے ہیں کہ

ان میں زنا کاری کی جائے اور شرابیں ڈھائی جائیں۔ جوا کھیلا جائے لیکن تم اس میں دخل نہیں دیتے اور اس حال کو نہیں بدلتے تمہاری ساری ذہنی قوتیں اس پر صرف ہو رہی ہیں کہ لذیذ کھانوں کی قسمیں پکواتے رہو۔ اور نرم و گداز جسم والی عورتوں سے لطف اٹھاتے رہو۔ اچھے کپڑے اور اونچے مکانات کے سوا تمہاری توجہ اور کسی طرف نہیں ہوتی۔ کیا تم نے اپنے سر کبھی اللہ کے سامنے جھکائے، خدا کا نام تمہارے پاس فقط اس لئے رہ گیا ہے کہ اپنے تذکروں اور قصے کہانیوں میں اس نام کو استعمال کرو۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کے لفظ سے تمہاری مراد زمانہ کا انقلاب ہے کیونکہ تم اکثر بولتے ہو کہ خدا قادر ہے کہ ایسا کر دے۔ یعنی زمانہ کے انقلاب کی یہ تعبیر ہے''۔ (۴۳)

شاہ صاحب نے ایک خط میں بھی بادشاہ امراء اور ارکان دولت کو کچھ نصیحتیں کی ہیں اس سے یہ بات مترشح ہوتی ہے کہ آزمائش کے وقت امراء منصب دار اور لشکری بادشاہ سے نمک حرامی اور ملت بیضاء کے مفاد سے غداری کرتے تھے اسلامی غیرت و عزت ان میں نام کی نہ تھی لشکروں کو وقت پر تنخواہیں نہ ملتی تھی اور اس وجہ سے وہ سودی قرض لینے پر مجبور ہوتے تھے اس سے طرح طرح کے مفاسد پھیلتے تھے رشوت عام تھی حتی کہ قاضی محتسب تک لیتے تھے مذہب کے خدمت گزار کسمپرسی کی حالت میں تھے بادشاہ اور امراء عیش و عشرت کی زندگی گزار رہے تھے اور بادشاہ اور امراء اسلامی حکومت کے استحکام اور ملت اسلامیہ کے اجتماعی مفاد کے کاموں سے یکسر غافل تھے۔

حضرت شاہ صاحب فرماتے ہیں

''جو لوگ اس فتنہ میں غنیم کے ساتھ ہوئے ہیں ضروری ہے کہ ان کو

جاگیر و منصب اور خدمت سے بے دخل کردیں تاکہ ان کیلئے یہ چیز سزا کے
قائم مقام ہو جائے اور دوسرے لوگ اس قسم کے مواقع پر حق نمک کی ادائیگی
کے رسالتہ سے نہ بھٹکیں ۔ افواج بادشاہی کی ترتیب عمدہ طریقہ پر کرنی چاہیئے
اور یہ ترتیب تین طریقوں سے ہو سکتی ہے:

۱۔ نجیب ہوں، بہادر ہوں اور اپنے ساتھیوں پر شفیق ہوں اور تہ دل سے بادشاہ کے خیر خواہ ہوں ۔

۲۔ جن لوگوں سے اس فتنہ میں بے غیرتی اور نمک حرامی سرزد ہوئی ہے ان کو معزول کر کے دوسروں کو داخل رسالہ کیا جائے ۔

۳۔ ملازموں کی تنخواہیں بغیر تاخیر کے ان کو ملنی چاہئیں اس لئے کہ تاخیر کی صورت میں وہ لوگ سودی قرض لینے پر مجبور ہوتے ہیں اور ان کا اکثر مال ضائع ہو جاتا ہے۔ .... قاضی اور محتسب ایسے لوگوں کو بنایا جائے جن پر رشوت ستانی کی تہمت نہ لگائی گئی ہو ۔ ائمہ مساجد کو اچھے طریقہ پر تنخواہ دی جائے ۔ نماز باجماعت کی حاضری کی تاکید اور ماہ رمضان کی بے حرمتی کی مخالفت پورے طور پر کی جائے ۔

بادشاہ اسلام اور امراء عظام ناجائز عیش و عشرت میں مشغول نہ
ہوں ۔ گزشتہ گناہوں سے سچے دل سے توبہ کریں اور آئندہ گناہوں سے
بچتے رہیں ۔ (۴۴)

یہ بیان کسی مورخ کا نہیں بلکہ ایک حکیم اور مدبر کی جانب سے بادشاہ، امراء اور ارکان سلطنت کے نام نصیحت نامہ ہے جس میں نہ صرف ان کے زیر دستوں کی بلکہ خود ان کی اخلاقی کمزوریوں کی بھی نشاندہی اور ان کے ترک کی نصیحت کی گئی ہے اس لئے اس کی اہمیت ایک مورخ کے بیان سے بڑھ جاتی ہے ۔

ہمیں اس بیان کی صداقت معلوم کرنے کے لئے کسی اور کسوٹی کی ضرورت نہیں بلکہ اس دور کی اخلاقی ومذہبی اور سماجی تاریخ کی یہ خود کوئی اور تاریخ کی صحت کا معیار ہے۔

امراء اور ارکان دولت کی جو اخلاقی ومذہبی حالت تھی اس سے ان کے زیردستوں کی حالت کا اندازہ بھی لگایا جا سکتا ہے حضرت شاہ ولی اللہ نے ان کی کمزوریوں اور اخلاقی پستیوں کی بھی نشان دہی کردی ہے۔ فوجیوں سے خطاب میں شاہ صاحب نے انہیں جن معائب کے ترک کی نصیحت کی ہے ان میں جہاد سے غفلت، نماز سے بے پروائی، میدان جنگ ومقابلہ سے فرار، عوام پر ظلم ان کا مال غصب کر لینا، دولت ودنیا کا عشق، عیاشانہ زندگی کی طلب بھنگ اور شراب نوشی وغیرہ عادات خبیثہ شامل ہیں۔

حضرت شاہ صاحب فرماتے ہیں:

''اے فوجیو! اور عسکریو! تمہیں خدا نے جہاد کے لئے پیدا فرمایا تھا مقصد یہ تھا کہ اللہ کی بات اونچی ہوگی اور خدا کا کلمہ بلند ہوگا اور شرک اور اس کی جڑوں کو تم دنیا سے نکال پھینکو گے لیکن جس کام کے لئے تم پیدا کئے گئے تھے اسے تم چھوڑ بیٹھے اب جو تم گھوڑے پالتے ہو ہتھیار جمع کرتے ہو اس کا مقصد صرف یہ رہ گیا ہے کہ اپنی دولت میں اس سے اضافہ کرو۔

اس سلسلہ میں جہاد کی نیت سے تم بالکل خالی الذہن رہتے ہو۔ تم شرابیں پیتے ہو بھنگ کے پیالے چڑھاتے ہو۔ عام لوگوں پر زیادتیاں اور ظلم کرتے ہو۔ حالانکہ جو کچھ ان کا لے کر کھاتے ہو اس کی قیمت ان تک نہیں پہنچتی''۔

کسی قوم اور ملک کیلئے تاجر اور صنعت کار ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے ہیں اگر کسی قوم کے تاجر اور

صنعت کار دین داری ورعمدہ اخلاقی کی صفات سے محروم ہو جائیں تو ملک کا اقتصادی توازن بگڑ جاتا ہے اور اخلاقی لحاظ سے معاشرہ تباہ ہو جاتا ہے۔

حضرت شاہ صاحب کے عہد میں اس طبقہ کی اخلاقی اور مذہبی حالت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ امانت دیانت کی صفات سے یہ طبقہ محروم اور توہمات میں گرفتار تھا اور ان میں ایک ایسا طبقہ پیدا ہو گیا تھا جس نے کسی جائز پیشے کو اختیار کرنے کی بجائے عورتوں کی حرام کمائی کو اپنا ذریعہ معاش بنا لیا تھا۔

اس طبقہ کی مذہبی و اخلاقی حالت کے اظہار کیلئے حضرت شاہ صاحب کا یہ خطاب کفالت کرتا ہے

اے ارباب پیشہ'' دیکھو، امانت کا جذبہ تم سے مفقود ہو گیا ہے تم اپنے رب کی عبادت سے خالی الذہن ہو چکے ہو ورتم اپنے فرضی بنائے ہوئے معبودوں پر قربانیاں چڑھاتے ہو تم مدار اور سالار کا حج کرتے ہو تم میں سے بعض لوگوں نے فال بازی اور ٹونکا اور گنڈے وغیرہ کا پیشہ اختیار کر رکھا ہے یہی ان کی دولت ہے اور یہی ان کا ہنر ہے یہ لوگ خاص قسم کا لباس اختیار کرتے ہیں۔ خاص طرح کے کھانے کھاتے ہیں ان میں جن کی آمدنی کم ہوتی ہے وہ اپنی عورتوں اور بچوں کے حقوق کی پروا نہیں کرتے۔ تم میں سے بعض صرف شراب خوری کو پیشہ بنائے ہوئے ہیں اور تم ہی میں سے کچھ لوگ عورتوں کو کرایہ پر چلا کر پیٹ پالتے ہیں یہ کیسا بدبخت آدمی ہے اپنی دنیا اور آخرت دونوں کو برباد کر رہا ہے۔

حالانکہ حق تعالیٰ نے تمہارے لئے مختلف قسم کے پیشے اور کمانے کھانے کے دروازے کھول رکھے ہیں لیکن تم خدا کی ناشکری اور غلط راہ

حصول رزق کی اختیار کی''۔ (۴۵)

''اب میں عام مسلمانوں کی طرف متوجہ ہوتا ہوں۔ آدم کے بچو! دیکھو تمہارے اخلاق سو چکے ہیں۔ تم پر بے جا حرص سوار ہو گیا ہے تم پر شیطان نے قابو پا لیا ہے۔ عورتیں مردوں کے سر پر چڑھ گئی ہیں اور مرد عورتوں کے حق برباد کر رہے ہیں حرام کو تم نے اپنے لئے خوش گوار بنا لیا ہے اور حلال تمہارے لئے بدمزہ ہو چکا ہے۔ (۴۶)

چاہیئے کہ تم اپنی شہوانی خواہشوں کو نکاح کے ذریعہ پوری کرو۔ اپنے شکم کی خواہشوں کی تکمیل چاہیئے کہ کھانوں سے کرو اور اتنا کمانے کی کوشش کرو جس سے تمہاری ضرورتیں پوری ہوں۔ دوسروں کے سینے کا بوجھ بننے کی کوشش نہ کرو کہ ان سے مانگ کر کھایا کرو تم ان سے مانگو اور وہ نہ دیں۔ اسی طرح بے چارے بادشاہوں اور حکام کے اوپر بھی بوجھ نہ بن جاؤ۔ تمہارے لئے یہی پسندیدہ ہے کہ تم خود کما کر کھایا کرو۔ کوئی نہ کوئی کمائی کی راہ آدمی ضرور اختیار کرے اور اسی کے ساتھ قناعت کو اپنا دستور زندگی بنالے اور رہنے سہنے میں اعتدال کا جادہ اختیار کر لے۔

اے آدم کے بچو! تم نے ایسے بگڑے ہوئے رسوم اختیار کر لئے ہیں جن سے دین کی اصلی صورت بگڑ گئی ہے۔ بری بری رسمیں تم میں جاری ہیں، جنہوں نے تمہاری زندگی تم پر تنگ کر دی ہے۔ ان رسموں میں تم اپنی دولت ضائع کرتے ہو وقت برباد کرتے ہو اور جو صحت بخش روش تھی اسے چھوڑ بیٹھے ہو۔ تم نے اپنی نمازیں برباد کر رکھی ہیں تم میں کچھ لوگ ہیں جو دنیا کمانے میں

اور اپنے دھندوں میں اتنے پھنس گئی ہیں کہ نماز کا انہیں وقت ہی نہیں ملتا کچھ
لوگ ہیں جو قصہ کہانی سننے میں وقت گنواتے ہیں۔

تم نے زکوٰۃ کو بھی چھوڑ دیا ہے۔ حالانکہ کوئی ایسا دولت مند نہیں ہے
جس کے اعزہ اقربا میں حاجت مند لوگ نہیں ہوتے۔ تم میں سے بعضوں نے
روزے چھوڑ رکھے ہیں خصوصا جو فوجی ملازم ہیں کہتے ہیں کہ وہ روزہ رکھنے
پر قادر نہیں ہیں۔ تم کو معلوم ہونا چاہیئے کہ تم نے راہ غلط اختیار کر دی ہے اور تم
حکومت کے سینے پر بوجھ بن گئے ہو۔ بادشاہ جب اپنے خزانے میں اتنی
گنجائش نہیں پاتا جس سے تمہاری تنخواہ ادا کرے تو رعایا پر زندگی کو دشوار
کر دیتا ہے سپاہیوں یہ تمہاری کیسی بری عادت ہے''۔ (٤٧)

مضمون کے اس حصے میں قوم کے مختلف طبقات اور عوام کی اخلاقی اور مذہبی حالت کا جائزہ لیا گیا ہے
کسی معاشرے کے یہی طبقات ہیں جن کے عادات وخصائل اور اطوار وخصائل کی روشنی میں اس معاشرے کی
اخلاقی و مذہبی حالت اور بلندی و پستی کا فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔

اس لئے اس بحث کو مزید طول دینے کی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی۔ بہ آسانی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ
اخلاقی لحاظ سے اس درجہ پست اور مذہبی لحاظ سے اس طرح فسق وفجور میں ڈوبے ہوئے طبقات سے معاشرہ کی
جو عمارت تعمیر ہوگی وہ کس درجہ بلند اور شاندار ہوگی۔



باب اوّل

فصل چہارم

اساتذہ وشیوخ

شاہ صاحبؒ کے اساتذہ وشیوخ میں حسب ذیل دس حضرات کے اسماءگرامی ملتے ہیں: ۱۔ان کے والد شاہ عبدالرحیمؒ (ولادت ۱۰۵۴ھ وفات ۱۱۳۱ھ) درسی کتب کا بیشتر حصہ شاہ صاحب نے اپنے والد ہی سے پڑھا جس کی تفصیل انہوں نے خود الجزء اللطیف، انفاس، اور القول الجمیل میں ذکر کی ہے اور جس کا خلاصہ خود شاہ صاحب کی اس تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ:

''واما العلوم الظاھرۃ فن التفسیر والحدیث والفقہ والعقائد والنحو والصرف والکلام والاصول والمنطق فقد تعلمنا من سیدی الوالد رض اللہ عنہ''

شاہ صاحب نے اپنے والد سے تصوف کی بعض کتابیں بھی پڑھی ہیں۔

۲۔ شیخ محمد افضل السیالکوٹی ثم الدہلوی (م ۱۱۴۶ھ) شاہ صاحب کو ان سے مشکوۃ اور صحاح ستہ کی اجازت حاصل ہوئی ہے۔

۳۔ حاجی محمد فاضل سندھی۔ یہ بزرگ علم قرات قرآن میں شاہ صاحب کے شیخ ہیں،

چنانچہ خود تحریر فرماتے ہیں:

''قال العبد الضعیف ولی اللہ بن عبدالرحیم عفی عنہ قرات

القرآن کلہ من اوله الی آخرہ بروایة حفص عن العاصم

علی الصالح الثقة حاجی محمد فاضل السندی ۱۱۴۵ھ۔

۴۔ شیخ تاج الدین القلعی الحنفی۔ شاہ صاحب کو ان سے حسب ذیل کتب کی قرات واجازت کا شرف حاصل ہے بخاری (صرف دو تین روز درس میں حاضر ہوئے) کتب ستہ کے اطراف، موطا امام مالک، مسند دارمی، اور امام محمد کی کتاب الآثار کا کچھ حصہ، موطا امام محمد۔

۵۔ شیخ ابو طاہر کردی۔ (ولادت ۱۰۸۱ھ وفات ۴ رمضان ۱۱۴۵ھ) مشائخ حرمین میں سے جن سے شاہ صاحب نے سب سے زیادہ استفادہ کیا وہ شیخ ابو طاہر ہی ہیں۔ شاہ صاحب نے ان سے حسب ذیل کتابیں پڑھیں: صحیح بخاری (کامل)، مسند دارمی (کامل) الائمہ (کامل) صحیح مسلم، ترمذی، ابوداؤد، ابن ماجہ، موطا امام مالک، مسند امام احمد، الرسالۃ للشافعی، الجامع الکبیر، الادب المفرد للبخاری، شفا قاضی عیاض (ان کتابوں کا کچھ حصہ) سورہ الصف، الحدیث مسلسل بانی احبک، الحدیث المسلسل بالمصافحہ، الحدیث المسلسل بالاولیۃ (ان کی سماعت کی)۔

جس طرح شاہ صاحب شیخ ابو طاہر سے متاثر تھے اسی طرح شیخ ابو طاہر بھی شاہ صاحب کی صلاحیتوں سے کم متاثر نہ تھے۔ شیخ ابو طاہر نے شاہ صاحب کو جو سند دی ہے اس میں لکھتے ہیں

"فانه طلب منی امراهوا حق ان يقتبس من مشكوته"۔

مولانا محمد محسن ترہتی نے شاہ صاحب کے بارے میں شیخ ابو طاہر کا یہ قول نقل کیا ہے کہ:

"كان يسند عنى اللفظ و كنت اصحح منه المعنى"۔

۶۔ شیخ وفد اللہ المکی المالکی۔ شاہ صاحب نے ان سے موطا امام مالک پڑھی ہے اور ان کے والد کی تمام مرویات کی اجازت ان سے حاصل کی ہے۔

۷۔عمران احمد المکی۔شاہ صاحب لکھتے ہیں:

''واجازنی لجمیعه (ای لجمیع مافی ''صلة الخلف'' لابن سلیمان، ذکر فیه اسانیه راقم) السید عمر ابن بنت الشیخ عبدالله بن سالم عن جده''

۸۔شیخ عبدالرحمٰن النخلی۔

شاہ صاحب لکھتے ہیں:

''اما النخلی فله رسالة (بغیة الطالبین لبیان المشائخ المحققین المعتمدین، طبع حیدر آباد دکن راقم) جمع فیها اسانیده، اجازنی لها ابوطاهر عنه وناولنیها الشیخ عبدالرحمن النخلی ابن الشیخ احمد المذکور واجازنی لها عن ابیه.

۹۔شیخ سالم بن عبداللہ۔شاہ صاحب لکھتے ہیں۔

''واما البصری فالف ولده الشیخ سالم رسالة اجازنی بها وبجمیع ماتصح روایته عن السید عمر عن جده الشیخ عبدالله المذکور''

۱۰۔ابن عقیلہ۔شاہ صاحب کے شیخ کی حیثیت سے ان کا ذکر کتانی نے کیا ہے۔راقم الحروف کو شاہ

صاحب کی کسی تحریر سے اس کا ثبوت نہیں۔

ملا شاہ صاحب لکھتے ہیں کہ میری سند کا اتصال حرمین کے سات مشائخ سے ہوتا ہے، ان سات مشائخ کی تفصیل اور ان سے شاہ صاحب کی سند کا اتصال منسلکہ نقشہ سے معلوم ہوگا۔ یہ سات مشائخ حسب ذیل ہیں:

۱۔ شمس الدین محمد بن علاء البابلی (م ۱۰۷۷ھ)۔ ۲۔ شیخ عیسی الجعفری المغربی (م ۱۰۸۰ھ)۔

۳۔ محمد بن محمد بن سلیمان المغربی (م ۱۰۹۴ھ)۔ ۴۔ شیخ ابراہیم الکردی (م ۱۰۷۰ یا ۱۰۷ھ) یہ حیات ون میں ہے غالباً لیکن انفاس میں ۱۹۳ میں تاریخ وفات ''وانا انا عدی فراقک یا ابراھیم لمحزنون'' لکھی ہے اور اس سے مختلف تاریخ نکلتی ہے۔ ۵۔ شیخ حسن العجمی (م ۱۱۱۳ھ)۔ ۶۔ شیخ احمد النخلی (م ۱۱۳۰ھ)۔ ۷۔ شیخ عبداللہ بن سالم البصری ثم المکی (م ۱۱۳۴ھ)

ان سات حضرات سے شاہ صاحب کی روایت بلا واسطہ نہیں۔ ان میں سے بعض حضرات کا شاہ صاحب کی ولادت اور بعض کا ان کے سفر حرمین سے قبل انتقال ہو چکا ہے۔

شاہ صاحب لکھتے ہیں کہ ان سات حضرات کی اسناد دو حضرات پر منتہی ہوتی ہیں۔ (۱) شیخ الاسلام زین الدین زکریا (م ۱۸۵۲ھ) (۲) شیخ جلال الدین سیوطی (م ۹۱۱ھ)

پھر ان دونوں حضرات کے بارے میں شاہ صاحب کہتے ہیں کہ ان کی اسناد تین حضرات پر منتہی ہوتی ہیں: (۱) شہاب الدین احمد بن ابی طالب الحجار المعروف بابن الشحنہ (م ۷۱۳ھ) (۲) فخر الدین ابوالحسن علی بن حمد بن عبداللہ المعروف بابن البخاری (م ۶۹۰ھ) (۳) شرف الدین عبدالمؤمن ابن خلف الدمیاطی (ولادت اواخر ۶۱ھ)

مذکورہ سات مشائخ تک شاہ صاحب کی سند کن واسطوں سے متصل ہوتی ہے اس کی تفصیل منسلکہ شجرہ سے معلوم ہوگی۔ (۴۷)

شاہ صاحب کی تصانیف

آپ کی تصنیفات بہت ہیں اور سب کے سب نافع اور مفید اور بعض ان میں سے اپنے باب میں عدیم النظیر غیر مسبوق منہا جو مندرجہ ذیل کا ذکر کیا جاتا ہے۔

قرآن ومتعلقات قرآن:

۱۔فتح الرحمٰن فی ترجمہ القرآن۔فارسی،مطبوعہ

۲۔المقدمہ فی قوانین الترجمہ۔فارسی،مطبوعہ

۳۔الفوز الکبیر مع فتح الخبیر۔فارسی وعربی،مطبوعہ

۴۔تاویل الاحادیث۔عربی،مطبوعہ

متفرقات:

۱۔ حجۃ اللہ البالغہ (عربی)

۲۔ ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء (فارسی)

۳۔ اطیب النعم فی مدح سید العرب والعجم،تفہیمات الالہیہ۔(عربی وفارسی)

۴۔ مصفی شرح فارسی مؤطا۔(فارسی)

۵۔ المسوی من احادیث مؤطا۔(عربی)

۶۔ فیوض الحرمین۔(عربی)

۷۔ انسان العین فی مشائخ الحرمین۔(فارسی)

۸۔ فوز الکبیر۔(فارسی)

۹۔ قول الجمیل ترمیم بخاری۔

۱۰۔ ہمعات (فارسی)

۱۱۔ الطاف القدوس۔ (فارسی)

۱۲۔ تاویل الاحادیث۔ (عربی)

۱۳۔ المقالۃ الوضعیہ فی النصیحۃ والوصیۃ۔ (فارسی)

۱۴۔ عقید الجید فی احکام الاجتہاد والتقلید۔ (عربی)

۱۵۔ الانصاف فی بین اسباب الاختلاف۔ (عربی)

۱۶۔ سرور المحزون۔ (فارسی)

۱۷۔ لمحات (فارسی)

۱۸۔ سطعات (فارسی)

۱۹۔ المقدمہ السنیہ فی انتصار الفرقۃ السنیہ۔ (عربی)

۲۰۔ فتح الرحمان ترجمہ فارسی قرآن

۲۱۔ انفاس العارفین۔ (فارسی)

۲۲۔ خیر کثیر۔ (عربی)

۲۳۔ شفاء القلوب۔ (فارسی)

۲۴۔ فتح الخبیر۔

۲۵۔ قرۃ العنین فی تفصیل الشیخین۔ (فارسی)

۲۶۔ البدور البازغہ۔ (عربی)

۲۷۔ الزہراوین۔

۲۸۔ الانتباہ فی احادیث رسول ﷺ۔ (فارسی)

۲۹۔ اعراب القرآن۔

۳۰۔ شرح رباعتین۔

۳۱۔ مسلسلات۔

۳۲۔ الاربعین۔ (عربی)

۳۳۔ الارشاد الی مہمات علم الاسناد۔ (عربی)

۳۴۔ بوارق الولایہ۔ (فارسی)

۳۵۔ تحفۃ الموحدین۔

۳۶۔ التفہیمات الالہیہ۔ (عربی و فارسی)

۳۷۔ حسن العقیدۃ۔ (عربی)

۳۸۔ الامداد فی مآثر اجداد۔ (فرسی)

۳۹۔ ہوامع شرح حزب البحر۔ (فارسی)

۴۰۔ شوارق المعرفۃ۔ (فارسی)

۴۱۔ المکتوب مدنی۔ (عربی مطبوعہ)

۴۲۔ القول الجمیل فی بیان سواء السبیل۔ (عربی)

۴۳۔ المقدمۃ السنیۃ۔ (۴۸)

۴۴۔ الانصاف فی بیان سباب الاختلاف (عربی)

ان کے سوا ایک کتاب تفہیمات ہے اس میں دو سو رسالوں سے زیدہ بلکہ کئی سو ہیں۔

الی غیر ذلک بلکہ تفہیمات میں فرماتے ہیں

ومن نعم الله علی ولا فخر ان جعلنی الله ناطق هذه الدورة وحكيمها وقائد هذا الطبقة وزعيها فنطق على لسانی ونفث فی نفسی فان نطقت باذكار القوم واشغالهم نطقت بجوامعها واتيت على مذاهبهم جميعها وان تكلمت على نسب القوم فيما بينهم وبين ربهم زديت لی مناكبها وبسطت فی جوانبها ودافيت ذروة سنامها وقبضت على مجامع خطامها .

وان خطبت باسرار اللطائف الانسانيه تغوصت قاموسها وتلمست ناعرسها وقبضت على جلابيبها واخذت بتلابيبها وان تميطت ظهر علم النفوس ومبالغها فانا ابو عذرتها آتيهم بعجائب لا تحصى وغرائب لا تكتنه ولا اكتناهما يرجى وان بحثت عن علم الشرائع والنبوات فانا الليث عرينها وحافظ جرينها بينها ودارث خزائنها وباعث مغابنها. وكم الله من لطف خفی يدق خفاه عن فهم الذكی(۴۹)

انصاف کی بات:

انصاف یہ ہے کہ اگران کا وجود صدر اول اور زمانہ ماضی میں ہوتا تو امام الائمہ و تاج المجتہدین میں شمار کئے جاتے ثنائے علماء عصر و مشائخ دہر کی ان پر اس قدر ہے کہ یہ مختصر اس کے نقل کی طاقت نہیں رکھتا۔

اولاد:

حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہ نے اول اپنے ماموں کی دختر سے نکاح کیا تھا ان سے مولوی محمد صاحب پیدا ہوئے تھے۔ اور آپ بڑے ولی کامل تھے۔ آپ پر جذب بہت غالب تھا۔

عقد ثانی اور ابناء اربعہ:

بعد انتقال والدہ ماجدہ مولوی محمد صاحب کے شاہ صاحب نے دختر نیک اختر سید ثناء اللہ صاحب ساکن قصبہ سونیپت مسماۃ بی ارادہ رحمۃ اللہ علیہا سے شادی کی ان سے چار فرزند پیدا ہوئے۔

۱۔ مولانا شاہ عبدالعزیز

۲۔ مولوی رفیع الدین

۳۔ شاہ عبدالقادر

۴۔ مولوی عبدالغنی

اور ایک دختر مسماۃ بی بی امۃ العزیز

دختر مذکورہ کو مولوی محمد فائق بن مولوی محمد عاشق بن شاہ عبداللہ بن شیخ محمد پھلتی رحمۃ اللہ علیہم اجمعین سے شادی کردی۔ (۵۰)

شاہ صاحب کی پیشنگوئی اور اس کا مصداق:

قول جلی میں ان کے کلام فیض نظام سے ذکر کیا ہے کہ فرمایا کہ یہ لڑکے کے لطف الٰہی نے ہم کو عطا کیے ہیں سب سعداء ہیں ایک نوع کی ملکیت ان میں ظہور کرے گی لیکن تدبیر غیب تقاضا کرتی ہے کہ وہ شخص اور پیدا ہوں کہ مکہ اور مدینہ میں سالہا احیائے علوم دین کریں اور اسی جگہ وطن اختیار کریں ماں کی طرف سے ان کا نسب ہماری طرف متمکن ہو کیونکہ آدمی زیادہ ماں کے وطن کی طرف میلان کرتا ہے۔ انتقال ایک جماعت کا جو

اپنی والدہ کے وطن میں متمکن ہوں کسی اور سرزمین کی طرف بالطبع مستحیل ہے۔

محرر سطور کہتا ہے کہ مصداق اس آگاہی کا وجود ہر دو نواسہ حضرت شاہ عبدالعزیز دہلوی قدس سرہ کا ہے مولوی محمد اسحاق اور مولوی محمد یعقوب رحمہ اللہ کی دہلی سے ہجرت کر کے مکہ مکرمہ میں اقامت فرمائی اور سالہا باحیائے روایت حدیث شریف با اہل عرب وعجم مشغول رہے۔ واللہ اعلم۔

لیکن اس وقت میں یہ خاندان علم وکمال کا منقرض ہوگیا اور کوئی ایک ان میں سے باقی نہ رہا۔

یفعل اللہ ما یشاء و یحکم ما یرید (۵۱)

نمونہ کلام عربی و فارسی:

میل طبیعت کبھی طرف نظم عربی و فارسی کے بھی فرماتے تھے۔ منجملہ ان کے منظومات کے ایک قصیدہ طویل الذیل ہے، نعت نبوی میں اول اس کا یہ ہے:

کان نجوما او مضت فی الغیاہب　　عیون الافاعی او رؤس العقارب

اور اشعار فارسی سے یہ اشعار ہیں:

عملے کہ نہ ماخوذ ز مشکوۃ نبی ست

واللہ کہ سیرابی ازاں تشنہ لبی ست

جائے کہ بود جوۂ حق حاکم وقت

تابع شدن حکم فرد بولہبی ست

☆ ☆ ☆

کہ باور دار دایں حرف از فقیر خاکسار من

کہ ظلم عالم قدس ست انکار قبول او

ندارد باطنش از خویش آئینہ صفت رنگے

طلسم حیرت آمد دست تمکین وفضول او
شعاع آفتاب از راہ این روزن ہمی ریزو
بجز ایں نکتہ نتواں بست مضمون وصوس او

☆ ☆ ☆

نخستین بادہ کاندر جام کردند
مزاجش عکس آن گلفام کردند
شراب وحدت از خمخانہ غیب
مراصبح ازل در کام کردند
جو غلطیدم زمستیہا بہر سو
حریفاں مستی از من دام کردند

☆ ☆ ☆

دمے دارم زخود جہابش میتواں گفتن
درو کیفیت جوش شرابش میتواں گفتن
سویدائے دل مایش اندر پیچ وتاب او
نفوس عالم ام الکتابش میتوا گفتن

☆ ☆ ☆

تابکے محنت مہجوری ودوری نکشم
نازنین وطنم سوئے وطن باز روم
تابکے باخس وخاشاک بود صحبت من

صدر بزم چمنم سوئے چمن باز روم

تا یکے ہمدمے سنگ شود شیوہ من

گوہرے از عدنم سوئے عدن بازروم نے(۵۲)

☆ ☆ ☆

مرزا صاحب جونظم حضرت شاہ ولی اللہ کے انتقال پر پڑھی وہ یہ ہے:

تھی عجب ذات مکرم شاہ ولی اللہ کی ذات

فیض بخش نسل آدم شہ ولی اللہ کی ذات

رونق دین محمد واقف سر آمہ

حامی شرع معظم شہ ولی اللہ کی ذات

کیا عجب گر منکشف اسرار عالم ان سے ہوں

راز سے حق کے تھی محرم شہ ولی اللہ کی ذات

بس ہے یہ فضل دمشرف اس شاہ والا کا کہ تھی

ذات آنسہ ورے ہمدم شہ ولی اللہ کی ذات

گر خدا چاہے تو ہونگے اولیا ہیں اے غنی

کیونکہ رہبر رکھتے ہیں ہم شہ ولی اللہ کی ذات(۵۳)

وفات:

۲۹ رمحرم ۱۱۷۶ھ بمطابق ۲۰ راگست ۱۷۶۲ء بوقت ظہر، اکسٹھ سال چار ماہ کی عمر پائی میں وفات پائی، تاریخ وفات یہ مصرع ہے:

او بود امام اعظم دیں

رضی اللہ عنہ دار ھناہ آمین کذا فی الاتحاف (۵۴)

حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہ نے کتاب انفاس العارفین میں خاص ذکر والد ماجد اور حضرت شاہ عبدالرحیم رضی اللہ عنہ اور عم بزرگوار شاہ ابوالرضا محمد رضی اللہ عنہ میں تالیف فرمائی ہے اس میں ان کے احوال ومقامات وکرامات وملفوظات ذکر کئے ہیں چونکہ اس کے حصہ ول کے آخر میں چند کلمات سودمند لکھ ہیں ان کا لکھ یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے فرماتے ہیں کہ:

اس فقیر نے بعض یاروں سے سنا تھا کہ نام ان کا عالم ملکوت میں ابوالفیض ہے میں نے تنہائی میں اس کام سے استفسار کیا تبسم فرمایا اور کہا اس طرح ہے اور تیرا نام ابوالفیاض ہے۔

شاہ عبدالرحیم کی نصیحتیں:

ایک دن متصل نماز ظہر کے طرف متوجہ ہوئے اور فی البدیہہ یہ دو بیتیں فرمائیں:

گر تو راہ حق بخواہی اے پسر
نظر کس را مرانجاں الحذر
در طریقت رکن عظیم رحمت ست
ایں چنیں فرمود آں خیر البشر

اس وقت فرمایا کہ دوات وقلم حاضر کرو اور اس کو لکھ حضرت حق سبحانہ نے ناگاہ دل میں القا فرمایا ہے تاکہ تجھ کو اس کی وصیت کروں اس وقت اشارہ فرمایا کہ یہ ایک عظیم نعمت ہے شکر اس کا لازم ہے انفاس نفیسہ ایشاں سے یہ دو بیت ہیں:

اے کہ نعمت ہائے تو از حد فزوں
شکر نعمت ہائے تو از حد بروں

عجز از شکر تو باشد شکر ما

گر بود فضل تو مارا رہنموں

اس فقیر کو مجلس صحبت میں حکمت عملی اور آداب معاملہ بہت سکھا تے تھے منجملہ ان کے جو کچھ حافظہ میں رہا ہے یہ ہے کہ فرماتے تھے کہ:

۱۔ مجلس میں برائی مت کر کہ اہل یورپ میں ایسے ہیں اور اہل پنجاب ایسے ہیں اور افغان ایسے ہیں اور مغل ایسے ہیں شاید درمیان ان کے کوئی آدمی اس قوم کا اہل حمیت اس قوم سے ہو تو اس کو برا لگے اور صحبت منغص ہو جائے۔

۲۔ فرماتے تھے کہ کوئی بات مخالف جمہور کے مجلس میں ہرگز زبان پر مت لا۔ گو وہ بات نفس امر میں صحیح ہی کیوں نہ ہو کہ وہ اس پر انکار کریں اور صحبت منغص ہو جائے۔

۳۔ فرماتے تھے کہ تجھ کو کسی سے کوئی حاجت ہو تو اس کے واسطے ایک تمہید شائستہ کر اور اس حاجت کی طلب میں تدریج کر ایسا نہ چاہیے کہ بات کو پتھر کی طرح ڈال دے۔

۴۔ فرماتے تھے کہ مجلس عام میں ہرگز کسی بر رو صریح مت کر۔

۵۔ فرماتے تھے کہ آدمی کا لباس وزی ایسا ہونا چاہئے کہ اس کی صنعت و کمال پر مشعر ہو مثلاً جو آدمی دانشمند ہے اسے چاہیے کہ دانشمندوں کا لباس پہنے اور انہیں کے آئین کے ساتھ زندگانی کرے اور جو فقیر ہے اس کو چاہیئے کہ فقیروں کا لباس پہنے اور انہیں کے آئین سے زندگانی کرے۔

۶۔ فرماتے تھے کہ بزرگوں کے مخاطبہ میں سخن مغلق ہو جز آہستہ روا نہیں ہے۔

۷۔ فرماتے تھے کہ اگر تجھ سے شجاعت یا سخاوت یا قنوت ظہور میں آتے تو چاہیے کہ ابنائے بزرگار اس کو تجھ سے دیکھیں۔

عبادت کے مقصود اعظم اس سے رضامندی مریض کی ہے نہ محض اطلاع اس کی کیفیت مزاج پر اور اسی

طرح تعزیت اور ایسے سفارش اور میل ان کے پس جو شخص یہ سب کام بجا لائے اور صاحب معاملہ کو محنت پر مطلع نہ کیا تو اپنی محنت کو ضائع کر دیا اور اسی طرح ہر وہ چیز جس سے مقصود اقامت مصلحت موافقت و تالیف میاں جمہور مردم کے ہو محل تو دیع یاراں میں اور ان کی وصیت میں یہ بیت بہت پڑھتے تھے:

آسائش دو گیتی تفسیر ایں دو حرف ست

با دوستاں تلطف با دشمناں مدارا

۸۔ فرماتے تھے جن لوگوں کا مرتبہ تیرے مرنے سے فروتر ہے اگر وہ ابتدائے بالسلام کریں تو اس کو ایک نعمت نعم الہی سے جان اور شکر اس کا بجا لا اور ان کے روبرو منبسط ہو اور ان کے حال کا تفقد کر بہت ہوتا ہے کہ ادنی التفات جو تیرے نزدیک کچھ قدر نہیں رکھتا ہے وہ ان کی آنکھ میں عظیم دکھائی دیتا ہے اور وہ اس کے ساتھ پورا اعتبار کرتے ہیں اور اگر اس کو نہیں پاتے ہیں تو غمگین ہوتے ہیں۔

صد رملک دل بہ نیم نگہ می تواں خرید

خوباں دریں معاملہ تقصیری کنند

۹۔ فرماتے تھے کہ احمقوں کی خصلت یہ ہے کہ ساتھ کسی بے اس و عادت کے خواہش مند ہوتے ہیں کلام مقرر کرتے ہیں یا کوئی کھانا مقرر کر لیتے ہیں کہ اس سے متنفر ہوتے ہیں اور لوگ اس کے سبب مسخرا پن کرتے ہیں فرماتے تھے کہ بعض آشنا محبت ذاتی رکھتے ہیں کہ اگر محبت بتدریج ان کے دل میں جگہ پکڑتی ہے بعد اس کے کسی حالت میں ان کے دل میں سے باہر نہیں جاتی ہے نہ سرائیں نہ ضرائیں اس یار کو غنیمت شمار کرنا چاہیئے اور فرزند سے بہتر رکھنا چاہیئے۔

اور بعض آشناؤں کی آشنائی کا سبب ظہور کسی فضیلت کا ہے تجھ سے یا ارتباط کسی حاجت کا ساتھ تیرے۔ قدر ہر آدمی کو پہچاننا چاہیے اور سب کو ایک منزلت و رتبے میں نہ رکھنا چاہیئے اور کسی آدمی پر زیادہ اس سے جو اس کا مرتبہ ہے اعتماد نہ کرنا چاہیئے۔

۱۰۔ فرماتے تھے کہ عاقلوں حکیموں کا یہ کام ہے کہ فقط استیفاء لذت مقصود نہ ہو بلکہ یوں چاہیئے کہ وہ ضمن کسی دفع حاجت یا کسی فضیلت کے اقامت یا کسی سنت کی ادائی میں واقع ہو۔

۱۱۔ فرماتے تھے بات کہنے رستہ چلنے، بیٹھنے اٹھنے میں اقوام کی رسم وعادت پر کام کرا گر چہ تو ضعیف ہی کیوں نہ ہو اور اگر کوئی عیب یا جبن یا بخل ناگاہ تجھ سے صادر ہو جائے تو اس کے کتمان واخفاء میں کوشش کرنا چاہیئے اور اس سے شرمگیں ہونا چاہئے اور صفت متقابل ظاہر کرنا چاہیئے تاکہ نفس اس آداب کے ساتھ خوگر ہو جائے جب بات چیت سفر کے حال میں ہوتی تو چوروں اوچکوں سے بچاؤ کرنے میں غلو کرتے اور میں نے جو واقعات سفر اکبر آباد میں دیکھے تھے بیان فرماتے ہیں۔(۵۵)

موصوف کے متعلق شاہ عبدالعزیز کا بیان:

مولانا شاہ عبدالعزیز قدس سرہ آپ کے مناقب میں کہتے ہیں:

آیة من آیات الله و معجزة نبیه الکریم صلی الله علیه وسلم

ترجمہ: یہ اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے اور نبی کریم ﷺ کے معجزہ میں سے ایک معجزہ ہے۔(۵۶)

علوم ومعارف میں سند مسلسل اور فیض بلا واسطہ آنحضرت ﷺ

ظاہر میں اگرچہ آپ کو اتصال صحیح ساتھ تمام خانوادوں کے حاصل ہے مگر باطن میں بیعت و اجازت خاص آنحضرت ﷺ سے سرفراز ہے۔

چنانچہ انتباہ میں فرماتے ہیں:

وچوں این فقیر بزیارت مدینہ رسید مدینے بر قبر مبارک متوجہ شد مراتب جذب وسلوک ہمہ از ابتداء تا انتہا در نظر آنحضرت ﷺ طے کرد

آ نگاہ این فقیر ر بہ زکی وحکیم ملقب ساختند وطریقہ عنایت فرمودند وآنچہ در علم مشکلات داشتم برسیدم جواب باصواب ظاہر نمودند اکثر آں ، چیز با در رسالہ فیوض الحرمین مرقوم نیست اینچ نوشتہ شد این فقیر در جناب آنحضرت ﷺ عرض کردہ بود بوجہے از کلام روحانی کہ آنحضرت چہ می فرمائید در فرق شیعہ کہ محبت اہل بیعت دعوی می کنند دیا اصحاب آن حضرت ﷺ عداوت دارید۔

افاضہ فرمودند کہ مذہب این جماعت باطل است وبطلان مذہب ایشاں از تامل در تعریف امام کہ ایشاں مقرر کردہ اند ظاہر خواہد شد بعد از افاقہ ازاں حالت در معنی امام تامل کردہ شد معلوم گشت کہ ایشاں می گویند کہ امام معصوم مفترض الطاعت می باشد ووحی باطنی کہ عبارت از القائے حکم الہی بردل است بطریق اجتہاد یا امن از خطا دراں مسئلہ اورا اثبات می کنند ومی گویند اورا خدائے تعالیٰ نصب کردہ است برائے مردماں تا ایشاں را احکام الہی رسانند وبحقیقت معنی نبوت ہمیں خصال رجوع می کنند زیرا کہ بعثہ اللہ تبیلغ ارا احکام حاملش ہمیں نصیب وافتراض طاعت است۔ (۵۹)

پس بحقیقت ایشاں قائل ختم نبوت نیستند دائمہ را رضی اللہ عنہم معنی نبوت اثبات می کنند اگر چہ نام نبوت نگویند وہل عقیدہ واقبح من ذلک انتہی۔

اس عبارت میں شاہ صاحب کے نام احمد بریلی میں یہ تعیق موجود ہے۔

ھو ابو محمد ولد لہ ولد قبل مولانا عبد العزیز فھی بمحمد فکنی بابی محمد المتولد ولی اللہ المحدث

۱۱۱۵ھ فی رابع الشوال بوم الرابع فی مقام بلت متعلقه ضلع مظفر نگر المتوفی فی الیوم ایست بعد الزوال فی تاریخ التاسع والعشرین ۱۱۷۶ فی الدهلی ولمدفون فی الدهلی عندقبره والده مولانا عبد الرحیم المتوفی فی الیوم الأربعا الصباح فی وقت الصباح فی اثنی عشر شهر الصفر.

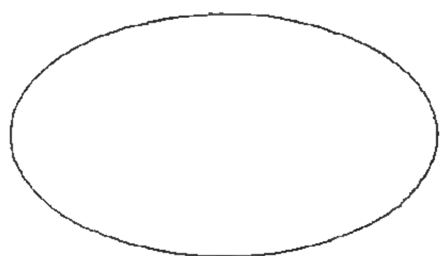
ترجمہ شاہ صاحب کی کنیت ابومحمد ہے مولانا عبدالعزیز سے پہلے آپ کے ایک بیٹا پیدا ہوا تھا جس کا نام محمد رکھا گیا اور اس کے نام پر کنیت ابومحمد ہوئی شاہ ولی اللہ محدث ۴ شوال بروز بدھ ضلع مظفرنگر کے نواح میں موضع پھلت میں پیدا ہوئے اور مورخہ ۲۹ بروز پیر بعد زوال ۱۱۷۶ھ دہلی میں وفات پائی اور اپنے والد مولانا عبدالرحیم کے مزار کے قریب دہلی میں مدفون ہوئے شاہ عبدالرحیم کی وفات ۱۲ صفر بروز بدھ صبح ۱۱۳۰ میں ہوئی۔ (۵۸)



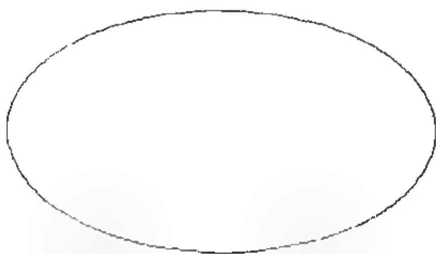
باب اول حوالہ جات

نمبر	کتاب	مصنف	ناشر	صفحہ
۱۔	فقہائے ہند	محمد اسحاق بھٹی	ادارہ ثقافت اسلامیہ ۱۹۸۱ء	ص۔۳۱۰ جلد پنجم
۲۔	اصول فقہ اور شاہ ولی اللہ	ڈاکٹر مظہر بقاء	کراچی پبلیکشنز گلشن اقبال ۱۹۸۶ء	ص: ۱۲۷
۳۔	اصول فقہ اور شاہ ولی اللہ	ڈاکٹر مظہر بقاء		ص ۱۲۷
۴۔	اصول فقہ اور شاہ ولی اللہ	ڈاکٹر مظہر بقاء		ص ۱۲۶
۵۔	تذکرہ شاہ ولی اللہ	سید مناظر حسین گیلانی	لاہور نوید پبلشرز اردو بازار ۲۰۰۳ء	ص ۱۲۲
۶۔	الرحیم ماہنامہ	شاہ ولی اللہ اکیڈمی حیدرآباد	جولائی ۱۹۶۶	ص ۹۰
۷۔	اصول فقہ اور شاہ ولی اللہ	محولہ بالا		ص ۱۲۹
۸۔	تاریخ دعوت و عزیمت	مولانا ابوالحسن ندوی	کراچی مجلس نشریات اسلام ۱۹۵۲ء	ص ۱۳۳
۹۔	القرآن الکریم	۔ ۵		
۱۰۔	فقہائے ہند			ص ۳۵
۱۱۔	القرآن	۲۳ ۔ ۲		
۱۲۔	المصطفیٰ شرح موطا	شاہ ولی اللہ	دہلی کتب خانہ رحیمیہ سبز مسجد ۱۳۴۶ھ	ص ۶۵
۱۳۔	موافقات اصول شرح شاطبی	محولہ بالا	مصر، مکتبۃ التجاریۃ الکبریٰ	ص: ۸۹
۱۴۔	موافقات اصول شرح شاطبی	محولہ بالا		ص: ۸۹
۱۵۔	اصول فقہ اور شاہ ولی اللہ	محولہ بالا		ص: ۵۴۷
۱۶۔	فیوض الحرمین	محولہ بالا	یوپی انڈیا مکتبہ دیوبند ۱۹۸۴ء	ص ۸۵
۱۷۔	اصول فقہ اور شاہ ولی اللہ	محولہ بالا		ص ۵۲۸
۱۸۔	فقہائے ہند	محولہ بالا		ص ۳۵۲
۱۹۔	اصول فقہ شاہ ولی اللہ	محولہ بالا		ص ۵۴۸
۲۰۔	فقہائے ہند	محولہ بالا		ص ۳۴۲
۲۱۔	شاہ ولی اللہ اور ان کا فلسفہ	عبید اللہ سندھی	لاہور سندھ ساگر اکیڈمی ۱۹۴۴ء	ص ۶۵
۲۲۔	فقہائے ہند	محولہ بالا		ص ۳۴۰ جلد پنجم
۲۳۔	شاہ ولی اللہ اور ان کا فلسفہ	محولہ بالا		ص ۶۴
۲۴۔	شاہ ولی اللہ اور ان کا فلسفہ	محولہ بالا		ص ۶۵
۲۵۔	القرآن الکریم	۲ ۔ ۱۳		
۲۶۔	فقہائے ہند	محولہ بالا		ص ۳۴۴ جلد پنجم
۲۷۔	فقہائے ہند	محولہ بالا		ص۔ ۳۴۵ جلد پنجم

۲۸۔	تاریخ دعوت عزیمت	محولا بالہ			ص:۱۶۷ جلد پنجم
۲۹۔	تاریخ دعوت عزیمت	محولا بالہ			ص:۱۶۷ جلد پنجم
۳۰۔	اصول فقہ اور شاہ ولی اللہ	محولا بالہ			ص:۳۰۳
۳۱۔	اصول فقہ اور شاہ ولی اللہ	محولا بالہ			ص ۲۱
۳۲۔	اصول فقہ اور شاہ ولی اللہ	محولا بالہ			ص:۲۳
۳۳۔	اصول فقہ اور شاہ ولی اللہ	محولا بالہ			ص:۲۴
۳۴۔	اصول فقہ اور شاہ ولی اللہ	محولا بالہ			ص ۲۷
۳۵۔	اصول فقہ اور شاہ ولی اللہ	محولا بالہ			ص ۷۰
۳۶۔	رود کوثر	شیخ محمد اکرم	فیروز سنز، کراچی	۱۹۸۶ء	ص:۸۲
۳۷۔	رود کوثر	محولا بالہ			ص ۹۹
۳۸۔	رود کوثر	محولا بالہ			ص ۱۰۲
۳۹۔	شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوب	خلیق احمد نظامی	لاہور ادارہ اسلامیات	۱۹۷۸ء	ص ۲۲۳
۴۰۔	تذکرہ شاہ ولی اللہ	سید مناظر احسن گیلانی			ص:۹۱
۴۱۔	تذکرہ شاہ ولی اللہ	محولا بالہ			ص ۹۲
۴۲۔	تذکرہ شاہ ولی اللہ	محولا بالہ			ص ۹۳
۴۳۔	تذکرہ شاہ ولی اللہ	محولا بالہ			ص:۹۳
۴۴۔	تذکرہ شاہ ولی اللہ	محولا بالہ			ص:۶۹
۴۵۔	تذکرہ شاہ ولی اللہ	محولا بالہ			ص ۷۱
۴۶۔	تذکرہ شاہ ولی اللہ	محولا بالہ			ص ۷۲
۴۷۔	اصول فقہ اور شاہ ولی اللہ	محولا بالہ			ص ۱۳۰
۴۸۔	اصول فقہ اور شاہ ولی اللہ	محولا بالہ			ص:۱۳۵
۴۹۔	تاریخ دعوت و عزیمت	محولا بالہ			ص:۳۹۹ جلد پنجم
۵۰۔	تاریخ دعوت و عزیمت	محولا بالہ			ص ۴۰۵ جلد پنجم
۵۱۔	فقہائے ہند	محولا بالہ			ص ۳۹۳ جلد پنجم
۵۲۔	الرحیم ماہنامہ	شاہ ولی اللہ اکیڈمی		۱۹۶۶ء	ص:۹۳،۹۲
۵۳۔	الرحیم ماہنامہ	محولا بالہ			ص ۸۳۵
۵۴۔	اصول فقہ اور شاہ ولی اللہ	محولا بالہ			ص ۱۳۰
۵۵۔	الرحیم ماہنامہ	محولا بالہ			ص ۹۷
۵۶۔	الرحیم ماہنامہ	محولا بالہ			ص ۸۳۴
۵۷	الرحیم ماہنامہ	محولا بالہ			ص:۸۰
۵۸۔	الرحیم ماہنامہ	محولا بالہ			ص ۱۱۶



باب دوم



باب دوم

فصل اوّل

انسانی معاشرے میں ارتقاء کے اصول

حضرت شاہ ولی اللہ کی نظر میں

معاشرہ اور جماعت کی حقیقت سمجھنے اور ان کی نگرانی کرنے والے اصول وقوانین منضبط کرنے کے لئے ارتقائے جماعت کا تفصیلی مطالعہ بہت ضروری ہے۔ جب تک یہ بات ذہن نشین نہ ہو جائے کہ معاشرہ کی ابتداء نہایت سادہ صورتوں سے عمل میں آتی ہے اور اس کے تمام مظاہر وعناصر آہستہ آہستہ ترقی کی طرف قدم بڑھاتے ہیں۔ اس وقت تک ہم نہ معاشرہ اور جماعت کے مختلف مظاہر کی حقیقت سے آگاہ ہو سکتے ہیں اور نہ معاشرہ کے لئے ان کی ضرورت ہماری سمجھ میں آسکتی ہے عمرانیات کے ماہرین اسی لئے سب سے پہلے جماعت کے ارتقاء کا مطالعہ کرتے ہیں اور پھر ہر اجتماعی عنصر کی ارتقائی تاریخ کی روشنی میں وہ اصول معلوم کرتے ہیں جو معاشرہ کے عروج وزوال اور اصلاح وفساد کا باعث بنتے ہیں۔

شاہ ولی اللہ نے معاشرہ انسانی میں اصول ارتقاء کی کارفرمائی پر اتنی وضاحت اور صراحت کے ساتھ تو کہیں بحث نہیں کی جس طرح کہ آج کل عمرانیت میں ہوتی ہے۔ البتہ اجتماعی اداروں کے مختلف درجات مقرر کر کے انہوں نے جو مباحث مدون کئے ہیں ان کے پیش نظر یہ ماننا پڑتا ہے کہ وہ معاشرہ میں ارتقاء کے قائل ہیں۔ اس خیال کی وضاحت اس وقت اور بھی ہو جاتی ہے جب ہمیں ان کے اجتماعی اداروں کے تذکرہ میں وحدت الوجود کے اثرات ملتے ہیں وحدۃ الوجود کائنات میں ارتقاء کا قائل ہے معاشرہ بھی اس سے باہر نہیں۔ کائنات میں ارتقاء کی کارفرمائی معدنیات نباتات اور دوسری مخلوقات کے باہمی ربط کو سامنے رکھ کر سمجھائی جاتی ہے۔

شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں:

''ہر زمانے میں نیا ظہور ہوتا ہے اور ہر ظہور کے اپنے احکام ہوتے ہیں چنانچہ جیسے جیسے زمانہ بدلتا ہے اس کے ساتھ احکام بھی بدلتے ہیں اور نئے نئے ترجمان حق آتے ہیں منشاء الہی کا پہلا ظہور معدنیات کی صورت میں ہوا معدنیات کے بعد عالم نباتی قدرت حق کا محور بنی، نباتات سے حیوانات نے یہ منصب لیا اور پھر انسان کی شکل میں ارادہ حق کا ظہور ہوا'' (۱)

وحدۃ الوجود کا عقیدہ ہمیں بتاتا ہے کہ نظام عالم ترقی پذیر ہے وہ ابتدائے آفرینش سے اب تک سینکڑوں تقلب بدل چکا ہے۔ جمادات ارتقائی قوتوں کے ذریعے نباتات کی شکل اختیار کرتی ہیں اور نباتات کے بعد حیوانی مظاہر کی منزل شروع ہوتی ہے حیوانات کی ارتقائی منزل کی سرحد سے انسانیت کی سرحد نمودار ہو جاتی ہے۔ شاہ صاحب مخلوقات کے ان ارتقائی مدارج ہی کی مثال سے اجتماعی اداروں یا انسانی معاشرہ کے مختلف درجات کا باہمی ربط و تعلق سمجھاتے ہیں فرماتے ہیں:

''انسانی معاشرہ کے ابتدائی درجہ میں اجتماعی اداروں کی تشکیل جانوروں کے اجتماع سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہوتی فرق اتنا ہے کہ حیوانات میں یہ ارتقاق بطور اجمال پایا جاتا تھا۔ انسانوں میں آ کر یہ پوری طرح نشوونما پاتا ہے جس کی وجہ سے انسانی معاشرہ اپنی اس ابتدائی شکل میں بھی حیوانات کے اجتماع کی بہ نسبت زیادہ بہتر اور بلند درجہ ہوتا ہے۔ حیوانی معاشرہ کے بعد معاشرہ انسانی کا یہ ابتدائی درجہ بالکل اس طرح وجود میں آتا ہے جیسے عنصر کائنات سے جمادات پیدا ہوتے ہیں انسانوں میں معاشرہ کا دوسرا درجہ پہلے درجہ کے بعد آتا ہے اس سے پہلے نہیں آ سکتا۔ اس

کی مثال بالکل ایسی ہی سمجھنا چاہیئے جیسے جمادات کے بعد نباتات کا آنا،
انسانی معاشرہ کے اس درجہ میں پہلے درجہ کی تمام باتیں پائی جاتی ہیں لیکن
اب ان میں لطافت عمدگی اور بہتر تنظیم پیدا ہو جاتی ہے دوسرے درجے کے
بعد معاشرہ انسانی کے تیسرے درجے کا آنا نباتات کے بعد حیوانات کی تخلیق
کے مانند ہے جس طرح حیوانات میں نباتات کی خصوصیت پائی جاتی ہیں اسی
طرح اس تیسرے درجے میں دوسرے درجے کی صفت بھی ہوتی ہیں۔ لیکن
ذرا مختلف شکل میں حیوانیت کے بعد انسانیت کی منزل آتی ہے، ارتفاقات
(اجتماعی اداروں) میں اس کی مثال تیسرے اور چوتھے درجے کو سمجھنا
چاہیئے''(۲)

شاہ ولی اللہؒ وحدۃ الوجود کی ذہنیت کے تحت معاشرہ انسانی کو جامد نہیں بلکہ ارتقاء پذیر مانتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ معاشرہ کبھی ایک حالت پر نہیں ہے جس میں آج نظر آتا ہے اس درجہ تک وہ بہت سے مراحل طے کرنے کے بعد پہنچتا ہے۔ انسانی معاشرہ میں پہلے اتنی بہتر تنظیم اور خوبی نہ تھی جتنی کہ آج پائی جاتی ہے انسانوں میں جماعت پسندی کا جذبہ جتنی قوت کا آج مالک ہے اس سے پہلے نہ تھا۔ اس سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ ارتقائے جماعت میں یہ کہاں تک مدد دیتے ہیں اور انسانوں میں جماعت پسندی کا جذبہ کس طرح ترقی کرتا ہے۔

نوعی تقاضے اور ارتقاء

انسانوں میں جماعت پسندی کا جذبہ ان اعمال و افعال کے ذریعے تربیت پاتا ہے جو اجتماعی طور پر انجام دیئے جاتے ہیں۔ انسان کے یہ عمل بدلتے رہتے ہیں اور اس تبدیلی کا نتیجہ اجتماعیت کی ترقی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ ہر اجتماعی عمل ایک جماعتی مظہر کی تشکیل کرتا ہے۔ مظہر اجتماعی کا تنوع ارتقائے جماعت کا

کفیل ہے۔ مختصر یہ کہ اجتماعی اعمال وافعال ارتقائے معاشرہ کا زینہ ہے اگر یہ معلوم ہو جائے کہ انسان بعض خاص خاص کام کیوں کرتا ہے اور اس کے یہ اعمال اپنی شکلیں کیوں بدلتے ہیں تو ہماری نگاہ سے ارتقائے جماعت کا کوئی راز پوشیدہ نہیں رہ سکتا۔ شاہ صاحب انسان کے انفرادی اور اجتماعی تمام کاموں کا سرچشمہ اس کے نوعی اور جنسی تقاضوں کو قرار دیتے ہیں۔

انسان کے فطری تقاضوں میں ایک ترتیب پائی جاتی ہے وہ سب ایک درجہ کے نہیں ہیں بعض تقاضوں کو پورا کئے بغیر انسان زندہ نہیں رہتا۔ اس لئے سب سے پہلے ان ہی کی تعمیل ضروری ہے۔ ایک خاص حد تک جب ان کی تعمیل ہو جاتی ہے تب کہیں دوسرے تقاضوں کی باری آتی ہے۔ انسان نے اپنے فطری تقاضوں کو کمال حسن وخوبی کے ساتھ پورا کرنا رفتہ رفتہ سیکھا ہے۔ وہ ابتداءً صرف اپنی حیوانی خواہشات پوری کرتا تھا۔ وہ بھی نہایت ابتدائی شکل میں۔ کیونکہ وہ فطرت کے خزانوں سے ناواقف تھا۔ اور کائنات کی قوتیں اس کے قابو میں نہ آئی تھیں جوں جوں وہ فطرت کی قوتوں کو تسخیر کرتا گیا اپنے فطری تقاضوں کو اچھی سے اچھی طرح پورا کرنے کی اس میں صلاحیت پیدا ہوتی گئی۔ اور آخرکار اس کی حیوانی خواہشات پورا کرنے کے طریقوں میں حسن ولطافت کا عنصر شامل ہوگیا۔ اس طرح اسے جنسی تقاضوں کے علاوہ اپنے نوعی تقاضوں کی تکمیل پر بھی قدرت حاصل ہوگئی۔

شاہ صاحب نے اس کا بھی ذکر کیا ہے کہ خارجی حالات کا انسان پر اور اس کے فطری تقاضوں پر کیا اثر پڑتا ہے۔ خارجی حالات بدلتے رہتے ہیں، بدلتے ہوئے حالات ہر مرتبہ فطری تقاضوں کو ایک نئی شکل دیتے ہیں فطری تقاضوں کی یہ نئی شکل خارجی حالات کو دوبارہ بدل دیتی ہے اور یہ نئے فطری تقاضوں کو پھر دوسری شکل دیتے ہیں یہ سلسلہ کبھی ختم ہونے میں نہیں آتا اس طرح معاشرہ برابر ترقی پذیر رہتا ہے۔

انسانی معاشرہ میں ترقی کی تیز رفتاری اور ارتقائے جماعت کا سلسلہ ان ہی کے دم سے قائم ہے، انسان کی فطرت کھانے پینے رہنے سہنے اور پہننے اوڑھنے کی طبعی ضروریات کو پورا کرنے ہی پر قناعت نہیں کرتی

اگر ایسا ہوتا تو شاید انسانی معاشرہ کبھی ترقی کے منازل طے نہ کرتا، یا اگر ان میں تبدیلی ہوتی تو محض حالات کے بدل جانے سے، لیکن ایسا نہیں ہے وہ اپنی ضروریات کو لطافت وحسن اور عقلی نظریات کی کسوٹی پر پرکھتا ہے۔ ضروریات پورا کرنے کا جو طریقہ اس کے مذاق لطیف کو نہیں بھاتا اس کے عقلی نظریات پر پورا نہیں اترتا اور اس کے پہلے سے حاصل کئے ہوئے علوم وتجربات کے خلاف ہوتا ہے وہ اسے چھوڑ دیتا ہے اور دوسرے عمدہ اور مفید طریقوں کی تلاش اسے ہر وقت سرگرداں رکھتی ہے اس کی بے چین طبیعت اس وقت تک مطمئن کا سانس لے سکتی ہے جب اسے یہ طریقہ معلوم ہو جاتا ہے لیکن ان طریقوں کی دریافت جو نئے حالات پیدا کرتی ہے ان میں بھی اسے سکون نہیں ملتا وہ اس منزل پر ٹھہرنے کے لئے آمادہ نہیں ہوتا، وہ چاہتا ہے کہ اس مقام پر زیادہ نہ ستائے، بلکہ جلد ہی دوسری منزل کی طرف قدم بڑھائے خوب سے خوب تر حاصل کرنے کی یہ تڑپ انسان کو کبھی ایجادات واختراع کی دنیا میں لے جاتی ہے۔

ایجادات واختراعات

ایجاد واختراع کے اظہار کا میدان فطرت خارجی ہے ہر زمانے میں اور ہر مقام پر انسان اور فطرت کے خارجی مظاہر میں کش مکش نظر آتی ہے تاریخ کے ابتدائی دور میں انسان کو حفظ نفس اور بقاء نسل کیلئے سردی، گرمی، وحشی جانوروں، دریاؤں، جنگلوں اور زمین کی قوتوں سے برسرپیکار رہنا پڑتا تھا اس کش مکش نے فطری طور پر اسے ایسے طریقے دریافت کرنے اور ایسے اوزار ایجاد کرنے پر مجبور کیا جس کے ذریعے وہ فطرت کے ان خارجی مظاہر پر قابو پاسکے۔ ابتدائی معاشرے میں زندگی بہت سادہ تھی اور ان کی ضرورتیں فطرت کے چند سرچشموں سے پوری ہو جاتی تھیں۔ کھاکر چٹانوں اور غاروں میں رہتا اور درخت کے پتوں سے اپنا بدن ڈھک لیتا تھا لیکن وہ زیادہ دنوں تک اپنی ان ایجادوں پر قناعت نہیں کرسکا اسے یہ ضرورت محسوس ہوئی کہ وہ فطرت کے بے پایاں سرمائے پر قبضہ واقتدار حاصل کرنے کے ذرائع دریافت کرتا جائے اور ان سے فائدہ اٹھانے کی ترکیبیں ایجاد کردیں آخر اس تمام جدوجہد کی انسان کو کیوں ضرورت پیش آئی۔

شاہ صاحب اس کا بڑی وضاحت سے جواب دیتے ہیں وہ فرماتے ہیں کہ یہ سب کچھ نسان کے دو فطری تقاضوں کا نتیجہ ہے ایک تو علم وتجربات کی خواہش انسان کو کائنات کی ہر شے کی حقیقت کی تلاش اور دنیا کی ہر چیز کے خصائص اور امتیازات کی جستجو میں سرگرداں رکھتی ہے وہ ہر اس نئی چیز جسے وہ پہلی مرتبہ دیکھتا ہے نہایت غور وخوض سے دیکھنے کی کوشش کرتا ہے اس طرح اشیاء کائنات کے بارے میں اس کا مطالعہ روز بروز وسیع ہوتا رہتا ہے دوسرے وہ ہمیشہ ہر چیز میں لطف خوبی اور حسن ونزاکت تلاش کرتا ہے اور بنی ضروریت پورا کرنے کے طریقوں کو ہمیشہ بہتر سے بہتر دیکھنا چاہتا ہے۔ یہ دونوں جذبے انسان کو ہمیشہ نت نئی دریافتوں اور جدید سے جدید ایجادوں پر اکساتے ہیں اسی طرح ایجادات کا یہ سسلہ کبھی ختم ہونے میں نہیں آتا۔

شاہ صاحب نے اجتماعی زندگی میں ایجاد واختراع کی اہمیت کسی جداعنوان کے ماتحت واضح کرنے کی کوشش نہیں کی۔ لیکن کسی اجتماعی ادارے کو ایک درجے سے دوسرے درجے تک پہنچنے میں جدید دریافتوں اور نئی نئی ایجادوں کے ذریعے جو مدد ملتی ہے شاہ صاحب اس سے ناواقف نہیں ہیں ارتقاقات کا بیان ارتقائے معاشرہ کے اس پہلو پر کافی وضاحت کے ساتھ روشنی ڈالتا ہے وہ ہر اس موقعہ پر جب معاشرہ ایک درجہ سے بلند تر درجہ کی طرف ترقی کرتا ہے بعض اہم ایجادات اور ضروری دریافتوں کا ذکر فرماتے ہیں۔

انسان کی ابتدائی زندگی معاشرہ کی پہلی منزل میں کسی ایک حالت پر قائم نہیں رہتی، انسان کی یجاد واختراع کی صلاحیت اسے برابر بدلتی رہتی ہے۔ معاشرہ کو درجہ اول کی تکمیل تک پہنچنے میں جن اشیاء کی ضرورت پیش آتی ہے اور جنہیں وہ ایجاد اور اختراع کے ذریعے حاصل کرتا ہے۔

جسے ہم مختصراً ذیل میں درج کرتے ہیں:۔

۱۔زبان ۲۔مکان ۳۔لباس ۴۔پکانے کے طریقے ۵۔برتن بنانا

۶۔جانوروں کی تسخیر۔ ۷۔کاشت کاری۔ ۸۔ایسی صنعتیں جن پر کھیتی باڑی کا دارومدار ہے جیسے کدال ڈول، ہل، رسی وغیرہ۔

معاشرہ کی ابتدائی شکل میں انسان ان چیزوں کو معمولی شکل میں حاصل کرتا ہے۔لیکن دن بدن ترقی کی جستجو نسان کو ان چیزوں کو بہتر سے بہتر شکل میں حاصل کرنے پر مجبور کرتی ہے۔اس لئے وہ ان میں سے ہر چیز کو عمدہ سے عمدہ شکل میں بنانا سیکھتا ہے اور اس کی ضرورتیں برابر بڑھتی رہتی ہیں۔

ایک منزل ایسی آتی ہے کہ کوئی شخص یا خاندان اپنی ان تمام ضرورتوں کی اشیاء تیار اور فراہم نہیں کرسکتا، اس لئے معاشرہ میں مبادلہ امداد باہمی، اجرت وکسب میں مدد دینے والی اشیاء دریافت ہوتی ہیں، اور معاشرہ دوسری منزل میں قدم رکھتا ہے، اس جگہ پر پہنچ کر ترقی کی رفتار پہلے سے بھی تیز ہوجاتی ہے۔اور اب انسانی زندگی کے تمام مختلف پہلوؤں پر علم وتجربہ کی روشنی میں نظر ثانی کی جاتی ہے اور زندگی کے ہر پہلو کے متعلق ایک مستقل حکمت اور فن مرتب ہوجاتا ہے۔

اس صورت حال کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ پیشوں میں تنوع اور کثرت پیدا ہوجاتی ہے پیشوں کی یہ کثرت اور تنوع ایجاد اور اختراع کی رفتار تیز کردیتی ہے، اور اب معاشرہ میں اتنے مختلف مفاد رکھنے والے پیشے معرض وجود میں آجاتے ہیں کہ ان کی اور اس نظام کی حفاظت کے بغیر جس کے گرد یہ پیشے نشوونما پاتے ہیں، انسانی زندگی کی بقاء مشکل ہوجاتی ہے ایک مستحکم سیاسی نظام کی یہ ضرورت معاشرہ کو ایک تیسری منزل میں داخل کردیتی ہے نظام کے استحکام کے بعد ایجاد واختراع کی رفتار میں نسبتا اور تیزی پیدا ہوجاتی ہے۔

اس طرح معاشرہ نئی نئی ضروریت کو پورا کرتے ہوئے آگے بڑھتا رہتا ہے۔اس منزل میں ایجادات واختر عات اور نظام معاشرہ میں ایک خاص ربط وتعلق اور موزونیت ومناسبت کی ضرورت رہتی ہے جب کبھی یہ توازن بگڑتا ہے اس کا اثر معاشی، اخلاقی، معاشرتی اور سیاسی نظام پر پڑتا ہے اور اس میں تبدیلی واقع ہوجاتی ہے۔

مدارج انسانیت

شاہ ولی اللہ کے افکار کی روشنی میں

اختلافات اوران کی حقیقت:

اس عالم رنگ وبو میں جدھر بھی نگاہ اٹھایئے اور جس چیز پر بھی نظر ڈالیے، نوعی اور خلقی اختلافات کا ایک عالم بپا نظر آئے گا، آپ ایک ہی نوع کے دو پودوں کو چھوڑ یئے، ایک ہی پودے کے دو پھولوں اور چند پتیوں کو لیجئے، ہر پھول میں دوسرے سے اختلاف اور ہر پتی میں فرق نظر آئے گا، اس عالم کی تمام موجودات کا یہی حال ہے۔

آپ تمام چیزوں کو چھوڑ دیجئے اور صرف ایک وجود انسانی کو پیش نظر رکھئے اور اس کے تمام اعضائے جسمانی سے صرف نظر کر کے صرف چہرہ کو آپ دیکھیں گے کہ چہرے پر مختلف اعضاء کی عددی یکسانیت کے باوجود رنگ وساخت میں ہر چہرہ دوسرے سے مختلف ہوگا۔ اختلاف الوان والسنہ کو اللہ تعالی نے اپنی نشانیوں میں شمار کیا ہے لیکن اس کی حقیقی اہمیت کو سمجھنا بھی اخص الخواص کا کام ہے، جن کو اللہ تعالی نے علماء کے خطاب سے نوازا ہے۔ عامی ان اختلافات کی اہمیت کو نہیں سمجھ سکتے۔ نہ ان حقائق واسرار کا ادراک کر سکتا ہے۔

اللہ تعالی نے فرمایا ہے:

''اور حکمت الٰہی کی نشانیوں میں سے ایک بڑی نشانی آسمانوں اور زمین کی خلقت ہے اور طرح طرح کی بولیوں اور رنگوں کا پیدا ہونا فی الحقیقت اس میں بڑی ہی نشانیاں ہیں ارباب علم وحکمت کیلئے''۔ (۳)

اور اس طرح فرمایا:

''اور اس طرح پہاڑوں میں مختلف رنگوں کے طبقات پیدا کئے۔ کوئی سفید

کوئی لال، کوئی کالے سیاہ ہیں اور اسی طرح آدمیوں، جانوروں، چارپایوں کی رنگتیں بھی کئی کئی طرح کی ہیں۔ (جن میں اللہ نے بڑی حکمتیں رکھی ہیں) اللہ کا خوف انہیں دلوں میں پیدا ہوسکتا ہے، جنہوں نے کائنات کے ان اسرار وحقائق کا مطالعہ کیا ہے اور اس کے علم وحکمت سے بہرہ افروز ہیں''۔ (۴)

یہ مرتبہ تو اللہ کے خاص بندوں کا ہے اور اس کا خاص فیضان رحمت وبخشش ہی کائنات کے راز ہائے سر بستہ کا فہم بخشتا ہے لیکن اگر سطحی مطالعہ ومشاہدہ بھی ہو تب بھی اس اختلاف میں غیر از حسن ودلفریبی کچھ نہیں پاتا۔

یعنی اس عالم رنگ وبو اور دنیائے محسوسات کے ساتھ ایک اور عالم بھی ہے اور وہاں بھی اختلاف ورنگا رنگی کی ایک عجیب وغریب دنیا آباد ہے، لیکن یہ اختلاف وضع وساخت اور رنگ وروغن کا اختلاف نہیں، جسے ہم حواس خمسہ سے محسوس کرسکیں۔ یہ اختلاف احوال ومقامات اور مراتب انسانیت کا اختلاف ہے جس کے مطالعہ ومشاہدے کیلئے بصارت چشم کے بجائے بصیرت قلب کی ضرورت ہوتی ہے۔

انسان کی گمراہی کی داستان کا سرآغاز:

انسان کی گمراہی کی داستان کا سرآغاز بھی یہی ہے کہ وہ اس عالم کے احوال ومراتب کو بھی اس میزان سے تولنا چاہتا ہے جس سے عالم محسوسات میں کام لیتا ہے اس نے سمجھ لیا ہے کہ احتیاجات زندگی میں مساوی الحیثیت کیلئے مجبور ہونا اور سڑکوں اور بازاروں میں چلنا پھرنا وغیرہ احوال ومراتب انسانیہ میں یکساں اور مساوی ہونے کی دلیل ہے اور اس لئے وہ پکار اٹھتا ہے۔

''یہ کیسا رسول ہے کھاتا ہے کھانا اور پھرتا ہے بازاروں میں کیوں نہ اترا اس کی طرف کوئی فرشتہ کہ رہتا اس کے ساتھ ڈرانے کو، یا آپڑتا اس کے پاس خزانہ یا ہوجاتا اس کے لئے ایک باغ کہ کھایا کرتا اس میں سے'' (۵)

یہ آدمی اس کے سوا کیا ہے کہ تمہارے ہی جیسا ایک آدمی ہے مگر چاہتا ہے تم پر اپنی بڑائی جتائے اگر اللہ کو کوئی ایسی ہی بات منظور ہوتی تو کیا وہ فرشتہ نہ اتار دیتا (وہ ہماری ہی طرح کے ایک آدمی کو اپنا پیغمبر کیوں بنائے گا) ہم نے اپنے اگلے لوگوں سے تو کوئی ایسی بات کبھی سنی نہیں، کچھ نہیں یہ پاگل ہوگیا ہے۔ پس (اس کی بات پر) دھیان نہ دھرو، کچھ دنوں تک انتظار کر کے دیکھ لو'' (٦)

یہ ان کی سخت غلطی تھی کہ جن پیمانوں سے وہ اپنی امارت وتمول کا حساب کرتے تھے، انہیں پیمانوں سے مقامات ومراتب انسانیہ ناپنا چاہتے تھے حالانکہ اس کے لئے دوسرے پیمانوں کی ضرورت تھی۔ اس حقیقت ناشناسی نے انسانوں کے ایک گروہ کو کفر میں مبتلا کر دیا۔

ارشاد الٰہی ہے:

> ''ان کے پاس عقل ہے مگر اس سے سمجھ بوجھ کا کام نہیں لیتے، آنکھیں ہیں مگر ان سے دیکھنے کا کام نہیں لیتے، وہ (عقل وحواس کا استعمال کھوکر) چار پایوں کی طرح ہوگئے ہیں۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ کھوئے ہوئے، ایسے ہی لوگ ہیں جو یک قلم غفلت میں ڈوب گئے ہیں۔'' (٧)

اگر چہ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ نوعی، خلقی اور اپنی اصل کے اعتبار سے تمام انسان برابر ہیں۔

> ''اے مجمع انسانی ہم نے تم سب کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا، پھر ایسا کیا کہ تمہیں مختلف شاخوں اور قبیلوں کی صورت دے دی اور تم بہت سے گروہوں اور ملکوں میں بکھر گئے لیکن شاخوں اور قبیلوں کا یہ اختلاف صرف اس لئے ہوا تا کہ ایک گروہ سے دوسرا گروہ پہچانا جا سکے'' (٨)

اور اس حقیقت کو لسان نبوت میں اس طرح بیان کیا گیا ہے:۔

''تم میں سے نہ عربی کو عجمی پر فضیلت ہے نہ عجمی کو عربی پر انسان تمام کے تمام آدم کی اولاد ہیں اور آدم مٹی سے بنائے گئے تھے، پس اپنی اصل وخلقت میں تمام انسان برابر ہیں'' (۹)

لیکن یہ برابری صرف اصل کے اعتبار سے تھی۔ مراتب ومدارج سے اس کا کوئی تعلق نہ تھا۔ جس طرح ایک ہی کان سے حاصل کیا جانے والا کوئلہ اور ہیرا قدر وقیمت میں یکساں نہیں ہوتے۔ ہیرا زینت تاج بنتا ہے یا خزانوں میں محفوظ رکھا جاتا ہے اور کوئلہ چولھے کا ایندھن بنتا ہے۔ اس طرح نیک، بد اور مومن وکافر اپنے مرتبہ ومقام میں برابر نہیں ہو سکتے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

''اور برابر نہیں اندھا اور دیکھتا، اور نہ اندھیرا اور اجالا اور نہ سایہ اور لو اور برابر نہیں جیتے اور مردے'' (۱۰)

اگرچہ اللہ تعالیٰ شکم مادر میں خلقت انسانیہ کی پہلی منزل یعنی استقرار نطفہ سے لے کر آخری درجہ تکمیل اور مرتبہ احسن تقویم تک ہر روح کو ایک ہی طریق تخلیق وتربیت سے نشو ونما دیتا ہے لیکن جب روح اس دنیا میں آتی ہے اور انسان بلوغ عقل وشعور کی منزل میں پہنچتا ہے تو ایک گروہ پر اس کی عقل ومشاہدہ یہ حقیقت منکشف کرتا ہے کہ جس طرح تخلیق کی پہلی منزل میں جب کہ انسان محض مجبور وبے بس تھا اور اسے ارادہ واختیار کی کوئی قوت حاصل نہ تھی اللہ تعالیٰ کی ہدایت کی ضرورت تھی اسی طرح دوسری منزل میں بھی یعنی درجہ انسانیت کی تعمیر وتکمیل کیلئے بھی ہدایت علم ووحی کی ضرورت باقی ہے یہی وہ گروہ ہوتا ہے جسے وعلم آدم الاسماء کلھا سے ایک حصہ ملتا ہے۔

دوسرا گروہ علم سے تہی دامن اور مطالعہ ومشاہدہ کی قوت سے عاری ہوتا ہے اور اگرچہ دونوں گروہ

ایک ہی شجر انسانیت کی دو شاخیں ہوتی ہیں لیکن باعتبار مراتب دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہوتا ہے انہیں دونوں گروہوں کے بارے میں قرآن میں آیا ہے:۔

''پھر کیا صاحبان علم اور گم گشتگان جہل دونوں کا ایک ہی درجہ ہے'' (۱۱)

انسانوں کی تقسیم باعتبار مراتب:

سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے جس بنیاد پر انسانوں کے درمیان خط فرق و امتیاز کھینچا ہے وہ یہی ہے اور سب سے پہلے انسان کو جن دو گروہوں میں تقسیم کیا ہے وہ یہی دونوں گروہ ہیں گویا کہ یہاں سے شجر انسانیہ میں شاخیں پھوٹتی ہیں۔

۱۔ عالم یعنی علم و بصیرت رکھنے والے۔

۲۔ گم گشتگان جہل یعنی علم و بصیرت سے تہی دامن۔

پہلی شاخ (علم و بصیرت) اپنے اندر قوت بالیدگی اور نشو و نما کی صلاحیت رکھتی ہے اس میں مزید شاخیں پھوٹتی ہیں، لیکن دوسری شاخ (جہل) اپنے اندر نشو و نما کی معمولی قوت اور صلاحیت بھی نہیں رکھتی اس کی بالیدگی ختم اور نشو و نما رک جاتی ہے۔

پہلی شاخ میں نشو و نما کی استعداد ہوتی ہے اس میں سے دو شاخیں پھوٹتی ہیں۔ پہلی شاخ سے تعلق رکھنے والے علماء حق کہلاتے ہیں اور دوسری شاخ سے تعلق رکھنے والے علماء سوء کے زمرہ میں داخل ہوتے ہیں۔

علماء حق:

یہ گروہ حق کو صرف پہچان ہی نہیں لیتا بلکہ حق کی ایک جھلک ہی اسے اپنا گرویدہ بنا لیتی ہے کہ پھر دنیا کی تمام رنگینیاں اس کو پھیکی نظر آنے لگتی ہیں اس کے نظارے کے بعد دنیا کا کوئی حسن اس کی نگاہوں میں نہیں جچتا۔ وہ جہاں بھی ہو جس حال میں بھی ہو، وہی ایک خیال وہی ایک دھن اس پر سوار رہتی ہے نہ فراعنہ وقت کی قہر مانیاں اس کے دل میں ادنیٰ شائبہ خوف و خطر پیدا کر سکتی ہیں نہ زمانے کی زلیخاؤں کا حسن اس کو اپنی طرف

متوجہ کر سکتی ہیں یہ جس لیلائے حسن سے رشتہ عشق جوڑتے ہیں، پھر دنیا کے لکھوں مصائب اس رشتہ کے انقطاع کے لئے ناکافی ہوتے ہیں، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ پھر اس راہ کے مصائب وشدائد اس کے لئے مصائب وشدائد ہی نہیں رہتے۔ یہ گروہ علمائے حق کا گروہ کہلاتا ہے۔

علمائے سوء:

دوسرا گروہ بھی اس لیلائے حق کے عشق کا دعویٰ کرتا ہے لیکن راہ عشق میں مصائب کے پہلے ہی حملے میں اس کی تمام عشق بازیاں ختم ہو جاتی ہیں لیکن اس کا نفس اس کو اس وہم عشق ومحبت میں مبتلا رکھتا ہے اور ایک لمحہ کے لئے بھی وہ اظہار عشق سے باز نہیں رہتا، لیکن اس کا دل صرف دنیا کا عاشق اور نفس کی لذتوں کا گرویدہ ہوتا ہے یا اس پر ایسے دبیز پردہ پڑے ہوتے ہیں کہ نگاہیں چوک جاتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ نفس کی خواہشات اس پر ایسی غالب آچکی ہوتی ہیں کہ حق پرستی کی پر خطر راہ پر دو قدم بھی نہیں چل سکتا۔

> ''پس افسوس ان پر جن کا شیوہ یہ ہے کہ خود اپنے ہاتھ سے کتاب لکھتے ہیں (یعنی اپنی رایوں اور خواہشوں کے مطابق احکام شرع کی کتابیں بناتے ہیں) پھر لوگوں سے کہتے ہیں یہ اللہ کی طرف سے ہے (یعنی اس میں جو کچھ لکھا ہے وہ کتاب الہی کے احکام ہیں) اور یہ سب کچھ اسلئے کرتے ہیں تاکہ اسکے بدلے میں ایک حقیر سی قیمت دنیوی فائدہ کی حاصل کریں'' (۱۲)

جس طرح شجر انسانیت کی پہلی دو شاخوں میں شاخ جہل اپنے اندر نشو ونما کی صلاحیت نہ رکھتی تھی اور بالیدگی کی ہر قوت مفقود تھی۔ اسی طرح اہل علم کا دوسرا گروہ یعنی علماء سوء بھی اپنی بقاء کے لئے کوئی بنیاد نہیں رکھتے انقلابات دہر کا دھارا ہمیشہ ان کو خس وخاشاک کی طرح بہاتا رہا ہے اس کے برعکس علماء حق کی زبان سے جو کلمہ بھی بلند ہوا اسے ثبات وقرار نصیب ہوا۔

> ''حق وباطل کے معاملے کی مثال ایسی ہی سمجھو جو اللہ بیان کرتا ہے۔ پس

(میل کچیل کا) جھاگ (جو کسی کام کا نہ تھا) رائیگاں گیا اور جس چیز میں

انسان کے لئے نفع تھا وہ زمین میں رہ گئی'' (۱۳)

علمائے حق کے مختلف مراتب:

پھر علماء حق میں بھی مختلف مراتب کے لوگ ہوتے ہیں حضرت شاہ ولی اللہ نے اہل اللہ (علمائے حق) کے تین گروہ بتلاتے ہیں۔

پہلا گروہ: جادۂ قویمہ سے ناواقف۔

دوسرا گروہ: وہ علماء اور اہل اللہ جو اگرچہ جادۂ قویمہ سے واقف اور اس کے شناسا نہیں لیکن بالکل ناواقف بھی نہیں۔ ان کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ وہ جادۂ قویمہ سے قریب ہیں۔

تیسرا گروہ: وہ علماء حق اور اہل اللہ جو جادہ قویمہ کے شناسا ہیں۔

اس سے قبل کہ ہم ان تینوں گروہوں کا تجزیہ کریں اور ان کے مراتب پر بحث کریں بہتر ہوگا کہ ہمیں جادہ قویمہ کا مطلب اور اس اصطلاح کی تعریف معلوم ہو جائے۔ (۱۴)

جادۂ قویمہ:

وہ جادہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لئے قائم کیا ہے۔ یہ راستہ ہی اللہ کا پسندیدہ راستہ۔ اس کو اختیار کرنے کے بعد ہی کوئی شخص اہل اللہ کی جماعت میں اور رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ کے زمرہ میں داخل ہوسکتا ہے۔

اس جادہ کی ظاہری صورت ظاہر شریعت محمدیہ (علی صاحبہا الصلاۃ والسلام) ہے اور اس کی باطنی صورت شریعت محمدیہ (علی صاحبہا الصلاۃ والسلام) کی وہ باطنی حکمتیں ہیں جو قیام شریعت کی مطلوب ومقصود ہیں اور جن تک ہر صاحب علم اور اہل حق کی نگاہ پہنچنا کچھ ضروری نہیں ہے پس جس نے جس قدر حقیقت کو پہچان لیا، اسی قدر وہ جادہ قویمہ سے قریب یا اس کا شناسا ہوگیا اور اسی قدر اس کا مرتبہ بلند ہوگیا۔

جادہ قویمہ سے ناواقف (پہلا گروہ):

یہ اولیاء اللہ اور علماء حق کا وہ پہلا گروہ ہے جسے اللہ تعالی کے قائم کردہ اور پسندیدہ جادہ قویمہ کا حقیقی علم نہیں ہوتا لیکن یہ پورے طریقے سے علماء حق اور فقہائے اسلام کے متبع ہوتے ہیں اور انہیں فقہائے اسلام میں سے کسی فقیہ کے قول کو حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کے فرمودات سے ربط دینے کا ملکہ حاصل ہوتا ہے اور یہ ملکہ اللہ تعالی کی ایک عنایت اور حکمت کا ایک جزء ہوتا ہے البتہ وہ فقہاء میں سے کسی ایک کے قول کو دوسرے فقیہ کے قول پر ترجیح نہیں دے سکتے۔ وہ حق و باطل میں تمیز کی صلاحیت رکھتے ہیں لیکن مختلف اقوال حقہ کی توجیہات ومراتب تک ان کے فہم کی رسائی نہیں ہوتی ان کا ذہن عزیمت اور رخصت کے فرق سے زیادہ کسی اور مقام ومرتبہ کا ادراک نہیں کر پاتا البتہ اس فرق پر وہ سیر حاصل بحث کر سکتے ہیں۔

جادہ قویمہ سے قریب پہنچنے والے (دوسرا گروہ):

اولیاء اللہ کا یہ دوسرا گروہ ہے اگرچہ اس کو بھی اللہ تعالی کے قائم کردہ اور پسندیدہ جادہ قویمہ کا حقیقی اور باطنی علم حاصل نہیں ہوتا لیکن ان کو وہ جادہ قویمہ ضرور نظر آتا ہے جو ظاہر شریعت محمدیہ کی طرف رہنمائی کرتا ہے اور ان کو جادہ قویمہ سے قریب ایک چیز مل جاتی ہے ان کے اندر پہلے گروہ سے زیدہ تمیز حق و باطل کی صلاحیت ہوتی ہے یہ گروہ مختلف اقوال حقہ کی توجیہات میں حقیقت سے زیدہ قریب ہوتا ہے یہ گروہ مختلف اقوال میں عزیمت ورخصت کے فرق ہی کو محسوس نہیں کرلیتا بلکہ مراتب عزیمت ورخصت کی باریکیوں کا ادراک بھی کرلیتا ہے اس گروہ کی اس اعتبار سے خدمات قابل قدر ہیں اس کو ترجیح دے کر دین کی مدد ومدافعت میں کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں۔

جادہ قویمہ کے شناسا (تیسرا گروہ):

اہل اللہ اور علمائے حق کا تیسرا گروہ وہ ہوتا ہے جسے حکمت الہیہ سے وافر حصہ ملتا ہے اس کے اندر

اقوال واحکام کی جزوی تطبیقات کی صلاحیت بھی ہوتی ہے اور شریعت کے ظاہر و باطن کا علم بھی ہوتا ہے۔ اس گروہ پر دین کی پوشیدہ حکمتیں بھی منکشف ہوتی ہیں اور وہ شریعت کے اسرار سے بھی واقف ہوتا ہے اس کی صلاحیت صرف مختلف اقوال اور شریعت کے ظاہر و باطن کی تطبیق تک ہی محدود نہیں ہوتی، بلکہ وہ ہر زمانے میں شریعت کے احکام کی تطبیق اور انہیں نافذ کرنے کی اعلیٰ صلاحیت رکھتا ہے اور اپنے زمانے اور وقت کے مسائل پر اپنے کلام سے شریعت کی برتری اور عظمت ثابت کر دیتا ہے اس کی وجہ سے دین کی کھوئی ہوئی قدر و عظمت واپس آ جاتی ہے اور شریعت کی گرتی ہوئی دیوار کے لئے اس کا وجود سہارا بن جاتا ہے۔

یہ گروہ صرف مقام عزیمت سے واقف ہی نہیں ہوتا مقام عزیمت پر خود فائز بھی ہوتا ہے۔ وہ صرف یہی نہیں جانتا کہ اللہ تعالیٰ کا پسندیدہ راستہ جادہ قویمہ ہے بلکہ اس کی حکمتوں اور مصلحتوں سے بھی خوب واقف ہوتا ہے۔ علم حق کے بیان میں اس حقیقت کو علم المصالح والمفاسد اور علم الشرائع والحدود کہتے ہیں۔

مفہمین :

لیکن علمائے حق کے اس مرتبہ پر آ کر انسانیت کی ترقی رک نہیں جاتی بلکہ اس مقام پر پہنچ کر ایک اور بلند مقام نظر آنے لگتا ہے یہ مفہمین کا مقام ہوتا ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں :

> ''واضح رہے کہ اجتماع انسانی میں بہترین طبقہ ان لوگوں کا ہوتا ہے جنہیں اصطلاح میں مفہمین کہتے ہیں، یہ لوگ اہل اصطلاح ہوتے ہیں، ان کی ملکیت بہت بلند درجے کی ہوتی ہے اور ان کیلئے ممکن ہوتا ہے کہ سچے داعی کے ساتھ اچھا نظام قائم کرنے کیلئے کھڑے ہو جائیں ان پر ملاء اعلیٰ سے علوم واحوال نازل ہوتے ہیں'' (۱۵)

....

مفہمین کی قسمیں:

حضرت شاہ صاحب نے مفہم کی کئی قسمیں گنائیں اور بتایا ہے کہ ہر مفہم کی استعداد مختلف ہوتی ہے اس لئے کہ ہر مفہم کو کتاب وحکمت اور علوم الہیہ میں سے جدا جدا چیزیں ملتی ہیں اور اس اعتبار سے ان کے نام اور کام یہ ہیں:

۱۔ جس مفہم کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اکثر حالات میں عبادات کے ذریعے تہذیب نفس کے علوم وغیرہ ملتے ہیں وہ کامل ہوتا ہے۔ اور جس کا اکثر حال یہ ہو کہ اسے اخلاق فاضلہ اور تدبیر منزل کے علوم وغیرہ ملے ہوں وہ حکیم کہلاتا ہے۔

۲۔ جسے اکثر حالات میں سیاسات ملی کے اصول سمجھائے جاتے ہیں اور جسے لوگوں میں عدل قائم کرنے اور ان میں سے ظلم وجور دور کرنے کی توفیق ملے وہ اصطلاح میں خلیفہ کہلاتا ہے۔

۳۔ اور جس کا ملاء اعلیٰ سے قرب ہو اور ملاء اعلیٰ کے فرشتہ اسے سکھائیں، اس سے گفتگو کریں اسے نظر آئیں اور جس سے طرح طرح کی کرامتیں ظاہر ہوں وہ مؤید بروح القدس ہوتا ہے۔

جس کے دل اور زبان پر نور ہو اور جس کے پاس بیٹھنے اور جس کی نصیحت سننے سے لوگوں کو فائدہ پہنچتا ہو اور جس سے اس کے دوستوں کو سلیقہ اور نور حاصل ہوتا ہو اور اس کے ذریعے وہ کمالات کے مرتبے حاصل کرسکیں اور وہ لوگوں کو راہ راست پر لانے کے لئے کوشاں ہوں وہ ہادی ومزکی کہلاتا ہے۔

جس کے علم اور معرفت کا بیشتر حصہ ملت کے اصول ومصالح پر مشتمل ہو ان کے منہدم حصے کو قائم کرنے میں کوشاں ہو وہ امام کہلاتا ہے جس کے دل میں یہ ڈالی جائے کہ وہ لوگوں کو خبر دے کہ ان کے لئے ایک بہت بڑی مصیبت دنیا میں آنے والی ہے یا وہ بھانپ لے کہ ایک قوم کو رحمت کا غیر مستحق قرار دے دیا گیا ہے اور وہ اس کی خبر اس کو دیدے یا وہ کبھی کبھی اپنے نفس سے مجرد ہو کر معرفت حاصل کر کے قبر اور حشر میں کیا باتیں پیش آنے والی ہیں اور ان سے لوگوں کو آگاہ کردے اسے منذر کہتے ہیں۔

مقام نبوت:

لیکن مفہم کا مقام انسانیت کا آخری مقام نہیں، اس سے اوپر ایک اور مقام ہوتا ہے جسے مقام نبوت کہتے ہیں۔ حضرت شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں جب حکمت الٰہی اس کی مقتضی ہوتی ہے کہ مفہمین میں سے مخلوق کے لئے ایک شخص مبعوث کرے اور اسے لوگوں کے لئے گمراہی کے اندھیروں سے ہدایت کے نور کی طرف آنے کا سبب بنائے اس صورت میں اللہ اپنے بندوں پر فرض کر دیتا ہے کہ وہ دل و جان سے اس کی اطاعت کریں۔ ملاءاعلیٰ میں ان کے بارے میں طے ہو جاتا ہے جو اس کی فرمانبرداری کریں گے اور اس کے ساتھ شامل ہوں گے اور اس کی مخالفت کریں گے ان کے لئے لعنت مقدر ہو جاتی ہے، چنانچہ وہ لوگوں کو اس کی خبر دیتا ہے اور اپنی اطاعت ان پر لازم کرتا ہے۔ اس ہستی کو نبی کہتے ہیں۔ (۱۶)

مقام ختم نبوت:

اس مقام نبوت سے اوپر ایک اور مقام آتا ہے یہ مقام جامع جمیع خصوصیات وفضائل مختلف ہوتا ہے، جو انسانیت کا نقطہ کمال اور منتہائے عروج کہلاتا ہے۔ اصطلاح میں اس مقام کو ''مقام ختم نبوت'' کہتے ہیں اگر کسی چیز کو اس مقام سے ناپسندیدہ نظر سے دیکھ لیا جائے تو اس کائنات کے ذرے ذرے پر یہ فرض ہو جاتا ہے کہ اس سے نفرت کرے اور اگر کسی چیز کی طرف وہ فی الجملہ رخ پھیرے تو ساری انسانیت پر فرض ہو جاتا ہے کہ اس کی طرف سے نہ صرف اپنے رخوں کو موڑ لے بلکہ دلوں کو پھیر لے۔ یہ مقام سند پر ایمان اور اس کی محبت کی کسوٹی ہوتا ہے۔ جب تک کوئی ایمان اور محبت الٰہی کا دعویدار اس شخص کی ختم نبوت کی محبت اور اس کی پیروی کو اپنی زندگی نہیں قرار دے لیتا، اس وقت تک اس کا ایمان مقبول بارگاہ نہیں ہوتا۔

لیکن جب کوئی شخص اس مقام ''ختم نبوت'' کی اتباع کو اپنی زندگی کا وظیفہ اور شعار بنالیتا ہے تو پھر اس کا ایمان ہی مقبول بارگاہ نہیں ہوتا بلکہ وہ خود بھی محبوب بارگاہ بن جاتا ہے۔ اور ''السابقون الاولون'' اور ''رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ'' کا مقام حاصل کر لیتا ہے اور یہی وہ مقام ہے جس کے

متعلق آسمان کی بلندیوں سے صاحب عظمت والجلال نے اعلان فرمادیا کہ آسمان وزمین اورلوح وقلم کا مالک اوراس کی فرمانبردار مخلوق (فرشتے) اس پر سلامتی بھیجتے ہیں پس ہر مسلمان اور مومن پر فرض ہے کہ وہ اس وجود قدسی پر صلاۃ کے تحفے اور سلام کے نذرانے پیش کرے۔

حضرت شاہ صاحب نے حضرت محمد رسول اللہ علیہ الصلاۃ والتسلیمات کے مقام کی طرف حکیمانہ انداز میں اشارہ کیا ہے فرماتے ہیں:

''وأعظم الأنبياء شأنا من له آخر من البعثة أيضا وذلك أن يكون مراد الله تعالى فيه أن يكون سببا لخروج الناس من الظلمات الى النور وأن يكون قومه خير أمة أخرجت للناس فيكون بعثه يتناول بعثا آخر.

والى الأول وقعت الاشارة فى قوله تعالى: هو الذى بعث فى الأميين رسولامنهم، الآية والى الثانى فى قوله تعالى: كنتم خير امة''. (۱۰۲)

انسانی معاشرے کی تشکیل

انسان کی امتیازی خصوصیات: شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں کہ.

''تین باتیں انسانوں کو دوسرے حیوانوں سے ممتاز کرتی ہیں:

(۱) رائے کلی (۲) ظرافہ (۳) تکمل

(۱) رائے کلی:

حیوان کو جب کسی چیز کی ضرورت ہوتی ہے تو وہ اسے حاصل کرنے کے لئے ہر قسم کے طریقے استعمال

کرتا ہے، اسے اس بات کی پرواہ نہیں ہوتی کہ اس کی ان باتوں سے دوسرے حیوانوں کو نقصان پہنچے گا۔ یا دوسروں کا حق مارا جائے گا۔ اسے صرف اپنا فائدہ (رائے جزئی) عزیز ہوتا ہے۔ انسان کو خدا نے چونکہ دوسرے جانداروں سے افضل پیدا کیا ہے اسلئے وہ دوسروں کا خیال پہلے کرتا ہے کسی بھی طریقے سے دوسروں پر ظلم نہیں کرتا اور نہ ہی ان کا حق چھینتا ہے بلکہ اگر کسی وقت اپنے فائدہ کے مقابلے میں دوسروں کا فائدہ ہو تو عام بھلائی کے لئے اپنا فائدہ قربان کر دیتا ہے۔ چنانچہ انسان میں رفاع عام (دوسروں کی بھلائی) کا جزیہ، رائے کلی کہلاتا ہے اگر انسان میں یہ جذبہ نہ ہو تو اس میں اور دوسرے حیوانوں میں کوئی فرق نہ رہے۔

(۲) زرافہ:

حیوان کو اس بات کی پرواہ نہیں ہوتی کہ کوئی چیز اچھی ہے یا بری، صاف ستھری ہے، یا گندی، خوبصورت ہے یا بدصورت، اسے تو بس اپنی ضرورت پوری کرنے کا خیال ہوتا ہے، لیکن خدا نے انسان میں حسن و خوبی کا شوق رکھا ہے۔ وہ ہر چیز کو صاف ستھری اور پاکیزہ دیکھنا چاہتا ہے۔

وہ جو چیز کھاتا ہے خوش ذائقہ پسند کرتا ہے، جو کچھ پہنتا ہے دیدہ زیب اور دل پسند چاہتا ہے۔ جہاں رہتا ہے وہاں کھلا، ہوادار اور صاف ماحول پسند کرتا ہے وہ اچھے منظر اور اچھی شکل کو گندے ماحول اور بد صورتی پر ترجیح دیتا ہے، اس کا یہ ذوق جمال (زرافہ) اسے دوسرے حیوانوں سے ممتاز کرتا ہے۔

(۳) تکمل بالارادہ والعلوم

حیوان جو کچھ سوچتا ہے وہ فوری ضرورت کیلئے اور جو کچھ سیکھتا ہے وہ بھی فوری ضرورت پوری کرنے کیلئے لیکن انسان کی حالت اس سے مختلف ہے وہ اپنے آپ اور دوسرے انسانوں کو فائدہ پہنچانے کیلئے نئی نئی باتیں سوچتا ہے اس سوچ کی بدولت وہ کچھ چیزیں ایجاد کرتا ہے، پھر ان ایجادات میں آئے دن ترقی کرتا رہتا ہے وہ جو کچھ سیکھتا ہے دوسروں کو سکھاتا ہے اور جو باتیں سیکھتا ہے وہ ذہن میں جمع بھی رکھتا ہے۔ طرح

طرح کے سوالات اس کے ذہن میں پیدا ہوتے ہیں۔ وہ جو کام بھی کرتا ہے ایسے مقصد کے لئے کرتا ہے جو اس کی ذہنی اور معاشرتی ترقی کا سبب بنیں۔ یہ سب باتیں انسان کو دوسرے حیوانوں سے افضل بناتی ہیں۔

چنانچہ انسانوں میں اگر یہ امتیازی خصوصیت نہ پائی جائیں تو ان میں اور دوسرے حیوانوں میں کوئی فرق نہ رہے ان امتیازی خصوصیات کو انسان کے نوعی تقاضے بھی کہا جا سکتا ہے۔ (۱۸)

انسان اور انسانیت:

انسان خواہ کوئی بھی کام کرتا ہو، اس کی اپنی ایک شخصیت ہے وہ انسان ہے اور انسانیت کا ایک حصہ، شاہ ولی اللہؒ ایک انسان کو انسان صغیر یعنی چھوٹا انسان کہتے ہیں اور پورے انسانی معاشرے کو انسان کبیر، یعنی بڑا انسان کہتے ہیں یہ چھوٹا انسان بڑے انسان کا ایک حصہ ہے دونوں ایک جسم کی طرح ہیں اگر انسان صغیر نیک اور خوشحال ہے تو سمجھا جائے گا کہ انسان کبیر یعنی انسانیت میں نیکی اور خوشحالی ہے لیکن وتکلیف ہے۔ (۱۹)

انسانیت کا یہ تصور اس قدر ٹھوس ہے کہ انسان اس سے معاشرے میں اپنی حیثیت کا بخوبی اندازہ لگا سکتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہنا چاہیئے کہ انسان خود انسانیت ہے یہی وجہ ہے کہ جب شاہ ولی اللہ معاشرے اور اس کی اصلاح پر کچھ لکھتے ہیں تو فردی اصلاح کو پہلا درجہ دیتے ہیں اور جب معاشرے میں امن اور خوشحالی لانے کی بات کرتے ہیں تو فرد کی خوشحالی پر زیادہ زور دیتے ہیں۔

ارتفاقات واقترابات (مادی اور روحانی ترقی)

خدا نے انسان کو بے مقصد پیدا نہیں کیا۔ زندگی گذارنے کو تو دوسرے حیوان بھی گذارتے ہیں اور ختم ہو جاتے ہیں اگر انسان کے پیدا کرنے کا مقصد بھی یہی ہوتا کہ وہ جیسے تیسے زندگی گذارے اور وقت آنے پر مر جائے تو انسان اور حیوان کی زندگی میں کیا فرق رہ جاتا ہے۔

☆ ☆ ☆

باب دوم

فصل دوم

شاہ ولی اللہ کا فلسفہ مبادیات واخلاقیات

نفسیاتی پس منظر:

مزاج اور عمل کا رشتہ وہی ہے جو سبب اور مسبب کا ہوتا ہے اسلئے اخلاقیات پر لکھنے والی نفسیات کو نظر انداز نہیں کر سکتے حضرت شاہ ولی اللہ اس سے مستثنیٰ نہیں ہیں۔ انہوں نے نفسیات کا ارتقاء حیوان سے اس انسان تک واضح کیا ہے جو تصورات قائم کرنے، نتائج اخذ کرنے، بحث کرنے اور کلیے بنانے کا اہل ہے وہ عم سے آگے بڑھ کر غیر جانبداری الہام اور وجدان تک پہنچتے ہیں، مگر چونکہ زیرنظر موضوع اخلاقیات ہے اس لئے بیان اخلاق اعلیٰ کا تجزیہ کرنا مناسب نہیں ہے نفسیات میں بھی بحث کو اس حد تک محدود رکھا جائے گا جہاں تک ان کے سات اخلاق فاضلہ سماجی روایات اور رسوم کو جو چار عمرانی درجوں کی وجہ سے معرض وجود میں آتی ہیں۔ اور جن کو ارتفاقات کہتے ہیں۔

شاہ ولی اللہ کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ وہ نفسیات میں تعامیت پسند تھے اور اخلاقیات میں افادیت پسند تھے، مگر نفسیات اور اخلاقیات دونوں میں ان کے فنون محض عارضی ہیں کیونکہ وہ ارتقاء کے تسلسل کو پس منظر میں جاری مانتے ہیں، متواتر تبدیلی کا تصور، ترقی کا بہاؤ اور نئی اقدار کا وضع ہونا جس کی شکل اپنی اصل سے مختلف ہو، یہ سب باتیں ان کے ذہن سے کبھی فراموش نہیں ہوتیں، ان کی نفسیات میں تعاملیت پسندی یہاں تک کام کرتی ہے کہ ذہن ان پر پوری طرح حاوی ہو جاتا ہے اور حسی، حساس اور ان تمام چیزوں سے جو

جسمانی نفسیت کے دائرے میں آتی ہیں بالاتر ہوجاتا ہے یہاں ان کے وہ نظریات جوانہوں نے کام چلانے کیلئے عائد کر لئے تھے ختم ہوجاتے ہیں۔

حس لامسہ (چھونے کے احساس) سے شروع کر کے جو جسم پر پورے طور سے پھیلا ہوا ہے اور بعد میں ظاہری حیات اور ان کے مقامات کو لے کر وہ ان مخصوص مرکزوں کے وجود پر غور کرتے ہیں جو جسمانی، علمی اور عملی قوتوں سے متعلق ہیں، وہ جگر کو جسمانی تندرستی کے عملیات کا خزانہ دماغ کو علم کا اور عمل کو پورا کرنے کا اور دل کو قوت ارادی کا خاص عضو بتاتے ہیں، یہ مثلث اسی وقت تک عمل کرتا ہے جب کہ وہ عالم آتا ہے جس میں نسمہ آزاد ہوجاتا ہے اور اپنا الگ وجود رکھنے لگتا ہے، اس عالم کے حاصل ہونے سے پہلے انسانی جسمانی زندگی میں اس کا جسم نسمانی جسم کے ساتھ وہی مقصد ادا کرتا ہے، جیسا کہ تتلی کے لئے اس کا خول یعنی غلاف انجام دیتا ہے۔

اخلاقی عمل کی بنیاد اس چیز پر ہے جسے شاہ ولی اللہ فطرت کہتے ہیں یا جس کے معنی ہوں مخصوص انسانی مزاج جو اپنے کو حیوان سے ممتاز کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

حیوانی نفسیات:

شاہ ولی اللہ کے مابعد الطبیعات کے مطابق ایک حیوان مختلف بنیادی تصور کی پیداوار ہے جن میں سے ہر ایک مخصوص صفات رکھتی ہے حیوان اس دنیا میں جس صورت میں بھی موجود ہے وہ بے جان مادے کی صفات اور نباتات کی صفات بھی رکھتا ہے۔

حیوانی مزاج:

حیوان کو شعور حیات کے ذریعہ ہوتا ہے وہ اعضاء جن کو شاہ ولی اللہ الحسن الظاہر (ظاہری حس) اور

الحس الباطن (مخفی حس) یا تصور یا عمل کہتے ہیں اور اس کے علاوہ خوشی اور تکلیف کے احساس اور کچھ ذہن کے نیچے درجے کی خصوصیات، حیوان کو اپنا شعور حاصل کرنے میں مدد کرتی ہیں۔ حقیقتاً ان کا عقیدہ یہ ہے کہ حیوان نیچے درجے کی مخلوق سے نسمہ یا روحانی جسم یا عقلی خودی کی وجہ سے مختلف ہے، اس کے پانچ خارجی اور پانچ داخلی حس ہوتے ہیں نسمہ تصور کی قوتوں، عمل اور ارادہ کا بھی مخرج ہے اور ان احساسات کا بھی جو حیوانی ضروریات کیلئے رجحانات پیدا کرتی ہیں۔

ایک خصوصیت جو انسانی مزاج کو حیوانی مزاج سے ممتاز کرتی ہے یہ ہے کہ اس میں ایک جزو ہے جس کو نفس یا طبع کہتے ہیں جس کے ساتھ مثلث کے دو اور عنصر ذہن عقل اور قوت ارادہ بالکل مغلوبیت کے عالم میں وابستہ ہیں، انسانی مزاج میں برخلاف اس کے انسانی عقل سب سے اہم عنصر ہے۔

شاہ ولی اللہ مثلث کے ہر حصے سے وابستہ کرتے ہیں۔ یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ عمل اور ارادہ کے علاوہ قلب، مختلف قسم کے نفسیاتی احساسات نفرت خوشی اور تکلیف کا بھی حامل ہے نفس کا اہم کام یا بھوک جنس حفاظت وغیرہ کی جسمانی خواہش، قلب پر اس کی تمام خصوصیت پر اثر کرتی ہیں اور عقل اس کی تمام حسی قوتوں پر بھی اور اس سے حیوانی مزاج کی صفات اور احساسات پیدا ہوتے ہیں ان کے انسانی دماغ کے مقابلہ میں سادگی اور بے ڈھنگا پن کی وجہ سے، حیوانی مزاج کی ان خصوصیات کی جبلتیں کہا جا سکتا ہے۔

حیوانی مزاج کی خصوصیات:

حیوانی مزاج کی خصوصیات کا جائزہ لینے کے لئے شاہ ولی اللہ ایک ایسے نر حیوان کے طرز عمل کا تجزیہ کرتے ہیں جو بالغ اور تندرست ہو اور یہ دکھاتے ہیں کہ وہ غصہ ہمت انتقام خود اعتمادی، اقتدار کا شوق، مادہ کی طرف رجحان محبت اور حسد نمایاں کرتا ہے، وہ ایسی جبلتوں کے بھی آثار دکھاتے ہیں جسے محبت، انکسار، خوف، غم، اپنے ہم جنس سے تعلق، بچوں پر شفقت وغیرہ کہا جاتا ہے۔

ان کے انسانی مزاج اور اس کے صفات کے تصور سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ حیوان کے سلسلہ میں مندرجہ بالا صفات مقابلہ سادہ ہیں، ان میں وہ ترتیب اور تبدیلی نہیں ہوتی جو ذہن کے اثر سے انسانی مزاج میں ارتقاء پذیر ہے، حیوانی مزاج کی نفسیاتی صفات جس کو سادہ اور بے ڈھنگی صورت میں جبلتوں کا نام دیا گیا ہے اور انسانی مزاج کی صفات جو زیادہ منظم اور پیچیدہ ہوتی ہیں جن کو جذبات اور احساسات کہا جاتا ہے ان کے درمیان فرق شاہ ولی اللہ کیلئے واضح ہے حالانکہ اپنی اصطلاحات میں وہ حیوانی جبلت اور انسانی جذبات واحساسات میں فرق نہیں کرتے۔

مثلاً حیوان وانسان دونوں میں ہمت کو وہ شجاعت کہتے ہیں۔ مگر انسانی بہادری کے بیان میں یہ واضح ہے کہ وہ حیوانی بہادری سے تربیت اور ارتقاء میں آگے ہے، اس لئے یہ ان کے خیالات کے خلاف نہ ہوگا اگر ہمت جیسی پیچیدہ صفت کو حیوان کی جبلت نزع کہا جائے جس کو وہ غضب کہتے ہیں اس کو دوسرے نقطہ نظر سے خودی کی جبلت اور نفرت کی جبلت کہا جائے۔

انسانی نفسیات

انسانی مزاج جبلتیں اور محرکات:

حیوان کا ایک مخصوص مثلث صفات کا مزاج ہوتا ہے جن کو شاہ ولی اللہ نے عقل، قلب اور طبیعہ کہا ہے یہ تین صفات جن کو بنیادی تین صفات کہا جا سکتا ہے انسان میں بھی پائی جاتی ہیں۔ یہ مثلث اس کے مخصوص مزاج کی بنیاد وتعمیر کرتا ہے جو اس سے ترقی پذیر ہوتا ہے اس طرح حیوان کی جبلتیں اور محرکات بھی انسان میں موجود ہوتی ہیں جو اس بنیادی مثلث کی صفت ہیں شاہ ولی اللہ کے مطابق حیوان اور انسان دونوں وہ شے رکھتے ہیں جس کو روحانی کیفیات کہتے ہیں یہ ان کی جبلتوں اور محرکات سے متوازی ہیں۔ اور ان سے ملحق بھی

فرق محض یہ ہے کہ حیوان کی روحانی کیفیات وملکات سادہ ہوتی ہیں اور انسان کی ملکات اس کے گہرے اور استدلال کے ساتھ ساتھ زیادہ پیچیدہ ہوتی جاتی ہیں۔

سات اخلاق فاضلہ انہوں نے ہی سراغ لگایا ہے اسی اصول کی بنیاد پر جس کے مطابق حیوان اور انسان دونوں میں ابتدائی جبلتیں اور محرکات ہوتی ہیں اس بنیاد پر بہت سے انسانی جوش اور جذبات کو اس مخرج سے وابستہ کیا جا سکتا ہے انسانی جوش، جذبات اور اوصاف کی پیچیدگی مخصوص انسانی ذہانت اور عقل کے زیر اثر تجدید اور تشکیل پاتی رہتی ہے جن سے تین ضروری صفات ہوتی ہیں .و. جو انسانی ذہانت کو حیوان کی ذہانت سے ممتاز کرتی ہیں۔

روحانی مزاج کا تین درجے اور منزلیں:

یہاں یہ امر ضروری ہے کہ مزاجوں کے تنوع کے بارے میں مختصراً لکھا جائے تا کہ شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کے نظام اخلاق پر تبصرہ کیا جا سکے۔ روحانی مزاجوں کی متعدد اقسام میں سے جو انہوں نے بیان کی ہیں ایک قسم روحانی اور جسمانی اجزاء کے تعلق اور ان کی قوت اور غلبہ پر قائم نظر آتی ہے اس نظریہ کے مطابق روحانی امزجہ کو تین عنوانات کے تحت تقسیم کیا جا سکتا ہے ان کو ہم اصطلاحات میں جسمانی، وجسمانی نفسیاتی ور روحانی قرار دے سکتے ہیں۔

تعاملیت

شاہ ولی اللہ تعاملیت پسند ہیں یہاں ان کے استدلال کے بارے میں مختصر سی بحث کی جاتی ہے ان کے خیال کے مطابق روحانی، جسمانی اور طبعی حالتوں کے درمیان ایک تعلق کا وجود پایا جاتا ہے اور اسی تعلق کے ذریعے ذہن یا روحانی مزاج طرز عمل کی خارجی اشکال پر قابو پاتا ہے۔

یہ امر قابل توجہ ہے کہ انسانوں اور حیوانوں کی خارجی خصوصیات کے مشاہدے کے ذریعہ کس طرح ان کے داخلی ذہن کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے یہ عام طور پر ہوتا ہے کہ غصہ اور خود نمائی کے جذبات ہمیشہ اکڑی گردن، سخت چہرہ اور تنے ہوئے عضلات کے ساتھ پائے جاتے ہیں۔ حالانکہ جب تقدس، خوف خدا یا انکساری برسر عمل ہوتی ہے تو انسان کا سر جھک جاتا ہے۔ جسم ڈھیلا پڑ جاتا ہے اور عضلات ڈھیلے پڑ جاتے ہیں۔ یہ مشاہدات ذہن اور خارجی طرز عمل سے انسان کی طبعی حالتوں کے تعلق کی طرف اشارہ کرتے ہیں اور یہ ظاہر کرتے ہیں کہ کس طرح ذہن انسانی جسم پر اپنے اثرات مرتب کرتا ہے۔

شاہ ولی اللہ بتاتے ہیں کہ عام انسانوں کے معاملہ میں ان کی طبعی حالتیں ان کے ذہن پر بھی اثر انداز ہوتی ہیں اور ان کے مزاجوں کی تشکیل کرتی ہیں حقیقت یہ ہے کہ ایک خاص درجہ پر جب کہ روحانی مزاج ترقی یافتہ نہیں ہوتا تب طبعی حالتیں روحانی کیفیات پر غلبہ رکھتی ہیں یہ یہاں تک ہوتا ہے کہ ایک طاقتور جسم ایک طاقتور دماغ ہی تعمیر کرتا ہے اور ایک کمزور جسم کا نتیجہ ایک کمزور دماغ ہی ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں خارجی حقائق جو طبعی جسم پر اثر انداز ہوتے ہیں حالانکہ اعلیٰ اور مستحکم روحانی امزجہ مزاج الحدید میں ذہن کا جسم پر اسی قسم کا اثر نمایاں اہمیت رکھتا ہے۔ ایسی صورت حال میں اس قسم کا اظہار جیسے طاقتور ذہن، طاقتور جسم، زیادہ مناسب ہوتا ہے۔ دونوں حالتوں میں یہ واضح ہے کہ ذہن اور جسم ایک دوسرے پر قوت اور اثر کے مختلف درجات میں تعامل کرتے ہیں یہ عمل جسم کی بیماری اور ذہن کی خرابی کی حد تک پہنچ جاتا ہے یہاں تک کہ مادی جسم میں سے طبعی موت یا روحانی عروج کی ایک مساوی حالت حاصل کرتے ہوئے جسے شاہ ولی اللہ نے موت الاختیاری قرار دیا ہے روحانی مزاج اخراج کر لیتا ہے۔

مزاج کا فروغ:

شاہ ولی اللہ کے امزجہ عامہ کے فروغ کا تصور تعاملیت کے نظریہ پر قائم ہے وہ کہتے ہیں کہ ہر شعوری

اور ارادی عملی یا سرگرمی فروغ پاتی ہے یا ایک اعتبار سے ذہن کی تعمیر کرتی ہے یہی نہیں کہ محض محرک ہی عمل کا سبب ہے بلکہ ہر عمل ہر آئندہ کے عمل کیلئے محرک کو مستحکم بناتا ہے۔ مستحکم محرکات مستحکم روحانی کیفیات کی نمائندگی کرتے ہیں یہ ذہن کے شعور کی تعمیر کرتے ہیں جو کارکردگی عمل اور زیادہ تیز رو شعور پیدا کرتے ہیں پھر یہ مزاج کے عظیم تر فروغ اور قوت میں اپنا حصہ ادا کرتے ہیں جب کہ دوسری طرف زیادہ مستحکم مزاج عمل میں مستعدی اور کارکردگی بڑھا دیتا ہے مزاج کی قوت اور اس کے عمل کی کارکردگی مسلسل تکرار اور مشق سے بڑھتی رہتی ہے اسی طرح شعوری قوت کی ہر کمی اور محرک کی قوت اسی تناسب سے ارادی قوت کو کم کرتی رہتی ہے ترک، اعدام عمل سے قوت کا زیاں یا تقلیل پیدا ہوتی ہے۔

شعوری عمل اور خارجی طرز عمل کے تعلق کی جزئیات جاننے کیلئے یہ مفید ہوگا کہ شاہ ولی اللہ کی بحث سوق العمل کا مطالعہ کیا جائے جس میں وہ بیان کرتے ہیں بے شک ایسے اعمال کا نتیجہ جو انسان شعوری طور پر اور خاص مقصد کے ساتھ انجام دیتا ہے حالانکہ بنیادی طور پر اس کے حقیقی مخرج سے پیدا ہوتا ہے مگر یہ مزاج کی طرف رجعت کرتا ہے اس سے وابستہ رہتا ہے اس کے مواد میں اضافہ کرتا ہے اور اس کو وسیع کرتا ہے۔

اختلاف طبائع

انسان کے نظام اعضاء میں صفت قوت اور تناسب کا فرق جس میں کہ وہ ایک دوسرے پر عمل اور تعامل کرتے ہیں نہ صرف حیوان اور قدیم دور کے انسان میں مزاجوں کے اختلاف کا سبب ہوتا ہے بلکہ یہ ترقی یافتہ، بنی نوع انسان میں بھی مزاجوں کا اختلاف پیدا کرتا ہے جس طرح کہ ذہن فروغ پاتا ہے اسی طرح روحانی مثلث تعاملیت اور ساخت میں زیادہ سے زیادہ پیچیدہ ہوتے جاتے ہیں۔

مزاجوں کے تنوعات کے بارے میں شاہ ولی اللہ کے تصورات کا تجزیہ کرنے سے ذیل کے نتائج اخذ کئے جا سکتے ہیں۔

(الف) ایک طاقتور اور گہرے مزاج کے وجود کے لئے ایک حالت اور گہرے بنیادی مثلث کی ضرورت لازمی ہے۔

(ب) اتصال اور تکاثف، مزاج کے متعدد حصوں یا اس کے طبعی حصوں اور روحانی مثلثوں کے درمیان ایک متوازن اور اعلیٰ ترین مزاج اور شخصیت کی تعمیر کرتا ہے۔

(ج) بنی نوع انسان کے وہ مزاج جو ذہنی قوت اور ذہانت سے مغلوب ہیں اور ان کی صفات، ان مزاجوں سے اعلیٰ تر ہیں جو جسمانی اور جسمانی وحیاتیاتی فطرت سے تعلق رکھتے ہیں اور جیسا کہ یہ حیوانوں میں نظر آتا ہے جس میں کہ ایک محرک ہی عمل پیدا کرتا ہے اور محرک عمل انفرادی مقصد اور خودنمائی کے سوا کسی اور شے سے روشنی حاصل نہیں کرتا۔

انسانی مزاج میں رُجعت پسندی:

شاہ ولی اللہ حیوانات کے کردار کے مطالعہ کی ہدایت کرتے ہیں تا کہ حیوانی جبلتوں یا صفات کا سراغ لگایا جا سکے جو انسانی فطرت میں بھی موجود ہیں اور جو ان کے خیال کے مطابق انسان میں برقرار بھی رہتے ہیں۔ اسے وہ حیوانیہ یعنی انسانی مزاج کا حیوانی پہلو قرار دیتے ہیں ساتھ ہی وہ اس امر پر بھی زور دیتے ہیں کہ کارکردگی عمل اور خارجی طرزِ عمل کیلئے مزاج کا ایک مستحکم حیوانی پہلو ضروری ہے۔ انسانی مزاج کا اعلیٰ تر روحانی پہلو جو کہ بنی نوع انسان کا ایک حیوان سے نشانِ امتیاز ہے شاہ ولی اللہ اسے ملکیہ یعنی انسانی مزاج کا فرشتہ صفت پہلو کہتے ہیں۔

حجابات:

انسانی مزاج کا قدرتی فروغ دونوں پہلوؤں کے قدرتی رشتہ کی بنیاد پر قائم ہے جس کے تحت عقل

یا فرشتہ صفت پہلو، حیوانی پہلو پر حکمرانی کرتا ہے مگر بعض اوقات حیوانی پہلو کی قوت فرد کی فطری ترقی اور فروغ کی راہ میں ایک حجاب میں تبدیل ہو جاتی ہے اسی قسم کی رکاوٹ کو شاہ ولی اللہ حجاب الطبع (جسمانی وحیاتی حجاب) کہتے ہیں۔

اس پیدائشی حجاب کے علاوہ دو اور حجابات ہیں جو فطری ترقی اور فروغ کی راہ میں رکاوٹ پیدا کرتے ہیں یہ حسب ذیل ہیں۔

(الف) حجاب الرسم، رسم و رواج کی رکاوٹ ہوتی ہے یہ ایک عام فرد کی ترقی کو اس وقت روک دیتی ہے کہ جب وہ اپنی افادیت سے زیادہ زندہ رہتا ہے اور ایک رکاوٹ بن جاتا ہے اس طرح ترقی یافتہ افراد کی راہ ترقی میں رسم و رواج رکاوٹ بن جاتے ہیں جو اگرچہ عام افراد کے لئے مفید ہوتے ہیں۔

(ب) حجاب سوالمعرفہ، غلط ہدایت و منہ ہمت اور بے حقیقت رہنمائی کی رکاوٹ ہوتا ہے یہ تیسرا حجاب ہے جو کسی مزاج کی فطری فروغ کی راہ میں رکاوٹ ہوتا ہے یہ حجابات نہ صرف انسانی افراد کی داخلی فطرت ہیں بلکہ معاشرہ میں بھی بالواسطہ بگاڑ پیدا کرتے ہیں۔ یہ اختیاتی تجزیہ کے لئے براہ راست اور بالواسطہ موضوعات بن جاتے ہیں بالخصوص اعلیٰ اخلاقیات ان تین حجابات سے ذہن کو آزاد کرانے کے مقصد کی علمبرداری ہوتی ہے۔

مسرت اور غم

شاہ ولی اللہ کے مطابق مسرت یا غم کا بنیادی مخرج کسی محرک کی تسکین یا محرومی پر ہوتا ہے قدرتی طور پر محرکات افراد کے مفادات کے تحفظ کے لئے وجود میں آتے ہیں یا زیادہ واضح طور پر یہ کہا جا سکتا ہے، کہ وہ کسی ایک یا دونوں حیوانی اور فرشتہ صفت پہلوؤں کے لئے ہوتے ہیں چونکہ وہ ان دونوں سے محروم ہوتے ہیں اس لئے حیوانات میں مسرت اور غم بہت کم اور مناسب رہبری کے ساتھ ہوتے ہیں ان کی مسرت ایسی شے ہوتی

ہے جو حیوانات کے نظام الاعضاء کو فائدہ پہنچاتی ہے ان کی جبلتوں اور محرکات کو تسکین دیتی ہے اور ان کے غم وہ ہیں جو ان کے بہتر وجود کے فوری محرکات کو شکست دیتے ہیں۔

غم کا اثر

شاہ ولی اللہ کے خیال کے مطابق غم ایک دبانے اور کمزور کرنے والا اثر ہے غالب حیوانی پہلوؤں کی مستوں کا عقل کی محکومی کے ذریعہ، فرشتہ صفت پہلو پر چھا جانے سے غم پیدا ہوتا ہے وہ نقصان دہ ہوتا ہے لیکن حیوانی پہلو کے لئے ایک حد تک غم اٹھانا کارآمد اور مفید اثر رکھتا ہے چونکہ وہ اس کی طاقت کچل دیتا ہے اور گھٹا دیتا ہے اور اس طرح وہ فرشتہ صفت پہلو کو حیوانی مسرتوں اور غلبوں کے غم ناک اثرات سے آزاد کر دیتا ہے انسان کے طبعی وجود کے دوران اس کے جسم کی بیماری، جسمانی محنت ومشقت اور بے آرامیوں کا اثر یکساں ہوتا ہے یہ اس اثر کی بنیاد پر ہے کہ روزے، تزکیہ نفس اور نفس کشی کے طریقے اس لئے رائج کئے گئے ہیں کہ فرشتہ صفت پہلو کو حیوانی پہلو کی گرفت سے آزاد کرانے کے لئے مددگار ثابت ہوسکیں۔ اس کی تفصیلات کا تعلق اعلیٰ اخلاقیات اعلیٰ یا مافوق البشر نفسیات اور روحانیت سے ہوتا ہے۔

سات اخلاق فاضلہ

سات اخلاق فاضلہ، بہتر ترقی یافتہ اور مستحکم عام انسانی مزاج کے نشانات ہیں جو حیوانی مزاجوں سے نمایاں فرق رکھتے ہیں ان اوصاف کو شاہ ولی اللہ نے اخلاق فاضلہ قرار دیا ہے کیونکہ یہ حقیقت ہے کہ یہ خصوصیات انسانی مزاج کی حیوان مزاج پر نہ صرف برتری بلکہ فرق بھی واضح کرتی ہیں۔

پیچیدہ جذبات، جوش اور ممتاز انسانی محرکات کی شکلیں اختیار کرتے ہوئے انسانی مزاج کے مخصوص نشانات مثلث صفات کے اثر کے تحت فروغ پاتے ہیں جو ان میں متعدد فوقیت، مثالیاتی رجحان ترقی وکاملیت کے عنصر عطا کرتے ہیں جو کہ مزاج کے جوش، جذبات کی متعدد شکلوں میں نمودار ہوتے ہیں انسانی

مزاج کے جومخصوص نشانات اس طرح ترقی پاتے ہیں وہ انسانی طرز عمل میں ظاہر ہوتے ہیں اس کو اس کار کردگی وصلاحیت کے تناسب کے پیش نظر اخلاق فاضلہ کا طرز عمل کہا جاسکتا ہے جو ان اوصاف کا اظہار کرتے ہیں جو شاہ ولی اللہ کے نزدیک واضح طور پر نفسیاتی خصوصیات ہیں۔

جب ان کا اخلاق فاضلہ کے طرز عمل میں اظہار ہوتا ہے تب وہ شاہ ولی اللہ کے نزدیک روح کی عظمت ذہن کی وسعت قلب کی گہرائی اور مزاج کی اعتدالیت کی قابل تعریف خصوصیت پیش کرتے ہیں یہ خصوصیات مقصد کی آفاقیت اور ہمہ گیری کی علامات ہیں جو حیوانی مزاج سے فرق پیدا کرتے ہیں انسانی مزاج میں اختلاف اور معیار کے طور پر کام کرتی ہیں اس بنیاد پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہر وہ علامت جو انسان کو حیوان سے ممتاز کرتی ہے اور حیوان پر انسانی کی عظمت و برتری ظاہر کرتی ہے اسے اخلاق فاضلہ کہا جا سکتا ہے ہر وہ نشان یا علامت جو ان صفات کے کسی فقدان یا خرابی کی طرف اشارہ کرتی ہے وہ بدخصلت یا برائی کہلا سکتی ہے۔

سات اخلاق فاضلہ کی معاشرہ میں اہمیت

جیسا کہ سات اخلاق فاضلہ کی صحیح ترقی کی بنیاد مستحکم مزاج میں ہوتی ہے اور ان افراد کے طرز عمل میں ہوتی ہے جو مستحکم مزاج رکھتے ہیں اور ان افراد کے لئے ایک معیار فراہم کرتے ہیں جو ایسے مزاج سے محروم ہوتے ہیں ایک صحت مند اور مستحکم معاشرہ کے وجود میں معاشرہ کے ایسے مزاج سے محروم ہوتے ہیں۔ ایک صحت مند اور مستحکم معاشرہ کے وجود معاشرہ کے لیے افراد کی اکثریت کے وجود پر منحصر ہوتا ہے جو ایسے مستحکم اعلیٰ اوصاف کے مزاجوں کے حامل ہوتے ہیں جیسا کہ یہ عملی طور پر ممکن نہیں کہ معاشرہ کے تمام افراد کامل اور مستحکم ترین مزاج کے حامل ہوں ایک معاشرہ زیادہ سے زیادہ عمدہ صحت اور اپنے افراد کے طبائع کی صفت معاشرہ میں موجود مستحکم طبائع کے افراد کے تناسب سے حاصل کر سکتا ہے۔ ہر صفت یا اخلاق فاضلہ معاشرہ کی بہبودی اور سالمیت کی تعمیر کرتا ہے۔

ایک معاشرہ کے افراد کے درمیان خیر سگالی اور دوستی کے جذبات پیدا کرنے کے لئے صفت سماحت لازمی ہے۔شاہ ولی اللہ کے نزدیک کسی خاندان کا سربراہ ایک ایسا شخص ہونا چاہیئے جو صفت سمت صالح کا حامل ہو۔لوگوں کے رہنما کو سات اخلاق فاضلہ کا حامل ہونا چاہیئے اوران کے ہمراہ صفت،حمت اور دوسری متعلقہ صفات بھی ہونی چاہئیں۔

دماغ کے ادارے میں جس کے لئے بعض اوقات جنگ ضروری ہو جاتی ہے تب شجاعت سب سے لازمی صفت ہو جاتی ہے۔مرد وزن کے درمیان مستقل خوشگوار اور انسان کی ترقی وتعمیر کے لئے صفت عفت بہت نمایاں کردار ادا کرتا ہے اسی طرح دوسرے اخلاق فاضلہ بھی اپنے معاشرتی مقاصد رکھتے ہیں اوران کی اہمیت ان لوگوں کی نظروں سے پوشیدہ نہیں رہ سکتی جوان کا مشاہدہ کرتے رہتے ہیں۔

حکمت:

حکمت عقل کا وصف ہے اس کا اظہار خود بخود ذہن کی تیزی اور ذکاوت کے ذریعہ ہوتا ہے اور یہ اس علم کو حاصل کرتی ہے محفوظ رکھتی ہے اور عملی فائدوں کے لئے کام میں لاتی ہے جو حسی ادراک،استدلال یا انوار الٰہی یعنی وجدان اور وحی کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے اور یہ علم بنی نوع انسان کی آئندہ نسلوں کے لئے باقی رہتا ہے اور اسے شریعت کہا جاتا ہے۔

اسی تعریف کی روشنی میں وصف حکمت کے دو لازمی اجزاء ہوتے ہیں۔

(الف) حصول علم کی صلاحیت،اگر اعلیٰ قسم کا علم نہیں تو کم از کم عام دنیاوی علم تو حاصل کر سکتی ہے۔

(ب) ذہن کی تیزی،مہارت وذکاوت علم کے استعمال اور اس کے عملی فائدے کے لئے ضروری ہوتی ہے اگر کسی شخص میں ان میں سے ایک جزو کمی ہو تو وہ دراصل اسی حد تک وصف حکمت کا ضرورت مند ہوتا ہے۔

اس کو صاف طور پر واضح کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ جو لوگ وصف حکمت سے محروم ہیں ان کی خصوصیات کو بیان کرنا چاہیئے۔ جس شخص میں صلاحیت فہم کی کمی ہوتی ہے وہ معنی ومفہوم کو صاف طور پر نہیں سمجھتا جو شخص اپنے علم کو بروئے عمل نہیں لاسکتا وہ صحیح وکارآمد اور غلط ونقص زدہ اشیاء کے درمیان فرق نہیں کرسکتا۔ جس شخص میں صلاحیت ادراک نہ ہو وہ پیچیدہ سوالات میں الجھ کررہ جاتا ہے۔

جو شخص تدبر ودوراندیشی کے عنصر سے محروم ہوتا ہے تو وہ اپنے موجودہ علم سے کسی فیصلہ یا نتیجہ پر پہنچنے سے قاصر رہتا ہے۔ جو شخص ایک سست اور غیر فعالی ذہن رکھتا ہے وہ سوچ بچار کو نظرانداز کرتا ہے اور اپنی ذکاوت وتیزی کے باوجود گہرے تصورات کی تلاش وجستجو زحمت گوارا نہیں کرتا ہے۔

اور جو شخص ایک اچھے حافظہ سے محروم ہے تو وہ صحیح طور پر تصورات پیش نہیں کرسکتا ہے اور ان کے اظہار میں تسلسل برقرار رکھنے میں ناکام رہتا ہے۔

جو لوگ وصف حکمت کے حامل ہوتے ہیں متذکرہ کمزوریوں کا شکار نہیں ہوتے۔ وہ وہ فطانت، بشارت، تفہیم، احصاء، ادراک، ذکاوت اور حدس خصوصیات کے حامل ہوتے ہیں یہ تمام خصوصیات ذہن کی مستعدی کو ظاہر کرتی ہیں اور واقعات کو صحیح طور پر محفوظ رکھنے اور ان کو حافظہ میں محفوظ رکھنے اور ان سے صحیح فائدہ اٹھانے کی صلاحیت یا مستعدی کا اظہار کرتی ہیں۔

حکمت نہ تو اعلیٰ اور پیچیدہ فلسفیانہ تصورات کے علم میں ہوتی ہے جو اصحاب فلسفہ کی خصوصیت ہوتی ہے اور نہ ہی وہ اس علم میں ہوتی ہے جو صوفیاء اور تارک الدنیا افراد کی صفت ہوتی ہے جسے وہ گہرے وجدان اور روشنی سے حاصل کرتے ہیں جو ان کے ذہن یا روح سے پیدا ہوتی ہے۔

لیکن حکمت ایک ایسی صلاحیت ہے جس سے مستحکم مزاج رکھنے والے افراد اپنی زندگی میں ہدایت پاتے ہیں۔ اپنے علم ومشاہدہ میں روشنی حاصل کرتے ہیں اور یہ فطرتاً نسمہ سے تعلق رکھتی ہے جو ایک نفسیاتی مزاج ہے

اور یہی دنیاوی و سطحی علوم کا مخرج ہے۔

حکمت ایک نفسیاتی حالت یا رجحان کا نام ہے جو ذہن میں ہوتی ہے یہ اشیاء کے کلی نظری علم سے زیادہ کوئی شے ہے یہ ان دور افتادہ مسائل اور باریکیوں سے کوئی واسطہ نہیں رکھتی جن کا کوئی عملی استعمال نہیں ہوتا ہے''۔(۲۰)

عفت:

ایک اور وصف جو انسانی طبائع کے حیوانی پہلو میں پائی جانے والی جہت سے صاف ستھرے اثر اور عقل کے تحت پیدا ہوتا ہے عفت کہلاتا ہے، یہ انسانی ذہن کے اس رجحان میں پایا جاتا ہے جس میں جنسی جہت پر قابو پانے اور اس کو کار آمد بنا کر اس سے اعلیٰ تر قدریں حاصل کرنے کے محرکات ہوتے ہیں انسانی طبیعت کے حیوانی پہلو اور صفات عقل کے مثلث کے اثر کے دو حیاتی عناصر میں اس وصف کی بنیاد ہوتی ہے۔

یہ حیاتیاتی عناصر حسب ذیل ہیں:

(الف) جنسی جبلت اور اس کے محرکات کی قوت، جیسا کہ وہ مستحکم طبائع میں ایک مضبوط اور صحت مند طبعی جسم کے ساتھ بالعموم پائے جاتے ہیں۔

(ب) مرد کا حاکمانہ اور برتری کا طرز عمل جو اسے وصف قوت کی بناء پر حاصل ہے۔ عورت پر چھا جاتا ہے۔ مرد کے مقابلہ میں عورت کا محکومانہ وتابعدارانہ طرز عمل اور شرمیلا پن اس کی طبیعت میں پیدائشی طور پر نرمی اور نزاکت ہوتی ہے یہ دو خصوصیات حیوان میں نمایاں ہوتی ہیں اور انسان طبائع حیوانی پہلو میں بھی پیدائشی طور پر ہوتی ہیں اور ان سے دونوں اصناف کے ارکان میں فطری طرز عمل کی بنیاد فراہم ہوتی ہے لیکن بنی نوع انسان کے معاملہ میں جیسے جیسے یہ فروغ پاتی ہیں مختلف النوع حالتیں پیدا ہوتی جاتی ہیں۔

☆☆☆☆

باب دوم

فصل سوم

معاشرتی ارتقاء کے چار مرحلے

ارتفاق اول | رتفاق دوم
ارتفاق سوم | ارتفاق چہارم

ایک فرد کی زندگی کو سرسری طور پر چار مرحلوں مثلاً بچپن، لڑکپن، جوانی اور عمر پختگی میں تقسیم کیا جاسکتا ہے اسی لئے شاہ ولی اللہ سہولت کی خاطر معاشرتی ارتقاء کو چار مرحلوں میں تقسیم کرتے ہیں جن کو وہ ارتفاقات کہتے ہیں اور یہ چاروں مرحلے ایک دوسرے سے اس قدر مربوط ہیں کہ ان کے درمیان مشکل ہی سے خط تقسیم ڈالا جاسکتا ہے، ہر ایک مرحلہ اس کی مخصوص صفات اور اداروں کی بنیاد پر تقسیم کیا گیا ہے اور شاہ صاحب نے ہر مرحلہ کے وسیع خطوط کھینچے ہیں۔

ضروریات کی تسکین وہ عام سطح ہے جس پر کہ ایک معاشرہ کے بنیادی خارجی صور پر قائم ہوتے ہیں، ابتدائی ضروریات، خوراک، سردی گرمی اور موسم کی شدت کے خلاف سرپناہ اقسام حیوانات کا ہم صحبت ہونا اور تولید نسل کرنا اور دوسری جسمانی وحیاتیاتی ضروریات کی تسکین ابتدائی دور کے انسانی معاشرہ کی تعمیر میں نہایت اہم کردار ادا کرتی ہے جو کہ اپنے آغاز میں حیوانات کے مقابلے میں مشکل ہی سے بہتر ہوگی لیکن ارتقاء کے دوران مخصوص خصوصیات نے فروغ پایا جنہوں نے اس کے طرز عمل کو گروہوں اور حیوانوں کے طرز عمل سے ممتاز کیا ہے۔

ارتفاق اوّل

انسانی معاشرہ، معاشرتی ارتقاء کے اولین مرحلہ میں

انسانی معاشرہ اپنے فروغ کے اولین مرحلہ میں اس وقت ہوتا ہے کہ جب وہ اپنی ابتدائی حالت میں ہی ہوتا ہے، ذیل کے خطوط کے مطابق انسانی معاشرہ ترقی پاتا ہے۔

بنی نوع انسان، حیوانات سے بلند تر فروغ پاتے ہیں اور جو شے ان کو اپنی ہی نوع سے قریب تر رابطہ پیدا کرنے کی صلاحیت عطا کرتی ہے وہ قوت گویائی ہے دوسری بات یہ ہے کہ جو شے افراد کے مسمہ گروہوں کی تشکیل میں مدد دیتی ہے وہ خانہ بدوشوں کے گروہوں میں سے زرعی گروہوں کا مستقل قیام ہے، یہ دونوں باتیں ہر انسان کے درمیان تعاون، محنت کی تقسیم گروہوں کے ارکان میں ایک دوسرے پر انحصار رکھتے ہیں جو زمین کو ہموار کرنے اور آبپاشی کا سامان پیدا کرنے کیلئے اجتماعی کوشش کی مزید ضرورت پیدا کرتی ہے یہ نہ صرف انسان کو باہمی تعاون کے لئے مجبور کرتی ہے بلکہ حیوانات کی پرورش بھی ضروری بنا دیتی ہے۔

انسانی ضروریات کی ترقی اور ان کی بتدریج وپیچیدگی جونئی شکلوں میں ترقی پذیر ہوتی رہتی ہے، جیسے سائے فراہم کرنا ایک قسم کے کپڑے بنانا ور پکا ہوا کھانا کھانا، زیادہ سے زیادہ باہمی امداد تعاون کی ضرورت پیدا کرتی ہے۔ پرورش حیوانات بھی خاندانی نظام زندگی کو تقویت کرتی ہے جو ایک گروہ میں ایک مستقل ادارہ ہوتی ہے۔

دوسری ضرورت دفاع ہے اکثر یہ ہوتا ہے کہ ایک گروہ دوسرے گروہ پر حملہ کردیتا ہے نہ صرف یہ کہ اکثر اندرونی طور پر گڑ بڑ ہوجاتی ہے اور ایک ہی گروہ کے ارکان آپس میں لڑتے ہیں اکثر ان میں ایسے تنازعات پیدا ہوجاتے ہیں جو تمام گروہ کی بیخ کنی کے لئے کافی ہوتے ہیں اسی وجہ سے متعلقہ رواج اور

روایات وجود میں آتی ہیں جن کی سختی سے حفاظت کی جاتی ہے ایک رہنما کی ضرورت محسوس کی جاتی ہے۔

اور اس کے پیرامن وجنگ کے دوران اس کا حکم مانتے ہیں اور اپنے تنازعات طے کرتے ہیں اسی بنیادی خصوصیات بھی ہیں جن کو ابتدائی دور کے معاشرہ نے ظاہر کیا ہے۔

ارتفاق دوم

(انسانی معاشرہ معاشرتی ارتقاء کے دوسرے مرحلہ میں)

تنظیم وقوت جو مشہرے اور علم سے حاصل ہوتی ہے اور پہلے مرحلے میں حاصل کی گئی مزید ترقی کی راہ ہموار کرتی ہے ترقی وتوسیع کی راہ میں کوئی بھی رکاوٹ وہی اثر پیدا کرتی ہے جو کہ ایک فرد کے معاملہ میں پیدائش مزاج کے حجاب آمیز محرکات پیدا کرتے ہیں وران کے نتیجہ میں بے چینی اور رنج پیدا ہوتا ہے۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ یہ نتیجہ کے طور پر ایک ارتقاء کی طرف راہنمائی کرتا ہے۔

قابل ذکر بات یہ ہے کہ پہلے مرحلہ پر بھی ضروریات کی طرح ان کی تسکین وتکمیل کے طور طریقے بھی فروغ پانا شروع کر دیتے ہیں اور زیادہ سے زیادہ پیچیدہ ہوتے جاتے ہیں۔ یہ اسی طرح کار کا نتیجہ ہے کہ آگے چل کر معاشرتی ارتقاء کا دوسرا مرحلہ وجود میں آیا۔

زندگی کے پانچ شعبے

شاہ ولی اللہؒ دوسرے مرحلے کی پیچیدہ زندگی کو پانچ شعبوں میں تقسیم کرتے ہیں جس کے ہر شعبہ میں کردار کے موزوں طریقے بروئے عمل ہیں جو معاشرہ کے اخلاقی کردار کے کثیر التعداد ضابطوں کو متشکل کرتے اور ترقی دیتے ہیں۔

یہ شعبے حسب ذیل ہیں:

فرد کی زندگی یا شخصی زندگی کا شعبہ

جو اصول شخصی زندگی کے موزوں کردار پر حکمرانی کرتے ہیں انہیں شاہ ولی اللہؒ حکمت المعاشیہ (طرز زندگی کی حکمت) قرار دیتے ہیں اور یہ ایک فرد کی ضروریات کی تسکین کی موزوں شکلوں سے وابستہ ہوتے ہیں۔ مثلاً خوراک، مشروبات، لباس، مقام رہائش، طرز نشست و برخاست، طرز زندگی اور سفر حضر میں، جو ترقی یافتہ معاشروں کی طرح ہر دور میں انسانی ضرورت رہے ہیں۔

گھریلو زندگی کا شعبہ:

خاندانی زندگی بھی اس مرحلہ پر زیادہ پیچیدہ ہو جاتی ہے، ازدواجی تعلقات نہ صرف بچوں کے لئے ذمہ داریاں پیدا کرتے ہیں بلکہ دوسرے رشتہ داروں، خاندان کے دوستوں، خادموں اور دوسروں کے لئے احساس ذمہ داری پیدا کرتے ہیں۔

اسی طرح سے نئے رواج اطوار اور روایات وجود میں آتے ہیں بعض حالات میں مشترکہ خاندان بھی ایک مظہر بن جاتا ہے جو اصول گھریلو زندگی میں کارفرما ہوتے ہیں انہیں شاہ ولی اللہ حکمت تدبیر المنزل کہتے ہیں یعنی گھریلو ذمہ داریوں کے کردار کی حکمت کا علم۔

پیشہ ورانہ زندگی کا شعبہ:

یہ زندگی کے ایک اعلی معیار کے لئے مہم سے تعلق رکھتی ہے جو مزید تقسیم محنت اور ذرائع پیداوار اور حصول روزی کی تخصیص کار اور ترقی سے تعلق رکھتی ہے شاہ ولی اللہ اس شعبہ کو حکمت اکتسابیہ، یعنی روزی حاصل کرنے کی حکمت کہتے ہیں۔

تجارتی معاہدوں کے تعلقات،

اور دوسروں سے سامان تجارت کے مبادلہ کا شعبہ:

یہ شعبہ اس علم پر قائم رہتا ہے جسے شاہ ولی اللہ نے حکمت التعاملیہ، یعنی باہمی لین دین کا علم قرار دیا ہے، یہ علم ایسے معاملات سے تعلق رکھتا ہے جیسے فروخت، پٹہ، کرایہ نامے، قرضہ، زیر باری، رہن وبیع وغیرہ۔

تعاون کا شعبہ (یا امداد باہمی کا شعبہ)

شاہ ولی اللہ کے نزدیک یہ شعبہ، حکمت التعاونیہ، یعنی امداد باہمی کے علم سے تعلق رکھتا ہے مثلاً یقین دہانی (ضمانت) سے تعلق رکھنا، مشترکہ ملکیت کا کاروبار، شراکت ایجنسی اور اسی قسم کے دوسرے معاہدے وغیرہ۔

آخر کے تین شعبے ایک معاشرہ کی معاشی زندگی کے کردار کے ترقی وفروغ کے مختلف پہلوؤں کی نمائندگی کرتے ہیں اسلیئے ان تینوں شعبوں کو مشترکہ طور پر ایک شعبہ بھی تصور کیا جا سکتا ہے اور اسے معاشی زندگی کے کردار کا شعبہ کہا جا سکتا ہے۔

زندگی کے تمام متذکرہ بالا شعبے ایک معاشرہ کی لازمی خصوصیات ہیں جو کہ اپنے ابتدائی مرحلہ سے ترقی پا گئے ہیں۔ ہر ایک شعبہ ترقی یافتہ معاشرہ کی تشکیل میں اپنا لازمی حصہ ادا کرتا ہے ترقی یافتہ معاشروں میں، شعبہ دوسرے شعبوں سے مربوط ہوتا ہے ایک دوسرے سے تعلق رکھتے ہوئے یہ پانچوں شعبے معاشرہ کے تمام ارکان کو بحیثیت مجموعی متحد کرتے ہیں اور معاشرہ کو بڑے پیمانہ پر ایک ہی خاندان کی شکل دیتے ہیں۔

ارتفاق سوم

انسانی معاشرہ، معاشرتی ارتقاء کے تیسرے مرحلہ میں

معاشرتی ارتقاء کا تیسرا مرحلہ سابقہ مرحلہ کا فطری نتیجہ ہے جس میں معاشرہ واقعتا ایک متحدہ نظام اعضاء کی طرح ہوجاتا ہے، اور یہی مملکت کی بنیاد ہے اتحاد اور عضویت دونوں مزید معاشرتی ارتقاء کی ضرورت محسوس کرتے ہیں یہ ایک ہم رنگ مملکتی حکومت کی تخلیق وترقی کی طرف واقع ہوتا ہے اسی مقصد کے حصول کرنے کے منصوبوں میں نہ صرف معاشرہ کا تحفظ وحفاظت اس کا اتحاد اس کی مملکت اور حکومت شامل ہوتے ہیں بلکہ وہ اس مکمل فائدے سے تعلق رکھتے ہیں جو اتحاد، مملکت اور حکومت اپنے معاشرہ کے ارکان کو پہنچا سکتے ہیں۔

باہمی تعلق کے بارے میں شاہ ولی اللہ کے الفاظ یہ ہیں:

> ''بلاشبہ جب انسان ایک دوسرے سے باہمی لین دین کرتے اور مختلف لوگ مختلف پیشوں میں مصروف ہوتے ہیں اور وہ ایک دوسرے کی ضروریات پیدا کرتے ہیں اور فراہم کرتے ہیں اور نتیجہ کے طور پر سامان تجارت کے مبادلہ کی مختلف شکلیں، مثلاً تعاون وغیرہ وجود میں آتی ہیں یہ لازمی طور پر اس اہمیت کو واضح کرتی ہیں کہ لوگوں کے درمیان، مثلاً کاشتکاروں تاجروں اور جولاہوں وغیرہ کے درمیان ایک قسم کا رشتہ، یعنی اتحاد موجود ہے۔
>
> یہ لوگوں کے وہ گروہ ہیں جو باہمی رشتے کے جوڑنے سے فی الحقیقت

مملکت کا نظام ترتیب دیتے ہیں حقیقی مملکت یہ چار دیواری، قلعہ اور تجارتی مکز
کا نام نہیں، اگر ایک دوسرے کے قرب وجوار میں بہت سے شہر واقع ہیں
اوران میں رہنے والے لوگ باہمی لین دین کرتے ہیں تب یہ ایک مملکت
کہلائیگی۔

اس نقطہ نگاہ سے کہ ایک مملکت کو اتحاد کے رشتہ سے متحد کیا جائے وہ فرد واحد یا ایک نظام اعضاء کی طرح ہو جاتی ہے جس میں لوگوں کا گروہ، اور ہر فرد کی حیثیت وہی ہوتی ہے جو اس شخص کے جسم میں ایک بڑے یا چھوٹے سے عضو کی ہوتی ہے۔

ایک مملکت میں اتحاد لازمی شے ہے۔ سب سے پہلے اس اتحاد کے تحفظ کی
ضرورت ہے تب اس کے تمام فوائد اٹھانے کے لئے اسے ترقی وفروغ
دینے کی ضرورت ہے۔ حکومت کا نظام (تدبیر) جس کے ذریعہ کہ ایک
مقصد حاصل ہوتا ہے وہی حقیقی رہنما (امام) یا مملکت کا فرمانروا ہوتا ہے شاہ
ولی اللہ کے نزدیک حکومت کا فرمان روا نہ صرف کلیۃ ایک انسانی فرد کا خاکہ
ہوتا ہے ماسواء بلا شبہ، جب ایک مستحکم اور طاقتور شخصیت کا حامل شخص، جو کہ
قطعی طور پر اس کام کیلئے موزوں ہو، مملکت کے امور سنبھال لے۔ وہی
مملکت کا سربراہ ہوتا ہے، حالانکہ وہ محض خارجی اور ظاہری طور پر سربراہ
ہوتا ہے"(۲۰)

مملکت کی حکومت کا نظام، ذیل کی ضروریات کی تکمیل کرتا ہے جو کہ مملکت کے تحفظ اور ترقی کے لئے
ضروری ہوتی ہیں۔

مملکت کی ضروریات

ا۔ عدلیہ:

مملکت کے استحاد کے لئے اس وقت بڑا خطرہ لاحق ہوجاتا ہے جب مملکت کے مختلف شعبوں کے لوگوں کے درمیان باہمی تنازعے اور رقابتیں شروع ہوجاتی ہیں اگر ان تنازعات کا تصفیہ نہ کیا جائے تو وہ بڑھتے جاتے ہیں اور مملکت کے لوگوں کے درمیان بے چینی اور تصادم پیدا کرتے ہیں جو مملکت کو زوال تباہی کی طرف لے جاتے ہیں اسی لئے مملکت ایک ایسے ادارے کے ڈھانچے کی شدید ضرورت محسوس کرتی ہے جسے اس کے نظام حکومت میں شامل کرلیا جائے۔ جو موثر طور پر اس کے تنازعات کا تصفیہ کرے۔ مملکت کی یہ ضرورت، عدلیہ کے ذریعہ تکمیل پاتی ہے جو مسلسل اور متفقہ طور پر تنازعات کے تصفیہ کا نظام ہوتا ہے۔ یہ ضروری ہے کہ عدلیہ منصف و مستحکم ہو اور اس کے فیصلے قابل عمل بھی ہوں ورنہ مملکت کی جو ضروریات اس سے وابستہ ہوتی ہیں پوری نہیں ہوتیں۔

انتظامیہ (عاملہ):

کمزور اور بدطبع لوگوں کی سرگرمیوں کو کچلنے کے لئے جو مملکت میں خرابی پیدا کرسکتے ہیں یہ ضروری ہے کہ ایسے افراد کے خلاف تعزیری اور انسدادی اقدامات کرنے کے لئے ایک مستحکم نظام ہونا چاہیئے۔ اور ان افراد سے نمٹنے کے لئے یکساں اور مہذب طریقے وضع کرنے والے کو اختیار کرنا چاہیئے۔

فوج یا قوت دفاع:

کوئی انسانی معاشرہ گمراہ طبائع کے افراد سے خالی نہیں ہوسکتا جو جان بوجھ کر فتنہ وفساد اور تصادم پیدا کرتے ہیں ان میں بہت سے ہولناک سرگرمیاں اختیار کرتے ہیں۔ مثلاً قتل و غارت گری، مملکت کے خلاف

بغاوت کرنے ، اور ذاتی مفادات کی خاطر جان بوجھ کر نظم و ضبط میں خلل ڈالتے ہیں ۔

یہ ذاتی مفادات ، املاک کا حصول ، یا کسی ذاتی انتقام یا دشمنی کی تسکین و تکمیل یا مذہبی تعصب ہوتے ہیں ۔ ایسی ہولناک صورت حال پر قابو پانے اور ان کے خطرہ سے مملکت کو بچانے کے لئے بہادر لوگوں کی ایک فوج کی شکل میں دفاعی قوت کا جمع کرنا لازمی ہے ۔ ایک فوج کے نقل و حرکت ایک طے شدہ دستور کے تحت ہوگی جس کو لوگ پسند کرتے ہیں یا خطرہ کے وقت ، فوج کی نقل و حرکت ہونی چاہیئے ۔ یا اس کی نقل و حرکت ارباب حل وعقد کی مرضی پر ہوگی جو فن جنگ سے بخوبی واقف ہوں اور لوگوں کی رضامندانہ فرمان برداری کی کمان کر سکیں ۔ شاہ ولی اللہ نے اس ادارہ کو جہاد کے نام سے موسوم کیا ہے ۔

عوامی فلاح اور تعمیرات عامہ:

ایک متمدن اور ترقی یافتہ مملکت ایک ایسے ادارے کی ضرورت محسوس کرتی ہے جو اس کے لوگوں کی فلاح و بہبود کی نگرانی کرے ۔ وہ ان امور کی انجام دہی کے وسائل و ذرائع پیدا کرتی ہے جنہیں لوگ خود انجام نہیں دے سکتے ۔

دوسرے الفاظ میں یہ ادارہ پبلک عمارتیں اور تعمیرات عامہ کے امور انجام دیتا ہے حکومت کا یہ ادارہ نقابہ ہوتا ہے اور ادارہ کا سربراہ نقیب والی کہلاتا ہے ۔

مملکت کے لوگوں کی تعلیم:

مملکت کی ضروریات کا تقاضا ہوتا ہے کہ اس کے لوگ بہتر طور پر ہدایت یافتہ ہوں اور حاصل کرنے کے شعبوں میں تاکہ وہ معاشرتی ارتقائی کے دوسابقہ مرحلوں کی معاشرتی ترقی پیش نظر ، بلند معیار زندگی حاصل کر سکیں ۔

مملکت کی حکومت کا فریضہ:

ایک مکمل مملکت مدینۃ التامہ، وہ ہے جو متذکرہ بالا ہر ضرورت کی تکمیل کے لئے ایک موثر طریقہ سنت کی شکل میں ایک معیار رکھتی ہے۔ جیسا کہ بالعموم یہ ہوتا ہے کہ جب سے ناموافق طبائع اور متصادم مفادات کے لوگ آپس میں ملتے ہیں تب ایک مسلمہ معیار مروجہ روایات کے مطابق کردار حکومت کی طرز کی تشریح و ترجمانی میں اختلاف آراء یقینی ہے لہذا یہ بہتر ہوگا کہ یکسانیت واتحاد کے کسی بھی خطرہ کو دور کرنے کے لئے ہر شعبہ کے فرائض امور کسی ایک شخص یا افسر کے سپرد کردیئے جائیں جو اس شخص کے ماتحت ہونا چاہیئے جو متعدد شعبوں کی کارکردگی کا ذمہ دار ہوتا ہے اور تمام مملکت کا لازمی سربراہ ہوتا ہے۔

ارتفاق چہارم

انسانی معاشرہ، معاشرتی ارتقاء کے چوتھے مرحلہ میں

بین الاقوامی مملکت:

ارتقاء کے دوران، معاشرتی ارتقاء کے دو ترقی یافتہ مرحلوں میں جو مملکت وجود میں آتی ہے، وہ خود کو ایک وحدت میں تبدیل کرلیتی ہے جو حقیقتاً اس قسم کی بہت سی وحدتوں کے درمیان اس وقت ایک وحدت ہوتی ہے جب کسی قوم کی آبادی اور تمام انسانیت کو زیرغور لایا جاتا ہے۔ مملکت کے انفرادی ارکان کی طرح ہر مملکت ایک طرح، ایک بڑی مملکت کی رکن ہوتی ہے جو کثیرالتعداد انسانیت سے قائم ہوتی ہے اور یہ تمام دنیا سے تعلق رکھتی ہے اور ان میں سے بعض جزوی مملکتیں دوسری مملکتوں سے متصادم ہوجاتی ہے اور اپنی مخالف مملکتوں سے داخلی امن اور اتحاد کو خطرہ میں ڈال دیتی ہیں۔

واقعات کی یہ نوعیت ایک زیادہ صاف تر نظام کی ضرورت پیدا کرتی ہے جو تمام دیگر مملکتوں کو ایک

دوسرے کے ساتھ پرامن رہنے کے لئے قابو میں رکھتی ہے اور وہ اتحاد انسانیت ''الانسان الکبیر'' میں مداخلت نہ کرسکیں اس ضرورت کی تکمیل ایک اعلیٰ خلافت کی شکل یا ایک بین الاقوامی حکومت سے پوری ہو جاتی ہے جسے اقوام اس وقت نافذ کر لیتی ہیں کہ جب وہ اپنے ارتقاء کے دوران معاشرتی ارتقاء کے چوتھے مرحلے کی طرف پیش قدمی کرتی ہیں اس مرحلہ کو شاہ ولی اللہ ارتفاق چہارم کہا ہے۔ جس کے بغیر اقوام کے درمیان حقیقی امن وسکون اور انفرادی مملکتوں کی حفاظت ممکن نہیں اور وہ خلافت کے بغیر، ہمیشہ نازک حالات سے دوچار رہتیں۔

مختلف سطوح:

اگرچہ یہ چار مرحلے ہیں جن سے ایک معاشرہ ترقی پذیر ہوتا ہے تاہم یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر معاشرہ ان میں سے ہر مرحلہ سے گذرا ہو، بعض معاشرے دوسروں سے زیادہ ترقی یافتہ ہوتے ہیں اور اعلیٰ تر ارتفاق کو پہنچتے ہیں اور بعض اپنی ترقی کے بعد زوال پذیر ہو جاتے ہیں اس لئے ہر معاشرہ کو اس کی موجودہ سطح سے جانچنا چاہیئے اور یہ دیکھنا چاہیئے کہ وہ ارتفاق کی پہلی دوسری اور تیسری غرض کس منزل میں ہے یا وہ جزوی طور پر دوسری منزل میں ہے۔

☆ ☆ ☆

باب دوم

فصل چہارم

سیاسی انتشار اور حکومت مغلیہ کے دور احتضار میں شاہ صاحب کا مجاہدانہ وقائدانہ کردار

تین نوخیز جنگجو طاقتیں:

بارہویں صدی ہجری کا ہندوستان سیاسی انتظامی اور اخلاقی حیثیت سے انحطاط وپستی، بدنظمی وطوائف الملوکی اور انتشار اور اضطراب کے اس نقطہ پر پہنچ گیا تھا جس کو کسی معاشرہ ونظام کا دم واپسیں یا حالت احتضار سے تعبیر کیا جاسکتا ہے، مغلیہ سلطنت ایک حکمراں مسلمان خاندان کے طویل ترین اور قوی ترین اقتدار کی علامت (Symbol) بن کر رہ گئی تھی جس کے پیچھے نہ کوئی طاقت تھی، نہ سلیقہ، نہ حوصلہ۔

بظاہر اس وقت سلطنت مغلیہ ہی نہیں پورے ملک کی قسمت کا فیصلہ کرنے والی تین نوخیز جنگجو طاقتیں تھیں علی الترتیب مرہٹہ، سکھ، جاٹ۔

مرہٹے:

مرہٹے جن کی سرگرمیاں پہلے دکن میں محدود تھیں، اور جن کی حیثیت ایک منظم قانونی حکومت کے خلاف ایک، احتجاجی گروہ (Agitators) اور چھاپہ مار (Guerrilla) طاقت سے زیادہ نہ تھی، مرکزی حکومت کی روز افزوں کمزوری، طالع آزما سرداروں کی باہمی زور آزمائی اور امرائے سلطنت کی کوتاہ نظری کی وجہ سے (جو اپنے حریف کو زک دینے یا زچ کرنے کی نیت سے مرہٹوں سے کام لیتے رہتے تھے) ایک ایسی ہندگیر

طاقت بن گئے جو دہلی کے تخت پر قبضہ کرنے اور اس خلا کو پر کرنے کا خواب دیکھنے لگے جو مغلوں کی فوجی طاقت کی کمزوری اور ان کی انتظامی نااہلی نے پیدا کر دیا تھا۔

۱۱۷۰ھ میں ملہار راؤ ہولکر اور رگھوناتھ راؤ نے شمالی ہند پر اپنا تسلط قائم کرنے کا فیصلہ کیا، اور جاٹوں کی مدد سے ۱۱۷۱ھ کو دہلی پر حملہ کر دیا، نجیب الدولہ کو مجبور ہو کر صلح کرنی پڑی، اس کے بعد انہوں نے پنجاب کا رخ کیا جو اس اہم جنگی علاقہ کا دروازہ تھا، جس سے فاتح ہندوستان میں داخل ہوتے رہے، اور جو ابھی تک کسی غیر اسلامی طاقت کے زیر نگیں نہیں رہا تھا، انہوں نے اپریل ۱۷۵۸ء میں لاہور پر قبضہ کر لیا، اور آدینہ بیگ کو اپنی طرف سے پنجاب کا حاکم مقرر کیا، آدینہ بیگ کے مرنے پر انہوں نے سبا جی سندھیا کو پنجاب کا حاکم مقرر کیا۔ (۲۲)

مرہٹوں کی ہنگامہ آرائیوں سے ہندو مسلمان سبھی متاثر ہوتے تھے، دیہاتوں کو بے دردی سے لوٹنا، لوگوں کے ہاتھ ناک کان کاٹ لینا کوئی غیر معمولی بات نہ تھی، حملہ آوروں کی نفسانی ہوس کا شکار بلا تفریق مذہب وملت عورتوں کا پورا طبقہ بنتا تھا، اس میں بھی ہر طرح کے حدود سے تجاوز کر کے بہیمانہ و وحشیانہ عمل کا مظاہرہ کیا جاتا رہا۔

بنگال کے مشہور شاعر گنگا رام نے بنگال پر ان کے حملوں پر تبصرہ کرتے ہوئے ان تاثرات کا اظہار کیا ہے۔ پرتگالی مصنفوں نے بھی مرہٹوں کی اخلاق سوز حرکتوں پر اپنے استعجاب کا اظہار کیا ہے، مرہٹوں کے اقتدار کا عوام پر بڑا اقتصادی اثر پڑا۔

مولانا غلام علی آزاد بلگرامی کے بقول ان کی نیت یہ ہے کہ جہاں تک ان کی دسترس ہو، خلق خدا کے معاشی ذرائع مسدود کر کے اپنے قبضہ میں کر لیں، مرہٹے مغلیہ سلطنت کے ان دور افتادہ علاقوں سے چندے وصول کرتے تھے، جو ان کے رحم وکرم پر تھے۔

سکھ:

سکھ پنجاب کا ایک مذہبی گروہ تھا جس کی بنیاد پندرھویں صدی عیسوی میں گرو بابا نانک کے ہاتھوں پڑھی، وہ نفس کشی، اخلاقیات اور سچائی کی تعلیم دیتے تھے، سیر المتاخرین کے بیان کے مطابق گرو بابا نانک نے فارسی اور دینیات کی تعلیم ایک بزرگ سید حسن سے حاصل کی تھی، اور ان کی گرو بابا نانک پر خصوصی نظر تھی، تیسرے گرو امرداس نے سکھوں کی مذہبی اور معاشرتی تنظیم کے سلسلہ میں سب سے پہلے قدم اٹھایا، اکبر بادشاہ ان کے مکان پر ان سے ملنے گیا اور انھیں ایک بڑی جاگیر عطا کی، انھوں نے اخلاقیات کی تعلیم میں گرو نانک کی تعلیمات کی روح کو قائم رکھا، اور ہندوؤں کی اوہام پرستی خصوصاً رسم ستی کی کھلم کھلا مخالفت کی اور نکاح بیوگان کے احکام جاری کیے، اکبر نے ۱۵۷۷ء میں انہیں ایک وسیع قطعہ اراضی عنایت کیا، انھیں کے زمانہ میں امرتسر کے مذہبی مرکز کی بنیاد پڑھی، اس طرح سکھوں کی قومی زندگی کے لئے ایک روحانی مرکز تیار ہو گیا۔

۱۵۱۸ء میں گرو ارجن اپنے باپ کے جانشین ہوئے، انھوں نے سکھوں کو ایک فرقہ کی حیثیت سے منظم کرنے کی مزید کوشش کی، اور گرنتھ کی تدوین عمل میں لائے، گرو ارجن نے اپنے آپ کو سچے بادشاہ کے نام سے ملقب کیا جو ان کے سیاسی اقتدار کی ہوس کا پتہ دیتا ہے، جہانگیر کے حکم سے گرو کو لاہور میں قید کر دیا گیا، اس لئے کہ انھوں نے اس کے باغی شہزادہ خسرو کی مالی امداد کی تھی، وہاں ان کو قتل کر دیا گیا، ان کے جانشین ہرگووند نے علانیہ عملی مدافعت و مزاحمت کا طرز عمل اختیار کیا جس سے سکھوں کی فوجی زندگی کا آغاز ہوا، انھوں نے جلدی شاہانہ منصب اختیار کر لیا، وہ شہنشاہ جہانگیر کے خلاف دشمنی کے جذبات رکھتے تھے، اور اپنے باپ کی موت کا اس کو ذمہ دار سمجھتے تھے، انھوں نے ہرگووند پور کا ایک مضبوط قلعہ بنایا جہاں سے نکل کر وہ میدانی علاقوں پر تاخت کرتے تھے، جہانگیر نے انھیں گوالیار کے قلعہ میں نظر بند کر دیا، لیکن کچھ عرصہ کے بعد رہا کر دیا، اور ان کا بڑا اعزاز کیا، شاہجہاں کی تخت نشینی کے فوراً بعد انھوں نے کھلم کھلا سرکشی اختیار کر لی اور

حکومت کے خلاف علم بغاوت بلند کیا، اخیر میں وہ پہاڑیوں کی طرف نکل گئے اور ۱۶۴۵ء میں انتقال کیا۔

۱۶۶۴ء میں اورنگ زیب کے زمانہ میں ہرگووند کے بیٹے تیغ بہادر گرو منتخب ہوئے، انھوں نے مغروروں اور قانون شکنوں کو پناہ دی، ان کا اقتدار ملک کی ترقی میں حائل ہوا، شاہی دستوں نے ان پر چڑھائی کی اور انھیں قید کر کے دہلی لے آئے جہاں انھیں اورنگ زیب کے حکم سے ۱۶۷۵ء میں سزائے موت دی گئی ان کی موت کے بعد ان کے بیٹے گووند رائے گرو تسلیم کیا گیا، انھوں نے سکھوں میں جمہوری

مساوات کے جذبات کو ابھارا، اور انھیں ایک قوم کی صورت میں منظم کرنے کا کام کیا، ورنگ زیب کے انتقال تک وہ زندہ رہے، اورنگ زیب کے جانشین بہادر شاہ نے گرو کے ساتھ مفاہمت کی کوشش کی اور انھیں دکن کی فوجی کمان عطا کر دی، لیکن انھوں نے اکتوبر ۱۷۰۸ء میں ایک افغان ملازم کے ہاتھوں زخمی ہوتے ہوئے انتقال کیا، انھوں نے کسی کو اپنا جانشین نامزد نہیں کیا اور اپنے پیروؤں کو حکم دیا کہ گرنتھ کو وہ اپنا آئندہ گرو اور خدا کو اپنا واحد محافظ تصور کریں۔

جاٹ:

جاٹ مرہٹوں کی طرح نہ کوئی منظم فرقہ تھے نہ سکھوں کی طرح کوئی مذہبی گروہ، لیکن مغل سلطنت کی کمزوری، سیاسی انتشار اور عام آبادی کے عدم تحفظ کے احساس نے ان میں ایک طرح کی سبھی و جارحانہ تنظیم پیدا کر دی تھی، اور وہ ایک تخریبی اور انتشار انگیز طاقت بن گئے تھے، جس کا مقصد قیام سلطنت اور کوئی سیاسی انقلاب نہ تھا، محض بگڑے ہوئے حالات سے عارضی فائدہ اٹھانا، استحصال اور اقتصادی مقاصد کی تکمیل تھی۔

شاہ ولی اللہ دہلوی فرماتے ہیں:

> ''جمنا کے جنوبی علاقہ میں آگرہ سے دہلی تک جاٹ آباد تھے ان کی
> مشرقی سرحد چنبل تھی، اس علاقہ میں ان کی ہنگامہ آرائی کا یہ عالم تھا کہ

> مرکزی حکومت کا ناک میں دم آ گیا تھا بقول سرکار دہلی اور آگرہ کی سڑک پر ایسا کانٹا برداشت نہیں کیا جا سکتا تھا دہلی سے آگرہ نقل و حرکت میں بڑی احتیاط برتنی پڑتی تھی، دکن کو اجمیر ہوتی ہوئی جو فوجیں جاتی تھیں، وہ اسی علاقہ سے گزرتی تھیں''۔ (۲۴)

بہادر شاہ کے زمانہ میں اس سڑک کی مخدوش حالت کا اندازہ دستور الانشاء کے مطالعہ سے ہوتا ہے ۱۷۱۲ء میں جب ڈچ نمائندے اس علاقہ سے گزرے تو انہوں نے بھی ان ہنگاموں کو دیکھا۔

جان سرمن (John Surman) جو ۱۷۱۵ء میں یہاں سے گزرا تھا، اس نے جاٹوں کی امن سوز حرکتوں کا ذکر اپنی ڈائری میں کیا ہے:۔

> شاہ جہاں کے عہد میں جاٹوں نے ایک مرتبہ زبردست شورش برپا کی تھی، ۱۶۳۷ء میں متھرا کا فوجدار مرشد قلی خاں ان سے لڑتا ہوا مارا گیا تھا۔
>
> اورنگ زیب کی شمالی ہندوستان سے غیر حاضری کا فائدہ اٹھاتے ہوئے جاٹ لیڈروں راجہ رام اور رام چہرہ نے اٹھایا راجہ رام کی قانون شکن حرکتوں کو آگرہ کا گورنر خانِ جہاں بھی نہ روک سکا، جاٹوں نے راستے بند کر دیئے، اور بہت سے علاقوں کو ویران کر دیا، اکبر کے مقبرہ کو لوٹنے کے لئے سکندرہ کا رخ کیا لیکن میر ابوالفضل نے جو وہاں کا فوجدار تھا، بہادری سے مقابلہ کیا اور باغی کو آگے نہ بڑھنے دیا، راجہ رام نے مشہور تورانی افسر اصغرخان کا سامان لوٹ لیا، اصغر خان جاٹوں سے لڑتا ہوا مارا گیا۔ (۲۵)

آگرہ کے قلعہ میں جاٹوں کا تسلط تھا، دہلی سے سومیل پر جاٹوں کا عمل دخل تھا، راجہ سورج مل بڑا ہوشیار صف آرائی میں ماہر اور ملک ستانی میں کارواں تھا، اس نے آگرہ سے مرہٹہ سردار کو نکال دیا، اور میوات پر قبضہ کرلیا، چار قلعے نہایت مستحکم بنائے، اس نے دلی کی سلطنت سے ایسی درخواستیں کرنی شروع کیں، جن سے سلطنت کا نام بھی نہ رہے، نجیب الدولہ نے اپنی حسن تدبیر اور روہیلوں کی مدد سے جاٹوں پر فتح حاصل کی، راجہ سورج مل نجیب الدولہ کے مقابلہ میں دہلی کے قریب مارا گیا، اس کے بعد جاٹوں کی ریاست میں بہت سے جھگڑے برپا ہوئے، سورج مل کے دو بیٹے مارے گئے تیسرا بیٹا رنجیت سنگھ راجہ ہوا، اس کے عہد میں جاٹوں کی ریاست کا بڑا عروج ہوا، جس ملک پر وہ فرماں روائی کرتے تھے، اس کے شمال مغرب میں الور اور جنوب میں آگرہ تھا، اس کی آمدنی دو کروڑ روپے کی تھی، ساٹھ ہزار فوج ان کے پاس تھی''۔ (۲۶)

دہلی کی حالت :

مرہٹوں، سکھوں اور جاٹوں کے حملوں سے جو گویا روزانہ کا معمول بن گیا تھا اور حفاظت و دفاع کی ہر قسم کی طاقت اور اہلیت کے فقدان سے دہلی ایک ایسا پر ثمر اور غیر محفوظ درخت بن گیا تھا، جس پر ہر طرف سے غول بیابانی حملہ کرتا اور اس کو برگ و بار سے محروم کردیتا، دہلی کے باشندے جو ساری سلطنت میں نہ صرف عزت واحترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے، بلکہ علم زبان، تہذیب، شرافت اور عادات و اطوار میں بھی معیار سمجھے جاتے تھے، حملہ آوروں کے لئے خوان بن گئے تھے۔

اس عہد کے علماء ومشائخ کے (جن کا شعار انقطاع الی اللہ اور رضا بالقضاء ہے) خطوط سے بھی جو انھوں نے اپنے معتقدین واحباب کو لکھے ہیں اس بدامنی، بے اطمینانی اور بے یقینی کا اندازہ ہوتا ہے، یہاں پر صرف حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے نامور معاصر اور سلسلہ نقشبندیہ مجددیہ کے گل سرسبد حضرت مرزا مظہر جان جاناں کے خطوط کے چند اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں:

ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:۔

از تشویشات ہر روزہ دہلی تنگ آمدہ ام۔

دہلی کے روزمرہ کے ہنگاموں اور بے اطمینانی سے تنگ آ گیا ہوں۔

ایک دوسرے مکتوب میں فرماتے ہیں:

از ہر طرف فتنہ قصد دہلی می کند۔ ہر طرف سے فتنہ دہلی کا رخ کرتا ہے۔

ایک اور مکتوب میں دارالسلطنت کی بدامنی اور اہل شہر کی پریشان حالی اور بے اطمینانی کا تذکرہ فرماتے ہوئے کہتے ہیں:

احوال مردم شہر از بیماری ناامنی وناامیدی تاکجا نویسد خدا ازیں بلدہ مورد غضب الٰہی برآرد کہ نسقے در امور سلطنت نماند خدا خیر کند۔ (۲۷)

عام بیماری اور بدامنی سے اہل شہر کی پریشانی کا حال کہاں تک لکھا جائے، خدا اس شہر سے جو غضب الٰہی کا مورد ہو رہا ہے باہر نکالے کہ امور سلطنت میں کوئی نظم باقی نہیں رہا، خدا اپنا فضل فرمائے۔

حملۂ نادری:

شاہ صاحب ۱۱۴۵ھ میں حجاز سے دلی پہنچے تھے، پانچ سال ہی گزرے تھے کہ ۱۱۵۱ھ میں نادر شاہ کا دلی پر وہ حملہ ہوا، جس نے سلطنت مغلیہ کی رہی سہی چولیں ہلا دیں اور دلی کی خاک اڑا دی، اس حملہ نے دلی کے غیرت مند شہریوں اور شریف خاندانوں کے دل و دماغ پر وہ اثر ڈالا کہ وہ زندگی سے بیزار و شرمسار اور اپنے ہاتھوں اپنی موت کا سامان کرنے کے لئے تیار تھے، شاہ عبد العزیز صاحب کے ملفوظات میں ہے کہ آپ نے اس کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ اس قتل عام اور عزت و ناموس کی بربادی کے موقعہ پر پرانی دلی کے شرفاء پرانے راجپوتوں کے دستور کے مطابق جوہر کا قطعی طور پر ارادہ کر چکے تھے، اس موقعہ پر والد ماجد (شاہ ولی اللہ صاحب نے) مسلمانوں کو واقعۂ کربلا، اور سیدنا حسینؓ کے مصائب یاد دلا کر اس ارادہ سے باز رکھا کہ انھوں نے ان لرزہ خیز اور ناقابل تصور مصائب کے باوجود صبر و رضا کی راہ اختیار کی اور حاکم بدہن، خویش کشی اور خودکشی کا ارادہ نہیں کیا۔

سیاسی انتشار اور حکومت مغلیہ کے دور احتضار میں مجاہدانہ وقائدانہ کردار

صرف یہی نہیں کہ شاہ صاحب مصائب وحوادث کے اس گرد وغبار، بلکہ ان کی موسلادھار بارش کے درمیان زیر آسمان بیٹھے ہوئے تصنیف وتحقیق اور درس وتعلیم میں اس طرح منہمک تھے کہ نہ ہوا کے تیز جھونکے سے زیر تسوید کتاب کا کوئی ورق الٹتا تھا، نہ بارش کا کوئی قطرہ اس کے کسی نقش کو مٹاتا تھا، بلکہ وہ ان حالات کو تبدیل کرنے، اس ملک میں مسلمانوں کا ایک اقتدار کو دوبارہ وجود میں لانے اور ایک فرض شناس، حقیقت پسند، احکام شریعت پر عمل کرنے والی، عام شہریوں کی عزت وناموس کی محافظ، انتشار انگیز طاقتوں کو ختم کرنے والی،

مستحکم وخوش حال سلطنت کے قیام کے لئے بھی ساعی اور سرگرم تھے اور اس سلسلہ میں بھی وہ ایسا قائدانہ کردار ادا کررہے تھے، جو بڑے سے بڑا سیاسی مبصر ادا کرسکتا تھا جس کو تصنیف وتالیف اور درس وتحقیق سے ادنی مناسبت اور ذرہ برابر فرصت نہ ہو۔

مجددین اور داعیانِ اسلام اور محققین ومصنفین میں اگر کسی کی زندگی میں یہ مماثلت نظر آتی ہے تو شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کی زندگی میں جنھوں نے ۷۰۰ھ میں شام کے مسلمانوں کو خون آشام تاتاریوں کا مقابلہ کرنے کی دعوت دی اور ان کے اکھڑتے ہوئے قدم جمائے، پھر جب سلطان مصر محمد بن قلاوون نے شام آکر تاتاریوں سے جنگ کرنے کا ارادہ ملتوی کیا اور اہل شام میں سخت انتشار اور اضطراب پیدا ہوا تو وہ خود مصر گئے اور سلطان کو ملک شام کی حفاظت اور تاتاریوں سے مقابلہ پر آمادہ کیا اور سلطان کے ساتھ جنگ میں شرکت کی اور تاتاری کو ایسی شکست فاش ہوئی جس کی مثال ان کی گزشتہ تاریخ میں ملنی مشکل ہے۔

شاہ صاحب نے بھی اپنے علمی مشاغل اور احیاء وتجدید کی مساعی کے ساتھ ایسے سیاسی تدبر، اور ایسی ذہانت اور بلند نگاہی سے کام لیا کہ اگر مغلوں میں کچھ بھی صلاحیت یا امرائے سلطنت میں ہمت اور سیاسی شعور ہوتا تو ہندوستان نہ صرف تنگ نظر اور انتشار پسند مقامی عناصر کی آرزوؤں سے محفوظ ہو جاتا، بلکہ انگریزوں کے اس تسلط سے بھی محفوظ ہو جاتا، جس نے انیسویں صدی کے وسط میں ہندوستان کو کمزور اور میدان کو خالی پاکر اپنے قدم جمالئے اور اس کو برطانوی سلطنت میں نہ صرف شامل کیا، بلکہ اس سے وہ قوت اور وسائل حاصل کئے جس نے دنیا کی پوری سیاست پر اثر ڈالا اور مسلم وعرب ممالک پر اپنا اقتدار جمایا۔

شاہ صاحب کی اس جمعیت خاطر ہمت واستقامت، بلند نگاہی واولوالعزمی اور اس کے مقابلے میں ملک کی زلزلہ انگیز فضاء کو دیکھتے ہوئے (جس میں نہ کسی تجدید اور عمیق ومسلسل علمی شغولیت کی گنجائش معلوم ہوتی ہے، نہ کسی انقلاب حال اور عروج بعد زوال کی امید) اقبال کا یہ شعر حقیقت حال کی سچی تصویر معلوم ہوتا ہے۔

ہوا ہے گو تند وتیز لیکن چراغ اپنا جلا رہا ہے

وہ مرد درویش جس کو حق نے دیئے ہیں اندازِ خسروانہ (۲۸)

پروفیسر نظامی لکھتے ہیں کہ:

جنگ پانی پت کے بعد احمد شاہ ابدالی نے شاہ عالم کو دہلی بلانے کی بے حد کوشش کی اور اپنا آدمی بھیجا جب نہ آیا تو احمد شاہ ابدالی نے شاہ عالم کی والدہ نواب زینت محل سے خط لکھوایا احمد شاہ نے شاہ عالم کو بلانے کی کوشش اس لئے کی تھی کہ وہ انگریزوں کے اثر سے نکل آئے اور دہلی آکر احمد شاہ کی موجودگی میں اپنی طاقت کا استحکام کرے۔ (۲۹)

شاہ صاحب فرماتے ہیں:

''مرہٹوں، جاٹوں، سکھوں کی تحریک میں اتنی وسعت اور ہمہ گیری نہ تھی کہ وہ ہندوستان کی مرکزیت ووحدت کو برقرار رکھ سکنے کی تدبیر سوچتی۔ شاہ صاحب اپنے مجوزہ نظام میں اکبر، جہانگیر، شاہجہاں اور اورنگ زیب کے زمانہ کی مرکزیت اور سلطنت ہند کے اقتدارِ اعلیٰ کو بحال دیکھنا چاہتے تھے لیکن اس طرح سے کہ مطلق العنان بادشاہوں کے بجائے انصاف کی حکومت ہو۔

اگر سلطنت میں تھوڑی سی بھی جان ہوتی تو وہ جنگ پانی پت کے نتائج سے فائدہ اٹھا کر اپنے اقتدار کو ہندوستان میں پھر کچھ صدیوں کے لئے قائم کر سکتی تھی لیکن حقیقت یہ ہے کہ مغلیہ سلطنت اس وقت بے روح جسم کی مانند تھی جنگ پانی پت کا اصلی فائدہ فاتحین جنگ پانی پت نے اٹھایا۔

شاہ عالم نے اپنی پست ہمتی اور کوتاہ نظری سے یہ زریں موقع کھو دیا اور ساری کوششوں اور خود اپنی والدہ زینت محل کے مشفقانہ خط کے باوجود پورے دس برس کے بعد ۱۷۷۱ء کے آخر میں ۲۵ دسمبر ۱۷۷۱ء کو قلعہ میں داخل ہوا اسکے بعد اسکے اور اسکے جانشینوں کے ساتھ جو کچھ پیش آیا وہ تاریخ میں تفصیل کے ساتھ درج ہے، اس کا نقطۂ عروج ۱۸۵۷ء کا انقلاب سلطنت بلکہ انتزاع سلطنت ہے جو انگریزوں کے ہاتھ پیش آیا، جنہوں نے اپنی دانشمندی اور سیاسی ذہانت سے ہندوستان پر تسلط کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔

شاہ صاحب کے بعد ان کے صحیح جانشین اور علم و بصیرت اور غیرت و حمیت دینی کے وارث ان کے فرزند ارجمند سراج الہند حضرت شاہ عبدالعزیز نے اپنے والد نامدار کے شروع کئے ہوئے کام کو نہ صرف جاری رکھا بلکہ اس کی توسیع و تکمیل کی کوشش کی اور سیاسی حالات کی تبدیلی کے ساتھ اپنی توجہ اس وقت کے سیاسی میدان کے اصل حریف اور حقیقی طاقت انگریزی اقتدار کی طرف موڑ دی، جس نے اب خطرہ سے بڑھ کر جس کے دیکھنے کیلئے سیاسی بصیرت درکار ہوتی ہے، واقعہ کی شکل اختیار کر لی تھی جس کے دیکھنے کے لئے بصارت بھی کافی ہوتی ہے۔ (۳۰)

شاہ عبدالعزیز کے بعد انھیں کے دانش گاہ کے دو تربیت یافتہ صاحب عزیمت داعی و مصلح حضرت سید احمد شہید اور شاہ اسماعیل شہید نے حضرت شاہ صاحب کے سیاسی نقشہ میں جو انھوں نے نظری طور پر حجۃ اللہ البالغہ اور ازالۃ الخفاء کے صفحات اور تفہیمات الٰہیہ میں پیش کیا تھا رنگ بھرنے کی کوشش کی اور اس کو خلافت علی منہاج النبوۃ کی اساس پر قائم کرنے کیلئے اپنی جان کی بازی لگا دی۔

انھوں نے حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کی تعلیمات اور ان کی دی ہوئی روشنی سے کتنا فائدہ اٹھایا ان کے عزائم کتنے بلند ان کی نگاہ کتنی دور بین ان کا قلب کتنا وسیع اور فراخ تھا، وہ پنجاب کے مسلمانوں کو سکھوں کی فوجی حکومت کے استیصال و استحصال کی اسی طرح کی فوری مصیبت سے بچانے کے بعد جس طرح شاہ ولی اللہ

صاحب نے مرہٹوں اور جاٹوں کے روزمرہ کے قتل و غارت گری سے اپنے وقت کے ماحول و معاشرہ کو بچانے کی کوشش کی تھی اور انگریزوں کو جن کو وہ بیگانگان بعید الوطن و تاجران متاع فروش کے الفاظ سے یاد کرتے ہیں نکالنے کے بعد ہندوستان کو وہ کس طرح آزاد کرانا اور اسلام کے عدل و مساوات کے اصول پر اس کا نظم و نسق قائم کرنا چاہتے تھے، اس کا اندازہ ان کے مکاتیب سے ہوگا جو انھوں نے سلاطین وقت، امراء نامدار، صاحب حمیت مسلمانوں اور ہوشمند والیان ریاست کو لکھے ہیں۔

اس طرح اس سلسلے کے اہل دعوت و عزیمت کو یہ کہنے کا حق ہے کہ:

آغشتہ ایم ہر سر خارے بخون دل

قانون باغبانی صحرا نوشتہ ایم (۳۱)



باب دوم حوالہ جات

نمبر	کتاب	مصنف / حوالہ	مقام	ناشر	سنہ	صفحہ
۱۔	حجۃ اللہ البالغہ	شاہ ولی اللہ	لاہور	المکتبہ السلفیہ	۱۲۸۶ھ	ص:۴۹ جلد اول
۲۔	البدور البازغہ	شاہ ولی اللہ	لاہور	سندھ ساگر اکیڈمی	۱۹۷۵ء	ص:۲۵
۳۔	القرآن الکریم	۲۲:۳۰				
۴۔	القرآن الکریم	۲۷:۳۵				
۵۔	القرآن الکریم	۲۵:۷				
۶۔	القرآن الکریم	۲۵، ۲۴، ۲۳، ۲۳				
۷۔	القرآن الکریم	۱۷۹:۷				
۸۔	القرآن الکریم	۴۳:۴۹				
۹۔	مشکوۃ شریف	ابوعبداللہ	کراچی	قدیمی کتب خانہ	۱۹۸۶ء	ص:۲۲۵
۱۰۔	القرآن الکریم	۲۸:۳۵				
۱۱۔	القرآن	۳۹:۳۹				
۱۲۔	القرآن الکریم	۱۷:۱۳				
۱۳۔	القرآن الکریم	۷۹:۲				
۱۴۔	تفہیمات الہیہ	شاہ ولی اللہ	بجنور		۱۳۵۵ھ	ص:۸۷ جلد اول
۱۵۔	حجۃ اللہ البالغہ	محولا بالا			باب اول	ص:۸۳ جلد اول
۱۶۔	حجۃ اللہ البالغہ	محولا بالا				ص:۸۴ جلد اول
۱۷۔	حجۃ اللہ البالغہ	محولا بالا				ص:[illegible] جلد اول
۱۸۔	حجۃ اللہ البالغہ	محولا بالا				ص:۸۱ جلد اول
۱۹۔	حجۃ اللہ البالغہ	محولا بالا				ص:۲۱۹ جلد اول
۲۰۔	حجۃ اللہ البالغہ	محولا بالا				ص:۴۰
۲۱۔	حجۃ اللہ البالغہ	محولا بالا				ص:۹۵
۲۲۔	شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات	خلیق احمد نظامی	لاہور	ادارہ اسلامیات	۱۹۷۸ء	ص:۲۲۳
۲۳۔	تاریخ دعوت عزیمت	ابوالحسن ندوی	کراچی	مجلس نشریات اسلام	۱۹۸۳ء	ص:۲۸۳ جلد پنجم

۲۴۔ شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات محولا بالہ ص ۱۷۴

۲۵۔ شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات محولا بالہ ص ۱۷۵

۲۶۔ تاریخ دعوت عزیمت محولا بالہ ص ۲۸۹ جلد پنجم

۲۷۔ تاریخ دعوت عزیمت محولا بالہ ص:۲۹۰ جلد پنجم

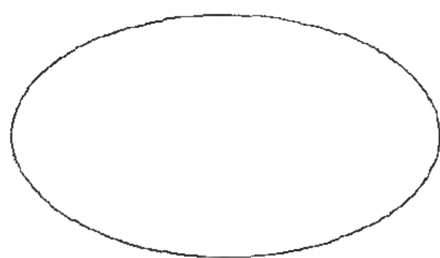
۲۸۔ تاریخ دعوت عزیمت محولا بالہ ص:۲۹۵ جلد پنجم

۲۹۔ تاریخ دعوت عزیمت محولا بالہ ص:۳۲۰ جلد پنجم

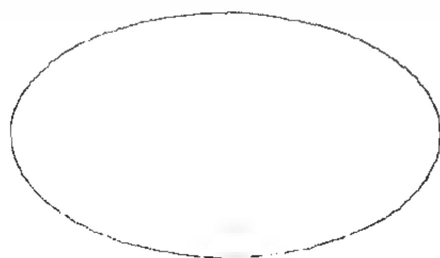
۳۰۔ تاریخ دعوت عزیمت محولا بالہ ص ۳۲۱ جلد پنجم

۳۱۔ تاریخ دعوت عزیمت محولا بالہ ص ۳۲۲ جلد پنجم





باب سوم



باب سوم

فصل اوّل

شاہ ولی اللہ کا عہد (ایک جائزہ)

حضرت شاہ ولی اللہ ۱۱۱۴ء میں پیدا ہوئے یعنی سلطان اورنگ زیب عالمگیر کی وفات سے چار برس قبل عالمگیر، اس براعظم کا، اس ملک کی معلوم و محفوظ تاریخ کی روشنی میں اشوک کے بعد (اگر اس کی سلطنت کی وسعت و عظمت سے متعلق بیانات صحیح اور قابل اعتماد ہیں) ہندوستان کا سب سے بڑا فرماں روا اور اس کی سلطنت ہندوستان میں قائم ہونے والی سلطنتوں میں سب سے زیادہ وسیع تھی۔

''قدیم زمانے سے انگریزوں کے عروج تک ہندوستان میں اتنی طویل و عریض حکومت کبھی قائم نہیں ہوئی تھی'' (۱)

اورنگ زیب کی وفات کے بعد اس کے نااہل جانشین تخت نشین ہوئے جو اورنگ زیب کے خیالات، دینی حمیت اور احیائے دین کے جذبات سے عاری تھے۔ یہ جانشین خود غرض، جاہ پسند اور امور سلطنت سے کلی طور پر عاری تھے۔

چنانچہ یہ دہلی سلطنت ہی نہیں، ملت اسلامیہ ہی نہیں، ہندوستان کی بدقسمتی تھی کہ اس کے تخت سلطنت پر یکے بعد دیگرے کم عمر اور نااہل حکمران آتے رہے اور تاریخ کی بوالعجبی اور خدا کی شان بے نیازی و کبریائی کا ظہور تھا کہ اس کا پہلا ہی جانشین شاہ عالم بہادر شاہ اول (۱۱۲۴ء تا ۱۱۱۸ء) اپنے نامور باپ کا بالکل ضد تھا۔ غرض جب شاہ صاحب پیدا ہوئے (۱۷۰۲-۱۷۰۳ء) تو اورنگ زیب عالمگیر (۱۶۵۸-۱۷۰۷) تخت نشین تھا اور جب آپ کا انتقال ہوا تو اس وقت شاہ عالم (۱۷۵۹-۱۸۰۶ء) کا عہد حکومت تھا۔ اکسٹھ برس کے اس عرصہ میں اورنگ زیب کے بعد گیارہ مغل بادشاہ یکے بعد دیگرے تخت پر جلوہ افروز ہوئے۔

برصغیر کے حالات:

اس دور میں مسلسل حکمرانوں کی تبدیلی کی وجہ سے ہندوستان کے سیاسی و معاشی حالات بری طرح متاثر ہورہے تھے (۲)

یہ سیاسی حالات سیاست کے اکھاڑے میں مختلف (سیاسی) پہلوانوں کی شکست و فتح کا باعث تو بن رہے تھے لیکن اصل مصیبت عوام پر تھی کہ بیچارے معاشی طور پر بری طرح بدحالی کا شکار تھے کیونکہ سیاسی بدحالی سے عوام میں عدم تحفظ کا احساس پیدا ہونا شروع ہو جاتا ہے جو کسی بھی قوم کے لئے زہر ہلاہل کا کام کرتا ہے متذکرہ حکمرانوں پر سیاسی حالت کی بدولت جو برا وقت آیا اس میں معاشی بدحالی اور بڑھ گئی۔

مغل حکمرانوں نے مرکز (حکومت اور بادشاہ) کے اخراجات کو پورا کرنے کے لئے ملک کے مختلف علاقے بڑی بڑی جاگیروں کی صورت میں تقسیم کردیے، یہ جاگیردار کی ذمہ داری ہوا کرتی تھی کہ وہ ٹیکس وصول کرے، علاقے کا نظم ونسق چلائے اور معینہ رقم مرکز کو بھجوائے۔ نتیجۃً ان علاقوں میں مرکز کی قوت کمزور اور جاگیرداروں کی قوت بڑھ گئی جو عوام کو اپنا غلام بنا کر مال مویشی کی طرح ہانکنے لگے اس طرح معاشرہ مجموعی طور پر زوال پذیر ہوگیا۔ اس عہد میں سیاسی اعتبار سے طوائف الملوکی کا دور دورہ تھا۔ بغاوتیں رکتی نہ تھیں اور سیاسی واقتصادی اعتبار سے مفلسی اور بدحالی گھر کئے ہوئے تھے۔

آپ کی تصانیف کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ جب آپ نے اپنے گرد سیاسی واقتصادی حالات کا جائزہ لیا تو آپ کے دل میں یکا یک ایک ہلچل سی پیدا ہوئی چونکہ آپ نادرشاہ کا بلا امتیاز خون وخرابہ اور لوٹ کھسوٹ کا زمانہ دیکھ چکے تھے۔

آپ نے مرہٹوں اور جاٹوں کی سفاکی اور لوٹ مار بھی دیکھی تھی، امیروں اور شاہی خاندانوں میں پھیلے ہوئے سازشوں کے جال پر بھی آپ کی نظر تھی آپ کے دیکھتے ہی دیکھتے یکے بعد دیگرے کئی بادشاہ تخت نشین ہوئے ابھی وہ سنبھل نہ پائے کہ دوسرے جانشین ان کی جگہ لینے کے درپے ہوئے، سرکردہ عہدے پر فائز

افسران کے مظالم اور بے جا زیادتیوں کے ساتھ ساتھ ان کی رشوت خوری بھی آپ کے علم میں تھی۔

دوسری طرف شاہی خزانہ میں کوڑی تک نہیں تھی اور جاگیرداروں کو تجوریاں بھرنے سے فرصت نہیں تھی، ان کے عیش وعشرت کے نئے اور نرالے انداز کوئی ڈھکی چھپی بات نہ تھی پھر آپ سے ملازموں، چھوٹے پیمانے کے محنتی دستکاروں، چھوٹے تاجروں اور عام لوگوں کی اقتصادی بدحالی دیکھی نہ جاتی تھی، جبکہ بدمعاشوں اور سماج دشمن لوگوں کی سرکشی پورے عروج پر تھی۔ غرض آپ اپنے ہم وطنوں کی سیاسی، سماجی اور اخلاقی وتمدنی غرضیکہ ہر لحاظ سے قابل رحم حالات کے مشاہدے سے آپ اس نتیجے پر پہنچ چکے تھے کہ عہد بہ عہد مسلمانوں کی اس گئی گزری حکومت کا خاتمہ بھی ہندوستان سے یقینی ہے یہ اور ایسی ہی دوسری باتیں اور حالات ہی تھے جو شاہ صاحب کے ذہن پر بری طرح اثر انداز ہوئیں۔ آپ کے ذہن پر ان باتوں کے اثرات اور ہندوستان کے سیاسی مستقبل سے آپ کی مایوسی کا اندازہ آپ کی تحریروں سے بخوبی ہوجاتا ہے۔

بین الاقوامی حالات:

شاہ ولی اللہ نے جس عہد میں اپنی بھرپور توانائیوں کے ساتھ امت کے ڈوبتے بیڑے کو سنبھالا دینے کی کوشش کی تو اس وقت بین الاقوامی حالات یہ تھے کہ سیاسی ومعاشی کشمکش کا ایک سیلاب رواں تھا جو تھمنے کا نام نہ لیتا تھا۔ بے چینی کا ایسا دور دورہ تھا کہ الامان والحفیظ۔

انگلستان کے عوام حصول حقوق کیلئے نوجوانوں اور بادشاہوں سے پارلیمنٹ میں دست وگریباں تھے روس فرانس میں معاہدہ عمرانی کا پرچار کررہا تھا، وہاں کے عوام شہنشاہوں اور جاگیرداروں کا تنگ پھندا اتار پھینکنے کے لئے تیاریوں میں مصروف تھے، امریکہ میں مقامی تحریکیں قوت پکڑ رہی تھیں اور اپنے حقوق کے لئے جنگ آزادی لڑ رہی تھیں، یورپین ممالک کی حریص نظریں ایشیاء پر جمی ہوئی تھیں اور وہ ان علاقوں کی دولت سمیٹ کر اپنے ممالک میں منتقل کرنا چاہتے تھے، ادھر ایشیائی ممالک میں (جن میں اکثریت مسلمان ممالک کی تھی) نہ اتحادی قوت تھی اور نہ حملہ آوروں سے دست وگریباں ہونے کی شکست۔

اس کا اصل سبب یہ تھا کہ ان ایشیائی ممالک کی عوام کا معاشی طور پر دیوالیہ ہو چکا تھا اور خواص (جاگیردار اور امرا) اور حکمرانوں (بادشاہ و سلطان) کو اپنے تحفظ اقتدار کا فکر دامن گیر تھا۔ انہیں عوام کے مسائل سے نہ تو دلچسپی تھی اور نہ کوئی سروکار، پھر اس طرف توجہ دینے کے لئے ان کے پاس وقت ہی کہاں (کیونکہ یہ اپنے عیش و عشرت میں مست تھے) حیرانی اس بات پر ہوتی ہے کہ جب ان ایشیائی ممالک میں سے کوئی یورپی ملکوں پر حملہ آور ہوتا تو وہ اپنی لڑائیوں کو پس پشت ڈال کر یکجان ہو جاتے اور جب کوئی یورپی ملک ان ملکوں میں سے کسی کے وجود کو خود میں ضم کرنا چاہتا تو ان سب کے سامنے سیاسی مقاصد اور حملہ آور ملک سے گٹھ جوڑ کی باتیں آجاتیں (آج کی طرح سے) مسلم کے نام پر اتحاد کا وجود نظر نہ آتا تھا غرض یہ کہ مشرق ہو یا مغرب اسلامی ملک ہوں یا عیسائی حکومتیں ان کی خارجہ پالیسیاں اور جنگیں ہوس ملک گیری اور ذاتی مفادات تک محدود رہ گئیں۔ (۳)

یہ وہ پر آشوب ماحول تھا جس کے تناظر یا پس منظر میں شاہ صاحب نے ایک عظیم ادارے سے بڑھ کر اسلام کی خدمت کی، انہوں نے نہ صرف مسلمانوں میں بلکہ اسلامی علوم میں بھی ربط باہمی اور فکری یگانگت پیدا کرنے کی سعی کی چونکہ اس وقت کا مسلم معاشرہ فکری تضادات، فروعی اختلافات اور نزاعی اعتقادات کی آماجگاہ بن چکا تھا جس سے عوام پر منفی اثرات مرتب ہو رہے تھے اور مسلم عوام باطل نظریات اور تصورات کو فکری وراثت جان کر انجانے میں اس پر عمل پیرا تھے۔

آپ نے اس وقت اپنی جہد و عمل میں فکری یگانگت اور مطابقت پیدا کی کہ وہ مستقبل میں انقلابی فکر و عمل کا دستور قرار پائی آپ نے صدیوں پرانے تعصبات کے بت و منات کی جگہ اجتہادی راہ اپناتے ہوئے زندگی کے مسائل کو اسلامی فکر سے آراستہ کیا، آپ کی تحریک کا سب سے ارفع اور عظیم مقصد احیائے اسلام تھا۔ آپ کا مقصد عظیم برصغیر کے مسلم معاشرے کو ایک معاشرتی انقلاب کے ذریعے ہر قسم کی برائیوں سے نجات دلانا تھا تاکہ ان کے تشخص کو برقرار رکھتے ہوئے انہیں خلافت راشدہ کے محاسن میں پرو دیا جائے۔

بادی النظر میں آپ کی یہ عظیم تحریک مسلمانانِ برصغیر کی فلاح اور اصلاح کے لئے تھی لیکن اس کے تجزیئے سے پتہ چلتا ہے کہ اس میں نہ صرف پورے عالم اسلام بلکہ پوری انسانیت کی فلاح مضمر ہے۔ آپ نے اپنی تحریک کے ذریعے مسلمانوں کے مختلف مکاتبِ فکر کو فروعی اختلافات بھلا کر قریب لانے کی جدوجہد کی۔

آپ نے صدیوں کے معتقدات میں اعتدال پسندانہ روش اختیار کرنے اور محققانہ اور مجتہدانہ سوچ پیدا کرنے کا پیغام دیا۔ گویا آپ مسلمانوں کے زوال پذیر معاشرے میں ایک قندیل نور بن کر تشریف لائے تاکہ مسلمانانِ برصغیر آپ کے کردار و عمل کی چکا چوند میں اپنا گم شدہ تشخص تلاش کریں۔ آپ نے ماحول کی تمام گندگی، زہرناکی اور تمام بندشوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے تفکر و تدبر کی نئی جہتیں روشن کیں۔ جو کہ ایک مصلح، دانشور اور مفکر کو کرنا چاہئے۔ آپ نے مسلمانوں کی ایک نئی اخلاقی جہت، روحانی معراج، اور عزم و یقین سے آشنا کیا۔ غرض آپ نے امت کو ایک جامع نظام زندگی مرتب کر کے دیا، جس سے غلط خیالات اور عقائد کی حقیر اور بے حقیقت ندیاں ایک بحر ناپید میں گم ہوگئیں اور بلند و بالا اس روحانی اور فکری اساس سے اسلامی تشخص کا ایسا سر سبز اور بلند و بالا مینار ابھرا جو نشان منزل کی حیثیت رکھتا ہے۔

شاہ ولی اللہ کا اقتصادی فلسفہ:

شاہ صاحب کے اصلاحی اور انقلابی پروگرام کا اہم حصول اقتصادیات میں توازن اور معیشت میں مساوات کو واضح کرنا تھا وہ معاشرے کی معاشی حالت کو درست کرنے اور صحیح خطوط پر چلانے کے لئے تجویز پیش کرتے ہوئے ہوئے کہتے ہیں۔

''معاشی مساوات سے انسان دوستی اور خدا پرستی پر مبنی صحت مند نظام قائم کیا جائے'' (۴)

شاہ صاحب کے نزدیک انسانوں کی اجتماعی زندگی کے لئے اقتصادی توازن ایک ضروری روش ہے۔ اور پھر انسانی جماعت کو ایک ایسے اقتصادی نظام کی ضرورت ہے۔ جو اس کی ضروریات زندگی کا کفیل ہو۔ جب لوگوں کو اپنی معاشی ضرورتوں سے فراغت نصیب ہوتی ہے تو پھر وہ اپنے فارغ وقت میں جو ان کے پاس کسب

معاش کے بعد بچ رہتا ہے۔ زندگی کے ان شعبوں کی ترقی اور تہذیب کی طرف متوجہ ہو سکتے ہیں۔ جو انسانیت کا
اصل جوہر ہیں لیکن اگر ان کی اقتصادی نظام کے درست اور متوازن ہونے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ حیات دنیاوی
میں انسانیت کے اجتماعی اخلاق تکمیل پذیر ہوتے ہیں۔

چنانچہ شاہ صاحب فرماتے ہیں:

> ''انسانیت کے اجتماعی اخلاق اس وقت برباد ہوتے ہیں جب ان کو اقتصادی تنگی پر مجبور کر دیا جائے۔ جب انسانیت پر ایک مصیبت نازل ہوتی ہے تو خدا تعالیٰ انسانیت کو اس سے نجات دلانے کے لئے کوئی نہ کوئی راستہ ضرور الہام فرماتا ہے۔ یعنی ضرورت ہے کہ قدرت ایسے انقلاب کے سامان پیدا کر کے قوم کے سر سے ناجائز حکومت کا بوجھ اتار دے۔'' (۵)

شاہ صاحب کے نزدیک سب سے پہلے معاشی خوشحالی کا ہونا لازمی ہے۔ جب انسان کو ذہنی سکون
ملتا ہے تو وہ مذہب و اخلاق کا متلاشی ہوتا ہے۔ جس کی حقیقی علت یہ ہے جب تک انسان انسانیت کے اس اولین
مرتبہ یا درجہ کو طے نہیں کرتا اس وقت تک وہ دوسرے حیوانات سے ممتاز ہو کر انسانیت کے اس اولین مرتبہ یا
درجہ تک نہیں پہنچ سکتا شریعت اور اخلاق کی ذمہ داری انسانوں پر ہوتی ہے حیوانوں پر نہیں۔

اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالنا چاہئے یہ کارل مارکس کے مادی فلسفہ سے مشابہت رکھتا ہے۔ کارل مارکس بھی
اخلاقی اصول اور مذہبی احکام کو معاشی ضروریات کے تابع قرار دیتا ہے اور کہتا ہے کہ اخلاقی اصول اور معاشی
تقاضوں میں باہمی ٹکراؤ ہوتا ہے تو اخلاق و مذہب کو اپنی شکست مان کر معاشیات کا غلبہ ماننا پڑتا ہے۔ لیکن
اصل حقیقت یہ ہے کہ معاشیات کے متعلق شاہ صاحب کے بتائے ہوئے اصولوں کی بنیاد قرآن مجید کی حکیمانہ
تعلیم اور اس کی عملی شکل پیغمبر اسلام ؐ کی سنت پر ہے۔ اس لئے فلسفہ ولی اللہ میں معاشرتی ضروریات سے مذہب
و اخلاق کے متصادم ہونے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ (۶)

شاہ صاحب نے اپنے فلسفہ کی تعبیر ''اقتراب'' اور ''ارتفاق'' جیسے الفاظ سے فرمائی ہے۔ یعنی ''خدا پرستی'' اور ''انسانی دوستی'' کو انسانیت کی بنیاد قرار دیا ہے انسان دوستی کی صحیح تعبیر مال و دولت کی مساویانہ تقسیم ہے تاکہ یہ نہ ہو کہ معاشرے میں ایک تو عظیم سرمایہ دار بن جائے اور دوسرے کو کھانے کے لئے روٹی اور اوڑھنے کیلئے کپڑا بھی میسر نہ ہو۔ (۷)

شاہ صاحب کی منشا یہ ہے کہ اگر معاشیات کے میدان میں صرف انسانی جدوجہد اور ذاتی محنت و کاوش'' کو ہی معیار بنایا گیا تو طبقاتی کشمکش کا پیدا ہونا ضروری ہو جائے گا۔ اس لئے کہ قدرتی طور پر نہ تو ہر شخص کی طاقت برابر ہے اور نہ حوصلہ جب طاقت و حوصلہ میں یکسانیت نہ ہوگی تو نتیجہ کے اعتبار سے مساوی حیثیت کیونکر ممکن ہے ویسے بھی فطری تفاوت درجات تو حدیث کے اعتبار سے بھی امت کے لئے سرتا سر خیر کا باعث ہے۔

لہذا جب تک معاشرہ میں تفاوت درجات بدستور رہے گا تو خیر بھی ہوگی لیکن جب یہ تفاوت درجات جاتا رہے گا تو معاشرہ ہلاکت کی طرف قدم بقدم بڑھتا رہے گا۔ اس لئے فطری تفاوت سے مقابلے کی کیفیت قائم رہتی ہے اور آگے بڑھنے کا جذبہ نئی نئی ایجادات کی طرف راغب کرتا ہے۔ جبکہ یکسانیت پر مبنی مساوات کا تصور غفلت و بے حسی کو دعوت دیتا ہے۔

شاہ ولی اللہ انسانوں کے درمیان ایسی ناہمواری کو بہرحال ناپسندیدہ اور قابل اصلاح قرار دیتے ہیں۔ جس میں امیر، امیر تر اور غریب، غریب تر ہوجاتے ہاں ایسے درجاتی تفاوت کا موجود ہونا برا نہیں۔ جس میں طبقاتی کشمکش نہ ہو ایسی درجہ بندی میں شاہ صاحب کے نزدیک قطعاً کوئی مضائقہ نہیں بلکہ یہ ایک فطری تفاوت اور قدرتی درجہ بندی ہوتی ہے جو خدائے قدوس کے حکیمانہ تقاضوں پر مبنی ہوگی۔

☆ ☆ ☆

باب سوم

فصل دوم

شاہ ولی اللہ کے دور کی معاشی حالات

بین الاقوامی حالات:

شاہ ولی اللہؒ جس دور میں اپنے افکار پھیلا رہے تھے۔ پوری دنیا کے انسانوں میں سیاسی و معاشی کشمکش جاری تھی انگلستان میں عوام اپنے حقوق کے لئے نوابوں اور بادشاہوں سے پارلیمنٹ میں لڑ رہے تھے روسو (۱۷۱۲ تا ۱۷۷۸ء) فرانس میں ''معاہدہ عمرانی'' کا پرچار کر رہا تھا اور وہاں کے لوگ بادشاہ اور جاگیرداروں کے اقتدار کو تار پھینکنے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ امریکہ میں مقامی تحریکیں زور پکڑ رہیں تھیں اور اپنے حقوق کے لئے جنگ آزادی لڑ رہی تھی۔ یورپی ملکوں کی نظریں ایشیاء پر جمی ہوئی تھیں۔ اور وہ ان علاقوں کی دولت سمیٹ کر اپنے ملکوں میں لے جانا چاہتے تھے ادھر ایشیائی ممالک میں (جن میں اکثریت مسلمان ملک تھے) نہ اتحاد تھا اور نہ ہی لڑنے کی طاقت۔

اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کے عوام معاشی طور پر بدحال تھی اور خواص (جاگیردار و امراء) اور حکمران (بادشاہ و سلطان) اپنا اقتدار بچانے کی فکر میں لگے رہتے تھے انہیں عوام کے مسائل سے نہ دلچسپی تھی اور نہ ہی اس طرف توجہ دینے کے لئے ان کے پاس وقت تھا۔ یہ حیرت کی بات ہے کہ جب ان ممالک میں سے کوئی یورپی ملکوں پر حملہ کرتا تو اپنی لڑائیوں کو بھول کر وہ ایک جگہ جمع ہو جاتے اور جب کوئی یورپی ملک ان ملکوں میں سے کسی کو ہڑپ کرنا چاہتا تو ان سب کے سامنے اپنے سیاسی مفاد اور حملہ آور ملک سے گٹھ جوڑ کر باتیں ہو رہی تھیں۔ اسلام کے نام پر اتحاد کہیں نظر نہ آتا تھا۔

غرض یہ کہ مشرق ہو یا مغرب، اسلامی ملک ہو یا عیسائی حکومتیں۔ ان کے خارجہ پالیسیاں اور جنگیں ملک

گیری اور حکمرانوں کے ذاتی مفادتک محدود ہوگئیں جہاں تک داخلی یعنی ملک کے اندرونی معاملات کا تعلق تھا عوام جاگیرداروں کی خدمت میں مصروف رکھے جاتے تھے۔ان کے کام (فرائض) سے تو ان لوگوں کو دلچسپی ہوتی تھی ان کے فلاح (حقوق) کا انہیں خیال نہیں تھا۔ (۸)

ہندوستان کی حکومت اور حکمران:

شاہ ولی اللہ سن ۱۷۰۲ء میں پیدا ہوئے اور سن ۱۷۶۳ء میں آپ کی وفات ہوئی اکسٹھ سال کے عرصہ میں ہندوستان میں گیارہ مغل بادشاہوں نے حکومت کی۔جب آپ پیدا ہوئے تو اورنگزیب عالمگیر (۱۶۵۸ تا ۱۷۰۷ء) کا دور تھا اور جب آپ کا انتقال ہوا اس وقت شاہ عالم (۱۷۵۹ تا ۱۸۰۶ء) کی حکومت تھی۔ (اس دور میں لگاتار حکمرانوں کی تبدیلی کی وجہ سے ہندوستان کے سیاسی اور معاشی حالات ایسے تھے جس سے وہاں کی حکومت اور حکمران بُری طرح متاثر ہو رہے تھے۔

یہ سیاسی حالات سیاست کے اکھاڑے میں تو مختلف (سیاسی) پہلوانوں کی شکست وفتح کا باعث بن رہے تھے لیکن عوام کو معاشی طور پر براہ راست متاثر کر رہے تھے اس دور میں سیاسی کشمکش نے خود حکمرانوں اور حکومت پر کیا اثرات چھوڑے اس کا مطالعہ بھی بڑا ہی دلچسپ ہے۔

جس سلطنت کو بابر اور اکبر جیسے لوگوں نے مختلف ذریعوں سے مضبوط کیا تھا لیکن وہ نااہل ہوگئیں تھیں۔صوبے خودمختار ہونے لگے اور ہندوستان میں اوااون اور راجاؤں کی چھوٹی چھوٹی حکومتیں بننے لگیں۔ان بادشاہوں کے طرف سپہ سالاروں اور امراء کی سازشوں کے جال بچھنے لگے تخت کے لیے آپس کی لڑائیوں، پارٹی بازیوں اور مختلف باغیانہ قوتوں نے ان کی رہی سہی ساکھ بھی ختم کردی اور آخر کار شاہ ولی اللہ دہلوی کی حیات میں ہی آخری فرمانروا شاہ عالم کے دور کا نقشہ یہ ہوگیا کہ

سلطنت شاہ عالم   از دہلی تا پالم

ان حکمرانوں پر سیاسی حالات کی بدولت جو برا وقت آیا اس میں معاشی بدحالی اور بڑھی مغل بادشاہوں میں مرکز (حکومت اور بادشاہ) کیا خراجات کو کرنے کے لیے یہ طریقوں رائج تھا کہ ملک کے علاقے بڑی جاگیروں کی صورت میں تقسیم کر دئے جاتے تھے جاگیردار خود ٹیکس وصول کرتا تھ۔ علاقے کا انتظام کرتا تھ اور مالیہ نہ کی سالانہ رقم مرکز بجھوا دیتا تھا۔ مرکز کے ساتھ بھی کچھ علاقہ مخصوص کر دیا جاتا تھا اس سے جو آمدنی ہوتی تھی وہ بادشاہ اور مرکزی حکومت کے مختلف کاموں میں استعمال کی جاتی تھی۔ علاقے کو ''خالصہ'' کہا جاتا تھا۔ مغل خاندانوں کے ہر دور اندیش حکمران کی کوشش ہوتی تھی کہ خالصہ کا علاقہ بڑھایا جائے ایسی صورت میں بادشاہ صوبائی گورنروں اور جاگیرداروں کے رحم وکرم پر نہیں رہتا تھا اور مرکزی دفاتر اور شاہی محلات کے اخراجات کے لئے جس قدر رقم کے اخراجات کی ضرورت ہوتی تھی وہ براہ راست بادشاہ کو ملتی رہتی تھی۔ (۹)

شاہ صاحب کے دور میں خالصہ کے علاقے میں کافی حد تک کمی آ گئی تھی جس سے حکمرانوں کی اقتصادی حالت پر کافی برا اثر پڑا، تاریخ عالمگیر ثانی کے مصنف نے لکھا ہے کہ:۔

> ''صوبہ دھلی کے پرگنے اور چند دیگر صوبوں کے پرگنے جو خالصہ میں شامل تھے اور جن سے بادشاہ کے ذاتی ملازمین کی تنخواہیں ادا ہوتی تھیں، اب ہاتھ سے نکل گئے تھے۔ سہارنپور، جس کے ٹیکس جاگیرداروں کے حوالے کر دیئے گئے تھے۔ اب نجیب خان روہیلہ کے قبضے میں تھا۔ آگرہ کے قریب کے علاقے جاٹوں کے پاس تھے۔ جے پور کے مادھو سنگھ نے نارنول وغیرہ کے علاقوں پر تسلط کر لیا تھا نتیجہ یہ تھا کہ ایک محل بھی خالصہ میں نہ تھا قوبت بایں جا رسیہ کہ بادشاہ کے دسترخوان کے لئے روپیہ نہ رہا۔ بیگمات بہت سے اخراجات اپنی حسیب خاص سے کرتی تھیں''۔ (۱۰)

اس لئے شاہ ولی اللہ کا خیال تھا کہ خالصہ کا علاقہ وسیع ہونا چاہئے آپ نے بادشاہ وزیر اور امراء کے نام جو خط لکھا اس میں اس بات کا خاص طور پر ذکر کیا آپ فرماتے ہیں :۔

''خالصہ کو کشادہ تر کرنا چاہئے ۔خصوصا وہ علاقہ جو دھلی کے اردگرد ہے ۔آگرہ ، حصار ، دریائے گنگ اور سرھند کی حدود تک سب علاقہ یا اس میں سے اکثر حصہ خالصہ ہو، کیونکہ امور سلطنت میں ضعف کا سبب خالصہ کی کمی اور خزانہ کی تلت ہوا کرتی ہے ۔ (۱۱)

جب خالصہ کا علاقہ (بابر کے دور میں) صوبہ بہار میں بھی ہوتا تھا تو سرکاری لگان وصول کرنے میں دقت نہ ہوتی تھی اور ایک یہ دور بھی آ گیا، کہ خالصہ کا علاقہ دہلی سے پالم تک رہ گیا رستی اور نا اہلی کی حد اس سے بڑھکر اور کیا ہوگی ، کہ اسے بھی حکومت نے ٹھیکہ پر دے دیا تھا ۔ٹھیکہ دینے کے رواج سے ٹھیکیداروں کے دن تو پھر گئے اور وہ مالدار بن گئے لیکن اس کا اثر یہ ہوا کہ بے چارے عوام پس گئے اور بھاری ٹیکسوں کے تلے دب گئے ۔ دوسری جانب علاقہ چونکہ ٹھیکہ پر ہوتا تھا اس لئے حکومت کے خزانے میں محدود رقم پہنچتی تھی اور وہ بھی وقت پر نہیں سرکاری خزانے اور عوام کی یہ حالت دیکھکر شاہ ولی اللہ نے بادشاہ کو لکھا کہ :۔

''خالصہ سے ٹھیکہ دینے کا رواج ختم جائے اس کے بدلے ایماندار اور تجربہ کار ملازم (ٹیکس وصول کرنے کے لئے) مقرر کئے جائیں ۔ اس لئے کہ ٹھیکہ دینے سے ملک خراب ہوتا ہے اور عوام پس جاتے ہیں ۔اور ان کی معاشی حالت تباہ ہو جاتی ہے''۔ (۱۲)

مرہٹے، سکھ، جاٹ اور روہیلے وغیرہ ملک کے گوشے گوشے میں حکومت کے خلاف بغاوت کرنے اور قتل و خونریزی میں مصروف تھے، ان مختلف باغیانہ قوتوں سے مرکز کو کافی نقصان پہنچ رہا تھا۔ گجرات اور مالودہ پر قبضہ کے بعد مرہٹوں نے شہروں اور دیہاتوں کو لوٹنا شروع کردیا۔ یہ لوگ مغلیہ حکومت کے مختلف علاقوں پر قبضہ

کر کے ان سے با قاعدہ لگان وصول کرنے لگے جیسے۔ چوتھ (چوتھا حصہ) کہا جاتا تھ۔ جاٹوں نے، دہلی اور آگرہ کے درمیان اس قدر ہنگامہ آرائی کی، کہ مرکزی حکومت کے ناک میں دم آگیا۔ ان میں شروج مل (جاٹوں کا سردار) نے تو میوات کی حدود سے فیروز آباد تک قبضہ کر کے عوام کو ستایا۔ یہاں تک کہ اس علاقے میں مسلمانوں کو یہ مجال نہیں کہ آذان اور نماز جاری رکھ سکیں۔

اس شخص نے (۹مئی ۵۲ےا ءکو) پرانی دلی کو خوب لوٹا۔ لوگ اس قدر پریشان ہوئے کہ گلیوں میں دربدر مارے مارے پھرنے لگے۔ پاگلوں کی طرح ہر شخص پریشان تھ۔ اور بہت سے لوگوں نے اس مصیبت سے نجات پانے کے لئے خودکشی کر لی۔

عوام کی دولت ان مختلف سیاسی قوتوں کے ہاتھوں لٹتی رہی۔ اور حکومت کا سرمایہ ان قوتوں کی بیخ کنی پر صرف ہوتا گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مرکزی خزانے میں پیسہ نہ رہا۔ مرکزی خزانے پر بحث کرتے ہوئے شاہ صاحبؒ مختلف صوبوں کی آمدنی کا تذکرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

''ہندوستان کے محصولات اس وقت بھی سات کروڑ سے کم نہیں ہیں لیکن جب تک کہ مرکز میں حکمران طاقت ور نہ ہو ورنہ ایک کوڑی بھی ملنا مشکل ہے''۔

چند لوگوں کا ذکر کرتے ہوئے شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ

''سرمایہ دار مرکزی حکومت سے ٹکر صرف اسی لئے لینے کی جرات کرتے ہیں کہ وہ مرکز کو تو کچھ دیتے نہیں اور ان کے پاس بے بہا دولت جمع ہوگئی ہے۔ یہ سب کچھ ان (مغل) بادشاہوں کی غفلت کا نتیجہ ہے'' (۱۳)

ایک طرف تو مرکزی حکومت کی آمدنی کی یہ حالت اور دوسری طرف بادشاہوں کے ذاتی اخراجات اور عیش وعشرت کی ایک طویل داستان اس کالازمی نتیجہ یہ نکلا کہ اس معاشی ابتری سے بےعملی عام ہوگئی اور

جس کا داؤ جدھر لگ گیا اس نے دولت سمیٹنا شروع کر دی۔ اس صورت حال کے پیش نظر شاہ ولی اللہؒ نے بادشاہ وقت کو یہ لکھا کہ:

''اگر حالات کو سدھارنا ہے تو بادشاہ اور امراء عیش و عشرت میں مشغول نہ ہوں گذشتہ گناہوں پر توبہ کریں اور آئندہ باز آئیں''۔ (۱۴)

جاگیردار امراء اور حکام:

شاہ ولی اللہؒ کے دور میں مرکزی مغل حکومت کی جو حالت تھی اس کی ہلکی سی جھلک دیکھنے کے بعد اعلیٰ طبقہ کی حالت دیکھنا بھی ضروری ہے۔ ایک طرف تو مرکز سیاسی حیثیت سے کمزور تھا اور معاشی حیثیت سے بدحال دوسری اسی تناسب سے جاگیردار، بڑے زمیندار، اور حکام سیاسی حیثیت سے مضبوطی تو اس طرح تھی کہ یہ سب لوگ اپنے مشترک مسائل میں ایک ہو جاتے تھے اور کسی حکمران کو تخت سے اتارنا ہوتا تھا تو سازشوں کا ایسا تانا بانا سا تیار کرتے کہ چند ہی روز میں لوگ ایک دوسرے شخص کو تخت نشین ہوتا دیکھتے۔

اس دور کی سیاسی تاریخ اس قسم کی مثالوں سے بھری پڑی ہیں معاشی طور پر خزانوں کی ملکیت کی بات بھی بالکل واضح ہے ایک طرف تو حکومت ہے جس کے پاس اخراجات پورے کرنے کیلئے صرف خاصہ کا علاقہ رہ گیا ہے اور خزانے میں مسلسل قلت ہو رہی ہے دوسری جانب عوام میں، جو بار بار سیاسی انتشار اور لوٹ مار سے تباہ و برباد ہو رہے ہیں پھر بھاری ٹیکسوں اور مہنگائی نے ان کی کمر توڑ دی ہے سرکاری ملازمین کی حالت اور بھی بدتر ہے۔

رہ گئے یہ لوگ جو سیاسی طور پر تو مضبوط ہیں ہی لیکن معاشی حالت یہ بھی ہے کہ ان کے پاس بڑی بڑی زمینیں اور جاگیریں ہیں اپنے علاقوں کے کرتا دھرتا ہیں جو غلہ آتا ہے ان کے گوداموں میں چلا جاتا ہے۔ عوام سے جو محصولات وصول ہوتے ہیں ان کی تجوریوں میں بند ہو جاتے ہیں مرکزی حکومت کے خزانے میں مرضی ہوتی تو مالیانہ کی رقم بھیج دیتے، ورنہ اپنے دوست حاکموں سے معاملہ طے کر لیا۔

شاہ ولی اللہ اس طبقے سے بہت نالاں نظر آتے ہیں جگہ جگہ ان کے اونچے محلات اور حویلیوں کا ذکر کرتے ہیں ان کے لذیذ کھانوں اور عیش ونشاط کے لوازمات پر تنقید کرتے ہوئے کہتے ہیں:۔

''اے امیرو! دیکھو کیا تمہیں خدا کا خوف نہیں آتا۔تم دنیا کی لذتوں میں ڈوبے جارہے ہو۔جن لوگوں (کسانوں۔دستکاروں وغیر) کی نگرانی تمہارے سپرد ہوئی ہے ان کو تم نے چھوڑ دیا ہے۔تم شرابیں پیتے ہو، جسے تم کمزور پاتے ہو اسے ھڑپ کر جاتے ہو۔جسے طاقتور دیکھتے ہو اسے کچھ نہیں کہتے۔تمہاری ساری ذہنی قوتیں لذیذ کھانوں ،نرم وگداز جسم والی عورتوں ،کپڑوں اور اونچے مکانوں میں صرف ہوتی ہیں''۔(۱۵)

سرکاری حکام کا تذکرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:۔

''ان کے گھروں میں ہر قسم کی دولت جمع ہوگئی ہے اور عوام بدحال ہیں''

جاگیرداروں کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:۔

''ان لوگوں کی آمدنیاں بے انتہا ہے۔دل میں آتا ہے کہ تو مالیانہ دیتے ہیں ورنہ اپنی تجوریاں بھرتے ہیں۔یہاں تک کہ اپنے دولت واقتدار کے بل بوتے پر حکومت سے ٹکر لیتے ہوئے بھی نہیں گھبراتے''(٦)

یہ بڑے زمیندار اور جاگیردار (جیسا کہ شاہ صاحب کے مذکورہ خطاب سے ظاہر ہے) اپنے ہم پلہ لوگوں کو تو کچھ نہیں کہتے لیکن غریبوں پر ظلم کرتے ہیں۔چنانچہ بادشاہ کو خط لکھتے ہوئے شاہ ولی اللہ ان کے مظالم کا ذکر کرتے ہیں اور ان کے لئے بدمعاش (مدعیین) جیسے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔اور کبھی اپنے دور کے جاگیرداروں اور امیروں کی حالت کو قیصر وکسریٰ (جاگیردارانہ نظام) سے بھی بدتر بتاتے ہیں۔اور کبھی ان تمام حالات کو ایک ایک کر کے بیان کرتے ہوئے یہ تنقید کرتے ہیں کہ۔۔

''جب انسانیت پر (اس قسم کے حالات جیسی) مصیبت نازل ہوتی ہے تو خدا انسانیت کو نجات دلانے کے لئے کوئی نہ کوئی راستہ ضرور پیدا کرتا ہے،،۔(۱۷)

فوج اور ملازم:

''مرکز کمزور ہونے کی بڑی وجہ اس دور میں فوجوں کی بدنظمی اور بے قاعدگی بھی تھی۔فوج کے اعلیٰ افسران آپس میں لڑتے رہتے تھے۔دشمنوں سے پوشیدہ خط وکتابت کرتے تھے۔عام بدنظمی نے فوج کو ایک بے ترتیب ہجوم کی شکل دے دی تھی۔نہ کوئی عسکری تربیت تھی اور نہ عسکری نظام۔غیر حاضری کی بڑی سے بڑی سزا یہ دی جاتی تھی کہ ایک دن کی تنخواہ کاٹ لی جاتی تھی۔اس فوج میں نہ فاتحانہ عزم تھا نہ سپاہیانہ جذبہ،،

فوج کے بارے میں یہ تاثر ایک انگریز مورخ کا ہے۔

اس تاثر کا حقیقت سے نہایت گہرا تعلق ہے اگر واقعات کی روشنی میں تفصیل سے دیکھا جائے ،تو رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اس کی ایک وجہ معاشی بدحالی بھی تھی۔(شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے زمانے ہی میں جب کہ احمد شاہ (۱۷۵۸تا۱۷۵۴ء) مغل سلطنت کا حکمران تھا،تین سال تک فوجوں کی تنخواہیں نہ ملیں مجبور ہوکر سپاہیوں نے شور مچانا شروع کردیا اور محلوں کے دروازے روک کر کھڑے ہوگئے ایک حاکم کا جنازہ چار روز تک پڑا رہا اور فوجیوں نے اس وجہ سے دفن نہ ہونے دیا کہ اس نے ان کی تنخواہیں ادا نہیں کی تھی۔

چنانچہ احمد شاہ ہی کے دور میں دوکانداروں کو شاہی محلات کے سامان کی فہرست بنا کر دی گئی تاکہ وہ اسے فروخت کریں اور پھر سپاہیوں کی تنخواہیں ادا کی جائیں۔(۸)

اس دور میں ایک وقت ایسا بھی آیا،جب فوجیوں نے افلاس اور بدحالی سے تنگ آکر اپنے گھوڑے بیچ

دیئے پیدل فوج کے پاس وردیاں نہ رہیں ۔سرکاری جانوروں کو چارہ نہ ملتا اور وہ بھوکے مرنے لگے ۔فوجی اپنے گھروں سے باہر نہ نکلتے اور بعض وقات تو ایسا بھی ہوتا کہ شاہی سواری کے ہمراہ بھی نہ ہوتے تھے ۔فوج ورسرکاری ملازمین کی یہ معاشی حالت ظاہر ہے کہ جو خط آپ نے احمد شاہ ابدالی کو ہندستان پر حملے کی ترغیب کے لئے لکھا اس میں حالات کی تصویر بھی کھینچی ۔

آپ نے لکھ کہ :۔

''اس وقت مختلف قسم کے سرکاری ملازمین کی تعداد ایک لاکھ سے زائد ہے ۔ بے عملی کا دور ہے شاہی خزانہ نہیں رہ ۔نقدی بھی ختم ہوگئی ہے ۔سب ملازم تتر بتر ہوگئے اور انہوں نے کاسۂ گدائی (بھیک مانگنے کا برتن ہ تھ میں لے لیا سلطنت صرف نام کی رہ گئی ہے ۔ جب سرکاری ملازمین کا یہ حال ہے تو عوام کی حا ت تو اس سے بھی بری ہوگی ۔'' (۱۹)

بار بار توجہ دلائی ہے فوج کی اہمیت اور اس کی ترغیب کے طریقوں کا ذکر کیا ہے ۔ اور لکھا ہے کہ :۔

''ملازموں کو بغیر کسی تاخیر کے (دولت پر) تنخواہیں ملنا چاہئیں ۔ اگر ایسا نہ ہو تو وہ قرض لینے پر مجبور ہو جائیں گے اور پھر ہندوستان میں سودی قرضے کے باعث اس کی حالت خراب سے خراب تر ہو جائے گی ۔''

عام ملازمین کے ساتھ شاہ ولی اللہ نے علماء اور ائمہ مساجد کی تنخواہوں کا بھی ذکر کیا ہے ۔ اور لکھا ہے کہ انہیں اچھے طریقہ پر تنخواہیں دی جائیں تا کہ یہ حضرات مذہبی تعلیم وتبلیغ میں یکسوئی سے مشغول رہ سکیں ۔ بادشاہ کو یہ باتیں لکھتے ہوئے آپ یہ شعر بھی فرماتے ہیں ۔

ے در پس آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند

آنچہ استاد ازل گفت ہماں می گویم (۲۰)

عوام:

شاہ ولی اللہؒ کے دور میں ہندوستان کی سیاسی حالت عوام کی معاشی زندگی پر گہرا اثر پڑا چھوڑا۔ مرہٹوں اور جاٹوں نے جو لوٹ مار مچا رکھی تھی اس کا عوام خصوصاً مسلمانوں پر گہرا اثر پڑا۔ حافظ جار اللہؒ کو خط لکھتے ہوئے شاہ صاحب بیان فرماتے ہیں کہ:

> دہلی میں رجب شعبان ۱۱۴۱ھ کے آخر تک جاٹوں نے لوٹ مار مچا رکھی جاری رکھی انہوں نے عوام کی عزت و ناموس کو برباد کیا اور خوب لوٹ، مکانات کو آگ لگا دی اور حکومت کچھ نہ کر سکی۔ (۲)

ملک کی اندرونی طاقتیں تو تخریبی کارروائیوں میں مصروف تھیں ہی، نادر شاہ کی لوٹ مار نے رہی سہی کسر بھی پوری نکال دی اور لوگ بار بار لٹنے سے بدحال ہو گئے تھے۔

نجیب الدولہ کو خط لکھتے ہوئے شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ:

> ''مسلمانان ہندوستان نے خواہ وہ دہلی میں ہو یا کسی اور جگہ انہوں نے لوٹ مار کے یہ صدمے کئی مرتبہ برداشت کئے ہیں اور اب چاقو، ہڈی تک بات پہنچ گیا ہے رحم کا مقام ہے میں آپ کو خدا اور اس کے رسول کا واسطہ دے کر کہتا ہوں کہ آپ کسی مسلمان کے مال کے درپے نہ ہوں (کیونکہ وہ پہلے ہی غریب ہیں) اگر اس بات کا خیال نہ رکھا گیا تو مجھے ڈر ہے کہ مظلوموں کی آہ آپکی کامیابی کے راستے میں دیوار نہ بن جائیں''(۲۲)

احمد شاہ ابدالی کی فوجوں کی آمد کی خبر جب شاہ صاحبؒ کو ہوئی، آپ نے خصوصی طور پر نجیب الدولہ کو لکھا کہ:۔

''جب شاہی فوجیں دھلی میں آئیں تو مہربانی کر کے یہ انتظام اچھی طرح کرلیں کہ دھلی پہلے کی طرح لٹنے نہ پائے کیونکہ دھلی والے کئی مرتبہ اپنے مالوں اور اپنی عزت کو لٹتا دیکھ چکے ہیں۔ (۲۳)

یہ تو لوٹ کھسوٹ کا وہ بازار تھا جو ملک کے اندرونی اور بیرونی طاقتوں سے سیاست کے نام پر گرم کر رکھا تھا اور عوام اس سے بری طرح متاثر ہو رہی تھے اس کے علاوہ ایک طبقہ ایسا بھی تھا۔ جس کے گھروں میں تیزی سے دولت جمع ہو رہی تھی۔

اس طبقے کا انکشاف شاہ ولی اللہ نے احمد شاہ ابدالی کو خط لکھتے ہوئے کیا آپ نے فرمایا کہ:۔

'' حکومت (بادشاہ) کے پیشکاروں اور کارکنوں میں اکثریت ہندوؤں کی ہے اعلیٰ سرکاری کاموں میں پورا عمل دخل انہیں ہندوؤں کا ہے ان کے گھروں میں ہر قسم کی دولت جمع ہوگئی ہے اور وقت مسلمانوں پر افلاس اور بدحالی کے بادل چھائے ہوئے ہیں۔ دستکاروں اور چھوٹے تاجروں کی حالت بہت خراب ہے۔ ان پر طرح طرح کے ظلم ہو رہے ہیں اور یہ لوگ تنگدستی کا شکار ہیں بے روزگاری بڑھ رہی ہے۔ اس پر ستم بالائے ستم یہ کہ اس دور میں اور بھی لوگوں کی کمر توڑ دی۔ (۳)

اور (نتیجہ یہ ہوا کہ غلہ اور دوسری ضروریات کی چیزیں مہنگی ہوگئیں چنانچہ ستمبر و اکتوبر سن ۱۷۵۷ء (شاہ صاحب کی وفات سے تقریباً پانچ سال پہلے) (مہنگائی کا یہ عالم تھا کہ گیہوں روپے کے نو سیر ملتے تھے، مونگ کی دال روپیہ کی آدھ سیر، ماش کی دال روپیہ کی پانچ سیر ہوئی تھی۔ دہلی میں دوائیں تک گراں ہوگئی تھیں۔ (۲۴)

وزیر آصف جاہ کو خط لکھتے ہوئے شاہ صاحب نے پرزور الفاظ میں ان سے کہا ہے کہ پوری طاقت اور

فوری طور پر اس مہنگائی کو ختم کرنے کی کوشش کی جائے۔ ایک طرف یہ مہنگائی، دوسری جانب کاشتکاروں تاجروں اور مختلف پیشوں کے لوگوں پر بھاری ٹیکس اور پھر ٹیکسوں کی وصولی میں سختی۔ شاہ صاحب اس صورت حال پر تبصرہ فرماتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:۔

''یہ ٹیکس بھی ملک کی بربادی اور عوام کی بدحالی کی ایک بڑی وجہ ہیں کیونکہ جو لوگ حکومت کی بات مانتے ہیں اور فرمانبرداری (ٹیکس دے کر) دکھاتے ہیں وہ تو کمزور ہو رہے ہیں اور جو سرکش ہیں اور حکومت کے ٹیکس ادا نہیں کرتے انکے حوصلے اور بڑھ رہے ہیں اور زیادہ سرکش ہو رہے ہیں۔ (۲۵)

غرض یہ کہ شاہ ولی اللہ نے اپنے دور کی جو معاشی تصویر فرمائی ہے۔ اس سے یہ تاثر پیدا ہوتا ہے۔ کہ حکومت کے خزانے میں قلت ہے اور جاگیرداروں اور امیروں کی تجوریوں میں خزانوں کی کثرت ہے۔ فرد اور سرکاری ملازمین بدحال ہیں۔ عوام پریشان حالی نیز معاشی تنگدستی میں ہیں۔

شاہ ولی اللہ کا مشن:

شاہ ولی اللہؒ جس دور میں پیدا ہوئے وہ سیاسی اعتبار سے طوائف الملکی اور جہالتوں کا دور دورہ تھا۔ اور اقتصادی لحاظ سے بدحالی اور مفلسی کا زمانہ تھا۔ گرد و پیش کا جب سیاسی و اقتصادی جائزہ لیا تو۔ آپ پر اس کا گہرا اثر ہوا آپ نے نادر شاہ کے قتل و غارت اور لوٹ مار، لوٹ کھسوٹ کا زمانہ بھی ہے، مرہٹوں اور جاٹوں کی لوٹ مار کے منظر بھی دیکھے امیروں اور شاہی خاندانوں میں سازشوں کے جال بھی دیکھے اور کئی بادشاہوں کو سلطنت کے تخت پر بیٹھے دیکھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے نئے جانشینوں کو ان کی جگہ لے لی۔ سرکاری۔ عہدوں داروں کے ظلم اور رشوتیں آپ کے علم میں آئیں۔ شاہی خزانے میں قلت دیکھی اور جاگیرداروں اور زمینداروں کو عیش و عشرت میں غرق پایا۔ ملازموں، دستکاروں، چھوٹے تاجروں اور عام لوگوں کی اقتصادی

بد حالی دیکھی اور بد معاشوں اور سماج دشمن لوگوں کی سرکشی کا مطالعہ کیا۔ اور ایسی ہی دوسری باتیں ظاہر ہے شاہ صاحبؒ کے ذھن اثر انداز ہوئیں (آپ کے ذہن) کا اندازہ آپ کے اس شعر سے ہوتا:

کان النجوم اومضت فی الغیاھب ے

عیون الا فعی اوروس العقاب.

یعنی (حالات کی) ان تاریکیوں میں جو (امید کے) ستارے چمک رہے ہیں

مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگوں کی آنکھیں ہیں، یا بچھوؤں کے سر آئیں۔

اپنے دور کو شاہ ولی اللہؒ قیصر و کسریٰ کے زمانے سے تشبیہ دیتے ہیں۔ بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر یہ بات کہتے ہیں کہ:

''اگر ہمارے ہاں (ہندوستان) کی حالت کا مطالعہ کیا جائے تو

معاملہ دو قدم آگے ہی ہے گا۔'' (۲۶)

چنانچہ آپ نے میدان جنگ کے جہاد کے بجائے اور معاشرتی جہاد (جدوجہد) کو اختیار فرمایا۔ اس کیلئے آپ نے ایک ایسا حلقہ پیدا کیا، جو آپ کے خیالات وافکار کو سمجھے اور لوگوں میں پھیلائے آپ نے سیاسی حلقوں میں اثر ورسوخ پیدا کیا کہ نجیب الدولہ جیسا شخص آپ کے مشوروں پر عمل کرتا اور بادشاہ وقت کی خدمت میں حاضر ہوتا۔ یہاں تک کہ آپ کی درخواست پر احمد شاہ ابدالی جیسا بادشاہ ہندوستان پر حملہ آور ہوں اور پانی پت کی مشہور جنگ (۱۷۶۱ء/۱۱۷۵ھ) لڑی۔ آپ کا مقصد بادشاہوں کو تبدیل کرنا نہ تھا بلکہ آپ کا منشاء یہ تھا کہ بہتر سیاسی قوتوں کے ذریعے ایسے لوگ برسر اقتدار آئیں کو صالح نظام قائم کرنے میں مددگار ثابت ہوسکیں۔

آپ کی نظر انتخاب سیاسی لوگوں میں سے چند ایک (نجیب الدولہ وغیرہ) پر تھیں لیکن ان سیاسی کوششوں کا کوئی واضح نتیجہ دیکھے بغیر چند ماہ بعد ہی (۱۷۶۲ء/۱۱۷۶ھ) میں آپ کا انتقال ہوگیا۔ تیسرا جہاد آپ کا قلمی

اور علمی جہد ہے آپ نے جب قرآن پاک کا ترجمہ کیا تو علماء مارنے دوڑے جب آپ نے فقہی مذہب نیز مدرسوں اور نظام تعلیم سے پیدا شدہ جمود پر لکھا تو علماء خلاف ہو گئے ۔

جب آپ نے تصوف کے مسائل پر بحث کی اور اپنے دور کے جعلی پیروں اور گدی نشینوں کی قلعی کھولی تو وہ غضب میں آگئے جب آپ نے جاگیرداروں، امیروں اور منافرت پھیلانے والوں کو للکارا اور ۔ معاشرتی برائیاں کھول کھول کر بیان کیں ۔ تو وہ آپ سے باہر ہو گئے لیکن آپ نے اس جہد میں جواں ہمت کی طرح مخالفتوں کا مقابلہ کیا ۔

وہ لوگ آپ کو مارنے دوڑے جب آپ نے فقہی مذہب نیز مدرسوں اور نظام تعلیم سے پیدا شدہ جمود پر لکھا تو علماء خلاف ہو گئے ۔

جب آپ نے تصوف کے مسائل پر بحث کی اور اپنے دور کے جعلی پیروں اور گدی نشینوں کی قلعی کھولی تو وہ غضب میں آگئے جب آپ نے جاگیرداروں، امیروں اور منافرت پھیلانے والوں کو للکارا اور معاشرتی برائیاں کھول کھول کر بیان کیں ۔ تو وہ آپ سے باہر ہو گئے لیکن آپ نے اس جہد میں جواں ہمت کی طرح مخالفتوں کا مقابلہ کیا ۔ (۲۷)

☆ ☆ ☆

باب سوم

فصل سوم

اقتصاد وعلم الاقتصاد

لغت کی زبان میں قصد واقتاد ''میانہ روی'' اور ''اچھے چلن'' کا نام ہے، مگر علمی اصطلاح میں اسے وسائل کی ''دریافت'' کو کہتے ہیں جو دولت وثروت کے پیدا کرنے کے مناسب طریقے، اس کے خرچ کے صحیح استعمال اور اسکی ہلاکت و بربادی کے ''حقیقی اسباب'' بتاسکیں۔

اس لیے ''علم الاقتصاد'' اس علم کا نام ہے جو ان وسائل سے بحث کرتا اور ان کے صحیح وغلط ہونے پر مطلع دلیل راہ۔ علمی دنیا کے قدیم وجدید مفکرین اور علماء عصرین نے اس مسئلہ کو علمی اور عملی دونوں طریقوں سے حل کرنے کی برابر سعی کی ہے اور آج تک اس سعی کا سلسلہ جاری ہے۔

یونان کے مشہور فلسفی افلاطون نے بھی اپنی کتاب ''جمہوریہ'' (Republic) میں اس مسئلہ کے متعلق اپنا نقطہ نگاہ بیان کیا اور علماءِ جدید میں کیسل (Cassel) مل (Mi.l) سمتھ (Smith) دیکارڈ (D-Recarod) اور جون (Jhon) نے اس مسئلہ کو عملی اور عملی بنانے میں جو کاوشیں کی ہیں وہ ان کی تصانیف اور ان کے نظریوں سے واضح ہے اور آخر میں کارل مارکس (Karlmarx) نے نظریہ اشتراکیت (Soeialisam) اور اسکے ''عملی پروگرام'' کے ذریعہ سے یورپ میں جو انقلاب پیدا کیا ہے اس سے علمی فکر ونظر، عملی نظام اور طرز حکومت پر جو اثر پڑا ہے وہ موافقت ومخالفت کے رنگ میں نہ صرف یورپ کو متاثر کررہا ہے بلکہ ایشیاء اور مشرق ومغرب کے تمام گوشوں میں زبردست رجحان برپا کئے تھے۔ اور روس جو کہ آج کل اشتراکیت کا عملی میدان بنا ہوا ہے۔ دوسروں کو بھی اس نظام میں منسلک کرنے کے لئے پیہم جدوجہد کے ساتھ سرگرم عمل ہے۔

لیکن دنیا کی تاریخ اس عمل کی شاہد ہے کہ قدیم وجدید تمام نظام ہائے حکومت میں ایک بھی ایسا نظام نہیں بتایا جا سکتا جس کے نظام اقتصادی نے دنیا کے اندر رفاہیت وخوش عیشی اور عدل وانصاف دونوں کو باہم ملا کر امن وسلامتی کا علم بند کیا ہو اور یہ تو وہم بھی نہیں ہوسکتا کہ ان کے پیش کردہ نظریوں اور عملی تجربوں نے دنیوی سربلندیوں کے ساتھ ساتھ انسانی حیات کے مقصد وحید یعنی اللہ اور اسکے بندوں کے درمیانی رشتہ کو مضبوط کرنے اور اخلاق کریمانہ کی رفعتوں تک پہنچانے کی خدمت انجام دی ہوں۔

افلاطون اپنی شاہرہ آفاق کتاب ''جمہوریہ'' میں اقتصادی حیثیت سے انسانوں کے آزاد اور غلام دو طبقے ضروری قرار دیتا ہے اور اس طرح خدا تعالیٰ کی آقائی کی جگہ بندوں کی آقائی کی دعوت دیتا اور زیردستوں پر زبردستوں کی قہرمانیت کے لئے دروازہ کھولتا ہے اور صنفی تعلقات میں انارکی پیدائش کر کے معاشرتی نظام کو برباد کردینے کے علاوہ معاشیات میں عوام وخواص کی تقسیم کو بڑی حد تک باقی رکھتا ہے یورپ کی جمہوریت کا نظام بھی اسی دیو استبداد کی قبا اوڑھے ہوئے ہے اور عام رفاہیت وخوش عیشی کے بجائے مخصوص مالدار طبقوں کی کفالت کرتا نظر آتا ہے اور اس لئے عدل وانصاف کے حقیقی معنی کو بھی مسخ کردیا گیا ہے اور ظلم و استبداد کو عدل وانصاف کا نام دیا جارہا ہے اور حقیقت میں نگاہیں یہ دیکھ رہی ہیں کہ نہ صرف معاشی نظام بلکہ پورا نظام حکومت محض ایک چھوٹی سی جماعت کے اغراض کو پورا کرتا اور جمہور کو ان مقاصد کے لئے آلہ کار بناتا اور حقیقت پر پردہ ڈالنے کیلئے اس کا نام بے جمہوریت (Democrac) رکھتا ہے۔

روما اور فارس کا پرشوکت تمدن اور اس کی خوش آئند حضارت دنیائے انسانی کو مطمئن تو کیا کرتے خود اپنی قوم اور اپنے ہم مذہب افراد کے لئے بھی دعوت حق اور پیغام رفاہیت نہ دے سکے اور جو کچھ بھی وہ سب طبقہ امراء وسلاطین ہی تک محدود رہا۔ خصوصاً فارس وعام تو قابل ذکر بھی نہیں جو مزدک کی تعلیم سے بہرہ انداز ہوا۔ موجودہ ڈکٹیٹر شپ بھی امن وسلامتی کی جگہ قہر وغضب کی اور عام رفاہیت کی جگہ دنیائے انسانی کو محکوم بنانے کی ہنگامہ آرائیوں کے سوائے دنیا کو کچھ نہ دے سکی۔

اشتراکیت اور اشتمالیت نے اگرچہ عام خوشحالی اور رفاہیت کا پیغامبر بننے کی بہت کوشش کی مگر اور طرف خدا سے بغاوت کر کے اور اس کے بندوں کے درمیان انارکی کا باعث بنی۔

اور دوسری جانب طبقاتی جنگ کے مراحل میں الجھ کر رہ گئی اور عالمگیر پیام امن بننے کی کے، بجائے وہ بھی ایک طبقہ کی مخصوص حکمرانی نظر آنے لگی فرق صرف اس قدر ہے کہ وہ سرمایہ داروں کا نہیں مزدوروں کا طبقہ ہے۔

بہرحال دنیا کے تمام نظام ہائے حکومت اور دنیا والوں کی ہر قسم کی جدوجہد ہمیشہ اس مرحلہ میں ناکام رہی اور آج کی ہولناک جنگ یورپ اس ناکامی کو اس طرح برسرعام لا رہی ہے کہ تہذیب نو سے مرغوب ہونے والے انسانی سرنگوں اور حیران نظر آ رہے ہیں اور ان کو کوئی تاویل بن نہیں آتی۔

پس اب دو ہی مرحلے باقی ہیں یا دنیا ان ہلاکت آفرینیوں کا شکار ہو کر یکسر شر ہی شر بن کر رہ جائے اور یا پھر خیر اور حقیقی امن وسلامتی کی وہ دنیا بن جائے جس کا مظاہرہ اسلام آج سے چودہ سو سال قبل مکمل طور پر دور نبوت، دور صدیقی اور دور فاروقی ایک مثال بن چکا ہے۔

''فاما الزبد فیذھب جفاء واما ماینفع الناس فیمکث فی الارض''. (۲۸)

ترجمہ: سو جھاگ تو سوکھ کر ضائع ہو جاتا ہے اور وہ جو کام آتا ہے لوگوں کے سو باقی رہتا ہے زمین میں ہیں۔

لہٰذا آج کی صحبت میں ہم اسلامی نظام حکومت کے اس شعبہ پر بحث کرنا چاہتے ہیں جو ''اقتصادی نظام'' سے معنون ہے اور جس نے اپنے وجود کے حقیقی زمانہ میں دنیا کی تاریخ کے لئے یہ مواد بہم پہنچایا کہ اس نظام میں اگرچہ دفتری اقتدار کی وہ جگمگاہٹ موجود نہیں ہے جو آج انسانوں کو سادہ راحت و آرام اور قلبی اطمینان و سکون بخشنے کے بجائے ان کی مشکلات و مصائب دن بدن اضافہ کا سبب بن رہا ہے اور جس کی بدولت حکومتوں

کا اربوں روپیہ غریبوں اور مفلوک الحال انسانوں کی فلاح و بہبود کی جگہ جنگ استحکامات پر صرف ہو رہا ہے ،لیکن اپنی عملی جدوجہد میں وہ علم المعیشت کے حقیقی مقصد کا سب سے بڑا علمبردار ہے۔اس کی تمام تر روح انسانوں کی خدمت ، فارض البالی ،اور قلبی سکون واطمینان کا باعث بنتی رہی ہے اس لئے اس میں طبقیت جنگ کی گنجائش ہے اور نہ اونچ نیچ کا غیر فطری فرق ہی موجود ہے۔جس سے ایک جماعت بے قید سرمایہ؛ دولت کی مالک بن جائے اور دوسری اس کے سامنے دست سوال پھیلا کر فقرہ فاقہ کی زندگی بسر کرے اور اس کے دستِ تظلم کا شکار بنے۔

یہاں ایسے نظریئے (تھیوریز) (Theories) زیر بحث نہیں لائے جائیں گے جو اپنے منطقی استدلالات اور عقلی کاوشوں کے اعتبار سے تو بہت خوب نظر آتے ہوں لیکن ان کی عملی افادیت یا تو صفر ہو اور یا پھر تمدن کے فاسد کرنے میں تیز گام ، بلکہ یہاں ایک ایسے نظام سے بحث ہے جو کائنات ہست وبود کی دنیوی ضروریات اور عملی معیشت کے لئے بہترین نظام عمل (پروگرام) رکھتا ہو اور تجرباتی زندگی میں اس بات کا ثبوت دے چکا ہو کہ وہ انسانوں کا ان کے حقیقی آقا ''خدا تعالیٰ'' کے ساتھ صحیح تعلق قائم کرنے اور ان کے اخلاق (کریکٹر) کو بلند اور مضبوط بنانے کے ساتھ ساتھ ہر ایک کے لئے یکساں معیشت کا کفیل رہا ہے۔اور انفرادی اور اجتماعی حیات کا ضامن اور طبقاتی جنگ کی جگہ عالمگیر اخوت کا پیغمبر ہے۔

کسی نظریہ کے ساتھ اس کی ''عملی قیمت کا لحاظ'' اس لئے ضروری ہے۔کہ بعض نظریئے اپنے منطقی دلائل کے اعتبار سے اگرچہ بہت زیادہ جاذب نظر اور دلکش معلوم ہوتے ہیں۔اور ''علم معیشت'' کے مباحث میں ان کی بہت زیادہ اہمیت نظر آتی ہے لیکن جب وہ عمل کے ترازو میں تولے جاتے ہیں اور تجربہ کی کسوٹی پر پرکھے جاتے ہیں تو ان کی قدر و قیمت بہت کم رہ جاتی ہے۔

مثلاً ''محنت'' کا مفید مفہوم یہ کہ ''وہ کام جس کا نتیجہ مادی معاوضہ ہاتھ آئے'' لیکن محنت کی عملی بحث میں ''والدین کی خدمت'' اولاد کے لئے ان کی ناز برداری اور اپنے محبوب کے لئے اور شوکین لوگوں کے

مشاغل تفریح طبع کے لئے ، یہ سب محنت میں شمار کئے جاتے ہیں اور محنت کے وسیع نظریہ کے پیش نظر زیر بحث لائی جاتی ہیں۔ تاہم علماء اقتصادیات پر سیر حاصل بحث کرنے کے بعد آخر میں یہ کہنے پر مجبور ہوتے ہیں۔

یہاں وہ اصلی بحث سے متعلق نہیں ہیں محض عملی مذاق کے لحاظ سے مفہوم دولت میں ان کا ذکر کرنا بھی ضروری معلوم ہوا۔

اس کے برعکس بعض نظریئے نئی اصطلاحوں ، جدید تعبیروں اور محض ماحول کے اثرات کے پیش نظر اگرچہ پہلے نظریوں کے مقابلے میں ظاہری چمک دمک نہیں رکھتے لیکن عملی تجربہ میں ان کی افادیت بہت زیادہ ان کی پذیرائی بہت وسیع اور نظام معیشت میں اُن کی درست کاری بے حد موزوں ثابت ہوتی ہے۔

لہذا کسی ''عملی نظام'' میں وہی نظریئے قابل قدر جگہ پانے کے مستحق ہیں جو تعبیری نقطہ نظر سے اگرچہ انقلاب آفریں اور مسحور کن نظر نہ آتے ہوں مگر عملی دائرہ میں اس قدر مفید اور ہمہ گیر ہوں کہ اگر ان کو دلیل راہ بنالیا جائے تو بلاشبہ وہ ایک ''صالح معاشی'' نظام اور ''امن عالم'' کے کفیل ہو سکتے ہیں اور تمام انسانوں کی خوشحالی اور امن و عافیت کے رہنما بن سکتے ہیں۔

نیز ان میں یہ خصوصیت پائی جاتی ہو کہ جہاں وہ ایک طرف ایسی محکوم بنیاد اور مضبوط اساس رکھتے ہوں کہ زمانے کے ہزاروں انقلابات اور بے شمار تاثرات اور ذہنی رجحانات کے باوجود ان کی اساس و بنیاد کا ایک نقطہ بھی اپنی جگہ سے نہ ہٹ سکے وہیں ان میں ایسی لچک پائی جاتی ہو کہ وہ وقتی تاثرات ذہنی انقلابات و رجحانات اور نت نئے حوادثات کیلئے اپنی جزوی تفصیلات اور فروعی جزئیات میں وقت کی صحیح رہنمائی انجام دے سکیں اور موجودہ دور کی اعلیٰ سے اعلیٰ ترقی یافتہ دنیا کے لئے بھی اسی طرح مشعل ہدایت کا کام دیں جس طرح گذشتہ دنیا کی عام فلاح وطمانت کے لئے کامیاب ثابت ہو سکتے ہیں۔

اور یہ صرف وہی اصول ہیں جس کی روشنی میں اسلام کا معاشی نظام اپنے حقیقی دور میں ایک زریں تاریخ پیش کر چکا اور جس کے لئے دوست و دشمن دونوں نے خراج تحسین ادا کیا ہے۔

الغرض مسطورہ بالا تفصیلات کے پیش نظر یہ مناسب ہے کہ ''اسلامی نظام معیشت'' کو موضوع بحث بناتے وقت دنیا کے مختلف نظام ہائے معاشی کو بھی پیش نظر رکھا جائے تاکہ عدل وانصاف کی روشنی میں یہ موازنہ ہو سکے کہ دنیا کے باقی نظام ہائے اقتصادی میں اور اسلام کے نظام اقتصادی میں کیا فرق ہے اور یہ کہ درحقیقت معاشی نظام کے حقیقی مقصد کو کون پورا کرتا ہے اور ان ہلاکت آفریں نظام ہائے حکومت سے نجات دلا سکتا ہے جنہوں نے ''اقتصادی ترقی'' کے نام پر حیات انسانی کو خس وخاشاک سے بھی زیادہ بے وقعت بنا دیا ہے اور جس کی خوشحالی کے لئے یہ ڈھونگ رچایا گیا آہستہ آہستہ اسی کی تباہی و بربادی کا سامان مہیا کر دیا ہے۔



شاہ ولی اللہ کی تعلیمات کے اقتصادی پہلو

عالم اقتصادیات کی ابتدا (۱۷۷۶ء) میں ہوئی جب کہ آدم اسمتھ نے "دولت اقوام" نامی کتاب شائع کی اس سے پہلے بھی اقتصادی مسائل سے دنیا دوچار ضرور تھی لیکن ان مسائل کے تجزیے کی بنا پر علم وفن کا ایک مربوط نظام مرتب نہیں کیا گیا تھا۔ ہر چند کہ فنی حیثیت سے اقتصادیات کے کلیوں اور اصولوں میں اب بھی وہ قطعیت اور درستگی نہیں جو طبیعی علوم مثلاً کیمیا، ریاضی یا طبیعیات کا خاصہ ہے۔ لیکن گذشتہ دو صدیوں میں بالخصوص صنعتی انقلاب کے بعد علم اقتصادیات نے اتنی ترقی کر لی ہے کہ مشرق ومغرب میں قومی اور بین الاقوامی منصوبہ بندی کے کئے اس کے وضع کردہ اصولوں کا علم بے حد ضروری تصور کیا جاتا ہے۔

زراعت، صنعت وحرفت، درآمدات، برآمدات، تعلیم وموصلات غرض کون سا شعبۂ زندگی ایسا ہے جو علم اقتصادیات سے کسبِ فیض نہ کرتا ہو اور منصوبہ بندی کے لئے اقتصادی مشیر سے رجوع نہ کرتا ہو۔ اس ضمن میں یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ اسلام کی اساسی کتاب یعنی قرآن حکیم میں اقتصادیات کا نہ علیحدہ ایک باب ہے۔ اور نہ ولی فلسفے میں اقتصادیات کو کوئی علیحدہ جزو قرار دے گیا ہے، لیکن چونکہ زندگی میں اقتصادی مسائل کو بہرکیف ایک اہم مقام حاصل ہے۔ اور اس کی اہمیت روز بروز بڑھتی جاتی ہے۔

لہذا اس پہلو پر بھی قرآن حکیم کی تعلیمات محیط ہیں اور شاہ صاحب نے بھی اپنی متعدد تصنیف میں انسان کی انفرادی، اجتماعی، اور تمدنی زندگی کی اصلاح کیلئے علم وعرفان کے موتی بکھیرے ہیں، ان میں قتصادی مسائل پر بھی سیر حاصل بحث کی ہے اور چند نکات اتنے واضح طور پر بیان کئے ہیں کہ اسلام کے اقتصادی نظام کی ماہیت کے افہام وتفہیم کیلئے اس سے بہتر شاید ہی اور کوئی مستند تصنیف یا تفسیر پیش کی جا سکے بالخصوص آپ کی معرکتہ الا راتصنیف حجۃ اللہ البالغہ میں ابتغائے رزق ورارتفاقات کے مباحث میں جو بصیرت افروز شارے موجود ہیں، ان سے اقتصادی اصولوں کی ترتیب وتہذیب میں حسب توفیق ہدایت حاصل کی جاسکتی ہے۔

مروجہ درجہ علم قتصادیات، جو مغربی تمدن کا ساختہ پرداختہ اور سرمایہ داری نظام کا جزوی عکس ہے، بالعموم ان وسائل وعوامل کی تحصیل وصرف پر بحث کرتا ہے جو نسبتاً کامیاب ہوں اور جو انسان کو انفرادی واجتماعی احتیاجات کی تشفی کے لئے کارآمد ہوں۔

ان مباحث میں آمدنی اور مصارف پر تو نظریاتی اور تجرباتی دلائل ضرور پیش کئے جاتے ہیں اور کم خرچ بالانشین کے اصول پر ہمیشہ نظر رہتی ہے۔ لیکن ان مباحث میں ایک پیچیدہ ضروری پہلو نظرانداز کر دیا گیا ہوں وسائل وعوامل کی حلت وحرمت کی بحث ہوتی رہی ہے اور اب بھی چند مفکرین اقتصادیات پنی اس رائے پر جند ہیں کہ اقتصادیات کو اخلاقیات سے کوئی واسطہ نہیں۔ (۳۸)

ان کا نقطہ نظر اجمالی طور پر یوں کیا جاسکتا ہے کہ وہ چونکہ اقتصادیات کو ایک فن تصور کرتے ہیں اور فنی اعتبار اور خالص فنی نقطہ نظر سے ریاضی، کیمیائی اور دیگر فنون جائز وناجائز وحلال کی بحث میں الجھے بغیر مادہ کا تجزیہ کرتے ہیں اور تجربوں سے حاصل شدہ نتائج کو معروضی، غیر جذباتی اور غیر جانبدارانہ طریقے سے پیش کر کے اسے عملی شکل دینے کی کوشش کرتے ہیں اسی طرح اقتصادیات بھی فنی اعتبار سے غیر جانبدارانہ طریقے سے وسائل وعوامل کے حصول وصرف پر بحث کرنے کا مجاز ہے، جائز وناجائز کی اخلاقی بحث میں الجھ کر اسے

اپنی حیثیت نہیں کھونی چاہیے۔ (۳۹)

اسلام کے اقتصادی نظام اور مروجہ اقتصادی نظریات یا علم اقتصادیت کے مروجہ نظریات میں یہ بنیادی فرق کہ موخرالذکر کسب معاش اور تشفی احتیاجات سے بحث کرتے ہیں، جائز و ناجائز اور حلال وحرام کی بحث میں الجھنا عار سمجھتے ہیں۔ لیکن اسلامی نظام حیات میں اکل حلال کو ایک نمایاں مقام حاصل ہے ہمارا یہ عقیدہ ہے کہ روزِ قیامت ہر شخص سے یہ سوال کیا جائے گا،

(من این اکتسبه و فیماانفقه) زر و مال کہاں سے حاصل کیا اور پھر کہاں خرچ کیا۔ (۴۰)

انفرادی ضروریات پوری کرنے کے لئے قرآن حکیم نے جہاں جہد واکتساب کی ترغیب دلائی ہے اور قطعی طور پر یہ صراحت کر دی ہے کہ: (لیس للانسان الا ماسعی) وہاں سورۃ مائدہ میں اس بات کی واضح ہدایت بھی موجود ہے کہ:

(فکلو مما رزقکم الله حلالا طیبا)

ترجمہ: ''پس اللہ نے جو کچھ تم کو دیا ہے اس میں سے حلال وطیب کھاؤ'' (۴۱)

اسلام میں عبادات کے ساتھ ہی پر تفصیلی مباحث موجود ہیں جن کی روشنی میں یہ کیا جا سکتا ہے کہ اسلام کے اقتصادی نظام میں بالعموم اور حقوق العباد کی ادائیگی میں بالخصوص عدل کو ایک بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ شاہ ولی اللہ کی تعلیمات میں اس اقتصادی پہلو پر باتفصیل بحث کی گئی ہے۔ چنانچہ حجۃ اللہ البالغہ کے باب ابتغاء الرزق میں ارشاد فرماتے ہیں کہ معاش وسائل کو ذریعہ معیشت بنانے کی شرط یہ ہے کہ کوئی شخص دوسرے کی آزادی معیشت پر اثر انداز نہ ہو کہ اس سے تمدن انسانی میں فساد پیدا ہوتا ہے۔ (۴۲)

اسی ضمن میں یہ بھی صراحت موجود ہے کہ اگر نفع ایسے طریقے پر حاصل کیا جائے کہ اس میں عاقدین کے درمیان تعاون اور محنت کو دخل نہ ہو جیسے قمار یا زبردستی کی رضامندی کا اس میں دخل ہو جیسے سودی کاروبار تو ان صورتوں میں بلاشبہ مفلس اپنے افلاس کی وجہ سے خود پر ایسی ذمہ داری عائد کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے جن کا

پورا کرنا اس کی قدرت سے باہر ہوتا ہے اور اس کی وہ رضامندی حقیقی رضامندی نہیں ہوتی، تو اس قسم کے تمام معاملات رضامندی کے معاملات نہیں کہلائے جا سکتے۔ اور نہ ان کو پاک ذرائع آمدنی کہا جا سکتا ہے۔ بلاشبہ یہ معاملات تمدنی حکومتوں کے اعتبار سے قطعاً باطل ہیں (۴۳)

شاہ صاحب اٹھارویں صدی کے ابتداء میں دہلی میں پیدا ہوئے اٹھارویں صدی ایک انقلاب آفریں اور بے حد ہنگامہ خیز صدی گزری ہے بالخصوص اس صدی کے نصف آخر میں مغربی ممالک نیز صنعتی، سیاسی و معاشرتی انقلاب کے ذریعے ارتقاء کی مختلف منازل و مراحل طے کر کے اقصائے عالم پر اپنی برتری کا سکہ جمالیا۔ ملکی فتوحات اور استعمار کی دیگر وسائل کو بروئے کار لا کر اپنی دولت میں اضافہ کیا اور انیسویں صدی میں مغربی ممالک کا تسلط کم و بیش ساری دنیا پر قائم ہو گیا بدقسمتی سے اٹھارویں صدی کی ابتدائی ہی سے مشرقی ممالک کا زوال شروع ہوا۔

شاہ صاحب کی پیدائش کے چار سال بعد اورنگزیب کی وفات واقع ہوئی اور اس کے بعد تو مغلیہ سلطنت کا شیرازہ منتشر ہو گیا ۱۷۰۷ء سے ۱۷۵۷ء تک یعنی نصف صدی کے عرصے میں تخت دہلی پر دس تاجدار بٹھائے گئے اور اتارے گئے۔ (۴۴)

ان میں سے صرف چار اپنی طبعی موت مرے باقی کے سر قلم کر دیے گئے۔ یا تخت سے اتار کر آنکھوں میں سلائی پھیر دی گئی۔ ان سلاطین کے عہد میں ہندوستان کو جن لرزہ خیز حوادث و انقلابات سے دوچار ہونا پڑا ان کی طرف صرف اشارہ کر دینا کافی ہے۔ سادات بارہ کا تسلط فرخ سیر کا ان کے ہاتھوں بیکسی قید میں مرنا تورانی امرائے دربار کے ہاتھوں ان میں سادات بارہ کا زوال، مرہٹوں کی بغاوت اور ان کا عروج، سکھوں کا خونی فتنہ، نادر شاہ کی یلغار اور دہلی میں قتل عام، احمد شاہ ابدالی کے معرکہ پانی پت میں فتح، روہیوں کا ہندوستانی سیاست میں شریک ہونا، مغربی اقوام کی ملکی سیاست میں بتدریج داخل ہوتے جانا انگریزوں کا بنگال، بہار وغیرہ پر اقتدار اور عمل دخل تقریباً یہ تمام واقعات شاہ صاحب کی زندگی میں پیش آئے۔ (۴۵)

شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ:

اس زمانے میں بربادی ملک کا سبب زیادہ تر دو چیزیں ہیں ۔

۱) خاص طبقے اس کے عادی ہو گئے ہیں کہ کچھ کئے دھرے بغیر اپنے خاص خاص امتیاز کی بناء پر مثلاً اس لئے کے وہ قاری یا عالم ہیں یا ان کا تعلق شعراء یا سجادہ نشین یا فقراء کے اس حلقے سے ہے۔ جس کو بادشاہوں کی طرف سے عطیے اور وظیفے ملتے رہے ہیں یا اس قسم کی دریوزہ گری اور بھیک کا کوئی ڈھنگ نکال کر خزانہ شاہی سے رقمیں وصول کرتے ہیں۔ اور ملکی دولت کے وسیع دامن کو تنگ کرتے رہتے ہیں۔ ان کا مطمع نظر ملک کی کوئی خدمت نہیں بلکہ رقمیں وصول کرنا ہے اور اپنا ذریعہ معیشت فراہم کرنا ان کا نصب العین ہوتا ہے۔ ان مذہب دریوزہ گروں کا ایک گروہ جاتا ہے اور دوسرا گروہ آتا ہے۔ اس طرح باشندگان ملک کی زندگی تنگ کر رہے ہیں اور ملک کے لئے بارگراں بنتے رہتے ہیں۔ (۴۶)

۲) کاشت کاروں، سوداگروں، اور دست کاروں پر بھاری بھاری ٹیکس مقرر کئے جاتے ہیں۔ اور ان کے وصول کرنے میں انتہائی سختی سے کام لیا جاتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وفادار رعایاں بھی بغاوت پر اتر آتے ہیں۔ جس کے فرو کرنے کے لئے جبر و تشدد سے کام لینا پڑتا ہے اور بے انتہاء فوجی طاقت صرف کرنی پڑتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ملک کی فلاح و بہبود اس میں ہے کہ ٹیکس کم سے کم ہوں اور دفاع پر بقدر ضرورت صرف کیا جائے۔

شاہ صاحب نے ہندوستان کے اقتصادی بحران کو ملک کی بربادی تباہی اور بدحالی کا سب سے بڑا سبب قرار دیا ہے۔ مولانا سید محمد میاں (شاہ صاحب قبلہؒ) کا یہ فیصلہ ہندوستان کے خاص حالات سے مخصوص نہیں بلکہ اس کا نظریہ ہے کہ عالم انسانیت میں ہمیشہ یہ ہوتا رہا ہے کہ اقتصادی عدم توازن نے مذہب کے سر بفلک قلعوں کو مسمار کر دیا ہے۔ اس لئے موصوف کے اقتصادی اصلاح مذہبی اور اخلاقی اصلاح اور روحانی کمالات کے لئے سب سے پہلی سیڑھی ہے۔ (۴۷)

شاہ صاحب نے سوسائٹی کی اقتصادی اصلاح کو انبیاء علیہم السلام کی تعلیم کا اہم جزو قرار دیا ہے۔ چنانچہ اپنی مشہور و معروف تصنیف حجۃ اللہ البالغہ میں معیشت پر بالتفصیل بحث کرتے ہوئے تحریر کیا ہے۔

محمد رسول اللہ ﷺ کی بعثت کرتے وقت دنیا کی یہ حالت تھی کہ عیش و عشرت اور حد سے بڑھے ہوئے شاہانہ تکلفات کا مرض جس نے ملک اور قوم کو اقتصادی عدم توازن کی تباہیوں میں مبتلا کر رکھا تھا ایران وروما دغیرہ میں وبا کی طرح پھیلا ہوا تھا۔

پس! اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کے دل میں القا کیا کہ وہ اس مرض کا ایسا علاج کرے کہ نہ صرف ختم ہو بلکہ زہریلا مادہ بھی فنا ہو جائے جس کی وجہ سے یہ مرض پیدا ہوا ہے۔ پس آنحضرت ﷺ نے ان اسباب و وجوہ پر غور فرمایا جن سے اس مرض کے جراثیم نشو ونما پا رہے تھے، پھر ایک ایک مرض کی تشخیص کر کے ان کی ممانعت فرمادی۔ (۴۸)

حضرت شاہ صاحب ان سلطنتوں کی تاریخی مثال سے اقتصادی خرابیوں کا تجزیہ کرتے ہیں اور پھر عبرت دلانے کے لئے اپنے بادشاہ و امرا اور انحطاط پذیر معاشرے کی طرف اشارہ فرماتے ہیں چنانچہ حجۃ اللہ البالغہ میں فرماتے ہیں۔

جب پارسیوں اور رومیوں کو حکومت کرتے صدیاں گزر گئیں اور دنیاوی تعیش کو انہوں نے اپنی زندگی بنالیا اور آخرت تک کو بھلا دیا اور شیطان نے ان پر غلبہ کر لیا تو اب ان کی تمام زندگی کا حاصل یہی بن گیا کہ عیش پسندی نے اسباب میں منہمک ہوئے اور ان میں ہر شخص سرمایہ داری اور تمول پر فخر کرنے لگا اور اترانے لگا۔ یہ دیکھ کر دنیا کے مختلف گوشوں سے وہاں ایسے ماہرین جمع ہو گئے جو بیجا عیش پسندوں کو دینے کے لئے عیش پسندی کے نت نئے طریقے ایجاد کرنے اور سامان عیش مہیا کرنے کے لئے عجیب وغریب اور نکتہ آفرینیوں میں مصروف نظر آنے لگے اور قوم کے اکابر اس جدو جہد میں مشغول رہنے لگے کہ اسباب تعیش میں کس طرح وہ دوسرے پر فائق ہو سکتے ہیں اور ایک دوسرے پر فخر کرسکتے۔

حتی کہ ان کے امراء اور سرمایہ داروں کے لئے یہ سخت عیب اور عار سمجھا جانے لگا کہ ان کی کمر کا پٹہ یا سر کا تاج ایک لاکھ درہم سے کم قیمت ہو یا ان کے پاس عالیشان سر بفلک محل نہ ہو جس میں پانی کے حوض سرد و گرم حمام بے نظیر پائیں باغ ہوں اور ضرورت سے زیادہ نمائش کے لئے بیش قیمت سواریاں حشم و خدم اور حسین و جمیل باندیاں موجود ہوں، اور صبح و شام رقص و سرور کی محفلیں گرم ہوں اور جام و سبو سے شراب ارغوانی چھلک رہی ہو اور فضول عیاشی کے وہ سب سامان مہیا ہوں جو آج بھی تم عیش پسند بادشاہوں اور حکمرانوں میں دیکھتے ہو اور جس کا ذکر قصہ طولانی کے مرادف ہے۔ (۴۹)

خلاصہ یہ کہ ظلم و بداخلاقی کی انتہا ہو گئی تھی۔

اس پریشانی اور افلاس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان کو اپنی اخروی سعادت و فلاح اور خدا سے رشتہ بندگی جوڑنے کی بھی مہلت نہ ملتی تھی۔ کسب معاش کے بہترین طریقوں کا فقدان تھا۔ اور ایک بڑی جماعت چاپلوسی مصاحبت، چرب زبانی اور دربارداری کو ذریعہ معاش بنانے پر مجبور ہو گئی تھی اور یہ ایک ایسا فن بن گیا تھا جس نے ان کے افکار عالیہ اور ذہنی نشو نما کی تمام خوبیاں منہدم کر دی تھیں اور زوال کر دیا تھا۔

جب اس مصیبت نے ایک بھیانک شکل اختیار کر لی اور مرض ناقابل علاج حد تک پہنچ گیا تو خدائے تعالیٰ کا غضب بھڑک اٹھا۔ اور اس کی غیرت نے تقاضا کیا کہ اس مہلک مرض کا ایسا علاج کیا جائے کہ فاسد مادہ جڑ سے اکھڑ جائے اور اس کا قلع قمع ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ نے ایک نبی امی کو مبعوث کیا اور اپنا پیغمبر بنا کر بھیجا وہ آیا اور اس نے روم اور فارس کی تمام رسوم کو فنا کر دیا۔ اور عجم اور روم کے رسم و رواج کے خلاف صحیح اصولوں پر ایک نئے نظام کی بنیاد ڈالی۔ اور اس نظام میں فارس و روم کے فاسد نظام کی قباحت کو اس طرح ظاہر کیا گیا کہ معاشی زندگی کے تمام اسباب کو ایک قلم حرام قرار دیا جو عوام و جمہور پر معاشی بدحالی کا سبب بنتے اور مختلف عیش پسندیوں کی راہ میں کھول کر حیات دنیوی میں انہماک کا باعث ہوتے ہیں۔

مثلاً مردوں کے لئے سونے چاندی کے زیورات اور حریر کے نازک کپڑوں کا استعمال اور تمام انسانی

نفوس کے لئے خواہ مرد ہو یا عورت ہر قسم کے چاندی اور سونے کے برتنوں کا استعمال اور عالی شان محلات و قصور کی تعمیر اور مکانوں میں فضول زیبائش ونمائش وغیرہ کی یہی فاسد نظام کیا بتدائی منزل اور معاشی نظام کی تباہی کا منشا و مولد ہیں ۔ بہر حال خدائے تعالیٰ نے اس ہستی کو اخلاق کریمانہ اور نیک نامی کے لئے معیار اور طاہر اور پاک امور کے لئے میزان بنا دیا۔ (۵۰)

شاہ صاحب فرماتے ہیں :۔

احوال ہند بر ما مخفی نیست کہ خود مولد و منشا فقیر است ۔ بلد ورب نیز د

یدیم و احوال مردم ولایت از ثقات اینجا شنیدیم (۵۱)

انہیں ہر طرف ایک افسردگی چھائی ہوئی نظر آئی ۔ ہر طرف سماجی معاشی اقتصادی تباہیاں اپنے ڈیرے ڈالے ہوئے تھیں اور ملت پر ایک جمود اور بے حسی کی کیفیت طاری تھی ۔

شاہ صاحب کا شمار اسلام کے ان عظیم مفکرین میں ہوتا جنہوں نے دین فطرت کے صحیح اصول واضح کئے لہذا ان کی دیگر تصانیف کے کسب فیض کر کے اسلام کے اقتصادی نظام کا ایک مکمل خاکہ مرتب کیا جا سکتا ہے ۔

اس سلسلے میں ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ اسلام کے اقتصادی یا معاشی نظام پر جو تصانیف موجود ہیں ۔

شاہ صاحب کی اپنی تصانیف پر مبنی ایک تحدید منضبط اور مربوط خاکہ مرتب کیا جائے تا کہ موجودہ نظامہائے اقتصادی اور اسلام کے اقتصادی نظام پر بھی فرق واضح ہوتے اور شاہ صاحب کی تعلیمات کا دائرہ بھی وسیع تر ہو جائے ۔ (۵۲)

☆ ☆ ☆

شاہ ولی اللہ دہلوی کا تصور دولت

عالمی مسلم مفکرین میں حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کا مقام اس وجہ سے بلند و بالا قرار دیا گیا ہے کہ ان کے فکری نظام سے دین و دنیا، شریعت و طریقت مادیت و روحانیت عالم مثال و عالم ناسوت میں کوئی تضاد یا فرق لازم نہیں آتا۔ دراصل یہ کائنات اور اس کے مظاہر یہ انسان اور اس کے ذہنی افعال کچھ اس قدر پیچیدہ ہیں کہ ان کے مختلف حصوں کو الگ الگ نام دے کر انہیں سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔

قدیم مصری، کلدانی، یونانی، چینی اور ہندی مفکرین سے لے کر شاہ ولی اللہ تک انسانی ذہن نے اس کائنات اور خود اپنے آپ کو سمجھنے کیلئے ایک ایسی راہ اختیار کی رکھی تھی جس میں الفاظ اور اصطلاحات اور تقسیم در تقسیم کے ذریعے ہر جز کو جداگانہ طریقے سے سمجھنے کی کوشش نے ''کل'' کو ہماری نگاہوں سے اوجھل کر دیا تھا اور یہ کل بھی ایک ایسا عظیم کل کہ جسے اینٹوں کے ایک ڈھیر سے تشبیہ دینے کی بجائے کسی زندہ جسم سے مشابہ قرار دیا جا سکتا ہے کہ جس میں ہر خلیہ دوسرے خلیہ کو متاثر بھی کرتا ہے اور تاثر بھی لیتا ہے جس میں متعدیت اور انفعالیت کی خصوصیات موجود ہوتی ہیں یہ کوشش اپنی جگہ پر کتنی بھی اہم ہو انسان کو ایک ایسی راہ پر ہرگز گامزن نہیں کر سکتی۔ کہ جس میں حق اور باطل کی تمیز ہو حق اور سچائی ایک بسیط امر ہے جو کائنات اور ماورا الکائنات کی اس جامعیت سے ابھرتا ہے جسے حضرت شاہ ولی اللہ نے نہایت محتاط الفاظ میں سمجھانے کی کوشش کی ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی پوری عمر اور اس تمام غور و فکر کرنے کے باوجود ان جامع نتائج تک نہ پہنچتے اگر ان کی تربیت مسلم معاشرہ میں نہ ہوتی یہ اس لئے کہ دین اور دنیا کی تفریق کے خاتمہ کی ذمہ داری بنیادی طور پر قرآن مجید پر عائد ہوتی ہے اور قرآن مجید کا پیدا کردہ معاشرہ انسانی ارتقاء کی تکمیل ہے حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کی فکر کو قرآن مجید اور اسلامی معاشرہ کا ایک شارح قرار دیا جا سکتا ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ کی سب سے مشہور تصنیف حجۃ اللہ البالغہ کے صرف ابواب اور ان کی ترتیب پر نظر ڈالنے سے یہ امر اظہر من الشمس ہو جاتا ہے کہ آپ کی اس تصنیف کا مقصد مختلف اجزاء کو ایک ایسے کل کی حیثیت

سے سمجھتا ہے کہ جس کے بغیر حقیقت کی شناسائی اور حق و باطل کی تمیز ایک ناممکن امر ہے۔ اس ترتیب میں حضرت شاہ صاحب نے سب سے پہلے وہ مباحث رکھے ہیں جن سے انسان کے مکلف ہونے کا ثبوت ملتا ہے اس نظریے کا ابطال ہو جاتا ہے کہ اس کائنات کی پیدائش کا نہ کوئی مقصد ہے اور نہ منزل یہ مباحث قرآن مجید کی آیت ''وما خلقت ھذا باطلا'' کی تفسیر قرار دیئے جا سکتے ہیں۔ ان مباحث کو سب سے پہلے رکھنے کی وجہ واضح ہے۔ اگر کائنات اور انسان کی پیدائش بے مقصد ہے تو پھر تلاش حقیقت کے لئے انسان کا سرگرداں ہونا بھی بے کار ہے۔

انسان کی پیدائش کے مقاصد اور اس کے مکلف ہونے کے ثبوت کے بعد یہ سوال ابھرتا ہے کہ انسان کے کون سے اعمال کا نتیجہ خیر و برکت کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے اور کون سے اعمال کا نتیجہ ہلاکت اور بربادی کا روپ دھارتا ہے۔ اس سوال کے جواب کے بعد شاہ صاحب نے جمعیت انسانی کے ان اداروں پر نظر ڈالی ہے کہ جن کے ذریعے سے غیر مہذب دور سے لے کر تہذیب اور ترقی اعلیٰ ترین مقامات تک انسان نے خیر و برکت یا ہلاکت اور بربادی کے اسباب کو اپنایا۔ اس سلسلے میں رسم و رواج اور ارتقائے معاشرہ کے مباحث کو بہت ہی لطیف انداز سے بیان کیا گیا۔

بعد ازاں وہ مباحث زیر غور آئے ہیں جن کا تعلق جمعیت انسانی کی سعادت نیکی اور بدی سے ہے۔ ان اداروں کے بارے میں بحث ہے جن کے ذریعے بالآخر کوئی ایسی راہوں پر گامزن ہو جاتا ہے جن کا منتج سعادت اور بر ہے۔ اس سلسلے میں نبوت، مذاہب شرائع، مناہج اور سیاست کا تذکرہ چھیڑا گیا ہے اور شریعت مصطفوی کو پہلے کی شرائع کا ناسخ ہونے کے اسباب بیان کئے ہیں۔

اخیر میں شریعت مصطفوی میں وارد شدہ احکام کے رموز و اسرار بیان ہوتے ہیں۔ اور یہ ثبوت مہیا کیا جاتا ہے کہ اب ابن آدم کے لئے فلاح و بہبود اور سعادت کا واحد راستہ اسلام ہی میں موجود ہے۔

اس طرح تخلیق کائنات اور مقصد تخلیق سے ـــ اسلامی احکام کے اسرار و رموز کے بیان تک شاہ

صاحب اس کلی کی پوری پوری تشریح کرتے ہیں۔

شاہ ولی اللہ دہلوی کا تصور ''دولت'' بھی ان ہی مباحث سے ابھرتا ہے۔ اور اس سے فلسفہ کل کا ایک ایسا حصہ ہے کہ جسے الگ کر کے نہیں سمجھا جا سکتا۔

شاہ صاحب کی نظر میں ہر فرد بشر چار چیزوں سے مرکب ہے:۔

۱۔ معدنیات ۲۔ نباتات ۳۔ حیوانات ۴۔ نفس ناطقہ۔

ان چاروں چیزوں کی ایک خاص امتزاج اور ترتیب سے انسان پیدا ہوتا ہے پہلی تین چیزوں کو ملا کر انسان کا طبعی پہلو کہا جاتا ہے اور نفس ناطقہ کو روحانی پہلو، ان دونوں پہلوؤں میں چولی دامن کا ساتھ ہے طبعی پہلو کی بہتری اور ترقی روحانی پہلو کی بہتری اور ترقی کی ضامن ہے۔

اسی طرح روحانی پہلو کی ترقی طبعی کو متاثر کرتی ہے یہ باہمی تاثر کا نظریہ اس اشراقی، ویدانتی اور بدتصوف کے خلاف ایک اعلان جہاد ہے کہ جس کے مطابق انسان کے روحانی پہلو کی فلاح و بہبود اس میں ہے کہ وہ اپنی معدنی و نباتی و حیوانی پہلوؤں کو نظر انداز کر دے۔

یوگ اور ویدانیت کا یہ انداز فکر دراصل اس غلط تصور سے پیدا ہوتا ہے کہ جس میں کائنات کا ہر ذرہ دوسرے سے الگ ہے۔

اس میں نہ انفعالیت اس غلط تصور کے برعکس حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی توصاف فرماتے ہیں کہ۔

''قوت حیوانیہ اور قوت ملکیہ میں تفسا دفطرت سلیم کے خلاف ہے
انسان کے ان دونوں پہلوؤں کے مصالح سے ہی ایک متعدل مزاج پیدا
ہوتا ہے''

اور سب سے زیادہ اعتدال اس شخص میں پیدا ہو جائے گا جس میں دونوں قوتیں بے حد مضبوط ہوں اور دونوں میں مصالحت ہو۔ بالفاظ دیگر انسان کی صحیح روحانی ترقی صحیح جسمانی ترقی کے بغیر ناممکن ہے اور یہ بھی

ایک امر مسلم ہے کہ صحیح جسمانی ترقی خوشحالی وفارغ البالی کے بغیر متصور نہیں ہوسکتی۔ اس خوشحالی الترفہ کے متعلق حضرت شاہ صاحب فرماتے ہیں۔

اس سلسلے میں دو نظریے قائم کیے گئے ہیں جو باہم بالکل متعارض اور متضاد ہیں۔ ایک یہ کہ خوشحالی اچھی چیز ہے۔ اس سے انسان کے مزاج کی اصلاح ہوتی ہے اخلاق میں استقامت پیدا ہوتی ہے معانی و معارف اور علوم وفنون کی اشاعت ہوتی ہے انسان اپنے ابنائے جنس میں امتیازی درجہ حاصل کر لیتا ہے اور سوتدبیر سے جو جہل اور عجز اور پست ہمتی وغیرہ پیدا ہوتی ہے اس سے نکل جاتا ہے۔

دوسرا نظریہ یہ ہے کہ خوشحالی قبیح چیز ہے اس سے جھگڑے پیدا ہوتے ہیں۔ باہمی معاملات کی مشقتیں محنت ولقب اور باہمی الجھنوں کی مصیبتیں جھیلنی پڑتی ہیں۔ خوشحالی عالم غیب سے اعراض وغفلت کا سبب بن جاتی ہے۔ اصلاح آخرت کی تدابیر سے بالکل غافل اور بے خبر کر دیتی ہے۔ ان دونوں میں صحیح طریقہ یہ ہے کہ تدابیر پر نافعہ کو باقی رکھا جائے۔ (۳۷)

اب جب یہ ثابت ہوگیا کہ خوشحالی ایک ایسی چیز ہے کہ جس سے انسان کی صحت جسمانی وصحت ذہنی وصحت روحانی رو بہ ترقی ہوتی ہے مزاج کی اصلاح ہوتی ہے، اخلاق میں استقامت پیدا ہوتی علوم وفنون کی ترقی ہوتی ہے اور انسان دوسرے حیوانوں سے امتیازی درجہ حاصل کر لیتا ہے۔

خوشحالی کیا ہے:

فرد کی خوشحالی سے مراد یہ ہے کہ اسے وہ اشیاء اور وہ حالات حاصل ہوں جن سے جسمانی وذہنی وروحانی ترقی ہو وہ اشیاء مندرجہ ذیل ہیں۔

ا۔ وہ اشیاء جن کا تعلق فرد کی بقا سے ہو پانی اور غذا اس میں داخل ہیں اور انسانی فرد کی تین بنیادی ضرورتیں ہیں خوراک، لباس اور مکان سب سے پہلے پوری ہونی چاہئیں جس معاشرہ میں لوگوں کے کھانے پینے کا انتظام نہ ہو اس کے افراد کی اخلاقی حالت گر جاتی ہے اور دماغی اور ذہنی کیفیت پست ہو جاتی ہے۔

۲۔ وہ اشیاء جن کا تعلق اس امر سے ہے کہ فرد کی جسمانی ونفسیاتی صحت برقرار رہے اور اس کی طبعی عمر میں اضافہ کا باعث بنے نہ تنقیص کا صحت مند ہوا۔صحت مند غذا۔صحت مند پانی ،موسم کی شدتوں سے بچنے کے لئے مناسب لباس ومسکن ۔صحیح عمرانی تعلقات اس میں داخل ہیں مناسب صحت مند گھر کے بارے میں شاہ صاحب فرماتے ہیں:۔

''ہر شخص کے لئے رہائش گاہ ایسی ہو جس میں سردی اور گرمی سے بچاؤ۔اور خاندان کے افراد واسباب کی حفاظت ہو! اس کا طول وعرض کشادہ فضا وسیع اور اونچائی متوسط ہو اور یہ اسے آسانی سے میسر ہو''۔

☆ ☆ ☆

شاہ ولی اللہ کے معاشی ارتقاء کا فلسفہ

اگر نوع انسانی کی عالمی ارتقائی معاشی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ گذشتہ ڈیڑھ سو برس کے دوران دنیا نے مادی اعتبار سے حیرت انگیز ترقی کی ہے صنعتی انقلاب ،فنی وتکنیکی ارتقاء کے باعث دیکھتے ہی دیکھتے معاشی شعبوں کے علاوہ زندگی کے دیگر شعبوں میں بھی بے پناہ تبدیلیاں ہوئیں۔انسانی زندگی اس کے گرد برق رفتاری سے جولانی کرنے لگی۔حرکت کی اس تیزی اور ترقی کی اس جولانی نے وقت کے مفکرین کو ارتقاء کے عوامل کا کھوج لگانے کی طرف متوجہ کر دیا۔یہ ارتقاء اگرچہ اپنی اپنی جگہ مختلف بھی ہیں اور منتشر بھی لیکن ان سب میں ایک قدر مشترک کام کر رہی ہے اس قدر مشترک کو واضح کرنے کے لئے ذیل میں چند مفکرین کے زاویہ فکر کا اجمالی تجزیہ کیا جاتا ہے۔

اٹھارہویں صدی کے عظیم مفکر پروفیسر آدم سمتھ نے اپنی کتاب ''دولت اقوام'' میں ارتقاء کا واحد عامل انسان کے استحصال منفعت کے رجحان کو قرار دیا ہے موصوف اسے اپنے خاص انداز میں غیبی ہاتھ کا بھی نام دیتے ہیں اور انھوں نے وقت کی حکومتوں کو عدم مداخلت کی پالیسی کی بھی اسی بنیاد پر تلقین کی کہ یہ غیبی ہاتھ

خود بخود معیشت کو ترقی کی راہوں پر توازن کے ساتھ گامزن اور متحرک رکھے گا۔ نہ اس میں انحطاط کا خطرہ ہے نہ ہی ٹھہراؤ کا حتیٰ کہ موجودہ صدی کے تیسرے حصے میں رونما ہونے والے معاشی عظیم بحران کی وجہ بھی پروفیسر پیگور Piguer نے حکومت اور ٹریڈ یونینوں کی مداخلت کو قرار دیا جو ذاتی منفعت کے عامل کو صحیح کام نہیں کرنے دیتیں۔

بایں ہمہ آدم سمتھ اور کلاسیکی فکر کے ابتدائی حامیان ریکارڈو اور مالتھس کو شدید مایوسی تھی کہ معیشت میں بس رہی نہیں تو اچانک ٹھہراؤ کی کیفیت پیدا ہو جائے گی اور لطف یہ ہے کہ مالتھس کے بعد اب تک تمام معاشی مفکرین مسلسل ارتقاء کے تصور کے سلسلہ میں تمام تر فکری کوششیں صرف کرنے کے باوجود اس کے لیے کوئی فکری جواز اور بنیاد پیش نہ کر سکے۔ ویزلیکمین یونیورسٹی کے ماہر اور ھاورڈ یونیورسٹی کے پروفیسر بالڈون اپنی کتاب اکنامک ڈیویلپمنٹ میں معاشی ارتقاء کے فکری رجحانات کا جائزہ لیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:۔

''یہ ایک عجیب سی بات ہے کہ ریکارڈو، مارکس، شمپیٹر، ہیرڈ، ڈومر
تمام کے دلائل اس بات پر زور دیتے ہیں کہ موجودہ معیشت اچانک ٹھہراؤ کی
کیفیت اختیار کرے گی۔'' (۵۳)

ریکارڈو اور مالتھس نے یہاں تک بھی پیشگوئی کی کہ وقت کی غیر فنی ایجادات اور تکنیکی امکانات کے باوجود ملک کی اکثریت جو محنت کش طبقہ پر مشتمل ہے۔

آہنی قانون کے تحت قوت لایموت سے زیادہ حاصل نہیں کر سکے گی۔ فی الحقیقت فکری یہی زاویہ تھا جس نے کارل مارکس اور اس کے پیروکاروں کو اس فکری بغاوت پر مجبور کیا کہ انسانی زندگی کو ترقی کی راہ میں یہ آہنی دیوار محنت کی رسد نے نہیں بلکہ سرمایہ داری کی بنا پر روک ٹوک، لوٹ کھسوٹ نے کھڑی کی ہے۔ اس کا خیال تھا کہ جب اشیاء میں تخلیق یا تخفیف قدر کا عمل محنت ہی کا مرہون منت ہے۔ تو اس عمل سے حاصل ہونے

والی فاضل قدر کا بھی محنت کے علاوہ کوئی حقدار نہیں جس پر سرمایہ دار نے ناجائز حق جتا کر معیشت کو ترقی کرنے سے روک دیا ہے۔

ارتقائی فکر کا یہ معاشی تجزیہ تھا۔ اس کے علاوہ ایک تاریخی تجزیہ بھی پیش کیا گیا۔ جس کا اولین نقیب خود کارل مارکس تھا۔ کارل مارکس نے معاشرتی و معاشی ارتقاء کی بنیاد جدلیاتی مادیت کے تاریخی تصور پر رکھی۔ ہر چند مارکس کا یہ تصور ہیگل کی اضدادی منطق پر موقوف تھا تاہم مارکس کو اس کا بھی دعویٰ تھا کہ مجلسی ارتقاء کا یہ نظریہ سائنٹیفک ہے کیونکہ یہ نظریہ ڈارون کے نظریہ تنازع للبقاء اور بقائے اصلح کی طرح علمی مشاہدات اور استخراجی استدلالات پر مبنی ہے۔

مگر لطف یہ ہے کہ کارل مارکس نے استخراجی اور استقرائی ان استدلالات کی بنیاد پر جتنی پیشگوئیاں کیں ان میں سے کوئی بھی پوری نہ ہوسکی۔ یہ چیز بجائے خود اضدادی مادیت کے تصور کے سائنٹیفک نہ ہونے کا واضح ثبوت ہو۔

ہسٹاریکل سکول کے جرمن ماہر معاشیات برونو ھائلڈ برانڈ اور کارل بوچر نے بھی معاشی ارتقاء کی بنیاد خودغرضانہ متنفر جذبات پر رکھی ہے۔ وہ تاریخی وحشت و بربریت، انفرادیت پسندی اور اجتماعیت گریزی کو ارتقاء کی عمل قرار دیا ہے۔ لیکن اس کے نزدیک چونکہ خودغرضانہ مقاصد کا حصول معاشرتی تعاون کے بغیر ناممکن تھا اس لئے اضطراری طور پر عمرانی معاہدات جمع کئے گئے جس سے مربیوں قصباتی اور قومی نظام وجود میں آئے۔ فریڈرک لسٹ کا شمار ان معاشی مصلحین کی فہرست میں ہوتا ہے جنہوں نے یہ آواز بلند کی کہ۔

''معاشرہ کو متحارب افراد کے مختلف گروہوں کا مجموعہ نہیں بلکہ ترکیبی کل ہونا چاہیئے۔''

فریڈرک لسٹ، میولر اور مورس کی طرح مزدوروں میں یہ احساس پیدا کرنے کا بھی حامی تھا کہ وہ ایک کل کے اجزاء ہیں، لیکن اس کے لئے وہ فکری اور عملی کوئی بنیاد پیش نہ کرسکا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ تمام آراء و افکار حالات و ظروف کی وقتی تعبیرات کے سوا کچھ نہیں۔ جنہیں نہ تو علمی اور سائنسی کمال کا نام دیا جاسکتا ہے

اور نہ ہی فلسفہ زیست کا بلکہ اگر ان مخصوص احوال وظروف سے نظر ہٹا کر جائے جن کی تشریح اور تعمیر کے لئے یہ خیالات گھڑے گئے ہیں تو ان کی کوئی قیمت بھی نہیں رہتی۔

حضرت شاہ صاحبؒ کے فلسفہ ارتفاء کے بنیادی نقاط پیش کرنے سے پہلے ہم حضرت شاہ صاحب کی خصوصی اصطلاح ارتفاء کی تشریح کرتے ہیں۔اور یہ کہ اسے معاشی ومعاشرتی ارتقاء سے کیا تعلق ہے۔ارتفاق کے لفظ کا مادہ رفق ہے۔اس کا مطلب نرمی یا نرمی سے کام لینا ہے۔

حضرت شاہ صاحبؒ کی یہ اصطلاح معاشرتی مذہبی ،فکری ارتقاء سے بالعموم اور معاشی ارتقاء کے تصور سے بالخصوص متعلق ہے اس کی وضاحت یہ ہے کہ مثال کے طور پر پیدائش دولت کا عمل لیجئے۔

پیدائش دولت کا مطلب ،، دولت کو عدم سے وجود میں لانا یا اس کی تخلیق نہیں اور نہ ہی اس کا مفہوم اشیاء کے اندر ایسے فوائد جو خالق کائنات نے ان میں پیدا نہیں کئے۔کیونکہ اس معنی کی رو سے ایک انسان پیدائش کے عمل سے بالکل قاصر ہے۔دراصل پیدائش دولت کا عمل اشیاء کی قدر کی تصنیف ہے آسان سی مثال لیجئے جیسے بڑھئی لکڑی پر وقت صرف کر کے اسے میز کی شکل دے دیتا ہے جو قدرو قیمت میں لکڑی کے ایک ٹکڑے سے کہیں بڑھ کر ہے۔

اس مقصد کے لئے ایک انسان کو قدرتی اور طبعی شئی پر وقت خرچ کرنا پڑتا ہے،دماغی یا جسمانی محنت صرف کرنا پڑتی ہے اور آلات وسرمایہ بھی کام میں لانا پڑتا ہے تقسیم کار کے موجودہ دور میں اگرچہ یہ تمام کام علحیدہ علحیدہ شعبوں اور حصول میں بٹ چکے ہیں تاہم بنیادی طور پر یہی طریق کار ہے جس کی مدد سے وہ زندگی کے ہر شعبہ میں کامیابیوں سے ہمکنار رہا اور اس کی بدولت اس نے فطرت کو رام کرنا سیکھا پھر وہ اس راہ میں جوں جوں قدم آگے بڑھایا گیا توں توں اس کے لئے راستہ ہموار ہوتا گیا۔

یہی ترجمان اتفاق ہے اور یہی ارتقاء ترجمان۔

سر ارد ولی اللہی حضرت مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم نے تحریر فرمایا ہیں :۔

''اللہ کی پیدا کی ہوئی چیزوں میں سے اوزاروں کے ذریعہ تھوڑے
وقت میں کم طاقت خرچ کرنے سے بہت فائدے حاصل کرنے کو ارتفاق
صالح کہا جاتا ہے۔'' (۵۴)

کائنات کی وہ تمام اشیاء جو انسان کے لئے فائدہ بخش ہیں وہ خود بخود اس کے تصرف میں نہیں آتیں تصرف استفادہ کے لئے یہ اشیاء انسان کو اپنی سہولت اور فائدہ کے مطابق تیار کرنا پڑتی ہیں (۵۵)

ارتفاق کے اس عنوان کے تحت حضرت شاہ صاحب نے معاشی و معاشرتی ارتقاء کا جو فلسفہ پیش کیا ہے وہ دیگر تمام ارتقائی فلسفوں میں تاریخی اعتبار سے مقدم، فکری اعتبار سے مکمل، عقلی اعتبار سے موثق، روحانی اعتبار سے مؤید، فلسفیانہ اعتبار سے عالمگیر اور اصولی اعتبار سے فطری ہے۔

اس تشریح کے بعد امید ہے کہ شاہ صاحب کے فلسفہ کی بنیادی خصوصیات بہتر طریق سے ذہن نشین ہوسکیں گی۔

ذیل میں شاہ صاحب کے فلسفہ کی رو سے انسان کے معاشی و معاشرتی ادارات کے ارتقاء کے مندرجہ ذیل بنیادی عوامل کا اجمالی تعارف کرایا جاتا ہے۔

(۱) ارتقاء کا معاشی محرک

(۲) ارتقاء کا انسانی عامل

(۳) ارتقاء کا وجدانی ذوقی ونفسیاتی عامل

(۴) ارتقاء کا تجربی استقرائی و تیقنی عامل

(۵) ارتقاء کا جبلت، عقل اور قلب انسانی کی معرفت الٰہی، باطنی، قوائی عامل

(۶) ارتقاء کا تاریخی عامل

(۷) عمرانی ارتقاء کا عامل

شاہ صاحب بنیادی طور پر ان لوگوں کے خلاف ہیں جو ابتدائی انسان کو وحشت کا خوگر، ہم نوع دیگر افراد انسانی سے متنفر اور اس سے برسرِ پیکار بناتے ہیں۔ حضرت شاہ صاحب کے نزدیک اجتماعیت، معاشرت مدنیت انسان کی فطرت ہے الفت و مروف اس کی طبیعت ہے. ورتعاون ومواسات اس کی سرشت میں داخل ہے(۵۶)

اس لئے اس کے معاشرتی و معاشی ارتقاء کے اسباب داخلی اور طبعی ہیں، وضعی اور اضطراری نہیں۔ شاہ صاحب دیگر تمام مفکرین کی طرح انسانی خواہشات اور ان کی تسکین کے جذبہ کو معاشی محرک قرار دیتے ہیں (۵۷)

لیکن آپ کے نزدیک انسانی معیشت اور معاشرت کا ارتقاء اس کی تین دیگر خصوصیات پر مبنی ہے۔ ان میں سے پہلی انسانی خصوصیات ہے دوسری نفسیاتی اور وجدانی اور تیسری معاشرتی وعمرانی میکینکی خصوصیت ہے ان کے پیچھے اصل محرک معاشرتی خواہشات ہیں۔ وہ تین خواہشات یہ ہیں:۔

پہلی خصوصیت انسان میں طبعی محرک کے علاوہ ایک عقلی محرک یا منشاء کلی کا ہوتا ہے۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ ایک حیوان بحیثیت جبلی کے تحت عمل کرتا ہے لیکن انسانی اعمال کے پیچھے اس کا طبعی اور جبلی خواہش یا داعیہ کام نہیں کر رہا ہوتا بلکہ ایک عقلی مقصد اس کا اصل ہوتا ہے۔

مثال کے طور پر اپنے بنی نوع میں بہتر اخلاق کا طالب ہوتا ہے کے لئے کوشاں ہونا یا ملک میں صالح نظام و معاشرت و معیشت کیلئے جدوجہد کرنا۔ یہ سب طبیعت وجبلت سے بلند تر عقلی وکلی تقاضے ہیں۔ (۵۸)

گویا انسان میں، مغرب کے موجدین کو چھوڑ کر بنی نوع انسانی سے ہمدردی، اس کی موجودہ فلاح بہبود اور اس کی ترقی وخوشحالی کا جذبہ پنہاں ہے، شاہ صاحب کے نزدیک یہی جذبہ ہے جو ترقی کیلئے مشعل راہ کا کام دیتا ہے۔

انسان کی دوسری خصوصیات وجدانی اور ذوقی ہے۔ اس کو یوں سمجھنا چاہئے۔ کہ انسان اپنی خواہشات کی تسکین حیوانوں کی طرح نہیں کرتا بلکہ ان کے لئے ایسا ماحول تیار کرتا ہے جو اس کے ذوق سلیم اور وجدان و مذاق کا آئینہ دار ہو۔ (۵۹)

مثال کے طور وہ کھانے کی خواہش ایک جانور کی طرح نہیں مٹاتا بلکہ کھانے کے لئے ایک طریقہ و سلیقہ ایک ماحول تیار کرتا ہے جو اس کے ذوقِ لطافت و نظافت کو تسکین دے۔ اسی طرح وہ مشروب بھی خوشگوار چاہتا ہے قرآن مجید میں بھی انسان کی اس فطری خصوصیت کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ کیونکہ اس نے جہاں انسان کے رہنے کی جگہ کا ذکر فرمایا ہے۔ تو اسے یوں بیان فرمایا ہے۔

''ومساکن ترضونہا''

یعنی مسکن جو اس کے ذوق حسن جمال کی تکمیل کرتے ہیں اس سے عیاں ہے کہ انسان کو صرف مسکن نہیں مسکن کے ساتھ کچھ اور بھی ذوقی داعیہ کی تکمیل مطلوب ہے۔

انسان کی تیسری خصوصیات استنباط اور تقید کا ملکہ ہے۔

شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ انسانوں میں سے کچھ اس قدر دانشمند اور ذی شعور ہوتے ہیں۔ جو خواہشات کے احساس مقاصد کے ادراک کے ساتھ ان کی تسکین کے لئے عمدہ اور صالح تدابیر کا استنباط کرتے ہیں اور کچھ ایسے ہوتے ہیں جنہیں یہ ملکہ نصیب نہیں ہوتا ان لوگوں کے دلوں میں مقاصد و مدعا تو پیدا ہوتے ہیں مگر وہ ان کی بہترین حل کا استنباط نہیں کر پاتے اول مذکورہ کو باری تعالیٰ نے مقاصد اور ان کی تکمیل کا تفصیلی ملکہ بخشا ہوتا ہے۔ اور موخرالذکر کو اجمالی، اس لئے یہ لوگ جب پہلی قسم کے لوگوں کے استنباط کو معلوم کرتے ہیں تو اپنے علم اجمالی کے موافق پاکر اس پر عمل پیرا ہوتے ہیں۔ (۶۰)

علم اجمالی کی سادہ اور سرسری مثال ایک معصوم بچے کی لیجیے۔ جسے مثال کے طور پر پیاس کا احساس ہوتا ہے۔ وہ روتا ہے اس کی ماں اس کے حلق میں پانی کے چند قطرے اتارتی ہے۔ تو اس سے وہ سکون اور تسکین کا

وجدان حاصل کرتا ہے فی الحقیقت یہی ملکہ اجمالی ہے۔ جو اسے خواہش کا شعور دیتا ہے۔ اور تسکین کا احساس لیکن پانی ملنے سے پہلے وہ اس پر قادر نہیں جو تفصیلی طور پر بتا سکے کہ اس کی پیاس کیونکر بجھے گی ان ہی دونوں ملکوں میں سے ملکہ اجمالی تقلید کرتا ہے۔ تو ملکہ تفصیلی استنباط کرتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ سائنس اور ٹیکنالوجی کی ارتقائی تعبیر کرنے کے فلسفیانہ پہلو بیان کرنے میں شاہ صاحب سے کوئی بھی آگے نکل نہیں سکا۔

اس پر بس نہیں، حضرت مجدد الف ثانی، قطب زماں، فلاسفی دوراں، جناب شاہ صاحب نے انسان کی ان منازل اور ارتقاء کے سلسلے میں ایک اور در مکنون، سرنہاں اور راز درون کا انکشاف کیا ہے۔ جس کے بغیر تمام نظریہ ارتقاء لغو اور بے بنیاد تھے۔ یہ ہے کہ کارگاہ ہستی کے اس عظیم الشان نظام کے پیچھے ایک بلند تر اور حقیقت اور ایک حق معروف عدل ہے جو عالم کی حیات کو اس کی جہت زیست کے ہر شعبہ میں اور اس کے سفر ارتقاء کے قدم پر اس کی رہنمائی فرماتا ہے۔ اور اسے راہ دکھاتا ہے۔ (۱)

اس لئے حضرت شاہ صاحب کے نزدیک معیشت و معاشرت کا یہ ارتقاء محض اکتسابی، وجدانی اور عقلی ہی نہیں بلکہ تو دیعی اور وہبی ہے۔

شاہ صاحب ذی حیات کے اندر یعنی اس کیفیت نور اور اس کے جلاء کو اپنی خاص اصطلاح میں ''الہام'' کا عنوان دیتے ہیں۔ اس بارے میں شاہ صاحب کی تفصیلات کا اجمالی تجزیہ کیا جائے تو الہام کی تین قسمیں بنتی ہیں۔

اول جبلی الہام، الہام کی یہ قسم عام ہے۔ اس میں ہر ذی حیات شامل ہے۔ انسان ہو یا غیر انسان یہ بقاء وجود کا جہت حیوان کی معرفت الہام ہوتا ہے۔

اس کے علاوہ دیگر دو قسمیں صرف انسان کے ساتھ خاص ہیں پھر انہیں سے ایک عقلی ہے۔ یعنی عقل وجدان اور ذہنی وشعور کی معرفت الہام اس میں عقلاً حکماء اصلحاء، وانبیاء تمام شامل ہوتے ہیں۔

اور دوسری قسم قلبی الہام کی ہے۔ یہ صرف انبیاء کے قلوب قدسیہ پر وارد ہوتے ہیں۔ (۶۲)

اس سے یہ حقیقت بھی عیاں ہوگئی کہ حضرت شاہ صاحب کے نزدیک ارتقاء اور ارتفاق اس کی فطرت میں اس کی تودیع گئی ہے۔ اور بشری طبع میں اس کی تودیع شاہ صاحب کے نزدیک کسی دلیل کی محتاج نہیں فرماتے ہیں۔

"علم الارتفاق کا بشری طبع میں نزول ایک بدیہی اور اظہر من الشمس حقیقت ہے جس کے لئے کسی دلیل کی ضرورت نہیں اس کی مثال ایسی ہے جیسے چرند و پرند کے سینوں میں بقاء زیست کے جبلی احساس کا نزول" (۶۳)

حضرت شاہ صاحب نے ارتقاء کے اس فلسفیانہ اور استخراجی طریق استدلال کو مستقل تاریخی شواہد سے موثق اور مدلل فرمایا ہے اور تاریخی اعتبار سے اس کے چار منزلوں میں تقسیم (ارتقاء کی پہلی منزل) فرمایا ہے۔ شاہ صاحب کے نزدیک (پہلی منزل ارتقاء) کا سراغ حضرت آدم کے دور کی معیشت اور معاشرت میں ملتا ہے۔ دوسری اور تیسری منزل کا سراغ سیدنا حضرت ادریسؑ، حضرت سلیمانؑ اور حضرت موسیٰ کے ادوار میں ملتا ہے اور اس کی آخری منزل بین الاقوامی اور عالمگیر معیشت اور معاشرت کی ہے۔ (۶۴)

شاہ صاحب کی نگاہ میں انسان کا یہ معاشرتی ومعاشی ارتقاء طبعی فطری اور داخلی، خارجی اور اضطراری یا وضعی نہیں اس لئے یہ فطرت کی طرح ہم آہنگ یکساں اور عالمگیر ہے۔ معاشرت اور معیشت کے اس ہمہ گیر نظام کے تمام فکری وعملی اصول نبی کریم ﷺ کی تعلیمات سے ملتے ہیں۔ (۶۵)

شاہ صاحب انسانیت کے عمرانی ارتقاء کو بھی معاشی ارتقاء کا اہم عامل قرار دیتے ہیں۔

اور اس کی پانچ منزلیں ہیں:۔

پہلی منزل:

ایک چھوٹے معاشرے کی ہے جو کہ کوہ وصحرا میں بسنے والے چھوٹے چھوٹے اجتماعات پر مشتمل تھا۔ یہ آبادیاں ایک دوسرے سے دور واقع تھیں۔ مختلف آبادیوں کا باہمی معاشی تعاون وتبادل رائج نہ تھا۔ صحرا کی

مختصر تھیں یہ آبادیاں اپنی اپنی جگہ خود کفیل معیشت کے صوبوں کے مطابق تعاون و تبادل کی سادہ اور ابتدائی شکلوں پر عمل پیرا تھیں۔

حضرت شاہ صاحب کے نزدیک کوئی اجتماع اور معاشرہ خواہ جس قدر مختصر ہی کیوں نہ ہو ارتفاق اول سے خالی نہیں ہوتا۔(٦٦)

دوسری منزل:

میں انسانی آبادی بڑھ گئی۔ وسائل نقل و حمل میں ترقی ہوئی۔ دور دور آبادیاں قریب تر ہو گئیں۔ تعامل و تبادل عام ہوا۔ تجربات و مشاہدات اور افکار میں ہم آہنگی پیدا ہونا شروع ہو گئیں پہلی منزل کی معاشی و معاشرتی صور و طریقے جو نہایت سادہ تھے اب نکھرنا شروع ہوئے ان میں حسن و جمال، ذوق و لطافت، اور استنباط و تجربیت کا زیادہ خیال کیا جانے لگا۔ ارتفاق اول کے اعمال زیادہ ترقی یافتہ صورتوں میں انجام پانے لگے۔(٦٧)

تیسری منزل:

سیاست کی منزل ہے جب منتشر آبادیوں نے سمٹ کر شہروں کا روپ دھار لیا صنعت و حرفت اور زراعت کو ترقی ہوئی۔ معاشی معاملات وسیع پیمانے پر رونما ہوئے۔(٦٨)

اور جب ان ممالک اور اقوام کا باہمی میل جول ہوا معاشی ربط و ضبط نے ایک قدم آگے بڑھایا تعاون و تعامل بڑھا وسائل نقل و حمل نے نئی کروٹ لی تو چوتھی، آخری اور ارتقاء کی بین الاقوامی، بین مملکتی اور بین العالمی منزل سامنے آئی گویا پہلی منزل دیہاتی معیشت کی، دوسری منزل شہری معیشت کی، تیسری منزل ملکی معیشت کی اور چوتھی بین الاقوامی نظام معیشت کی ہے۔

حضرت شاہ صاحب نے آخری منزل بین الاقوامی ادارے، ان کی تشکیل اور ان کی نوعیت پر بھی سیر حاصل بحث فرمائی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ حضرت قائم الزمان رحمتہ کو استقرائی اور تجربی بتاتے ہیں

اور فرماتے ہیں کہ:۔

''انسانی جمعیت استنباط تدابیر کے سلسلے میں اکثر و بیشتر ایسی شخصیتوں کی محتاج رہی ہے جو چشمہ حکمت و دانش ہوں انسانی ضروریت سے واقف ہوں۔ معیشت کے طریقوں سے شناسا ہوں اور محض مصلحت کلی کو سامنے رکھ کر نتائج اخذ کرنے کے عادی ہوں۔ (۶۹)

لیکن مصلحت کلی اور عالمگیریت کا یہ انداز قومیت کے موجودہ مغربی جنون میں کبھی پیدا نہیں ہوسکتا۔ اس کیلئے اسلام کے عالمگیر اصول ہی بنیاد کا کام دے سکتے ہیں۔ ورنہ دیگر انداز مفضی الی الجہاں معاش ہوگا۔ (۷۰)

اس کا مقصود اصلی یہ ہے کہ تمام انسانیت کو ایک قطعہ پر جمع کرے اور سب فکروں سے بلند فکر یہ سب سے بلند بین الاقوامی نظریہ جو ساری انسانیت پر جامع ہو اس کی طرف لوگوں کو جائے۔ اور ان سے ان پر عمل کرائے انٹرنیشنل انقلاب یہ مضمون میں نے قرآن مجید کی آیت۔

''ھو الذی ارسل رسول '' سے استنباط کیا ہے۔ (۷)

خود حضرت شاہ صاحبؒ کے نزدیک اس زمانہ فکر کی اشاعت مشیت ایزدی کا تقاضا ہے اور اس کی طرف لوگوں کو دعوت دینا اور جمع کرنا جہاد ہے بدور بازغہ میں فرماتے ہیں۔

دکن من المجاهدین بانحصار الغرض الالهی الخ

تم اس فکر کو ملکی اور بین المملکتی، قومی اور بین الاقوامی، ملی اور بین الملی سطح پر غالب کرنے اور شائع کرنے کے لئے معیشتِ خداوندی کے علمبردار بن جاؤ کیونکہ یہ جہاد سے کم نہیں۔ (۷۲)

☆ ☆ ☆

باب سوم

فصل چہارم
علم اخلاق اور علم المعیشت کا باہمی ربط و تعلق
حضرت شاہ ولی اللہ کا ایک خاص نظریہ

علم اخلاق کا موضوع:

''علم الاخلاق کے ساتھ علم المعیشت کا تعلق'' ہے مگر حکماء اسلام میں چونکہ صرف حکیم الامت شاہ ولی اللہ (نور اللہ مرقدہ) نے اس ''تعلق'' کو ''علم الاخلاق'' میں بہت اہمیت دی ہے اور حکمت ولی اللہ ہی میں اس کا مقام بہت بلند ہے اس لیے اگر ہم اس کی تعبیر ان الفاظ میں کریں کہ شاہ ولی اللہ کے فلسفہ کا خصوصی امتیاز کیا ہے؟ تو یہ صحیح اور برمحل ہوگا۔

حکمت کی تعریف:

جدید وقدیم فلاسفہ اور حکماء نے فلسفہ حکمت کی جو تعریفیں کی ہیں ان کا خلاصہ اور نچوڑ اس طرح کیا جا سکتا ہے حکمت نام ہے قول وعلم میں درست کاری اور حق وراستی کی معرفت کا پس اگر یہ معرفت اور درست کاری اشیاء کے پوشیدہ اسرار اور اسباب ومسببات کے باہمی تعلق وارتباط سے آگاہ کرتی ہے تو اس کو حکمت آملیہ کہتے ہیں۔

اس پوری حقیقت کو قرآن عزیز نے اپنے معجزانہ انداز میں اس طرح بیان کیا ہے:

من یوت الحکمة فقد اوتی خیرا کثیرا (۲۰۹)

جس شخص کو ''حکمت'' سے حصہ دیا گیا ہے بلاشبہ اس کو زبردست بھلائی دی گئی اور بہت بڑا

کمال بخشا گیا اور اگر مندرجہ بالا معرفت اور آگاہی رموزِ قدرت کے مطابق ہر شے کو اس کے مناسب جگہ دی تو اس کو ''حکمت عملی'' کہا جاتا ہے۔

حکمت کی عظمت:

حکمت اپنے اندر کیسے عظیم الشان کمالات رکھتی ہے اور جبات انسانی کے ارتقاء میں اس کا درجہ کس قدر بلند اور پر عظمت ہے، اس کا اندازہ جدید وقدیم علمی کائنات کے اس ذخیرہ سے ہوسکتا ہے جو علمی نظروں اور علمی سائنس کے ذریعہ ہماری مادی زندگی کی ترقی اور سربلندی کے بیش بہا خدمات انجام دیتا رہا، اور دے رہا ہے۔

نیز ہماری روحانی نشو ونما اور کمالات کے ارتقاء کا ضامن اور کفیل ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ خالق علوم نے اپنی ذات کے ساتھ اس کمال کو متصف ظاہر کیا ہے۔

انک انت العلیم الحکیم (بلاشبہ تو ہی علم والا، حکمت والا ہے یعنی سرچشمہ علم وحکمت ہے)

حکمت اور علم الاسرار:

یہی حکمت جب ''قوانین الٰہی'' (شریعت حقہ) کے رازہائے سربستہ اور حقائق ورموز سے آگاہی میں استعمال کی جاتی ہے تو اس کا نام ''علم الاسرار'' ہو جاتا ہے۔ اس وقت اس کا منشا یہ ہوتا ہے کہ وہ بتائے کہ دین ومذہب کے قوانین واصول کس طرح عقل وفطرت (نیچر) سے مطابقت رکھتے اور کس طرح کائنات کے انفرادی واجتماعی نظام کے لیے باعث فلاح وسعادت ہیں۔

دینی فلاسفر اور حکماء:

اسلام میں سرتاج انبیاء محمد رسول اللہ ﷺ کے بعد فلسفہ وحکمت کے اس خاص شعبہ ''علم الاسرار'' کا معلم اول عمر بن الخطاب (فاروق اعظمؓ) ہے اور معلم ثانی علی ابی طالب (حیدر کرارؓ) کو سمجھا جاتا ہے۔ عورتوں

میں یہ سعادت سب سے پہلے عائشہ صدیقہؓ کے حصہ میں آئی ۔ اس کے بعد اسلامی گہوارہ میں بہت سی ماؤں نے ایسے بچوں کی پرورش کی جو غزالی، قشیری، رازی، ابن تیمیہ، ابن نعیم اور احمد سرہندی بن کر اس فلسفہ و حکمت کے ''امام'' کہلائے۔

حکیم الامۃ امام ولی اللہ دہلوی:

لیکن بارہویں صدی ہجری کے شروع میں یوپی کے غیر معروف قصبہ پھلت میں معلم اول حضرت عمر بن الخطابؓ کی نسل سے ایک بچہ نے عالم وجود میں قدم رکھا، والدین کی جانب سے اگرچہ اس کو احمد سے موسوم کیا گیا لیکن اپنی فطری کمالات اور ''علم الاسرار و حکمت'' کی امانت کبریٰ نے اس آفتاب حکمت کو دارالسلطنت دہلی میں ''ولی اللہ'' کے لقب سے مشہور کیا۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ فیلسوفِ امت ولی اللہ دہلوی نے حکمت ربانی اور فلسفہ الٰہی کا جو اسلوب قائم کیا وہ اپنے تمام پیشواؤں سے زیادہ ممتاز اور اپنی حیثیت سے بہت زیادہ توقع ہے یہی نہیں بلکہ تمام اسلامی وغیرہ اسلامی حکماء فلاسفر کے نظریہ اخلاق میں وہ حقیقت مفقود نظر آتی ہے جو اس حکیم و متصوف کے یہاں بدرجہ کمال پائی جاتی ہے۔

حکیم الامۃ کا نظریہ اخلاق:

شاہ ولی اللہ بہت سی پُرعظمت کتابوں کے مصنف ہیں جو مختلف علوم و فنون کا نادر ذخیرہ ہیں اگر ان کی تصنیفی زندگی کا شاہکار ''حجۃ اللہ البالغہ'' ہے۔ یہ کتاب علوم عقلیہ و نقلیہ کا بیش بہا گوہر اور انمول ہوتی ہے علم اسرار'' اور حکمت ربانی'' کے پیش نظر شاہ صاحب نے اس میں وہ سب کچھ سپرد قلم کر دیا ہے جو انسانی سعادت کے انفرادی و اجتماعی دونوں پہلوؤں اور دینوی و اُخروی دونوں زندگیوں سے متعلق ہے۔

اس کتاب کا ایک حصہ ''علم الاخلاق'' سے متعلق ہے جس میں اخلاق کے علمی نظریوں اور عملی درست کاریوں کو بہترین طرز نگارش کے ساتھ واضح کیا گیا ہے۔ دوسری کتابوں میں جب آپ ''علم الاخلاق'' ان

مباحث کا مطالعہ کریں گے جن میں ''علم الاخلاق کا دوسرے علوم سے تعلق'' پر بحث کی گئی ہے تو تمام علماء اخلاق اور حکماء فلاسفر کو اس پر متفق پائیں گے۔

حالانکہ جرمن فلاسفر آگسٹ اور کاؤنٹ اور انگریز فلاسفر ہربریٹ اسپنسر تو ان مشاہیر فلاسفروں میں سے ہیں۔ جنھوں نے ''علم اخلاق'' کے ساتھ علم الاجتماع اور علم الارتقاء کو منطبق کرنے کے لئے بہت سے جدید اور وسیع نظریوں سے کام لیا ہے۔ لیکن ان میں سے کسی ایک کی بھی پرواز فیال اس رفعت و بلندی تک نہ پہنچ سکی جو ولی اللہ دہلوی کے حصہ میں آئیں ہیں۔

متاخرین علماء اخلاق عارف رومی، سعدی اور شیخ سرہندی نے اخلاقیات پر بہت کچھ کہا اور خوب کہا مگر دنیا کے اجتماعی اخلاق کی برتری یا بربادی جو چیز سب سے زیادہ اثر انداز ہے اور ہوتی رہی ہے۔ یعنی ''اقتصادیت'' اس کا نشان یہاں بھی نہیں ملتا۔

غرض ولی اللہ دہلویؒ کی مشہور کتاب ''حجۃ اللہ البالغہ'' وہ پہلی کتاب ہے جس نے ہم کو اس بیش قیمت عملی نظریہ سے روشناس کرایا کہ ''اجتماعی علم اخلاق کی فلاح'' و سعادت، اجتماعی معاشیات کا عادلانہ نظام پر موقوف ہے۔ اور یہ کہ دنیا کی قوموں کا اجتماعی اخلاق اس وقت تک صحیح تعبیر نہیں ہو سکتا جب تک کہ ان کے درمیان ایک ایسا اجتماعی اقتصادی نظام قائم نہ ہو جائے جو افراط اور تفریط سے پاک عادلانہ اصول رکھتا ہو۔

امام الحکمہ ''ولی اللہ'' کے علاوہ تمام علماء اخلاق جدید ہوں کہ قدیم یہ سمجھتے رہے ہیں کہ قوموں کے اجتماعی اخلاق کو 'حسین' بنانے کیلئے عمدہ اخلاقی نظریوں کے غازہ کی ضرورت ہے۔

اس لئے انہوں نے جدید علم اخلاق کو علم الاجتماع پر منطبق کرنے کی زبردست کوشش کی جائے۔ اگر یہ ہو جائے تو پھر اجتماعی اخلاقیات کا تازہ خون خود بخود جسم اقوام میں دوڑنے لگے گا۔ اور اس کے حسن و زیبائش کے لئے کسی خارجی پوڈر اور غازہ کی ضرورت نہیں رہے گی۔

اجمال کی تفصیل:

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ علمائے اخلاق کے نزدیک یہ تسلیم شدہ مسئلہ ہے کہ علم اخلاق کا علم الاجتماع کے ساتھ گہرا تعلق ہے اور اس کی وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ:

> ''انسان کی زندگی اجتماعی زندگی کے بغیر ناممکن ہے۔ لہذا وہ ہمیشہ کسی نہ کسی جماعت کا فرد ہو کر ہی زندہ رہ سکتا ہے۔ اور یہ ہماری قدرت سے باہر ہے کہ ہم کسی ایک فرد کے فضائل سے اس طرح بحث کریں کہ جس جماعت کی جانب وہ منسوب ہے اس سے بالکل قطع نظر کر لیں اس لئے کہ اس کے بغیر ہم یہ کیسے جان سکتے ہیں کہ جس جماعت سے اس کا تعلق ہے اس کے اندر کون سے اوصاف ہیں جن سے فضائل و محاسن اخلاق میں مدد ملتی یا رکاوٹ پیدا ہوتی ہے۔'' (۳۰)

حقیقت حال یہ ہے کہ انسان نہ صرف کسی ایک بلکہ بہت سے روابط کے ساتھ ناگزیر طور پر مربوط ہے، اور اس طرح وہ اپنے کنبہ کا بھی عضو ہے۔ شہرہ قریہ کا بھی قوم کا بھی فرد ہے اور پھر انسانی دنیا کا بھی۔ ان حقائق کے پیش نظر انفرادی اخلاق کا تعلق اجتماعی اخلاق کے ساتھ ناگزیر امر ہے۔ اور اگر یہ صحیح ہے تو پھر بلاشبہ علم اخلاق کا تعلق علم اجتماع کے ساتھ بھی ایک ناقابل انکار حقیقت ہے جسے شاہ ولی اللہ نے خصوصیت کے ساتھ ''بحث ارتفاقات'' کے عنوان سے اس مسئلہ پر سیر بحث کی ہے۔ (۳۱)

افلاطون کبھی اپنے استاد سقراط کی تقلید کرتا نظر آتا ہے اور کبھی ''خواہشات نفس پر ضبط اور کنٹرول'' کو سب سے بڑی فضیلت شمار کرتا ہے۔

ابن مسکویہ ارسطو کی تائید میں مصروف ہے اور دور حاضر کے علماء فضائل اجتماعیہ کو بغیر کسی برتری اور فضیلت کے مختلف اقسام میں تقسیم کرتے نظر آتے ہیں۔ شیخ ولی اللہ دہلوی نے اصول اخلاق کو چار حصوں میں

تقسیم کرتے ہوئے''اجتماعی اخلاق''' کے لئے صرف ایک ہی فضیلت کو''اصل''اور''معیار'' قرار دیا ہے اور وہ''عدل'' ہے چنانچہ فرماتے ہیں:۔

''عدالت ہی ایک ایسی اساس ہے کہ جب انسانی اطوار زندگی مثلاً نشست و برخاست خواب و بیداری رفتار و گفتار اور شکل ولباس وغیرہ میں اس کا لحاظ کیا جائے تو اس کو''ادب'' کہتے ہیں اور جب مالی حیثیت جمع خرچ سے متعلق امور میں اس کو پیش نظر رکھ جائے تو اس کا نام''کفایت'' ہے اور اگر تدبیر مملکت میں اس کو بنیاد بنایا جائے تو اس کو''سیاست'' کہا جاتا ہے اور اگر اس کو باہمی اخوت و محبت و تعلقات میں اساس بنایا جائے تو اسے''عدل'' کو حسن معاشرت کا نام دیا جاتا ہے''۔(۳۲)

اجتماعی اخلاق میں''عدل'' کی حیثیت کو جس طرح شاہ صاحب نے ظاہر فرمایا ہے''علماء حق کے لئے یہ ایک ایسا بہترین نظریہ ہے جو''فضیلت'' سے متعلق،قدیم و جدید تمام مباحث کے اختلاف کے لئے ایک ''محاسبہ''اور فیصلہ کن مسئلہ کی طاقت رکھتا ہے اور اس سے اجتماعی اخلاق میں''عدل'' کی ترقی کے ساتھ ساتھ وہ تمام مشکلیں بھی حل ہو جاتی ہیں جو''فضیلت'' کی بحث میں علمائے اخلاق کے سامنے رونما ہیں۔

عدل کا تعلق نظام سے:

فلیسوف امۃ''شاہ ولی اللہ''اجتماعی اخلاق میں''عدل'' کو یہ حیثیت کیوں دیتے ہیں؟اس کا جواب خود انہوں نے''عدالت'' کی تعریف کرتے ہوئے دیا ہے حجۃ اللہ میں ارشاد فرماتے ہیں ۔

''عدالت ایک ایسی ملکہ کا نام ہے جس کے ذریعہ سے تدبیر منزل سیاست مملکت اور اسی قسم کے اجتماعی معاملات کے لئے سہولت اور آسانی کے ساتھ ایک عادل اور پر از خیر نظام قائم ہو جاتا ہے دراصل یہ ایک ایسی

نفسیاتی کیفیت کا نام ہے جس سے ایسے لطیف ورا فکار کلیہ اور سیاست عا یہ پھوٹ نکلتے ہیں جو اللہ تعالیٰ اور اس کے عامل روحانیت کے نزدیک ٹھیک مناسب ہوں''۔ (۳۳)

اور فیوض الحرمین میں خلق حسن ''سمت صالح'' کی بحث میں تحریر فرماتے ہیں۔

''اخلاق انسانی میں ایک خلق کا نام ''سمت حسن'' (نیک شرست) ہے اس کی حقیقت یہ ہے کہ اس کے ذریعہ سے نفس نا صقہ ان اعمال و اخلاق میں بیداری اور توجہ کامل حاصل کر لیتا ہے جو اس کے اور خدا کے درمیان اور خدا کی تمام مخلوق کے درمیان وابستہ ہیں اور ایسے نظام صالح'' کی جانب راہ پاتا ہے جو رضائے الٰہی کا منشا ہے سو جب اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی بھلائی چاہتا ہے تو ان کے اعمال و اخلاق کی سمجھ عنایت کرتا اور ''عادلانہ نظام'' کی جانب راہنمائی کرتا ہے''۔ (۳۴)

معیشت کا نظام اور علم الاخلاق:

اس طویل بحث کو اب اس طرح ترتیب دیجیے کہ ''انسان'' اگر اخلاق کریمہ سے متصف نہیں ہے تو پھر وہ حیوانوں اور چوپایوں سے بدتر ہے اور اللہ قرآن پاک میں بیان فرماتا ہے کہ:

لَھم قلب لاَیفقہون بھاولھم اَعین لاَیبصرون بھاوَلھم لا یسمعون بھااولیک ھم الغفلون . (۳۵)

ان کے دل ہیں پر سمجھتے نہیں، ان کی آنکھیں ہیں پر دیکھتے نہیں۔ ان کے کان ہیں پر سنتے نہیں۔ یہ چوپاؤں کی طرح ہیں۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ بے راہ ہیں یہی ہیں جو غفلت میں سرشار ہیں۔

اخلاق میں انفرادی اخلاق سے زیادہ اجتماعی اخلاق کا رتبہ ہے قرآن عزیز نے اگرچہ جدا جدا ہر قسم

کے اخلاقی اصول بیان کئے ہیں لیکن جس آیت جو جامع اخلاق کہا گیا ہے۔ اس میں ان ہی اخلاق کریمانہ کا ذکر کیا ہے جو اجتماعی اخلاق کہلاتے ہیں۔ چنانچہ ارشاد ہے:

ان اللہ یا مرکم بالعدل و لا احسان و ایتاء ذی

القربیٰ. (۳۶)

ترجمہ: بلاشبہ اللہ تعالیٰ تم کو حکم دیتا ہے بے عدل کا حسان کا ور

قربت والوں کے ساتھ محسن اور داد و دہش کا۔

پھر یہی آیت اس کیلئے بھی ناطق ہے کہ اجتماعی میں بھی ''عدل'' کا درجہ بلند و برتر ہے۔

سئے کہ عدل ہی سے احسان تک رسائی ہوتی ہے اور ''عدل'' ہی ''ایتاء ذی القربی '' کی توفیق بخشتا ہے اور 'عدل' کا درجہ بلند و بالا ہے اس لئے کہ آیت میں اس کو اولیت کا شرف بخشا گیا۔

پھر ''عدل'' ہی اس چیز کو منصۂ شہود پر لاتا ہے۔ جو اجتماعی بلکہ اجتماعی حیات کا دارومدار ہے۔ یعنی ''نظام صالح'' بلاشبہ یہ ایک محور مرکز ہے۔ اور تمام اجتماعی مسائل اس کے گرد ہی گھومتے نظر آتے ہیں۔ صرف اسی کے وجود سے اجتماعیت کا وجود ہے۔ اور اسی فساد و فتنہ میں اجتماعیت کا فساد و فتنہ مضمر ہے۔

الحاصل ان ہر سہ درجات و منازل کے بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ عدل و صالح نظام کی صلاحیت اور اس کا فساد کس شے کے ساتھ وابستہ ہے؟ یہ بظاہر ایک بہت زیادہ اثر انداز ہے۔

پس شاہ صاحب کے زیر بحث نظریہ اخلاق کے پیش نظر اجتماعی اخلاق اور عادلانہ معاشی نظام میں ایسا تلازم ہے جو کسی طرح ایک دوسرے کو جدا ہونے نہیں دیتا اور شاہ صاحب کی نظر میں اجتماعی اخلاق میں حسن و کمال جب ہی پیدا ہوسکتا ہے کہ حکومت کا معاشی نظام ایسے اعتدال پر ہو کہ جس میں عیش پسندی کا دخل نہ ہو، نہ افلاس اور فقر و فاقہ کا اور نہ وہ معاشی استبداد اور آئینی استحصال بالجبر پر قائم ہو اور نہ معیشت کے ترقی پذیر ذرائع سے خالی اور محروم ہو۔

☆ ☆ ☆

باب سوم حوالہ جات

۱۔ تاریخ دعوت عزیمت — مولانا ابوالحسن ندوی — کراچی — مجلس نشریات اسلام ۱۹۸۴ء — ص ۴۸ جلد پنجم

۲۔ تاریخ دعوت عزیمت — محولا بالا — ص ۴۴ جلد پنجم

۳۔ تاریخ دعوت عزیمت — محولا بالا — ص ۴۰ جلد پنجم

۴۔ تاریخ اقوام عالم — مرتضیٰ احمد خان — لاہور — مجلس نشریات اسلام ۱۹۵۸ء — ص ۵۹۵

۵۔ شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات — خلیق احمد نظامی — لاہور — ادارہ اسلامیات ۱۹۷۸ء — ص ۵۱

۶۔ شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات — محولا بالا — ص ۵۲

۷۔ تفہیمات الٰہیہ — شاہ ولی اللہ — حیدرآباد — شاہ ولی اللہ اکیڈمی ۱۹۶۷ء — ص ۳۶ جلد اول

۸۔ تفہیمات الٰہیہ — محولا بالا — ص ۴۰

۹۔ تاریخ اقوام عالم — محولا بالا — ص ۵۵۰

۱۰۔ شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات — محولا بالا — ص ۱۵۵

۱۱۔ شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات — محولا بالا — ص ۴۲

۱۲۔ شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات — محولا بالا — ص ۴۳

۱۳۔ شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات — محولا بالا — ص ۵۰

۱۴۔ شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات — محولا بالا — ص ۴۳

۱۵۔ تفہیمات الٰہیہ — محولا بالا — ص ۱۲۹

۱۶۔ شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات — محولا بالا — ص ۵۱

۱۷۔ فقہائے ہند — محمد اسحاق بھٹی — لاہور — ادارہ ثقافت اسلامیہ ۱۹۸[illegible]ء — ص ۲۵۵ جلد پنجم

۱۸۔ تاریخ دعوت عزیمت — محولا بالا — ص ۳۲۹ جلد پنجم

۱۹۔ شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات — محولا بالا — ص ۵

۲۰۔ شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات — محولا بالا — ص ۳۴

۲۱۔ شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات — محولا بالا — ص ۸۹

۲۲۔ شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات — محولا بالا — ص ۲۱

۲۳۔ شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات — محولا بالا — ص ۴۰

۲۴۔ شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات — محولا بالا — ص ۱۷۸

۲۵۔ حجۃ اللہ البالغہ — شاہ ولی اللہ — مکتبہ سلفیہ لاہور ۱۹۷۵ء — ص ۳۵ جلد اول

۲۶۔ اصول فقہ اور شاہ ولی اللہ — ڈاکٹر مظہر بقاء — کراچی بقاء پبلیشرز گلشن اقبال ۱۹۸۶ء — ص ۵۳۳

۲۷۔ القرآن الکریم — ۱۳: ۱۷

۲۸۔ القرآن الکریم ۱۳: ۲۶۹

۲۹۔ القرآن الکریم ۲۳:۲

۳۰۔ اخلاق اور فلسفہ اخلاق — مولانا حفیظ الرحمن سیوہاروی — لاہور — مکتبہ تنویر القرآن، ۱۹۷۶ء ص: ۲۲۱

۳۱۔ اخلاق اور فلسفہ اخلاق — محولا بالا — ص ۲۳۵

۳۲۔ حجۃ اللہ البالغہ — محولا بالا — ص ۲۸۰ جلد اول

۳۳۔ تاریخ دعوت عزیمت — محولا بالا — ص ۶۱

۳۴۔ تاریخ دعوت عزیمت — محولا بالا — ص ۶۲

۳۵۔ القرآن الکریم ۷۹:۷

۳۶۔ القرآن الکریم ۹۰:۷

۳۷۔ حجۃ اللہ البالغہ — محولا بالا — ص: ۱۰۵ جلد اول

۳۸۔ اسلام کا معاشی نظام — ڈاکٹر نور محمد غفاری — لاہور — مرکز تحقیق دیال سنگھ لائبریری ۱۹۹۲ء ص ۲۰۸

۳۹۔ اسلام کا معاشی نظام — محولا بالا — ص ۲۰۹

۴۰۔ حجۃ اللہ البالغہ — محولا بالا — ص: ۱۰۳ جلد اول

۴۱۔ القرآن الکریم ۸۸:۵

۴۲۔ حجۃ اللہ البالغہ — محولا بالا — ص ۷۵ جلد اول

۴۳۔ الرحیم ماہنامہ — محولا بالا — حیدرآباد شاہ ولی اللہ اکیڈمی ۱۹۶۸ء ص: ۱۵

۴۴۔ علماء دیوبند کا شاندار ماضی — سید محمد میاں — کراچی — مکتبہ رشیدیہ ۱۹۸۶ء ص ۳۰

۴۵۔ حجۃ اللہ البالغہ — محولا بالا — ص ۱۳ جلد اول

۴۶۔ علماء دیوبند کا شاندار ماضی — محولا بالا — ص ۱۵ جلد اول

۴۷۔ حجۃ اللہ البالغہ — محولا بالا — ص ۱۰۶ جلد اول

۴۸۔ حجۃ اللہ البالغہ — محولا بالا — ص ۸۰ جلد اول

۴۹۔ علماء دیوبند کا شاندار ماضی — محولا بالا — ص ۲۰ جلد پنجم

۵۰۔ حجۃ اللہ البالغہ — محولا بالا — ص: ۱۰۵ جلد اول

۵۱۔ حجۃ اللہ البالغہ — محولا بالا — ص ۱۰۵ جلد اول

۵۲۔ اخلاق اور فلسفہ اخلاق — محولا بالا

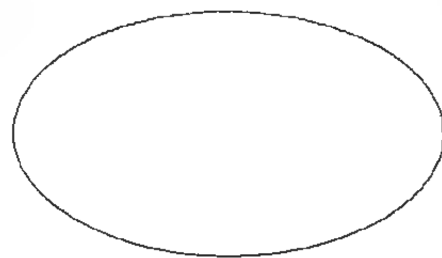
۵۳۔ ماہنامہ الرحیم — حیدرآباد شاہ ولی اللہ اکیڈمی ۱۹۶۸ء ص ۳۱

۵۴۔ الہام الرحمن — مولانا عبیداللہ سندھی — حیدرآباد شاہ ولی اللہ اکیڈمی — ص ۳۷

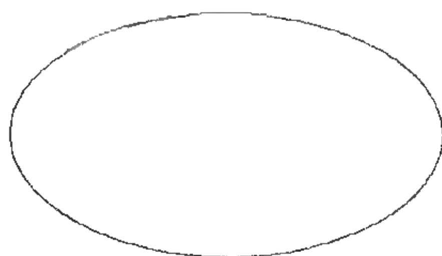
۵۵۔ شاہ ولی اللہ کی تعلیم — غلام حسین جلبانی — حیدرآباد شاہ ولی اللہ اکیڈمی ۱۹۷۳ء ص ۲۳۰

۵۶ـ	حجۃ اللہ البالغہ	محولا بالا		ص ۲۳۰
۵۷ـ	حجۃ اللہ البالغہ	محولا بالا		ص ۳۰ جلد اول
۵۸ـ	البدور البازغہ	شاہ ولی اللہ	حیدرآباد شاہ ولی اللہ اکیڈمی ۱۹۷۰ء	ص ۲۸
۵۹ـ	البدور البازغہ	محولا بالا		ص ۲۸
۶۰ـ	البدور البازغہ	محولا بالا		ص ۲۸
۶۱ـ	حجۃ اللہ البالغہ	محولا بالا		ص ۲۹ جلد اول
۶۲	حجۃ اللہ البالغہ	محولا بالا		ص ۳۰ جلد اول
۶۳ـ	ماہنامہ الرحیم	محولا بالا	۱۹۶۸ء	ص ۳۱
۶۴ـ	ماہنامہ الرحیم	محولا بالا		ص ۳۸
۶۵ـ	حجۃ اللہ البالغہ	محولا بالا		ص ۳۷ جلد اول
۶۶ـ	حجۃ اللہ البالغہ	محولا بالا		ص ۳۹ جلد اول
۶۷	حجۃ اللہ البالغہ	محولا بالا		ص ۴۰ جلد اول
۶۸ـ	حجۃ اللہ البالغہ	محولا بالا		ص ۴۳ جلد اول
۶۹ـ	حجۃ اللہ البالغہ	محولا بالا		ص ۴۹ جلد اول
۷۰ـ	شاہ ولی اللہ اور ان کا فلسفہ	عبید اللہ سندھی	لاہور سندھ ساگر اکیڈمی ۱۹۶۴ء	ص ۱۷۵
۷۱ـ	القرآن الکریم	۴۸ ـ ۲۸		
۷۲ـ	البدور البازغہ	محولا بالا		ص ۹۲





باب چہارم



باب چہارم

فصل اوّل

مغربی ماہرین کی نظر میں معاشیات کی تعریف

معاشیات کی تعریف اور اس کے مطالعہ کی ضرورت واہمیت

(Definition Of Economics and the need for its Study)

علم معاشیات کیا ہے؟

اگر ہم اپنے ارد گرد نظر ڈالیں تو ہر انسان کو کسی نہ کسی کام میں مشغول پاتے ہیں۔ مزدور، کسان، کاریگر، کلرک، مدرس، افسر، انجینئر، ڈاکٹر غرض ہر شخص اپنے اپنے شعبے میں مصروف کار دکھائی دیتا ہے آخر ہر شخص کسی نہ کسی کام میں مصروف کیوں ہے۔

انسان جب اس دنیا میں آنکھ کھولتا ہے۔ تو اپنے آپ کو ضروریات اور خواہشات میں گھرا دیکھتا ہے اسے بھوک پیاس مٹانے کیلئے خوراک، تن ڈھانپنے کیلئے کپڑا اور سر چھپانے کے لئے مکان کی ضرورت ہوتی ہے۔ شروع میں اس کی ضروریات مختصر اور سادہ نوعیت کی ہوتی ہے لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کی تعداد میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے، اور ان کی نوعیت بھی پیچیدہ ہوتی ہے۔ ان کی احتیاجات کی تسکین خود بخود نہیں جب انسان جدوجہد سے ایک خواہش کو پورا کر لیتا ہے تو ایک نہیں اور اس سے بڑی خواہش پیدا ہو جاتی ہے۔

ایک آدمی بائیسکل حاصل کرنیکی خواہش رکھتا ہے جدوجہد کر کے وہ بائیکل حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے، تو وہ مطمئن نہیں ہو جاتا، بلکہ اسکے دل میں اسکوٹر یا موٹر کار حاصل کرنیکی خواہش کروٹیں لینے لگتی ہیں پھر وہ جدوجہد میں مصروف ہو جاتا ہے اس طرح خواہشات جدوجہد اور تسکین کا لا متناہی سلسلہ چلتا رہتا ہے۔

آپ کو معلوم ہے کہ دنیا میں بہت سے علوم ہیں مثلاً تاریخ ، جغرافیہ ، دینیات ، سائنس اور شہریت وغیرہ ان علوم میں سے ایک علم ایسا بھی ہے جس کا تعلق انسان کے مادی ضروریات اور خواہشات اور ان کی تکمیل سے ہے۔ اس علم کو علم معاشیات کہتے ہیں۔

معاشیات کی تعریف (Definition Of Economics)

ہر دور کی معاشیات دانوں نے معاشیات کے مفہوم اور موضوع کو بیان کرنے کی کوششیں کی ہے سب سے پہلے ۱۷۷۶ء میں (AdamSmith) آدم اسمتھ نے معاشیات کے موضوع پر ایک جامع اور مربوط کتاب لکھی جسکا نام ''اقوام کی دولت کی نوعیت اور اسباب کے بارے میں تحقیقاتی مقالہ'' ہے اور جو ''دولت اقوام'' کے نام سے مشہور ہے اس کتاب کے نام سے یہ ظاہر ہے کہ وہ معاشیات کو دولت کا علم سمجھتے تھے۔

این ڈبلیو سینئر (N.WI SENIOR) نے معاشیات کو ایک ایسا علم قرار دیا ''جو دولت کو نوعیت ، پیدائش اور تقسیم سے سروکار رکھتا ہے'' اس طرح جے اور معیشت دانوں نے بھی اس علم کو دولت سے تعلق رکھنے والا علم قرار دیا۔ ( )

ان معاشیات دانوں معاشیات کی تعریف میں دولت کا جو لفظ استعمال کیا اس سے مراد ''روپیہ، پیسہ'' نہیں تھا جیسا کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے بلکہ وہ ''کمیاب اشیاء و خدمات'' تھیں۔ جن سے انسان اپنی ضروریات کی تسکین کرتا ہے۔ لیکن عام لوگ لفظ دولت سے غلط فہمی کا شکار ہو گئے اور انہوں نے اس علم پر نکتہ چینی شروع کر دی انہوں نے ، اسے دولت پرستی کا علم قرار دیا، رسکن (Rusk n) اور کارلائل (Carlyle) جیسے مصنفین نے سے ، شیطانی علم (Dismal Science) اور (Pig Philosopny) خنزیر یا فلسفہ جیسے نام دیے۔

مارشل کی تعریف (Marshall Defintion)

معاشیات کے بارے میں عام لوگوں کی غلط فہمیوں کو دور کرنے کے لئے الفریڈ مارشل (Alfred

(Marshal) نے سن ۱۸۹۰ میں اپنی مشہور کتاب اصولِ معاشیات (Principles Economics) لکھی وہ معاشیات کی تعریف اس طرح کرتے ہیں۔

معاشیات عام کاروباری زندگی میں انسانوں کے اعمال کے مطالعہ کا نام ہے۔ یہ علم انسان کے انفرادی اور اجتماعی کوششوں کے اس حصے کا جائزہ لیتا ہے جس کا گہرا تعلق خوشحالی کے مادی لوازمات کے حصول اور استعمال سے ہے اس طرح یہ علم ایک طرف دولت کا مطالعہ کرتا ہے اور دوسری طرف انسانی جدوجہد کا جو زیادہ اہم ہے۔

اس تعریف سے پتہ چلتا ہے کہ مارشل نے اس میں تین پہلوں کو پیش نظر رکھا ہے۔

(۱) انسان کی کاروباری زندگی کا مطالعہ۔

(۲) دولت کا حصول۔

(۳) انسانی جدوجہد۔

ان تینوں پہلوں پر غور کرنے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس میں انسانی جدوجہد کو مرکزی حیثیت دی ہے، جس کی وجہ سے انسان کی کاروباری زندگی شروع ہوتی ہے اور پھر اس جدوجہد کی وجہ سے پیدائش دولت ہوتی ہے جس سے انسان ضروریات کی تسکین ہوتی ہے، مارشل نے دولت کو ایک ''ضمنی شے'' قرار دیا کیونکہ دولت کی پیدائش اور استعمال دونوں کا انحصار انسان پر ہوتا ہے۔ اس طرح یہ واضح ہوگیا کہ معاشیات کو صرف دولت کا علم نہیں کہا جاسکتا۔

پیگو کا نظریہ (Piguo's View)

اے سی پیگو (A.C Pigou) نے مارشل کے ساتھ ہی مارشل والی تعریف میں فلاح و بہبود کے عنصر کا اضافہ کرکے معاشیات کی ایک نئی تعریف بھی پیش کی اس نے کہا ''ہمارے مطالعہ کی حدوں میں سماجی فلاح و بہبود (Welfare) کا صرف وہ حصہ شامل ہے جو بلاواسطہ یا بل واسطہ طور پر زر کی میزان پر پورا

اتر تا ہے یا جس کو روپے کی ترازوں میں تولا جا سکتا ہے پیگو کا خیال یہ ہے کہ وہی دولت مفید ہو سکتی ہے جو بنی نوع انسان کی خوشحالی اور بہبودی میں اضافہ کر سکے۔

رابنز کی تعریف (Robin's Definition)

رابنز نے مارشل اور پیگو کی پیش کردہ تعریفوں کو غیر سائنٹیفک قرار دیتے ہوئے معاشیات کی ایک نئی تعریف پیش کی ہے جو آج کل زیادہ مقبول ہے۔ اور صحیح تصور کی جاتی ہے رابنز نے معاشیات کی تعریف کے لئے انسانی زندگی کے چار نمایاں خصوصیات کو مدنظر رکھا ہے۔

(۱) انسانی احتیاجات (مقاصد) لامحدود ہیں۔

(۲) ان احتیاجات کی تسکین کے لئے ذرائع بہت محدود ہیں۔

(۳) ہر ذریعہ ایک سے زائد مقاصد کی تکمیل کے لئے استعمال ہو سکتا ہے۔

(۴) ہر احتیاج یکساں اہمیت کی حامل نہیں اس لئے احتیاجات میں سے اہم تر کا انتخاب ضروری ہو جاتا ہے۔

پروفیسر رابنز کے نظریے کے مطابق اگر مذکورہ چاروں حالات کسی ایک وقت اکٹھے ہو جائیں تو معاشی مسئلہ پیدا ہو جاتا ہے اور اگر ان میں سے کوئی ایک بھی شرط غائب ہو تو معاشی مسئلہ پیدا نہیں ہوتا۔ چنانچہ رابنز نے معاشیات کو ایسا علم قرار دیا ہے جو متبادل استعمالات (Alternative Jse) رکھنے کے لئے محدود ذرائع سے متعلق انسانی اعمال کا مطالعہ کرتا ہے یعنی یہ بتاتا ہے کہ محدود ذرائع کو اس طرح استعمال میں لانا چاہئے کہ ان سے زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل کیا جا سکتا ہے رابنز نے معاشیات کی تعریف یوں کی ہے۔

''معاشیات ایسا علم ہے جو متعدد مقاصد اور مختلف استعمالات میں آنے والے محدود ذرائع کے تعلق سے پیدا ہوتا ہے''

رابنز کی یہ تعریف نہایت جامع ہے، اس نے انسانی معیشت کے نمایاں خصوصیات یعنی لامحدود

احتیاجات محدود ذرائع، ذرائع کے مختلف استعمالات اور اہم احتیاجات کے انتخاب کی نشاندہی کی اور ان پر اپنے سائنٹیفک تعریف کی بنیاد رکھی انسانی معیشت کے یہ چاروں نمایاں خصوصیات جس طرح انفرادی طور پر صحیح ہیں اسی طرح قومی سطح پر بھی درست ہیں اس لئے اس تعریف کا اطلاق انفرادی اور اجتماعی دونوں طرح کے معاشی مسائل پر ہوتا ہے۔ (۲)

معاشیات کے مطالعہ کی ضرورت اور اہمیت

(The need for its Study)

ہماری روزانہ زندگی میں معاشیات کی اہمیت بڑھتی جا رہی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس علم کی بدولت ہماری زندگی زیادہ خوشگوار ہوتی جا رہی ہے وہ ہماری زندگی کی تمام تر معاشی مسائل کا صحیح حل پیش کرتی ہیں اس سے کسی ایک فرد یا قوم کو فائدہ نہیں پہنچتا بلکہ تمام بنی نوع انسان کو اس سے استفادہ کرنے کا موقع ملتا ہے ایک علم کا مقصد بھی یہی ہونا چاہئے کہ وہ انسانی بہبود اور خوشحالی کا ذریعہ ہو۔ یہ علم بنی نوع انسان کے معاشی الجھنوں کی نہ صرف نشاندہی کرتا ہے بلکہ ان کا صحیح حل بھی پیش کرتا ہے۔

یہ دولت پیدائش اس کے مصرف تبادلہ اور تقسیم کی صحیح اصول بتاتا ہے دوسرے الفاظ میں یہ علم روزانہ زندگی کے لئے ایک مکمل ضابطہ ہے وہ ہمیں کاروباری نظام سکھاتا ہے وہ ہمارے معاشی نظام کا تجزیہ کرکے اس کی خامیوں کو دور کرنے کے طریقے سکھاتا ہے مثال کے طور پر دو بڑی معاشی الجھنیں غیر منصفانہ تقسیم دولت اور افلاس ہیں یہ علم ان کے وجود پر غور کرتا ہے دنیا معاشی ترقی کی طرف گامزن ہے پیچیدہ مسائل اور پیچیدہ طریقِ کار بعض اوقات ماہرین معاشیات کو عجیب و غریب دشواریوں میں مبتلا کر دیتے ہیں۔

موجودہ دور میں بین الاقوامی معاشی معاملات دنیا کے قوموں کیلئے دردِ سر بنی ہوئی ہے اس کا صحیح حل بھی اس علم کے ذریعے تلاش کئے جا رہے ہیں اس وقت اپنی معاشی الجھنوں کو دور کرنے کے لئے دنیا کا ہر ملک منصوبہ بندی میں مشغول ہیں وہ معاشی ترقی حاصل کرکے ملک میں خوشحالی کا دور دورہ لانا چاہتے ہیں۔ غیر ملکی

امداد اور سرمایہ کاری سب کچھ زراعت اور صنعت و حرفت کی ترقی کیلیے مفید سمجھی جا رہی ہے ان سے ملک کی آمدنی میں اضافہ ہوتا ہے اور عوام کا معیارِ زندگی بلند تر ہوتا ہے۔لوگوں کو روزگار زیادہ سے زیادہ ذرائع مہیا ہوتا ہے اسکے مطالعہ سے معاشرتی خدمات بہتر طور پر سرانجام دینے کا شعور پیدا ہوتا ہے اور معاشی ترقی کی دستاویزات، تجارت، سرکاری تمسکات (Government Securities) محصولات، مالیات اور مشترک کارخانے وغیرہ وہ مسائل ہیں جو ماہرین معاشیات کے شب روز توجہ ہی سے حل ہو سکتے ہیں۔

اس کے مطالعے سے ہمارے معاشی نظریوں میں وسعت پیدا ہوتی جا رہی ہے بیروزگاری اور کساد بازاری کے خراب اثرات کو اسی علم کی مدد سے ختم کیا جا سکتا ہے۔عہد حاضر کی معاشی دستور اور پیچیدہ نظام کے مسائل کو بھی اس کی مدد سے سلجھایا جا رہا ہے حکومتوں کو بھی بیروزگاری اور مفلسی جیسے معاشی مسائل کے حل کرنے میں اس سے مدد مل رہی ہے اس لئے یہ علم افراد، سماج اور حکومت سب کے لئے یکساں مفید ہے۔

اہل پاکستان کیلیے علم معاشیات کی ضرورت

پاکستان میں معیشت پیچیدہ مسائل سے بھری ہوئی ہے پاکستان کا سب سے بڑا اقتصادی مسئلہ اس کے باشندوں کی ''مفلسی'' ہے یہ مفلسی ان کے پست معیارِ زندگی کا پتہ دے رہی ہے انہیں خوراک، پوشاک اور دیگر ضروریات زندگی پوری طور پر میسر نہیں آتی صحت اور تندرستی قائم رکھنے کی پوری سہولتیں بھی نہیں ملتی یہی وجہ ہے کہ وہ وبائی اور بیماریوں کے شکار رہتے ہیں۔

ہمارا ملک اس وقت خوراک کی قلت سے دوچار ہے زرعی پیداوار میں اضافہ کے طریقوں پر غور کیا جا رہا ہے صنعتی ترقی کی رفتار، فنی اور تنظیمی صلاحیت کی کمی کی وجہ سے بہت کم ہے ملک میں نیم صنعتی ماحول اب پیدا ہوا ہے افراط زر کی وجہ سے اشیاء کی قیمتیں بہت زیادہ ہیں حکومت دوسرے ملکوں سے قرضے لے رہی ہے ان تمام مسائل کے ہونے کے باوجود حکومت اہل پاکستان کی زندگی کو ''خوشحال'' بنانے میں کوشاں ہے وہ منصوبہ بندی کر رہی ہے۔

پاکستان اس زرعی اور صنعتی ترقی کے دور سے گزر رہا ہے تو اہل پاکستان کے لئے اس علم کا جاننا بہت ضروری ہے تاکہ وہ منصوبہ بندی کے اصولوں کو سمجھیں اور ملک کو خوشحال بنانے میں مدد دیں ملکی رہنماؤں کے علاوہ حکومت کے علمبردار کے لیئے بھی اس علم کا جاننا ضروری ہے تاکہ وہ ان پر عمل پیرا ہو کر ملک کو ترقی کی شاہراہ پر لے جا سکیں ملک کے سرمایہ داروں، تاجروں اور مزدوروں کو اپنی اپنی فرائض سے آگاہ ہو کر سرمایہ کاری، کارکردگی اور کفایت کے اصولوں کو مدنظر رکھنا چاہئے تاکہ ہمارا ملک پیدائش دولت میں دوسرے ملکوں کا محتاج نہ رہے۔

معاشیات کی نوعیت

انسان کو اللہ کریم نے اشرف المخلوقات کا خلعت فاخرہ پہنا کر پیدا فرمایا ہے۔

لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم (القرآن)

ترجمہ: اور بلاشبہ ہم نے انسان کو بہترین صورت میں پیدا کیا۔(۳)

اور اس سے دو چیزوں سے عبارت فرمایا ایک روح اور دوسرا جسم، اور ان کے ملاپ کا نام انسان اور زندگی ہے۔ اور ان میں سے کسی ایک کا کام نہ کرنا، لاش اور موت کا روپ اختیار کر لیتا ہے یہ دونوں اکھٹے کام کریں تو انسان کی زندگی کا سلسلہ روز و شب جاری رہ سکتا ہے ان دونوں کے غذائیں اگرچہ الگ الگ ہیں مگر دونوں کا منبع و مصدر ایک ہی ہے روح کی غذا اللہ کریم کے نازل کردہ روحانی تعلیمات ہیں جنہیں انبیاء رسول علیہم السلام لیکر مبعوث ہوئے ہیں جبکہ جسم کی غذا پانی، روٹی، پھل اور دیگر حلال اشیاء ہیں اور یہ دونوں قسم کی غذاء کا منبع آسمان کو بنایا گیا ہے۔ گویا کہ اللہ کریم آسمان کی بلندیوں سے فرشتوں کے ذریعے انبیاء کریم پر روحانی تعلیمات نازل فرما کر روح کی غذاء کا سامان مہیا فرماتے ہیں اور اُسے آسمان سے بذریعہ بارش رزق اتار کر انسان کے جسم کے غذاء کے اسباب مہیا فرماتے ہیں اور اس کریم رزاق نے ان دونوں کی عطا میں کسی قسم بخل سے کام نہیں لیا۔ قرآن مجید نے اس حقیقت کو یوں بیان فرمایا ہے:۔

وَفِي السَّمَآءِ رِزْقُكُمْ وَمَا تُوعَدُوْنَ

ترجمہ: اور تمہارا رزق اور جس چیز کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے آسمان میں (یعنی اللہ کریم کے پاس) ہیں۔ (۴)

انسان کے جسم کے رزق کا مسئلہ ہی معاشیات کا موضوع ہے۔ ہذا ہم اس پہلو پر ہی بحث کرتے ہیں اللہ کریم اور رحیم نے انسان کو صرف پیدا ہی نہیں فرمایا، اس کی غذا اور پرورش کا نظام بھی قائم فرمایا اس کی پیدائش کے روز اول سے مہربان نے ماں کے درد بھرے سینے سے دودھ کے دو چشمے جاری کر دیئے۔

ب چونکہ یہ نومولود نرم غذا کھائے بلکہ صرف پی ہی سکتا ہے اس لئے اس کریم و حکیم اللہ نے طاقتور مگر پی جانے والی غذا دودھ کا انتظام کر دیا پھر جوں جوں وہ سن بلوغ و شعور کو پہنچایا گیا اس کو رزق اور وسائل رزق فراہم کئے جاتے رہے۔ جن کے ذریعے وہ اپنے بھوک اور دیگر ضروریات زندگی کو پورا کرتے ہیں پر اُسے کریم رزاق کے سخاوت کا یہ عالم تمام انسانوں کو ان کے ماحول کے مطابق رزق فراہم فرماتا ہے اور اس کے رزاقی سے بدترین دشمن بھی محروم نہیں ہے اپنے کتاب عزیز کا آغاز ہے اُس ذاتِ کریم نے اپنے رزق کی ذمہ داریوں کے تسلیم کرنے سے فرمایا ہے آپ قرآن مجید کی تلاوت کرنا چاہیں تو پہلی سورۃ الفاتحہ کی پہلی آیت یہ نظر آئے گی۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ (سورۃ فاتحہ)

ترجمہ: تمام تعریف اللہ کریم ہی کے لئے جو تمام جہانوں کا رب (یعنی پالنے والا) ہے۔ (۵)

مگر یہ انسان ہی ہے جس نے دوسرے انسان کے رزق کو اس تک پہنچنے کا راہ میں رکاوٹیں پیدا کیں، مثلاً بذریعہ طاقت، دولت اور ذرائع دولت پر قبضہ کریں۔ دوسرے انسان کو مزدور یا ملازم رکھ کر اس کا حق ادا نہیں کیا، طاقتور نے کمزور کا معاشی استحصال کیا اور یوں کمزور انسان جس کی دنیا میں ہمیشہ غالب اکثریت رہی ہے ان پر رزق کے دروازے بند ہوتے گئے اور وسائل رزق محدود ہوتے گئے چنانچہ ان کے احتیاجات میں

اضافہ ہوتا گیا وسائل کم محسوس ہونے لگے اور حاجات زیادہ نظر آنے لگے اگر رزق اور وسائل رزق دولت اور ذرائع تمام انسانوں کے لئے آزاد چھوڑ دیے جائیں تو کوئی بھی محروم معیشت نہ ہو مگر عملاً ایسا نہیں کیا گیا اور جو لوگ وسائل رزق پر قابض ہوتے انہوں نے یا ان کی نمک خوار اسکالرز اور معیشت دانوں نے کمزور انسانوں کو یہ سمجھانا شروع کر دیا کہ انسان کے احتیاجات لامحدود ہیں۔

جبکہ ذرائع (Sources) محدود ہیں یہ وسائل کی محدودیت اور احتیاجات کی لامحدودیت اور محدود وسائل کو با کفایت استعمال کرنا، تینوں نے مل کر جہاں ایک طرف معاشی مسئلے کو جنم دیا وہاں دوسری طرف اس کے حل کے لئے مختلف نظریات کو وجود بخش جن کی اجتماع نے معاشیات کا موضوع بنایا ۱۸۰۰ء میں آدم اسمتھ اور ان کے ساتھیوں نے معاشیات کو باقاعدہ علم بنایا۔ آدم اسمتھ اور ان کے ہمنوا کلاسیکی (قدیم) ماہرین معاشیات کہلائی پھر انہوں نے معاشیات کو دولت کا علم قرار دیا ۱۷۷۶ء میں آدم سمتھ نے کتاب ''اقوام کی دولت'' Wea th of Nations'' لکھی جس میں اس نے پیدائش دولت صرف دولت تبادلہ دولت اور تقسیم دولت پر بحث کی۔

بعد میں ماہرین کا ایک اور گروہ آیا جس نے معاشیات کو مادی فلاح و بہبود کا علم قرار دیا اس گروہ کے سرخیل الفرڈ مارشل تھے یہ لوگ نو کلاسیکی (Neo-classical Econom sts) ماہرین معاشیات کہلائے۔ ان کے بعد ایک تیسرا گروہ آیا جو جدید ماہرین معاشیات کہلائے۔ انہوں نے معاشیات کو وسائل کی قلت اور حاجات کی لامحدودیت کے درمیان انسانی رویہ کا علم قرار دیا۔ ان کے سرکردہ پروفیسر رابنز Prof. Robins تھے۔

معاشیات پر آج تک بے شمار کتابیں کتب اور مقالات لکھے جا چکے ہیں سینکڑوں کالج اور شعبہ جات قائم ہو چکے ہیں جن میں معاشیات کا موضوع پڑھا اور پڑھایا جاتا ہے ہزاروں افراد اس کے مختلف پہلوؤں پر تحقیق کر کے اعلیٰ درجہ علمی اسناد حاصل کر چکے ہیں مگر نہ آج تک معاشیات کی تعریف پر اتفاق ہو سکا نہ انسان کا

معاشی مسئلہ حل ہوا جو معاشیات کا اصل موضوع ہے۔انسان کا معاشی مسئلہ کیا ہے اور اسلام ت کیونکر حل کرتا ہے۔

علم اسلامی معاشیات کی تعریف کی ضرورت

۱: اسلامی معاشیات کی تعریف کی ضرورت دو اعتبار سے ہے ابھی تک اسلامی معاشیات کی کوئی مستند اور جامع تعریف نہیں کی جاسکی بلکہ طرفہ تماشہ ہے کہ جدید رواجی معاشیات کی بھی آج تک کوئی متفق علیہ تعریف نہیں کی جا سکی س کا ثبوت یہ ہے کہ جدید رواجی معاشیات کی ۔اس کا ثبوت یہ ہے کہ جدید رواجی معاشیات کی آج تک بے شمار تعریفیں کی جا چکی ہیں اور ان میں سے ہر ایک تعریف دوسری سے مختلف ہے ہر تعریف کرنے والا ایسا نظریہ بیان کرتا ہے جس سے دوسرے تمام نظریات یا ان کی غالب اکثریت اختلاف کرتی ہے۔

۲: جب ہم اسلامی اقتصادیات کی عملی تطبیق کرنا چاہتے ہیں تو ہمارے لئے ضروری ہے کہ ہم اسلامی معاشیات کی کوئی جامع اور مستند تعریف وضع کریں جو ان تمام نظریات اور عملی مسائل کو شامل ہو جن کا ہمیں سامنا کرنا پڑتا ہے۔اور اس کے اغراض و مقاصد کو بیان کرے۔

جدید رواجی معاشیات کی تعریف

جدید معاشیات کی تعریف اور مفہوم کے بارے میں مدارس فکر Schools Of Thought کو ہمیں پیش نظر رکھنا ہوگا۔معاشیات کی تعریف اور اس کے معانی اور مفاہیم ہی معاشی نظاموں کو جنم دیتے ہیں اور پھر یہی معاشی نظام پر اور ان کے پروردہ ماہرین معاشیات معاشیات کی تعریف اور اس کا مدعا اپنے نظام کے مطابق وضع کرتے ہیں گویا افکار اور مفاہیم لچک دار ہیں جنہیں کوئی فرد یا قوم یا نظام اپنا مقصد نکالنے کے لئے جدھر چاہے موڑ لیتا ہے اس اصول کو استعمال کرتے ہوئے نظام سرمایہ داری نے معاشیات کی تعریف اور دائرہ کار اپنے نظریہ کے مطابق وضع کیا ہے اور اشتراکیت یا سوشلزم نے معاشیات کو اپنا مفہوم دیا ہے لہذا اہم جدید معاشیات کی تعریف کرتے وقت دونوں کو مد نظر رکھنا چاہئے۔

معاشیات کی تعریف نظامِ سرمایہ داری میں

نظامِ سرمایہ داری کے ماہرین معاشیات نے آج تک جدید معاشیات کی اتنی تعریفیں وضع کی ہیں کہ ان کا احاطہ کرنا غیر ممکن ہے۔ البتہ یہاں چند اہم تعریفات کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

۱: معاشیات کا علم ان سرگرمیوں کا مطالعہ کرتا ہے جو مختلف افراد میں تبادلہ اشیاء وخدمات کا ذریعہ بنتی ہے خواہ اس تبادلے میں زر کا استعمال ہو یا نہ ہو۔

۲: معاشیات وہ علم ہے جو انسان کے اس رویہ کا مطالعہ کرتے ہیں کہ وہ کیونکر قلیل وسائل کے ذریعے مختلف اشیاء تیار کرتا ہے اور افراد معاشرے میں انہیں خرچ کرنے (استعمال کرنے) کیلئے بانٹ دیتا ہے۔

۳: معاشیات انسانوں کی مادی زندگی کا مطالعہ کرتا ہے کہ وہ کیونکر کماتا ہے؟ اور کیسے زندگی میں اسے استعمال کرتے ہیں؟

۴: معاشیات دولت کا علم ہے کہ دولت کیونکر کمائی جاتی ہے اور صرف کی جاتی ہے۔

۵: معاشیات کا علم معاشی وسائل کے انتظام کرنے سے بحث کرتا ہے۔

۶: معاشیات وہ علم ہے جو معاشی خوشحالی کے مفہوم اور اس کے حصول کے ذرائع سے بحث کرتا ہے خواہ اس معاشی خوشحالی کا تعلق قبیلہ سے ہو یا قوم سے۔

۷: معاشیات کا علم فرد کے خرچ اور کمائی کی سرگرمیوں کا مطالعہ کرتا ہے۔

۸: معاشیات کا علم معاشرے کی مادی خوشحالی کا مطالعہ کرتا ہے یہ پروفیسر مارشل کی رائے ہے۔

''لیونل روبنز Leonol Robins نے کہا ہے

''ہم سارے ایک ہی شے کے بارے میں بات کرتے ہیں لیکن ہمیں
یہ معلوم نہیں کہ جس شے کے بارے میں ہم بات کر چکے ہیں، وہ کہاں ہے؟''

یعنی معاشی خوشحالی یا انسان کے معاشی مسئلے کا حل اس لیے روبنز نے معاشیات کی ایسی تعریف کی ہے جسے

اس کی بہت سی خامیوں کے باوجود بہت زیادہ سراہا گیا ہے اور اسے قبول عام نصیب ہوا رونبز معاشیات کی تعریف کرتے ہوئے کہتا آیا ہے:

"معاشیات انسان کے اس طرز عمل کا مطالعہ کرتا ہے جو وہ خواہشات کے بے شمار ہونے اور ذرائع کے محدود ہونے کی بناء پر اختیار کرتا ہے جبکہ یہ ذرائع مختلف صور پر استعمال ہو سکتے ہوں"

جدید معاشیات دانوں نے اس تعریف کی بے شمار نقائص بیان کر دیے ہیں، مثلاً:

۱: رابنز اس تعریف کے ذریعے طبعی علوم Natural Science کی طرح ایک علم بنانا چاہتا ہے تو اس کے قوانین بھی دیگر طبعی علوم کی طرح قطعی اور یقینی ہوں، معاشیات کے قوانین کو کثر و بیشتر مفروضات پر بنی ہوتی ہیں۔

۲: رابنز کی تعریف نے معاشیات کے موضوع کو محدود بنا دیا ہے اور یوں معاشیات معاشی ترقی اور منصوبہ بندی، قومی آمدنی، روزگار، تقاعل صرف وغیرہ سے بحث نہیں کرتی جبکہ موجودہ دور میں معاشیات کے اہم ترین موضوعات ہیں۔

۳: رابنز نے معاشیات کو روکھا پھیکا، پیچیدہ اور بے کار مضمون بنا دیا ہے وغیرہ الغرض، ان مختلف قسم کی تعریفوں نے معاشیات کو ایک بھول بھلیوں کا مضمون بنا دیا ہے۔ بقول رابنز بات ساری ایک شے ہی کرتی ہے مگر انہیں پتہ نہیں چلتا کہ شے کہاں ہے۔

مذکورہ بالا تمام تعریفوں کو سامنے رکھ کر معاشیات کی ایک ایسی تعریف وضع کی گئی ہے، جو ان تمام تعریفوں کی جامع نظر آتی ہے۔

وہ تعریف یہ ہے:

علم معاشیات انسان کے اس طرز عمل کو بتاتا ہے۔ جو وہ یا معاشرہ

زرخرچ کر کے یا بغیر زرخرچ کئے پیداوار قلیل وسائل کو مختلف قسم کی اشیاء تیار کرنے کے لئے استعمال کرنے میں استعمال کرتے ہیں جبکہ اس وسائل و ذرائع کے استعمال بھی مختلف ہو سکتے ہیں پھر وہ ان اشیاء کو معاشرے کے مختلف افراد یا گروہوں میں تقسیم کرنے میں اختیار کرتے ہیں تاکہ لوگ ان اشیاء کو موجودہ وقت یا آئندہ آنے والے وقت میں استعمال کر سکیں۔ پھر یہ علم ان اخراجات اور ان سے ہونے والے منافع کا تجزیہ کرتا ہے تاکہ اس طرح وہ تمام قسم کے وسائل و ذرائع کو استعمال کرنے کے طریقوں کو بہتر بنا سکیں اور انہیں ترقی دے سکیں۔ (۶)

اشتراکی نظام میں معاشیات کی تعریف

جب ہم اشتراکی نظام معیشت کے ماہرین معاشیات کی طرف دیکھتے ہیں کہ شاید یہاں ہمیں معاشیات ایک جامع اور متفق علیہ تعریف مل جائے گی کیونکہ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے ایسا نظام دینے کا وعدہ کیا ہے جو تمام انسانی ضروریات کی کفالت کرتا ہے مگر یہاں بھی سوائے مایوسی کے اور کچھ نہیں ملتا ان ماہرین نے معاشیات کو صرف مارکس اور لینن کے فکری تناظر میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے مارکس اور لینن کی فکر کے تین بڑے اجزاء یہ ہیں۔ ''فلسفہ، معاشیات اور عملی اشتراکیت''

ان تینوں میں معاشیات کو کلیدی حیثیت حاصل ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ مارکس کے نظریئے میں معاشی حالات انسان کی فکری زندگی کا تانا بانا بنتے ہیں۔ انسانی فکر، انسانی سوچ، انسانی نظریہ، انسانی جدوجہد سب کا نقطہ آغاز معاشیات ہے۔ اشتراکی نظام کے ماہرین ہمیشہ یہی کہتے اور سناتے نظر آتے ہیں:

> ''اجتماعی، سیاسی، دینی اور قانونی افکار کا منبع ہر چیز سے پہلے تلاش کرنا چاہیے'' (۷)

آپ نے اس جملے سے بخوبی اندازہ لگا لیا ہوگا کہ اشتراکی ماہرین نے معاشیات ہی کو تمام انسانی افکار اور جدوجہد کا مصدر اور منبع قرار دیا ہے یعنی معاشی جدوجہد، معاشی حاجات کی تکمیل، معاشی ترقی اور معاشی انتظام وہ ذرائع ہیں جو ایک قوم یا معاشرے کا اجتماعی، سیاسی، قانونی اور دینی نقشہ اور نظریہ تشکیل دیتے ہیں۔ گویا معاشی ضروریات، معاشی احتیاجات یا تعلقات بنائے جاتے نہ اللہ کریم انبیاء کرام کو مبعوث فرماتے، نہ کوئی دین ہوتا نہ اخلاقی نظریہ۔

مگر اس میں اشتراکی ماہرین کا کوئی قصور نہیں ان بیچاروں نے ایک ایسے نظریہ کی عملی صورت دیکھی، پڑھی اور سنی ہے۔ اس نظریہ کی بنیاد پر وجود میں آنے والی ریاست میں جنم لیا، پلے، بڑھے، جوان اور بوڑھے ہوئے جس نظریہ کا مقصد ہی پیٹ کی تعمیر کرنا ہے خواہ اس کی خاطر اپنے خالق حقیقی اور محسن ﷺ اللہ کریم کی ذات کے افکار کی بھی قربانی دینا پڑے اس لئے اگر ہم یوں کہیں کہ یعنی اور مارکسی فکر کے تین بڑے اجزاء یعنی فلسفہ اقتصاد اور عملی اشتراکیت کیا ''فلسفہ شکم پروری'' تو نہیں ہے؟ یعنی اشتراکیت جو فلسفہ وحیات، سیاسیات، اخلاق وغیرہ پیش کرتا ہے اس کا مقصد 'شکم' (بذریعہ اقتصادیات) ہے جس کی ''پروری'' وہ اشتراکیت کی صورت میں کرتا ہے۔

اسلامی معاشیات کی تعریف

اسلام کی معاشی تعلیمات یا اسلام کے معاشی نظریے کی تاریخ اتنی ہی قدیم ہے جتنی اسلام کی اپنی تاریخ قدیم ہے مگر ان معاشی نظریات کی طرز پر ڈھالنے اور ترتیب دینے کا خیال مسلم اسلام اور مسلم معیشت دانوں کو تھوڑا عرصہ قبل ہی ہوا گویا یہ بھی امت مسلمہ کی بیداری کی علامت ہے کہ اسے اپنے اس عظیم وجامع ورثہ کو مرتب کرنے اس کی ایک موزوں شکل بنانے اور اس کی جامع تعریف وضع کرنے کا احساس ہوا ہے۔ سرمایہ دارانہ اور اشتراکی استعمار کے ستائے ہوئے مسلمانوں کو اب ہوش آ گیا ہے اور انہیں اپنی دینی معاشی تعلیمات کو ترتیب دینے اور اسلامی معاشیات کو مدون کرنے کا خیال آ گیا ہے تو یہ بہت بڑی سعادت، دانائی اور

غیر تمندی کی بات ہے۔ اس لحاظ سے اسلامی معاشیات چونکہ جدید موضوع Discipline ہے لہذا ابھی تک اس کی جامع اور مناسب فنی تعریف کرنے میں دیر لگے گی۔ البتہ ابھی مسلم معیشت دانوں نے اس جدید علم کی تعریف میں مختلف انداز میں کی ہے۔ چند تعریفیں یہاں درج کی جاتی ہیں۔

پہلی تعریف:

اسلامی معاشیات اسلام کے اس اقتصادی نظریہ کا نام ہے جس میں معاشی زندگی کی تنظیم کا اسلامی طریقہ بیان کیا گیا ہے۔

دوسری تعریف:

اسلامی معاشیات میں ان تمام معاشی اصولوں کا مجموعہ ہے جنہیں ہم قرآن اور سنت سے حاصل کرتے ہیں اور اس معاشی بناء (طریقہ اسلوب) کا نام ہے جو ہم ماحول اور ہر زمانہ کی ضروریات کے مطابق ان اصولوں کی روشنی میں ہم قائم کرتے ہیں۔

تیسری تعریف:

اسلامی معاشیات معاشی سرگرمیوں کا مطالعہ کرتی ہے۔ اور انہیں اسلام کے اصول وقواعد اور اس کی معاشی پالیسی کے مطابق منظم کرتی ہے۔ یہ قواعد دو طرح کے ہوتے ہیں۔

۱) غیر متغیر قواعد: اس سے مراد اسلامی معاشیات کے وہ اصول ہیں جو قرآن مجید اور سنت نبویہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام سے ثابت ہیں۔ اور مسلمانوں کے لئے لازم ہے کہ ہر زمان و مکان میں ان کا اتباع کریں۔ یہ بنیادی قواعد واصول مندرجہ ذیل امور سے متعلق ہوتے ہیں۔

۱: معاشی سرگرمی کی تنظیم کرتے ہیں اور ان شروط وقیود کو طے کرتے ہیں جو معاشی سرگرمی کو منظم کرتی ہیں۔

۲: معاشی سرگرمیوں میں ریاستی عمل کا دائرہ کار طے کرتے ہیں۔

اسلامی معاشیات کی جامع تعریف

اسلامی معاشیات کی تعریف یوں کی جا سکتی ہے:

''اسلامی معاشیات ان وسائل کے علم کا نام ہے جنہیں انسان اس (مال یا معاش یا ذرائع معاش) سے استفادہ کرنے کے لئے استعمال کرتا ہے جس میں اسے (اللہ کریم کی طرف سے) امین ونگران بنایا گیا ہے۔ تاکہ اس طرح شریعت کے مقررہ منہج (طریقہ) کے مطابق فرد اور معاشرہ کی (معاشی) حاجات کی تکمیل ہو''

حضرت عمر بن خطابؓ بازار میں ایک شخص کو بھیجا کرتے تھے جو بازار سے ایسے لوگوں کو اٹھا دیا کرتا تھا جو خرید وفروخت کے اسلامی احکام سے واقف نہ ہوتے تھے۔

ابوعبداللہ بن الحاج اپنے کتاب ''المدخل'' میں تحریر کرتے ہیں۔

''كان عمر بن الخطابؓ يضرب بالدرة من يقعد في السوق وهو لا يعرف الاحكام، ويقول، لا يقعد في سوقنا من لا يعرف الربا''

ترجمہ: حضرت عمر بن خطابؓ ایسے شخص کو درے سے مارتے جو بازار میں آکر (خرید وفروخت) بیٹھا مگر وہ (بیع وشراء کے) احکام نہ جانتا ہوتا ہو اور آپ فرمایا کرتے، جو شخص ربا، (سود کے تمام احکام) نہیں جانتا وہ ہمارے بازار میں نہ بیٹھا کرے۔

خلفاءراشدینؓ اور بعد کے اسلامی خلفاء کے ادوار میں بازار کی معاشی سرگرمیوں کو شریعت کے مطابق چلانے کیلئے باقاعدہ محتسب (بازار کا نگران) کا تقرر کیا جاتا تھا جو بازار میں چل پھر کر اور مختلف دکانداروں سے بطور امتحان سوال کر کے دریافت کرتا کہ آیا وہ بیع وشراء کے شرعی احکام سے واقف ہیں یا نہیں۔ (۸)

معاشیات کی تعریف شاہ صاحب کی نظر میں

علم ان لانسان یوافق ابنا جنسه فی الحاجة الی الا
کل والشرب و الجماع والا استظلال من الشمس
والمطر والا ستدفاء فی الشتاء و غیر ها. (۹)

انسان کھانے پینے اور دوسرے فطری تقاضوں میں دوسرے حیوانوں کی طرح ہے وہ جب پیدا ہوتا ہے تو دودھ کے لئے چیخ و پکار کرتا ہے جب بڑا ہوتا ہے تو خوراک اور دوسری بنیادی ضرورتیں پوری کرنے کے لئے زندگی میں جدوجہد کرتا ہے اور آسودہ (خوشحالی) زندگی گزارنے چاہتا ہے مذہب اور اخلاق اس کو یہ سکھاتے ہیں کہ وہ انسانی خوبیاں پیدا کرے اور اچھے لوگوں کی طرح رہے۔ شاہ ولی اللہ کا خیال ہے کہ اگر انسان بدحال اور تنگدست ہو تو مذھب اور اخلاق کے تقاضوں کو بالکل پورا نہیں کر سکتا۔ اس لئے انسانوں میں خوشحال زندگی (ترفہ) کا ہونا ضروری ہے اگر وہ خوشحال ہوگا تو اس کی عادتیں اور مزاج بھی درست ہوں گے اخلاقی اور مذہبی لحاظ سے بھی وہ اچھا انسان ہوگا اور اچھے انسانوں کی تمام خوبیاں اس میں مجود ہوں گی۔

(ii) آپ کے خیال میں انسان کا سب سے اہم مسئلہ یہ ہے کی آیا وہ معاشی طور پر خوشحال ہے یا بدحال کیونکہ خدائی منشا ہے کہ.

''اس دنیا میں کوئی شخص ان چیزوں کے بغیر باقی نہ رہے جن کی ایک متمدن زندگی میں انسان کی ضرورت ہوتی ہے''

معاشیات کی تعریف اور اس کا موضوع

انسان کی کچھ بنیادی ضرورتیں ہیں ان ضرورتوں کو پورا کرنے کیلئے مختلف وسیلوں سے دولت حاصل کرتا ہے اسکی بنیادی ضرورتیں کیا ہیں انکو پورا کرنے کیلئے وہ دولت کن وسائل سے حاصل کرتا ہے؟ ان وسائل کی ملکیت کے بارے میں اس کا تصور کیا ہے؟ یہ اور اس قسم کی دوسری باتیں علم معاشیات کا موضوع ہیں۔

شاہ ولی اللہؒ نے اس علم کے انہی موضوعات پر بہت کچھ لکھا ہے آپ معاشرے یعنی رہن سہن کے علم پر ور معاشرتی آداب کے فن پر 'فن آداب المعاش' کے عنوان سے قلم اٹھاتے ہیں اور اقتصادیات یا معاشیات کے علم کو 'فن المعاملات' کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

اور فرماتے ہیں کہ۔

وھو الحکمة ''الباحثة'' عن کیفیة ''اقامه'' المعادلات و المعاونات والا کساب علی الا رتفاق الثانی

ترجمہ: ''یہ علم انسان کے معاشی اشیاء کے تبادلے کے نظام (معاوضت)، انسان میں امداد باہمی (معاونت) کے قیام اور روزی کمانے کے ذریعوں (کتساب سے بحث کرتا ہے)'' (٠)

چنانچہ آپ اپنی تحریروں میں اس علم پر لکھتے ہوئے انسان کی بنیادی ضرورتوں (حاجات) دولت کی ملکیت کے تصور، دولت کی پیداوار کے ذرائع، امداد باہمی (معاونت)، پیشوں، معیار زندگی اور دولت کے استعمال وغیرہ کو بحث کا موضوع بناتے ہیں۔



باب چہارم

فصل دوم

معیشت کے اسلامی احکام

یہ بات پہلے ہی قدم پر واضح رہنی چاہئے کہ اسلام کوئی معاشی نظام نہیں ہے۔ بلکہ ایک دوایک دین ہے، جس کے احکام ہر شعبۂ زندگی سے متعلق ہے جس میں معیشت بھی داخل ہے۔ لہذا قرآن وحدیث نے معروف معنوں میں کوئی معاشی فلسفہ یا نظریہ پیش نہیں کیا، جس کو موجودہ دور کی معاشی اصطلاح میں تعبیر کیا گیا ہو، لہذا ترجیحات کا تعین، وسائل کی تخصیص، آمدنی کی تقسیم اور ترقی کے عنوان یا اسلامی فقہ میں براہ راست کوئی بحث موجود نہیں ہے لیکن زندگی کی دوسرے شعبوں کی طرح اسلام نے معیشت کے بارے میں بھی کچھ احکام دیئے ہیں ان احکام کے مجموعی مطالعے سے ہم یہ مستنبط کر سکتے ہیں کہ مذکورہ چار مسائل کے سلسلے میں اسلام کا نقطۂ نظر یہ کیا ہے؟ اور اسی مطالعے میں استنباط کا حاصل اس وقت تک پیش کرنا مقصود ہے۔

اسلام کے معاشی احکام اور تعلیمات پر غور کرنے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اسلام نے بازار کی قوتوں یعنی رسد وطلب کے قوانین کو تسلیم کیا ہے۔ اور معیشت کے مسائل حل کرنے کے لئے ان کے استعمال کا فی الجملہ حامی ہے۔

چنانچہ قرآن کریم کا ارشاد ہے۔

نحن قسمنا بینهم معیشتهم فی الحیاة و رفعنا بعضهم فوق بعض درجات لیتخذ بعضهم بعضا سخریا (۱۱)

''ہم نے ان کے درمیان معیشت کو تقسیم کیا ہے اور ان میں سے بعض کو بعض پر درجات میں فوقیت دی ہے تا کہ ان میں سے ایک دوسرے سے کام لیں سکیں''۔

ایک دوسرے سے کام اس طرح لیا جائے گا کہ کام لینے والا کام کی طلب اور کام دینے والا کام کی رسد ہے اس طلب اور رسد کی باہمی کشمکش اور باہمی امتزاج سے ایک متوازن معیشت وجود میں آتی ہے۔ اس طرح آنحضرتؐ کے زمانے میں جب دیہاتی اپنے زرِ پیداوار شہر میں فروخت کرنے کے لئے لاتا تو بعض شہری لوگ اس دیہاتی سے کہتے کہ تم اپنا مال خود لے جا کر شہر میں مت بیچو، بلکہ یہ سامان مجھے دے دو، میں مناسب وقت پر اس کو فروخت کرونگا، تاکہ اس کی قیمت زیادہ ہو جائے آنحضرتؐ نے شہریوں کو ایسا کرنے سے روکا، اور اس کے ساتھ ہی یہ جملہ ارشاد فرمایا:۔

''دعوا الناس یرزق اللہ بعضھم عن بعض''

''لوگوں کو آزاد چھوڑ دو تا کہ اللہ تعالیٰ ان میں سے بعض کو بعض کے ذریعے رزق عطا فرمائے''۔(۱۲)

اس طرح آنحضرت ﷺ نے بے شمار خریدنے والے کے درمیان تیسرے شخص کی مداخلت کو اس لئے مسترد فرما دیا تاکہ طلب و رسد کا صحیح توازن قائم ہو۔ ظاہر ہے کہ دیہاتی جب براہ راست بازار میں کوئی چیز فروخت کرے گا تو اپنا مناسب نفع رکھ کر ہی فروخت کرے گا۔ لیکن اسے چونکہ جلدی واپس جانا ہے، اس لئے اس کے پاس ذخیرہ اندوزی کی گنجائش نہیں اور خود اس کے بازار میں پہنچنے کی صورت میں طلب و رسد کا ایسا امتزاج ہوگا جو صحیح قیمت متعین کرنے میں مدد دے گا۔ اس کے برخلاف اگر کوئی تیسرا آدمی ان کے درمیان آ جائے اور مال کی ذخیرہ اندوزی کرکے اس کی مصنوعی قیمت پیدا کرے تو وہ مطلب کے قدرتی نظام میں بگاڑ پیدا کرے گا۔

لہٰذا اس حدیث سے بھی یہ بات معلوم ہوتی کہ حضور اقدسؐ نے طلب و رسد کے قدرتی نظام کو تسلیم فرمایا اور اس باقی رکھنے کی کوشش فرمائی۔

اسی طرح جب آپ بازار میں فروخت ہونے والی اشیاء کی قیمتیں سرکاری طور پر متعین فرما دیا تو اس

موقع پر بھی یہ الفاظ ارشاد فرمائے :۔

''ان اللہ ھو المسعر القابض الباسط الرازق'' (۱۳)

'بیشک اللہ تعالی ہی قیمت متعین کرنے والے ہیں وہی چیزوں کی

رسد میں کمی کرنے والے اور زیادتی کرنے ہیں اور وہی رازق ہیں۔

اللہ تعالی کو قیمت مقرر کرنے والا قرار دینے کا مطلب اس حدیث کے سیاق میں یہ بھی ہے کی اللہ تبارک وتعالی نے طلب و رسد کے قوانین کو فی الجملہ تسلیم کیا ہے۔ اسی طرح ذاتی منافع کے محرک سے بھی فی الجملہ کام لیا ہے۔ اسلام نے ذاتی منافع کے محرک کو برقرار رکھے ہوئے اور رسد وطلب کے قوانین کو تسلیم کرتے ہوئے تجارتی اور معاشی سرگرمیوں پر کچھ ایسی پابندیاں عائد کردیں کہ ان پر عمل کی صورت میں ذاتی منافع کا محرک ایسے غلط رخ پر نہیں چل سکتا جو معیشت کو غیر متوازن کرے یا اس سے دوسری اخلاقی یا اجتماعی خرابیاں پیدا ہوں۔

نبی کریم ﷺ کی معاشی تعلیمات

(Economic Teachings of Holy Prphet)

حدیث:

رسول اکرمؐ کے قول، فعل اور تقریر کو کہا جاتا ہے۔ قول سے مراد آپ کا کلام، فعل سے مراد آپؐ کا کام ہے اور تقریر کا مفہوم یہ ہے کہ کسی نے آپؐ کے سامنے کوئی کوئی کام کیا یا کوئی بات کہی اور آپؐ نے منع نہ فرمایا۔ گویا آپؐ نے اپنے سکوت سے اس کام کے جواز یا اس بات کی صحت کو متعین کر دیا۔

احادیث، قرآن مجید کے مضامین کی یا تو تائید کرتی ہے یا قرآنِ حکیم کے مجمل احکام کی وضاحت کرتی ہے یا جو بات قرآن میں مذکور نہ ہوا تو وہ اسے بیان کرتی ہے۔ حدیث کے بغیر قرآن کریم کا ادراک مشکل ہے قرآن مقدس میں اللہ نے رسولِ کریم ﷺ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ اسے ہم نے اس لئے اتارا

ہے کہ تم لوگوں کے سامنے اس کی وضاحت اور تشریح کر دیں۔قرآن میں رسول اکرم کو معلم کتاب کہا گیا ہے۔ظاہر ہے کوئی بھی استاد جب کسی کتاب کی تعلیم دیتا ہے تو کتاب ہی کے متن کو طلبہ پر دہرایا جاتا بلکہ کتاب کے مشکل اوراق مضامین توضیح اپنی زبان یا عمل وغیرہ سے بھی کرتا ہے رسولِ کریمؐ نے بھی قرآن کی تشریح فرمائی ہے۔اس لئے ثابت ہو حدیث کے بغیر قرآن فہمی ممکن نہیں۔

قرآن کا ٹھیک ٹھیک ہم تک پہنچنا قطعی یقینی ہے کیونکہ قرآن کریم ہم تک تواتر سے پہنچا ہے۔یعنی ہر زمانے میں ہزاروں، لاکھوں لوگوں نے اسے حاصل کیا اور دوسروں کو پہنچایا۔اس برعکس جو احادیث ہم تک راویوں کے ذریعے پہنچیں۔محدثین نے احادیث صحیح یا غیر معلوم کرنے کے لئے اصول واضح کئے جو اصول حدیث کہلاتے ہیں۔راویوں کی خوب چھان پھٹک کی گئی اس طرح محنت اور عرق ریزی سے احادیث کی درجہ بندی کی گئی حدیث کو ظنی کہا جاتا ہے۔عربی میں ''ظن'' گمان اور اٹکل دوڑانے کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔اس کے معنی یقینی استدلالی کا بھی ہے۔یعنی وہ یقین جو دلائل سے حاصل ہوتا ہے۔قرآن کریم میں ''ظن'' کا لفظ مذکورہ دونوں معنوں میں مستعمل ہے چنانچہ سورۃ البقرہ میں یہ کہا گیا ہے کہ ''نماز ان لوگوں پر بھاری نہیں ہے جو یہ ظن رکھتے ہیں کہ ان کی ملاقات ان کے رب سے ہونے والی ہے'' تو یہاں ظن کے معنی یقین کے ہیں کیونکہ جس شخص کو رب تعالیٰ سے ملاقات کا شک ہو وہ منافق ہوگا۔

سنت:

سنت کا لفظ محدثین کی اصطلاح میں آنحضورؐ کے عمل کو ظاہر کرتا ہے لیکن کبھی اس لفظ کو حدیث کے مترادف سمجھا جاتا ہے۔لہٰذا حرفِ عام میں قرآن وسنت سے مراد قرآن وحدیث ہے۔گویا اس باب رسالت مآب کی احادیث مبارکہ کی روشنی میں اقتصادی تعلیمات ((Econom c Teachings کا احاطہ کیا جائے گا۔کیونکہ زندگی کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جس کے بارے میں آپ ﷺ نے واضح اور ضروری ہدایت سے سرفراز نہ کیا ہو۔کوئی بھلائی ایسی نہیں جس کے کرنے کی آپؐ نے تعلیم نہ دی ہو۔اور کوئی برائی ایسی

نہیں جس سے آپؐ نے منع نہ فرمایا ہو۔ گویا ایک سپاہی سے لیکر کمانڈر تک اور چرواہے سے لے کر فرمانروائے سلطنت تک آپؐ کے کلام شیریں، اور دل پذیر سے رہنمائی حاصل کرسکتا ہے۔

احادیث مبارکہ سے شواہد

۱) حلال معیشت کا طلب کرنا اللہ کی عبادات میں سے ہے۔ دُعا بھی عبادت ہے بقول رسول کریمؐ دعا عبادت کا مغز ہے وہ بھی نماز کا حصہ ہے۔ یہ لفظ وسیع معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ ہر وہ کام وہ اللہ کی رضا کیلئے اور رسول ؐ کی متعین کردہ حدود کا لحاظ رکھتے ہوئے کیا جائے، اسے عبادت کہتے ہیں لہٰذا ہر نیکی عبادت کے زمرے میں شامل ہے۔ (۱۴)

۲) آپ ﷺ نے فرمایا رات سونے کے بعد اٹھو اور فجر کی نماز پڑھ کر اپنے رزق کی تلاش میں مصروف ہو جاؤ اور نیند کا نام نہ لو۔

۳) حضرت عمرو بن العاصؓ سے روایت ہے کہ آپؐ نے فرمایا اچھا مال اچھے آدمی کے لئے اچھی چیز ہے (۱۵)

۴) نبی کریم ﷺ نے فرمایا مسلمان مرد کے لئے ریشمی لباس اور ریشمی نرم گدوں پر بیٹھنے اور ارغوانی رنگ (بھڑکیلا رنگ) استعمال کرنے کی ممانعت ہے۔ (۱۶)

۵) جس شخص نے دنیا میں فخر و غرور کا لباس پہنا تو اسے قیامت کے دن ذلت اور خواری کا لباس پہنایا جائے گا۔ نیز فرمایا فخر و ناز کا لباس وہ ہے جو اس کے بھائیوں کے لباس سے مختلف ہو یعنی افضل اور امتیازی ہو۔ (۱۷)

۶) رسول اکرمؐ نے فرمایا مسلمان مردوں اور عورتوں کو جائز نہیں کہ سونے، چاندی کے برتن استعمال کریں۔ (۱۸)

۷) حضرت حذیفہؓ کے قول کے مطابق آپؐ نے ہمیں سونے چاندی کے برتن ریشمی لباس اور اس

طرح کے پوشاک کے استعمال کی ممانعت فرمائی ہے۔(۱۹)

۸) حضورؐ نے فرمایا جس شخص کا گوشت پوشت ظلم سوذ سے بنا ہو اس کے لئے دوزخ کی آگ زیادہ بہتر ہے(۲۰)

۹) حضرت جابرؓ کی روایت کے مطابق آپؐ نے فرمایا ''جب تم تولنے لگو تو ترازو دوسرے فریق کے حق میں رکھو۔(۲۱)

۱۰) حضرت کعبؓ فرماتے ہیں جب میں نے سارا مال صدقہ کرنے کا ارادہ کیا تو آپؐ نے فرمایا کچھ بچا تو یہ بھی دارِ خیر ہے، شبہ پیدا ہوتا ہے کہ غزوہ تبوک کے موقع پر حضرت ابوبکر صدیقؓ کو سارا مال دینے سے کیوں نہ روکا ان کا مقام توکل بہت بلند ہے توکل اسباب کے چھوڑ دینے کا نام نہیں ہے بلکہ یقین رکھنا ہے کہ اسباب اس لئے رکھ رہا ہوں کہ رب تعالیٰ کا حکم ہے ورنہ کامرانی وناکامی اسی کے قبضہ قدرت میں ہے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ میں توکل کی صفت اتنی اعلیٰ درجے کی تھی کہ سارا مال دینے کے بعد تنگی محسوس نہ کریں مگر عام لوگوں کا معاملہ اس کے برعکس ہے۔ ان میں اتنا مادہ نہیں ہوتا۔(۲۲)

۱۱) بعض گناہوں میں سے ایسے بھی ہیں جن کا کفارہ صرف (حلال) طلب معیشت اور جدوجہد سے ہوسکتا ہے۔(۲۳)

۱۲) اے اللہ میں کفر اور فاقہ سے پناہ مانگتا ہوں (ابن ماجہ) ایک شخص نے دریافت کیا کہ کیا دونوں ایک جیسے ہیں؟ تو فرمایا ''ہاں''(۲۴)

۱۳) عطیہ جب تک عطیہ رہے اسے قبول کرو اور جب دین اور اس کے مبادیات کے خلاف رشوت کی شکل اختیار کرے تو ہرگز قبول نہ کرو۔ مجھے ڈر ہے کہ غربت وفاقہ کشی تم پر اس طرح سوار ہوجائے کہ مجبور ہوکر رشوت بھی لینے لگو۔(۲۵)

۱۴) حضرت سعد ابن ابی وقاصؓ نے اپنا تمام مال صدقہ کرنے کا ارادہ کیا تو حضور اکرمؐ نے فرمایا

اس میں سے اپنے وارثوں دوتا کہ تمہارے بعد بھیک نہ مانگیں۔(۲۶)

۱۵) مزدور کو اس کے کام سے بھی حصہ دو کیونکہ اللہ تعالی کا عامل اور لیبر نامراد نہیں کہا جا سکتا(۲۷)

۱۶) یہودیوں کے بارے میں فرمایا گیا ''اکلون للسحت'' یعنی وہ حرام چیزوں کے زیادہ کھانے والے ہیں لہٰذا اس سے پرہیز ضروری ہے نیز امانت کا حکم دیا گیا اور خیانت سے بچنے کی تاکید کی گئی(۲۸)

۱۷) حضرت ﷺ نے راشی اور مرتشی دونوں کو جہنمی فرمایا ہے۔(۲۹)

۱۸) زکوۃ کے بارے میں ارشاد ہوا کہ دولت مالداروں ہی میں نہ گردش رہے اس لئے غریبوں کی اعانت کا حکم ہوا۔(۳۰)

۱۹) حضرت ابو ہریرہؓ کے قول کے مطابق آپ ﷺ نے فرمایا:

''اللھم انی اعوذبک من الفقر والقلة''(۳۱)

آپؐ نے مزید فرمایا اے اللہ! میں بھوک سے پناہ مانگتا ہوں کیونکہ یہ بہت برا ساتھی ہے(نسائی)

۲۰) آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے جو دوسرے پر رحم نہیں کرتا اللہ اس پر کبھی رحم نہیں کرے گا(۳۲)

۲۱) حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ سے روایت ہے آپؐ نے فرمایا اگر دو آدمیوں کے لئے کھانا پکانا مطلوب ہو تو تین کے لئے پکاؤ تاکہ کوئی مستحق شامل ہو کر تمہارے لئے برکت کا باعث بنے۔(۳۳)

۲۲) میں (بن خرم) کہتا ہوں کہ ایک شخص بھوکا ننگا ہے۔اور دوسرا افاضل سامان کی قدرت رکھتا ہو اور پھر اس کی کفالت نہیں کرتا وہ قرآن وحدیث کی رو سے مجرم وگناہ گار ہے۔(۳۴)

۲۳) محبوبِ کبریا نے فرمایا فراڈ دوزخ کی طرف لے جاتا ہے اور جو کوئی ایسے عمل سے آگاہ نہ کرتا ہے جو ہمارے طور طریق سے مطابقت نہیں رکھتا تو وہ مردود(فجور) ہے۔(۳۵)

۲۴) ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کی سند سے حضور کا ارشاد نقل ہے کہ بھوکے کی پرورش اور قیدی کی

رہائی تمہارے ذمہ ہے۔ (۳۶)

۲۵) آپ ﷺ نے فرمایا جن کے پاس زائد سواری ہو پیدل کو دے۔ جس کے پاس ضرورت سے زیادہ خوردونوش ہو یا لباس ہو وہ دوسرے مستحق کو دے حضرت ابوسعیدؓ کہتے ہیں۔ اس طرح ہم سمجھ گئے کہ اپنی حاجت سے زیادہ کوئی چیز ہماری نہیں وہ دوسرے کا حق ہے۔ (۳۷)

۲۶) آپؐ نے فرمایا مزدور سے کام لیتے وقت اجرت طے کی جائے اور اس کی رضا مندی حاصل کی جائے۔

۲۷) مزدور کا پسینہ خشک ہونے سے پہلے اجرت ادا کی جائے۔ (۳۸)

۲۹) بہترین کمائی مزدور کی ہے۔ کیونکہ وہ جسم کے تمام توانائیاں صرف کرتا ہے۔ اگر مزدور کی حق اور بھلائی بھی پیش نظر رکھے تو اس کا درجہ بہت بلند ہے۔ (۳۹)

۳۰) مرتشی حاکم عدالت نہیں کر سکتا اور جو شخص عدل پر مامور ہو اور انصاف نہ کرے اس کے لئے جہنم ہے۔ مزید فرمایا رشوت کا لین دین، دلالی کرنا حرام ہے اور خنزیر اس کے مرتکب عذابِ الٰہی میں گرفتار ہوں گے۔ (۴۰)

۳۱) لاَ اِیمان لِمن لاَ امانۃ لہ

(ترجمہ) اس کا ایمان نہیں جو امانت دار نہیں۔ (۴۱)

۳۲) ماعال من اقتصد

(ترجمہ) وہ محتاج نہ ہوا جس نے میانہ روی اختیار کی۔ فضول خرچ انسان کیلئے مضر ہے۔ اسلئے اس حدیث مبارکہ میں اعتدال پسندی کی ترغیب دی گئی ہے۔ (۴۲)

۳۳) عُودوا المریضَ وَاطعِمُوا الجائع وفکوّ العانیَ

(ترجمہ) بیمار کی تیمارداری کرو اور بھوکے کو کھانا کھلاؤ اور قیدی کو آزاد کرو۔ (۴۳)

۳۴) لاَیحیتکوُ لا الحاطِی (ترجمہ) ذخیراندوزی نہیں کرتا مگر وہی جو خطا کار ہے۔

اس حدیث میں ذخیرہ اندوزی کی مذمت کی گئی ہے۔ اور یہ ارتکاب صرف خطا کار سے ہی سرزد ہوسکتا ہے۔ یہاں ذخیرہ اندوزی سے مراد یہ ہے کہ غلہ وغیرہ کو اس لئے روکنا کہ لوگ مجبور ہوکر مہنگے داموں خریدیں۔ قحط سالی کے زمانے میں غلہ روک کر اپنی دولت بڑھانے کے فکر پرلے درجے کی خودغرضی ہے ہاں اپنے گھریلوں ضرورتوں کے لئے یا عام حالات تجارت کیلئے ذخیرہ اندوزی ممنوع نہیں۔ (۴۴)

۳۵) مَا اٰمَن بِی منِ بَات جارُہٗ جائعاً۔

ترجمہ: وہ مجھ پر ایمان نہیں لایا جس کا ہمسایہ رات بھی بھوکا سوئے۔ (۴۵)

۳۶) جو شخص زمین کے ایک بالشت بھی ناحق طور پر سے لے قیامت کے دن ساتوں زمینوں کا طوق بنا کر اس کے گلے میں ڈالا جائے گا۔

اس حدیث میں نقدی سے کسی کی زمین پر قبضہ کر لینے سے ڈرایا گیا ہے۔ (۴۶)

۳۷) اللہ تعالیٰ قیامت کے دن تین اشخاص سے بات نہ کرے گا۔ نہ رحمت کی نظر کرے گا۔ ایک وہ ہے جس کے پاس ضرورت سے زیادہ پانی تھا مگر دوسرے کو آبپاشی نہ کرنے دے جس طرح تو نے پانی روکا اسی طرح میں فضل روکوں گا۔ (۴۷)

۳۸) اوپر والا ہاتھ نیچے والے ہاتھ سے بہتر ہے اور شروع اس شخص سے کہ جس کے نان ونفقہ کے تم ذمہ دار ہو (متفق علیہ) اس حدیث سے اپنے اہل وعیال اور قرابت داروں کی مالی امداد کرنے کیلئے اشارہ ملتا ہے کہ خیرات بھی اپنے عزیز واقارب سے شروع کرنی چاہئیے کیونکہ ان کے حقوق زیادہ ہوتے ہیں (۴۸)

۳۹) رسول اللہ نے فرمایا: نہیں ایسا کوئی مسلمان جس نے کھیتی کی ہو یا درخت اگایا ہو پھر اس کھیتی سے یا درخت، آدمی یا جانور مگر یہ کہ ہوگا اس کی طرف سے صدقہ۔ (۴۹)

۴۰) ارشادِ گرامی ہے: اور چاہیے کہ اپنے اہل وعیال کے لئے طلب حلال کی کوشش کرو کہ یہ

اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد ہے۔(۵۰)

۴۱) منی لم یسأل اللہ یغضب علیہ .

(ترجمہ) جو اللہ تعالیٰ سے نہیں مانگتا رب اس پر غصہ کرتا ہے۔(۵۱)

۴۲) اے اللہ میں فقیر محتاجی کے فتنہ سے تیری پناہ مانگتا ہوں مجھ سے میرے قرض کے بار کو اتار دیں اور محتاجی سے مجھے بے نیاز کیجئے۔(۵۲)

۴۳) آنحضور ﷺ کا فرمان ہے۔کہ جب تم نے زکواۃ ادا کر دی تو تم پر جو حق تھا وہ پورا کر دیا۔

۴۴) تم میں سے جس کی نظر کسی ایسے شخص پر پڑے جسے مال و دولت میں برتری عطا کی گئی ہو تو چاہئے کہ اس وقت ان لوگوں کو دیکھے جو اس سے نیچے ہوں۔ایسا کرنے سے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنے کی توفیق ہوگی۔(۵۳)

۴۵) آدمی سے دریافت کیا جائے گا کہ اپنے مال کو کن ذرائع سے حاصل کیا اور کن راہوں پر صرف کیا(۵۴)

۴۶) جو غنی ہونے کے باوجود لوگوں سے بھیک مانگتا ہے وہ دوزخ کے انگارے جمع کرتا ہے(۵۵)

۴۷) حضرت جابرؓ کے قول کے مطابق رسول مقبول کا ارشاد ہے"غبن المسترسل ربا" کسی ایسے شخص کا استحصال کرنا جو کہ تم پر اعتماد کرتا ہو سود کے مترادف ہے۔(Toexploit)

۴۸) صدقہ صاحب غنا اور مضبوط کے لئے حلال نہیں ہے۔(۵۶)

۴۹) تم اپنے وارثوں کو غنی چھوڑ کر جاؤ یہ اس سے بہتر ہے کہ انہیں افلاس کی حالت میں چھوڑ دو کہ لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلاتے پھریں۔(۵۷)

۵۰) آدمی جو خرچ اپنی بیوی پر کرتا ہے اور خدا کو سامنے رکھتا ہے یہ اس کی طرف سے صدقہ ہے۔(۵۸)

۵۱) آپؐ نے فرمایا مرنے کے بعد جو کوئی مال چھوڑے وہ اس کے وارثوں کا حق ہے۔ مگر کوئی بوجھ چھوڑ کر مرے تو اس کی ذمہ داری حکومت پر ہے۔ (۵۹)

۵۲) تم نے اپنے آپ کو جو کھلایا یہ بھی صدقہ ہے جو اپنی اولاد کو کھلایا وہ بھی صدقہ ہے تمہاری طرف سے اور اپنی بیوی کو کھلایا وہ بھی صدقہ ہے۔ اور اپنے نوکر کو جو کھلایا وہ بھی تمہاری طرف سے صدقہ ہے (۶۰)

۵۳) وہ اشرفی جسے اللہ کے راہ پر خرچ کیا اور وہ اشرفی جو غلام آزاد کرنے میں اور جو مسکین پر صدقہ کی اور وہ جو اپنے زوجہ پر صرف کی تو ان تمام اشرفیوں میں ثواب اور اجر کے حساب سے بڑی وہ ہے جسے اپنی بیوی پر خرچ کیا۔ (۶۱)

۵۴) سونے چاندی کے برتنوں میں نہ پیا کرو اور نہ ان کے بادیوں میں کھانا کھایا کرو (۶۲)

(صحاح ستہ) چاندی کے برتن میں جو کھاتا پیتا ہے۔ وہ دوزخ کی آگ میں اس کے پیٹ میں کھولے گا۔

۵۵) اعتبہ بن عامر کے قول کے مطابق رسالت مآب ﷺ نے فرمایا ایک مسلمان دوسرے کا بھائی ہے اس کے لئے جائز نہیں وہ کسی دوسرے مسلمان کے ہاتھ کوئی ایسی چیز فروخت کرے جس میں کوئی خرابی ہو اور اسے ظاہر یا بیان نہ کیا جائے۔ (۶۳)

۵۶) نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے" اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں پر رحم کرتا ہے جو کہ خرید و فروخت یا قرض کی واپسی پر دوسروں کے شائستہ ہیں اور ان کا خیال رکھتے ہیں۔ (۶۴)

۵۷) اِن اللہ یحب ان یری اثر نعمۃ علی عبدہ (ترجمہ) اللہ تعالیٰ اس کو پسند کرتے ہیں کہ اپنی نعمت کے نشانات کو اپنے بندے پر دیکھیں۔ (۶۵)

۵۸) اذا كان أحدكم فقيراً فليبدء بنفسه

(ترجمہ) تم میں جو کوئی نادار نہ ہو تو چاہیے خرچ کی ابتداء کو اپنی ذات سے کرے۔

نیز ابوداؤد میں ہے۔ تصدق به علی نفسك اپنی ذات پر اسے خیرات یعنی خرچ کرو۔ (۶۶)

۵۹) علم والوں کا اس پر اتفاق ہے کہ ایسے نادار والدین جن کی نہ کوئی کمائی ہو اور نہ اس کے پاس مال ہو ان کا خرچ اولاد کے ذمہ ان کے مال سے واجب ہے۔ رسول کریم سے دریافت کیا گیا تو فرمایا۔

'امک! امک! امک! ثم الا قرب فالاقرب (ابوداؤد)

ماں کے ساتھ! ماں کے ساتھ! ماں کے ساتھ! پھر جو قریب رشتہ دار ہوں اس کے بعد پھر وجاحت فرمادی، ماں کو دو، باپ کو دو، بہن، بھائی قریبی رشتہ کو پھر اس کے بعد ہوں مزید فرمایا۔ دینے والے کو دو ثواب حاصل ہوتے ہیں۔۔ رشتہ داری کا صدقہ کا۔ (۶۷)

۶۰) (لا يبارك في ثمن ارض ولا دار لا يجعل في ارض ولا دار)، برکت دے اللہ اس زمین اور اس گھر کی قیمت میں جو پھر زمین ہی یا گھر ہی میں نہ لگا دی جائے۔

اس طرح ابن ماجہ کے الفاظ میں۔

''جو شخص گھر یا جائیداد افروخت کرے اور پھر اس جیسی چیز یعنی گھر یا جائیداد خریدنے میں نہ لگا دی تو وہ اس کا مستحق ہے کہ اس کے مال میں برکت نہ دی جائے''

اسی طرح یحییٰ بن آدم القرشی نے الخراج میں اس حدیث کا ذکر یوں کیا ہے۔

نہیں برکت دی جاتی زمین اور گھر کی قیمت میں مگر یہ کہ پھر اس قیمت کو زمین یا گھر ہی میں لگا دیا جائے گویا اس احادیث سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ ایک جائیداد کو فروخت کر کے اس کے بدلے دوسری جائیداد بنائی جاتیں۔ نہ کہ اس رقم کو عیاشی اور فضول کاموں پر صرف کر دیا جائے، جیسے کہ امراء عموماً کرتے ہیں۔ (۶۸)

۶۱) کوئی شخص حرام کماتا ہو پھر صدقہ کرتا ہو تو ایسا صدقہ قبول نہیں ہوتا۔ اور نہ ایسے مال کو اپنے

اوپر خرچ کرنے میں برکت ہوتی ہے اور اگر ایسے مال کو ترکہ میں چھوڑ مرا تو وہ اس کے حق میں دوزخ کا توشہ بن جاتا ہے کیونکہ خدا تعالیٰ برائی کو بھلائی سے نہیں مٹاتا بلکہ بھلائی سے برائی کو مٹاتا ہے۔(۶۹)

۶۲) کسی چیز کو ھبہ کر کے واپس لینا ایسا ہی ہے جیسے کتا قے کر کے پھر کھا جاتا۔ دوسری روایت ہے کہ ایک دوسرے کو ہدیہ دیا کرو یہ آپس کی دشمنی اور کینہ کو دور کرتا ہے۔(۷۰)

۶۳) قیامت اس وقت تک قائم نہ ہوگی جب تک مال کی اتنی زیادتی نہ ہو جائے کہ بہا بہا پھرے حتیٰ کہ مالدار آدمی کو فکر پڑ جائے گی کہ اس کا صدقہ کون لے جس کو دینا چاہئے گا یہ کہہ کر رد کر دے گا کہ مجھ کو ضرورت نہیں۔

اسی طرح ایک حدیث میں ہے کہ:

''صدقہ کیا کرو کیوں کہ ایسا زمانہ آنے والا ہے آدمی اپنا صدقہ زکواۃ لئے پھرے گا اور اس کو لینے والا کوئی نہ ہوگا''(۷۱)

۶۴) حضور اکرمؐ فرماتے ہیں کہ میں نے جنت کے دروازے پر لکھا دیکھا کہ صدقہ دینے سے دس نیکیاں اور قرض دینے سے اٹھارہ۔ آپؐ نے حضرت جبرائیلؑ سے پوچھا تو انہوں نے فرمایا قرض وہی مانگتا ہے جسے حاجت ہو بخلاف صدقہ کے قرض دینے کا اتنا ثواب ہے (خیر و خیرات کا نہیں) یعنی بعض حالات میں قرض دینے کا اجر زیادہ ہے۔

۶۵) رسول مقبول ﷺ نے امراء سے غرباء کے بارے میں یوں فرمایا:

''اگر کسی مسلمان بھائی کی حالت گھٹیا ہو تو اسے جو کچھ خود کھاتا ہے اور پہنتا ہے تو اس کا حصہ دار بنانا چاہئے''(بخاری شریف)

۶۶) دولت امراء سے لے کر غریبوں کو لوٹا دینا چاہئے۔(بخاری)

اس حدیث کا مطلب یہ نہیں ثروت امیروں سے زبردستی چھین لینی چاہئے بلکہ انہیں ترغیب دینی چاہئے

کہ غریبوں میں تقسیم کریں البتہ جولوگ زکوۃ ادانہیں کرتے ان پر سختی بھی کی جاسکتی ہے جس طرح کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے زکوۃ نہ دینے والوں کے خلاف اعلان جنگ کیا تھا۔ (۷۲)

۶۷) حضرت عائشہ صدیقہؓ کے مطابق حضور اکرم ﷺ نے فرمایا آپس میں ہدیہ اور تحفہ بھیجا کرو اس سے بغض اور کینہ دور ہوتا ہے۔ (۷۳)

۶۸) ہر اُمت کیلئے کوئی خاص آزمائش ہوتی ہے اور میری امت کی خاص آزمائش مال ہے (۷۴)

۶۹) بھوکے بھیڑیے جو بکریوں کی ریوڑ میں چھوڑ دیے گئے ہوں ان بکریوں کو ان سے زیادہ تباہ نہیں کرسکتی جتنا آدمی کے دین کو مال وعزت وجاہ کی حرص تباہ کرتی ہے۔ (۷۵)

۷۰) حضرت ابوہریرہ کہتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا بندہ کہتا ہے کہ میرا مال، میرا مال حالانکہ اس کے مال میں سے جو واقعی اس کا ہے وہ بس تین مدیں ہیں جو اس نے کھا کر ختم کردیا جو پہن کر پرانا کردیا۔ اور جو راہ خدا میں دے کر آخرت کے لئے ذخیرہ کرلیا، باقی جو بچ وہ دوسروں کے لئے چھوڑ جانے والا ہے۔ (۷۶)

۷۱) جو شخص دنیا کو مطلوب ومحبوب بنائے گا وہ اپنی آخرت کا ضرور نقصان کرے گا۔ پس عقل و دانش یہی ہے کہ فانی کے مقابلے میں باقی کو اختیار کیا جائے۔ (۷۷)

۷۲) حضرت ابوامامہؓ نے روایت کیا ہے، آپؐ نے فرمایا اللہ نے میرے سامنے یہ بات رکھی کہ وہ میرے لئے مکہ کی وادی کو سونے سے بھر دے، میں نے عرض کیا، میرے پروردگار میں اپنے لئے یہ نہیں مانگتا بلکہ میں تو پسند کرتا ہوں کہ جب بھوکا ہوں تو آپ کو یاد کروں اور آپ کے سامنے گریہ وزاری کروں اور جب آپ کی طرف سے ملے اور پیٹ بھریں تو آپ کی مدد و شکر کروں۔ (۷۸)

مختلف نظامہائے معیشت دولت کی پیدائش اور تقسیم

علم معاشیات کو چار عنوانات کے تحت بیان کیا جاتا ہے:۔

۱) پیدائش دولت: (Production fo Wealth)

اس عنوان کے تحت ان مسائل سے بحث ہوتی ہے جو دولت کی پیداوار سے متعلق ہیں۔ جنمی یہ بتایا جاتا ہے کہ نظام معیشت کے تحت پیداوار حاصل کرنے کے لئے کیا طریقے اختیار کئے جاتے ہیں اس میں افراد اداروں اور حکومت وغیرہ کا کیا کردار ہوتا ہے اس عنوان کا عربی نام ''انتاج الثروہ'' ہے۔

۲) تقسیم دولت (Distribution of Wealth)

اس عنوان کے تحت اس بات سے بحث ہوتی ہے کہ حاصل شدہ پیداوار کو اس کے مستحقین کے درمیان کس طریق کار سے تقسیم کیا جائے اس کو عربی میں ''توزیع الثروہ'' کہتے ہیں۔

۳) مبادلہ دولت (Excange of Wealth)

اس عنوان کے تحت ان طریقوں سے بحث کی جاتی ہے۔ جو لوگ ایک چیز کے بدلے دوسری چیز اختیار کرتے ہیں۔ اس عنوان کو عربی میں ''مبادلۃ الثروہ'' کہتے ہیں۔

۴) صرف دولت (Consumption of Wealth)

اس عنوان کے تحت حاصل شدہ پیداوار یا دولت کو خرچ کرنے سے معتق مسائل پر بحث ہوتی ہے اس کو عربی میں ''استھلاک الثرو'' کہا جاتا ہے۔

جہاں تک ''مبادلۂ دولت'' اور ''صرف دولت'' کا تعلق ہے۔ البتہ اس پیدائش دولت اور تقسیم دولت کے بارے میں چند بنیادی باتیں اشتراکیت، سرمایہ داری۔ اور اسلام کے تقابلی مطالعہ کے لئے ضروری ہیں، ان کو مختصراً بیان کرنا پیش نظر ہے۔

پیدائش اور تقسیم کا سرمایہ دارانہ نظریہ

سرمایہ دارانہ نظام میں یہ بات ایک مسلمہ کے طور پر طے شدہ ہے کہ کسی بھی چیز کی پیداوار میں چار عوامل کارفرما ہوتے ہیں۔ جن جو اُردو میں ''عوامل پیداوار'' اور عربی میں ''عوامل الانتاج'' اور انگریزی میں Factors of Production کہتے ہیں۔

۱) زمین (Land)

اس سے مراد قدرتی عامل پیدائش ہے جو براہ راست اللہ تعالیٰ کی تخلیق ہے۔ اور اس کے پیدا کرنے میں انسانی عمل کا کوئی دخل نہیں۔

۲) محنت (Labour)

اس سے مراد وہ انسانی عمل ہے۔ جس کے ذریعہ کوئی نئی پیداوار وجود میں آتی ہے قدرتی عمل پیدائش ہے جو براہ راست اللہ تعالیٰ کی تخلیق ہے اور اس کے پیدا کرنے میں کوئی انسانی عمل کا دخل نہیں ہے۔

۳) سرمایہ (Capital)

اس کی تعریف سرمایہ دارانہ نظام میں یہ کی گئی ہے کہ سرمایہ ''پیدا کردہ'' عامل پیدائش'' (Produced facto ro Production) کا نام ہے۔ اس کی تعریف کی ذرا وضاحت کے ساتھ یوں کہا جا سکتا ہے۔ کہ سرمایہ وہ عامل پیداوار ہے جو قدرتی نہ ہو بلکہ کسی عمل پیدائش کے نتیجے میں پیدا ہوا اور اس کے بعد کسی اگلے عمل پیدائش میں استعمال ہو رہا ہو۔

۴) آجر (Enterpreneur)

ان سے مراد وہ شخص یا ادارہ ہے جو کسی عمل پیدائش کا محرک ہوتا ہے اور مذکورہ بالا تین عوامل پیداوار کو جمع کر کے انہیں پیدائش کے عمل میں استعمال کرتا ہے اور نفع ونقصان کا خطرہ مول لیتا ہے۔

سرمایہ دارانہ نظریہ یہ ہے کہ موجودہ دور میں پیدائش کا عمل ان چار عوامل کی مشترک کاروائی کا نتیجہ

ہوتی ہے اگرچہ بعض اوقات یہ عوامل ایک ہی شخص کی ذات میں بھی جمع ہو جاتے ہیں۔ یعنی وہی زمین فراہم کرتا ہے۔ وہی محنت کرتا ہے۔ اور وہی سرمایہ فراہم کرتا ہے۔ لیکن بڑے پیمانے کی صنعتوں میں عموماً یہ چاروں عوامل الگ الگ شخصیتوں میں ظاہر ہوتے ہیں۔ اور چونکہ پیداواران کے اشتراک سے عمل میں آتی ہے لہذا حاصل شدہ پیداوار کے مستحق بھی یہی ہیں۔

چنانچہ تقسیم دولت کا سرمایہ دارانہ نظریہ یہ ہے کہ زمین کو لگان یا کرایہ (Rent) ملنا چاہئے۔ محنت کو اجرت (Wages) سرمایہ کو سود (interst) اور آجر کو نفع (Profit) ان میں سے تقسیم کی پہلی تین مدات یعنی کرایہ، اجرت اور سود پہلے سے متعین ہوتی ہیں اور ان کا تعین رسد و طلب کی بنیاد پر ہوتا ہے۔

اسلامی نظام معیشت کے اصول

(Principal of Islamic Econmic System)

اسلام کی معاشی نظام کے بنیادی اصول حسب ذیل ہیں۔

۱) اسلامی معاشی نظام کی سب سے اولین بنیاد یہ ہے کہ اسلام میں معاشی سرگرمیاں مذہب و اخلاق سے الگ نہیں بلکہ معاشی زندگی میں بھی حدود اللہ تعالیٰ کی پابندی اور اخلاقی ضابطوں کا احترام سکھاتا ہے۔ تقاضا یہ کرتا ہے کہ مسلمان معاشی تگ و دو کے ساتھ ساتھ خدا کے ذکر میں مصروف رہیں اور اس کی اطاعت اور رضاجوئی حاصل کرتے رہیں۔

۲) اسلام کے معاشی نظام کا دوسرا اصول یہ ہے کہ اس کی معاشی جدوجہد اس کا بنیادی جز ہو، اسلام پوری کائنات کو انسان کیلئے میدان عمل قرار دیتے ہوئے اسے ترغیب دیتا ہے کہ وہ حصول معاش کیلئے زیادہ سے زیادہ تگ و دو کرے بے عملی، بے روزگاری اور گداگری کو اسلام سخت ناپسند کرتا ہے۔ اور مثبت طور پر رزق کی تلاش پر مسلمانوں پر فرض قرار دیتا ہے۔

۳) اسلامی نظام معیشت کا ایک بنیادی اصول یہ بھی ہے کہ اسلام پیداوار میں اضافے اور معاشی فروغ کے ساتھ ساتھ حلال وحرام کی تمیز کو بھی لازم ٹھہراتا ہے۔ اسلام ذرائع آمد پر اس بات کی کڑی شرط عائد کرتا ہے کہ اسے جائز ذرائع سے حاصل کیا جائے اور ہر وہ نفع جو حرام ذرائع سے حاصل ہو اسے وہ دوزخ کی آگ قرار دیتا ہے۔

قرآن واحادیث میں رزقِ حلال کی جتنی اہمیت بیان کی گئی ہے اس سے یہ واضح ہوتا ہے، کہ اسلام صرف جائز حلال رزق کی کوششوں کو فروغ دے کر ایک مثالی وجود میں لانا چاہتا ہے۔

۴) اسلام کے بنیادی اصولوں میں ایک حرمت پر بہت زور دیتا ہے اور اسے ہر شکل میں حرام قرار دیتا ہے سود کی ممانعت صرف اخلاقی بنیادوں پر ہی نہیں بلکہ اس کے معاشی، معاشرتی اور سیاسی نتائج بھی بے حد خطرناک ہیں سود کی بنیادی استحصال زر اور ظلم وتعدی پر ہیں۔ اور اسی کی وجہ سے ملکی دولت صرف چند سرمایہ داروں کے پاس مرتکز ہو جاتی ہے۔ اور اس طرح معاشرہ تباہ وبرباد ہو جاتا ہے۔

۵) اسلامی معاشی نظام کا اصول یہ ہے کہ اس نے لین دین خرید وفروخت اور تجارت کے لئے ضابطہ اخلاق پیش کیا ہے۔

اسلامی معیشت کی بنیاد خوف خدا اور امانت اور دیانت پر رکھی گئی ہے تجارت باہمی رضامندی اور صرف جائز، مباح اشیاء پر ہونی چاہیے ذخیرہ اندوزی، جوا، اور سٹہ کی اسلام نے سختی سے ممانعت کی ہے اسلام یہ بھی مطالبہ کرتا ہے کہ تاجر کو خوش خلق خدا ترس اور سچا، دیانتدار اور اعلیٰ اخلاقی کردار کا حامل ہونا چاہیے۔

۶) اسلام طلب معاش کے حلال ہونے کے ساتھ ساتھ مصارف دولت کے جائز ہونے کا بھی تقاضا کرتا ہے نیز اسراف اور فضول خرچی سے بھی سختی سے روکتا ہے۔ کیونکہ یہی چیز بالعموم دولت کے ضیاع کے لئے ناانصافی اور ظلم کا باعث بنتی ہے۔

۷) اسلام ارتکازِ دولت کی سختی سے ممانعت کرتا ہے اور یہ چاہتا ہے کہ دولت پورے معاشرے میں

گردش کرے اور تقسیم زیادہ سے زیادہ منصفانہ ہو چنانچہ اسلام نے ارتقاءدولت روکنے کے لئے زکوۃ صدقہ اور خیرات ،انفاق فی سبیل اللہ اور وراثت کے قوانین دیے جاتے ہیں۔ اور اس بات کی ترغیب دی ہے کہ ضرورت سے زائد مال معاشرے پر خرچ کردیا جائے۔

۸) اسلام زمین اور تمام وسائل کو خدا کی ملکیت قرار دے کر اس کے تحت انسان کو انفرادی تصرف کے حق کو بہت سی اخلاقی قانونی پابندیوں سے محدود کردیتا ہے تاکہ ظلم وتشدد کی صورت پیدا نہ ہو۔

۹) اسلام یہ تقاضا کرتا ہے کہ تمام شہریوں بنیادی ضروریات زندگی فراہم کرنا ریاست کا فریضہ ہے۔ ناداروں اپاہجوں ،محتاجوں اور ایسے افراد جن کا کوئی وارث نہ ہو۔ ان کی ذمہ داری بھی حکومت پر عائد ہوتی ہے۔ اس طرح وہ عدل اجتماعی کو قائم کرتا ہے۔

مختصر یہ کہ اسلامی نظامِ معیشت کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ اس کا مرکزی تصور انسان اور اس کی معاشی واخلاقی فلاح ہے۔ وہ معاشی ترقی کے ساتھ ساتھ اجتماعی عدل شخصی آزادی اور اخلاقی ترقی کو اولین اہمیت دیتا ہے

یہی وجہ ہے کہ اسلام کا معاشی نظام سرمایہ داری اور اشتراکیت دونوں سے اپنے اصولوں اور مقاصد کے اعتبار سے مختلف اور اعلیٰ اور برتر ہے۔ (۷۱)

اسلام میں
صرف دولت، پیدائش دولت، تقسیم دولت

صرف دولت اور اسلام

انسان نے صرف دولت میں بڑی بڑی خرابیاں پیدا کر رکھی ہیں ان کی وجہ سے معاشرہ انسانی میں بے پناہ خرابیاں پیدا ہوگئی ہیں ضروریات انسانی کی اگر صحیح ترتیب وتقسیم کی جائے تو حسب ذیل قسمیں ہوتی ہیں۔

۱) ضروریاتِ زندگی:

یعنی ایک انسان کو اپنی اور اپنے اہل وعیال کی زندگی کے لئے جن چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ مثلاً غذا، پانی، مکان، لباس، وغیرہ۔

۲) ضروریات کارکردگی:

یعنی ایک آدمی کو اپنا کام جاری رکھنے کیلئے جن چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے مثلاً کسان کیلئے ہل، بیل، ٹریکٹر وغیرہ صنعت کار کیلئے اوزار، آلات تاجر کیلئے گودام اور سائبان وغیرہ۔

۳) ضروریات توانائی:

یعنی آدمی اپنی حرکات میں اور جدوجہد میں اپنی توانائی کا حصہ صرف کرتا ہے۔ اس کے پھر سے واپس لانے کی تدابیر کے سلسلے میں جو ضروریت لاحق ہوتی ہیں مثلاً سیر و تفریح وغیرہ۔

ان تین اقسام کو شریعت اسلامی نے قبول کیا ہے۔ اور ان کی تکمیل کیلئے جدوجہد کو قابل تعریف قرار دیا ہے البتہ اس سلسلے میں اعتدال سے باہر قدم رکھنے کی ممانعت کی گئی ہے ان ضروریت زندگی کی تکمیل کے سلسلے میں بے اعتدالی کی وجہ سے لوگوں میں شک و حسد، دشمنی اور معاشی ناہمواری پیدا ہوگی ان تینوں ضروریات کے علاوہ آدمی دو قسموں کے ماتحت اپنی دولت صرف کرتا ہے۔

قرآن مجید نے ان دونوں صورتوں کوممنوع قرار دیا ہے اور رسولؐ نے بہ حکم الہی ان کی ممانعت فرمائی ہے اسراف وتبذیر کہلاتی ہیں۔

اسراف یہ ہے کہ جہاں پرجتنی خرچ کی ضرورت ہواس سے زیادہ خرچ کیا جائے چاہے وہ کام اچھا ہی ہو قابل تعریف ہوگر اس میں ضرورت سے زیادہ خرچ اسراف ہے اور اسراف کی اللہ تعالٰی نے قرآن مجید میں صریح ممانعت فرمائی ہے۔ اسراف کو اسلام نہ صرف اس لئے روکتا ہے کہ ان سے قومی دولت کا ضیاع ہوتا ہے۔ بلکہ اس لئے بھی کہ ان کا مقصد نام ونمود اور نمائش ہوتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

''اور بے جا خرچ نہ کرو۔ بیشک بے جا خرچ کرنے والے شیطان کے بھائی ہیں۔'' (۸۰)

درحقیقت اسلام یہ چاہتا ہے کہ دولت کو بے جا اور ناجائز خرچ کرنے کے بجائے اسے تعمیری اور مفید کاموں میں خرچ کیا جائے۔ اس لئے اسلام میں اسراف وتبذیر کی سخت ممانعت کی گئی ہے۔

پیدائش دولت:

اس سلسلے میں حضورﷺ نے جو اصلاحی ہدایات دیں۔ اور ان پر جس پابندی کے ساتھ عمل کرایا۔ اس نے معاشیات کی بگڑی ہوئی شکل کو اصلاحات کے ذریعے سے سنوار کر خوش نما بنا دیا ورنہ حرص کے داغ سے پیدائش دولت کی جدوجہد کا چہرہ ہمیشہ گھناؤنا رہا ہے۔ حقیقی عوامل پیدائش دولت صرف دو ہیں۔ ایک زمین اور دوسرا انسان یعنی محنت۔ یہ دونوں عوامل ایسے ہیں کہ ان کے پیدا کرنے میں ہمارا کوئی حصہ نہیں ہے یہ تمام تر رب العالمین کا عطیہ ہے، محنت کر کے روزی کمانے کا حق ہر انسان کو حاصل ہے اور جب وہ اپنی محنت سے اس شے کو ضروریات میں سے کسی ضروریات کی تکمیل کے قابل بنائے تو پھر اس شے کا مالک ہے اور اسے حق حاصل ہے اگر کسی کو مفت دے دے یا اسے فروخت کر دے۔

تقسیم دولت:

ہر شخص جو کچھ زمین یا باغ سے پیدا کرے یا اپنی صنعت وحرفت سے بنائے اس کو خود ہی خرچ کر دے۔

نہ ایسا ممکن ہے اور نہ یہ ممکن ہے کہ ضرورت مند تک ان تمام چیزوں کا سفر کر کے خود پہنچ سکے اس لئے تبادلہ دولت کے ایسے قواعد وضوابط ضروری ہیں کہ کاشتکار یا صرف کنندہ پر ظلم ہو سکے۔

اس کا بنیادی اصول قرآن مجید میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ تبادلہ دولت کے اس بنیادی اصول کی خلاف ورزی کرے تو مسلمانوں پر واجب ہے کہ اس شخص کو سزا دیں کسی کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ بلا واسطہ یا بلواسطہ ایسی صورت پیدا کرے جس میں خریدار خریدنے یا فروخت کرنے پر مجبور ہوئے اسی طرح ذخیرہ اندوزی، چور بازاری اور کسی چیز کو اس کا نقص بتائے بغیر فروخت کرنے کی ممانعت ہے۔ یہ سارے جرائم دنیا میں قابل سزا اور آخرت میں موجب عذاب عظیم کے ہیں۔ حضور پاکؐ کے بیان کردہ تین احکام جو مندرجہ ذیل ہیں۔

۱) سٹہ کی ممانعت:

فروخت کی جانے والی چیز اور اس کی قیمت دونوں کی غیر موجودگی میں ہر بیع یا معاہدہ بیع ناجائز ہے بڑی سختی سے ایسی خرید وفروخت کو حرام قرار دیا ہے۔ یہ بہت نقصان رساں معاملہ ہے اس کی وجہ سے ضروری اشیاء پیدا کرنے والے کو کم سے کم قیمت ملتی ہے اور صارف کو اشیائے صرف کی زیادہ سے زیادہ قیمت ادا کرنی پڑتی ہے یہ صورت غیر منصفانہ بلکہ صریحاً ظلم ہے اور اس کی آپؐ نے ممانعت فرمائی۔

۲) سود کی حرمت:

سود جسے عربی میں ''ربوا'' کہتے ہیں اس کی متعدد صورتیں ہوتی ہیں۔ ہر صورت میں سود حرام ہے چاہے۔ سودی قرضے لینے والے نے اپنی اس ذاتی ضرورت کے لئے لیا ہو یا کاروباری ضرورت کے لئے، چاہے اصل قرض دی ہوئی رقم پر کوئی اضافہ وصول کیا جائے یا کوئی شے فروخت کر کے۔ یہ شرط لگا دی جائے کہ اتنی مدت کے اندر اس کی قیمت ادا نہ کی جائے تو اس قدر زیادہ رقم ادا کرنی ہوگی۔ سود ہر صورت میں حرام ہے۔ اور اس شدت کے ساتھ اس کی حرمت بیان کی گئی ہے کہ جو لوگ حرمت کا حکم آجانے کے بعد بھی سود لے تو اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے اعلانِ جنگ ہے۔ سود میں اضافہ بے محابہ وقت تسلیم کی جاتا ہے حالانکہ کہ یہ قانونی فطرت کے بالکل برخلاف ہے۔

کسی سرمایہ میں بے مقابلہ وقت کبھی نہیں ہوسکتا۔ یہ قانونِ فطرت کے خلاف کھلی بغاوت ہے۔ سود کا ہر معاملہ ایک طرفہ معائدہ ہوتا ہے۔ اور ایک طرفہ معائدہ دنیا کے کسی قدیم وجدید قانون میں جائز نہیں۔ سود کے ذریعے سے اشیائے صرف کی قیمتوں میں اضافہ ہوجاتا ہے۔ اور شدید معاشی ناہموری پیدا ہوجاتی ہے۔

۳) قانونِ وراثت:

قانونِ وراثت خود اپنی جگہ پر بڑی اہم معاشی اصلاح ہے۔ قدیم اقوام میں عام طور سے وراثت اکبر جیسے انگریزی میں پرایموجنیچر کہا جاتا ہے، رائج تھا۔ دنیا کے اکثر ممالک میں یہ طریقہ رائج تھا کہ باپ کی وفات پر اس کی سب سے بڑی اولاد وارث ہوتی تھی۔

اس ناانصافی کی اصلاح قرآن مجید نے اس طرح کردی کہ تفصیل کے ساتھ وارثوں کے حصے مقرر کردیئے۔ اس سے ایک فائدہ یہ ہوا کہ دولت مند کی وفات کے بعد خود بخود تقسیم ہوگئی اور بڑی بڑی جائیداوں کے وراثتی دولت مندوں کا کاہل بے عمل طبقہ ختم ہوگیا۔ دوسرا فائدہ یہ ہوا کہ دو بھائیوں اور بھائی بہنوں کے مابین محبت والفت کے رشتوں کو باقی رہنے کا موقع میسر آگیا۔

اسلام بمقابلہ سرمایہ داری نظام

اسلام	سرمایہ داری
۱) اسلام میں مقصود آخرت کی زندگی ہے۔ اور دینوی زندگی کی کھیتی سمجھا گیا ہے مگر طرز زندگی حلانکہ ایسا دیا گیا ہے جس میں آخرت کی بہتری کے ساتھ دینوی زندگی بہتری خود بخود حاصل ہو جاتی ہے۔	۱) اس میں آخرت کی کوئی جگہ نہیں دینوی زندگی کی بہتری ہی مقصود ہوتی ہے حالانکہ دینوی زندگی کے ساتھ آخرت جس میں آکر رہنا چاہے اور یورپ کے سرمایہ دار برائے نام جس مذہب کو مانتے ہیں اس میں عقیدہ کو آخرت کا وجود ہے۔
۲) اسلام میں روح اور مادہ دونوں کے حقوق ادا کئے گئے ہیں اور دونوں کے حقوق میں توازن رکھا گیا ہے۔	۲) سرمایہ داری نظام میں مادی مفاد پر پورا زور دیا گیا ہے اس کے مقابلے میں روح کو نظر انداز کیا گیا ہے حالانکہ فطری حد تک وہ بھی مانتے ہیں کہ انسان کے ساتھ روح لگی ہوئی ہے۔
۳) اسلام میں اکتساب مال کی آزادی ہے مگر پابندیوں کے ساتھ۔	۳) سرمایہ داری نظام میں اکتساب مال پر کسی قسم کی کوئی پابندی نہیں۔
۴) اسلام نے فرد کو انفرادی آزادی دی ہے مگر حدود قیود کے ساتھ۔	۴) اس میں بے لگام آزادی دی گئی ہے۔
۵) اسلام میں جہاں انفرادی آزادی معاشرے کے لئے نقصان دہ ثابت ہونے لگے تو حکومت دخل دینے کی مجاز ہے	۵) اس کے برعکس سرمایہ دارانہ نظام میں فرد معاشرے کو تباہ

	کرنے کے جوبھی طریقے اختیار کرے حکومت دخل نہیں دے گی۔ اس کی حیثیت مصنف یا پولیس کی سی ہوتی ہے۔
۶) اسلام مال جمع کرنے کی ممانعت کرتا ہے اور خرچ کرنے کا حکم دیتا ہے کیونکہ اس سے برکت ہوتی ہے اور دولت کی گردش بڑھتی ہے۔	۶) بچت کو جمع کرنا اور جمع شدہ دولت کو مزید دولت پیدا کرنے میں لگانا دراصل سرمایہ داری کی جڑ ہے۔
۷) اسلام میں سود حرام ہے اس کی سختی سے ممانعت کی گئی ہے۔	۷) سرمایہ داری نظام کا دارومدار مادی ہی سود پر ہے
۸) اسلام میں امدادِ باہمی کا تصور یہ ہے کہ جو لوگ دولت مند ہوں وہ غریبوں کو نہ صرف قرض دیں بلکہ قرض ادا کرنے میں بھی مدد دیں اور تنگ حال کا قرضہ معاف کردیں۔	۸) سرمایہ داری میں امدادِ باہمی کے معنی یہ ہیں کہ امدادِ باہمی کو پیسے روپیہ دے کر اس کا کارکن بنے، پھر اگر ضرورت پیش آئے گی تو انجمن کم شرح سود پر قرضہ دے گی۔ اگر روپیہ کسی کے پاس نہیں ہے تو انجمن امداد باہمی سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔
۹) اسلام یہ بھی حکم دیتا ہے کہ روپیہ اول تو جمع ہی نہ ہو اگر جمع ہو تو بھی اس تالاب میں سے زکواۃ کی نہریں نکال دی جائیں تاکہ جو کھیت سوکھے ہیں ان کو پانی پہنچے اور آس پاس کی زمین بھی شاداب ہو جائے۔	۹) سرمایہ داری نظام میں روپیہ جمع کرنے کی ترغیب دی جاتی ہے اس کو بڑھانے کیلئے سود لیا جاتا ہے تاکہ ان نالیوں کے ذریعے سے آس پاس کے

	لوگوں کا روپیہ بھی سمٹ کر اس جھیل میں جمع ہو جائے۔

اسلام	شوشلزم
۱) اسلام کی بنیاد خدا پرستی پر ہے۔	۱) اس کے برعکس شوشلزم خدا کے انکار پر مبنی ہے۔
۲) اسلام الہامی تعیمات پر مبنی ہے۔ شریعت قوانین کا مجموعہ جس کی بنیاد الہامی ہو، اسلامی نظامِ زندگی ہے۔	۲) شوشلزم کا مجموعہ قوانین انسانی ہے۔
۳) اسلام میں نجی ملکیت کا پورا حق موجود ہے۔ انسان کی ذاتی کوششوں سے حاصل کردہ دولت کو مقدس سمجھا گیا ہے۔	۳) شوشلزم میں انفرادی ملکیت کا انکار ہے۔
۴) اسلام میں طبقات کے درمیان محبت پیدا کرنے کا حکم	۴) شوشلزم میں مختلف طبقات میں نفرت کی آگ بھڑکائی جاتی ہے۔
۵) اسلام میں معاشرے اور فرد کے حقوق وفرائض میں اعتدال برتی گئی ہے۔	۵) شوشلزم میں معاشرے کے اتنے زیادہ حقوق ہیں کہ انفرادیت ختم ہوگئی ہے۔
۶) مساوات کا اسلام میں فطری تصور ہے، یعنی پڑھے لکھے اور جاہل کو زبردستی ایک سطح پر لایا جائے ممکن نہیں رکھا گیا۔	۶) شوشلزم کی مساوات غیر فطری ہے، انسانی فطرت کے خلاف ہے۔
۷) اسلامی معاشرے میں آزادی رائے، حق تنقید اور فریاد کا حق حاصل ہوتا ہے۔	۷) شوشلسٹ معاشرے میں سخت قسم کی زبان بندی ہے، ہڑتالی تنظیمیں

اسلام	سوشلزم
	بنانے کا حق اور آزادانہ تنقید کا حق نہیں۔
۸)اسلامی معاشرے کا ہر فرد اور ہر مزدور کا آزادانہ درزی کما سکتا ہے۔	۸) شوشلست معاشرے میں مزدور آزادانہ اپنا معاشپیدا کرنے کا حقدار نہیں
۹)اسلام میں اخلاقی اقدار کی بہت اہمیت ہے۔ والدین کے حقوق ہیں، ہمسائے کے حقوق ہیں۔	۹) اس میں سرے سے اخلاق موجود نہیں۔ بچوں پر پہلا حق حکومت ہے والدین ثانوی حیثیت رکھتے ہیں باقی چال چلن کی پاکیزگی کا سرے سے وجود نہیں۔
۱۰) اسلام میں عورت کا مالی بوجھ رشتے دار مردوں کے پر رکھ گیہ ہے۔	۱۰) اس معاشرے میں ہر فرد اپنا بوجھ اٹھاتا ہے۔ اور عورت بھی اس سے مستثنیٰ نہیں
۱) اسلام میں معاشی اقدار اور اخلاقی اقدار ہم آہنگ ہیں	۱۱)شوشلسٹ معاشرے میں اخلاقی اقدار کو معاشی اقدار کے ماتحت رکھا گیہ ہے
۱۲) اسلام میں حکومت کو مطلق العنان اختیار حاصل نہیں اختیارات حاصل ہوتے۔ اس پر کچھ پابندیاں عائد ہوتی ہیں۔	۱۲) شوشلزم میں حکومت کو لامحدود ہوتے ہیں۔ اس پر پابندی ہوتی ہیں۔ نہیں ہے۔(۸۱)

مختلف معاشی نظاموں کا جائزہ
(Apprasal of different Economic System)

آج کل اضطراب وافراتفری کے بعض دنیا چند گروہ میں بٹ چکی ہے۔ ایک طرف سرمایہ داری کا دوردورہ ہے۔ تو دوسری جانب شوشلزم اور کمیونزم کی یلغار جاری وساری ہے۔ اب تیسری طرف ترقی پذیر اور پسماندہ ممالک کا گروپ ابھر رہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ سب کچھ اقتصادی عدم توازن کے موجب استعجاب وتذبذب کی فضاء منڈلا رہی ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام اپنی سخت چیرہ دستیوں اور ہولناکیوں کے سبب اپنی موت آپ مررہا ہے۔ اس سے دو بڑے اور متحارب فریق قائم ہونے تھے۔

ایک جانب متمول اور صنعت کار طبقہ منظر عام پر آیا تو دوسری طرف مزارع ومزدور کا ٹولہ وجود میں آیا۔ جو سرمایہ داروں کے سہام ستم جو کا ہدف۔ خطا بنا۔ اور اس کی دردمند سسکیاں کسی نئے نظام کی متلاشی تھیں۔ پایان کا مردنیا کے اندر ایک عجیب وغریب اور پرفریب سسٹم نے سر اٹھایا۔ چند ممالک نے اسے سرآنکھوں پہ بٹھایا اور اپنی تجارت اسی کے نفوذ میں گردانی اب پوری آب وتاب اور برق رفتاری سے اکثر ممالک کو اپنی منحوس لپیٹ میں لے لیا۔

اس کے برعکس کچھ طالع آزما اسلام کے ساتھ پیوند کاری میں مصروف ہیں۔ وہ اسلامی اشتراکیت، سائنٹیفک، شوشلزم اور اس قسم کے دیگر دلفریب نعرے لگانے میں بے تاب ہے۔ گویا ان کے خیال میں اسلام کا نظام اقتصادیت نامکمل ہے جو وقتی ضروریت سے ہم آہنگی کرنے سے قاصر ہے۔ اللہ نے (الیوم اکملت لکم دینکم) کہہ کر پایہ تکمیل تک پہنچادیا۔ اس باب میں مختلف نظاموں کا ناقدانہ جائزہ پیش خدمت ہے۔ (۸۲)

سرمایہ داری: (Capitalism)

سرمایہ دارانہ نظام کی بنیاد جس نظریہ پر قائم ہے وہ صاف اور سادہ الفاظ میں ہے کہ ذرائع پیدائش عوام کے ہاتھوں میں ہوتے ہیں۔ اور حکومت ان کی نگرانی ومحافظ ہوتی ہے۔ ہر فرد اپنی کمائی کا

مالک ہوتا ہے اور کسی دوسرے کا اس پر حق نہیں ہوتا۔

صنعت، زراعت، تجارت، پرائیوٹ اداروں اور اشخاص کی رہن منت ہوتی ہیں۔ تاہم دھاندلیوں، بے قاعدگیوں اور بے اصولیوں کو روکنے کے لئے حکومت وقتاً فوقتاً قوانین اور قواعد کا نفاذ کرتی رہتی ہے۔ ہر شخص کو اپنے مال میں کم بیشی کرنے اور تصرف کرنے کا پورا پورا اختیار ہوتا ہے۔ جس قدر وسائل دولت اس کے قبضے میں آئیں۔ انہیں روک رکھنے اور اپنی ذات کے لئے کوئی مفاد حاصل کی ہے۔ بغیر انہیں صرف کرنے سے انکار کرنے کا اختیار ہوتا ہے۔

اور یہی غیر مساوی تقسیم دولت کی ابتداء ہوتی ہے۔ معاشرہ عموماً دو متحارب گروہ سرمایہ داروں اور ناداروں میں بٹ جاتا ہے۔ اس طرح معاشی توازن بگڑنے لگتا ہے اور سوسائٹی کے مختلف عوارض میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ امیر طبقہ غرباء کا خون چوسنے لگتا ہے اور ان کی بے بسی، عُسرت اور غربت انتہاء کو پہنچ جاتی ہے، حتیٰ کہ امیر طبقہ اپنے ثروت کی جھنکار سے عنانِ حکومت بھی اپنے ہاتھ میں لے لیتا ہے۔

دونوں فریق اپنی اپنی طاقت و بساط کے بل بوتے پر ایک دوسرے کو نیچے کرنے کے عملی کوشش کرتے ہیں، اور اس طرح طبقاتی کشمکش کا ایک عجیب سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ اس نزاع کے باعث تالہ بندی، رسد بندی اور ہڑتال وغیرہ منظر عام پر آجاتی ہیں۔ پیداوار بری طرح متاثر ہونے سے معیشت کا شیرازہ بکھرنے لگتا ہے بعض اوقات انسانیت کا دائرہ تنگ کر دیا جاتا ہے۔ اس نظام میں لوگوں کا رجحان زیادہ تر روپے جمع کرنے کی طرف زیادہ منتقل ہو جاتا ہے۔

نجی ملکیت، سرمایہ دارانہ نظام کی روح رواں ہے جبکہ اس کے مکمل نفع، اشتراکیت اصل مغز ہیں آج جس سرمایاداری کا ہمیں سامنا ہے یہ دولت کے مذہب یا ڈالر کے آمریت کا مظہر ہے۔

ایچ، جی، ویلز کے فصیح وطبیع الفاظ میں:

''سرمایہ داری ایک ایسی چیز ہے کہ ہم میں سے کوئی بھی اس کی

تعریف کرنے سے قاصر ہے مگر ہم نے اسے سرمایہ دارانہ نظام کہا ہے
یہ روایتی معمولات بے پناہ اور بے لگام اکتسابی قوتوں، اخلاق کے
معکوس ارتقاء و زندگی کی ضیاع کا نام ہے۔''

جان سٹارچی اپنی تصنیف ''خطرہ فاشلزم'' میں رقم طراز ہیں:

سرمایہ دارانہ نظام میں غلام کے لئے آزادی قدیم تاریخ مثلاً
یونانی جمہوریہ کے زمانے سے ہی یکساں قسم کی رہی ہے۔ جدید دور
کے اجرتی غلام، سرمایہ دارانہ استحصال سے اس قدر کچل دیئے گئے
ہیں اور اس قدر ناداری اور غربت کا شکار ہیں کہ جمہوریت ان کے
لئے کوئی معنی نہیں رکھتی۔

سیاست ان کیلئے ایک فضول امر ہے یہ باتیں ان کے لئے روزمرہ معمولات ہیں۔ آبادی کا ایک بڑا حصہ معاشرتی و سیاسی زندگی میں شرکت سے محروم کردیا گیا ہے۔(۸۳)

سرمایہ داری(Eapialism)

خوبیاں

۱) شخصی ملکیت کے حقوق:

اس نظام میں شخصی حقوق ملکیت کا تحفظ کیا گیا ہے۔ اس میں مختلف قسم کی اشیاء مثلاً کپڑے، برتن، مکان، مویشی، وغیرہ ہی نہیں بلکہ ایسی چیزوں پر بھی حقوق تسلیم کئے گئے ہیں۔ جن کی مدد سے مزید اشیاء پیدا کی جاسکتی ہیں جیسے مشین، آلات، زمین اور دیگر اشیاء پیداوار وغیرہ۔

اس نظام کے سنگ بنیاد ہی ہے کہ اس نے حقوق ملکیت کو مان لیا ہے۔ اور جب کسی فرد کا کسی ایک شے پر قبضہ ہو جاتا ہے۔ تو وہ قانونی لحاظ سے بھی اس کا حق بن جاتا ہے۔ اور اس سے کوئی دیگر چھین نہیں سکتا۔ نیز حقوق ملکیت پر کوئی قدغن نہیں لگائی گئی۔

۲) جدوجہد کی آزادی:

افراد کا یہ حق کہ وہ فرداً فرداً یا چھوٹے گروہوں کی شکل میں مل کر اپنے ذرائع کو جس میدان میں چاہیں استعمال کر سکتے ہیں اس کوشش میں فائدہ یا نقصانات برداشت کرنا پڑتے ہیں گویا ان کی ذاتی سعی کو ہی اس میں داخل ہوتا ہے اور وہ آزادانہ طور پر کوئی پیشہ اختیار کر سکتے ہیں۔ اشیاء کی پیدائش صرف، تقسیم وغیرہ کا اختیار انہیں حاصل ہوتا ہے پیدائش کے عوامل اور نسبتی اس طرح کے عمل بھی انہیں کا مرہون منت ہوتا ہے اور وہ خود اس کے دائرہ کار کا یقین کرتے ہیں آجر و مستاجر، زمیندار و مزارع کے مابین شرائط بھی باہمی صلاح و مشورہ طے پاتی ہیں۔

۳) مقابلہ و مسابقت:

سرمایہ دارانہ نظام کے حامی کہتے ہیں کہ یہی وہ چیز ہے جو بے قدر و حیثیت میں افراد کی خود غرضی کو بے جا حد تک بڑھنے سے روکتی ہے۔ اور ان کے درمیان اعتدال توازن کی فضاء قائم کی جاتی ہے۔

یہ نظام فطرت نے خود کر دیا ہے کہ بہت سے سوداگروں، صنعت کاروں اور تاجر کے درمیان مقابلہ پایا جاتا ہے اور وہ ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی دوڑ میں اچھا مال سپلائی کرنے کی تگ و دو کرتے ہیں نیز زیادہ سے زیادہ صارفین کی توجہ کھینچنے کی خاطر جدید مال تیار کرتے ہیں اگرچہ اس میں حقیقت شاید کم پائی جاتی ہو اور عام طور پر یہی کہا جاتا ہے کہ قیمتوں میں توازن قائم رہتا ہے۔

۴) ریاست کی عدم مداخلت:

اس نظام کے وکلاء کا یہ موقف ہے کہ جب کاروبار اور پیداوار زیادہ ہوتا کاروباری شخص کو اپنا مفاد مجبور کرتا ہے کہ زیادہ سے زیادہ پیداوار حاصل کرنے کے نئے طریقے اور سائنسی آلات استعمال کئے جائیں اپنی مشینری کو اچھی حالت میں رکھے خام مال کی کم قیمت پر حاصل کرے اپنی تنظیم کو ترقی دینے میں ہر وقت کوشاں رہے اور وہ بیرونی مداخلت کے بغیر ہی کاروبار کو وسیع تر کرتا جائے اس لئے حکومت کی مداخلت کی کم ضرورت پڑتی۔ چونکہ نفع حاصل کرنے کے شوق میں آجر اپنے حالات کو درست رکھنے کی کوشش کرتا رہتا ہے۔

۵) اجیر اور مستاجر کے حقوق کا فرق:

نظام میں عموماً دو طبقے جنم لیتے ہیں۔ ایک مالک جو اپنے کاروبار کو شروع کرتا۔ اور دوسرا مزدور ہوتا ہے جس طرح صنعت کار صنعت کو چلاتا ہے اور مزدور کام کرتا ہے اس طرح لینڈ لارڈ زمین کا مالک ہوتا ہے اور مزارع چند شرائط کے مطابق کاشت کرتا ہے فریقین کے درمیان معاہدے اور شرائط خود بخود طے ہو جاتے ہیں نفع اور نقصان کا ذمہ دار خود مالک ہوتا ہے اور مزدور فقط اپنی اجرت لینے کے حقدار ہوتے ہیں انہیں پیداوار کی کمی بیشی سے کوئی سروکار نہیں ہوتا مزدور کی بھرتی، شرائط کار، ترقی، تنزلی اور بے دخلی کا اختیار مالک کو ہوتا ہے۔

عموماً کاریگر اور لیبر فورس مجبور محض ہوتی ہے البتہ دور جدید میں چند اہم تبدیلیاں کر دی گئی ہیں۔ مگر اس کے باوجود زیادہ اختیارات صرف آجر طبقہ کو حاصل ہوتے ہیں۔ اور وہ اپنی من مانی کاروائی کرتے رہتے ہیں۔ مزدوروں کی تنخواہوں آلات کار اور دیگر سہولیات کا تعین مالکین کرتے ہیں۔ اس طرح اس نظام میں دو گروہ قائم ہو چکے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ زندگی کے ہر شعبہ میں طبقاتی کشمکش نظر آتی ہے۔ اور ہر گروپ اپنی سرگرمیوں میں مصروف عمل ہے۔

۶) ذرائع کا استعمال:

ہر شخص ایسا کاروبار شروع کرنے کی کوشش کرتا ہے جس سے اسے زیادہ سے زیادہ نفع حاصل ہو اور اس طرح ان ذرائع کو بھی استعمال میں لانے کی پوری جدوجہد کی جاتی ہے جس سے پیدائش کا عمل شروع ہو سکتا ہے چنانچہ آجر انکے استعمال کو وسعت دینے کی کوشش کرتے ہیں اس طریقے سے پیداوار میں اضافہ کیا جا سکتا ہے تاہم بعض اوقات چند ذرائع بیکار بھی پڑے رہتے ہیں اور قوم و ملک انکے فوائد سے محروم رہ جاتی ہے۔

۷) فطری اسباب پر بھروسہ:

ہر آجر کی یہ پالیسی ہوتی ہے کہ اشیاء کی لاگت کم سے کم ہو تاکہ وہ زیادہ سے زیادہ منافع کما سکے اس لئے وہ عاملین کو اس طریقے اور تربیت سے لگانے کی کوشش کرتا ہے کہ کم سے کم اخراجات پر زیادہ سے زیادہ پرافٹ حاصل کر سکے اس کے لئے نئے طور طریقے بھی ایجاد کئے جاتے ہیں۔ طریق کار میں اصلاح کی تدابیر کی جاتی ہے مشینوں کا صحیح استعمال اور تنظیم کی صحیح تربیت وغیرہ سے کئی فوائد حاصل کئے جاتے ہیں۔

۸) صارفین کی خواہشات:

آجر ایسا مال تیار کرنے کی کوشش کرتے ہیں جن کی منڈی میں طلب زیادہ ہوتی ہے۔ بدلے ہوئے فیشن کے تقاضے پورے کئے جاتے ہیں۔ نئی اشیاء کو پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے جدت طرازی ترقی کرتی ہے مختلف النوع اشیاء کی پیدائش سے خواہشات بھی بدلتی رہتی ہے۔ اور اس طرح میدان عمل گرم رہتا ہے۔

۹) ذاتی نفع کا محرک:

اپنے نفع اور طمع کی خاطر آجر سعی و عمل میں زیادہ کوشش کرتا ہے اور اس طرح اس میں جذبہ اُبھرنے سے پیداوار زیادہ حاصل کی جاتی ہے۔ (۸۳)

☆ ☆ ☆

بابِ چہارم

فصل سوم

اشتراکیت:

اشتراکیت کا فلسفہ یہ ہے کہ تمام وسائل ثروت سوسائٹی کے درمیان مشترک ہیں ۔ اس لئے فرداً فرداً ان پر مالکانہ حقوق کا قبضہ کرنے اور اپنے حسبِ منشاء ان میں تصرف کرنے اور ان کے منافع سے تنہا متمتع ہونے کا کوئی جواز نہیں افراد کو جو کچھ ملے گا وہ محض ان خدمات کا معاوضہ ہوگا جو معاشرے کے مشترکہ مفاد کے لئے انجام دیں گے معاشرہ ان کیلئے ضروریات زندگی فراہم کرے گا اور وہ اس کے بدلہ اپنی ذہانت واہلیت کے مطابق کام کریں گے نجی املاک اور جاگیریں نہیں ہوں گی ۔ روپیہ جمع کرنے ذاتی کاروبار کرنے کی اجازت ہی نہیں ہوتی پرائیویٹ اداروں ،صنعتوں ،اور کمپنیوں کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں ہوتی ۔

چونکہ بنیادی طور پر سارا انتظام وانصرام حکومت یا پارٹی کے زیرتحت ہوتا ہے۔اور لین دین کے مواقع بہت ہی کم ملتے ہیں مگر عملاً ایسا نہیں ہورہا کیونکہ ابتداء میں جونظریہ قائم کیا گیا تھا وہ صحیح طور پر کامیاب نہیں ہوسکا اس لئے اب تبدیلیاں اور ترمیمیں کردی گئی ہیں ۔جن کے مطابق زائداز ضروریات معاوضہ بنکوں میں رکھا جا سکتا ہے اور اس پر سود بھی حاصل ہوتا ہے ۔ روس اور چین میں اشتراکیت کی آماجگاہ ہیں ۔انہوں نے محسوس کیا ہے کہ ذاتی جائداد کا لالچ دینے سے لوگوں میں کام کرنے کا جذبہ موجزن ہوتا ہے ۔ سرکاری پالیسیاں بند ایوانوں میں مرتب کی جاتی ہیں پیدائش وصرف کے سارے نظام پر سرکاری کنٹرول ہوتا ہے اپنی مرضی سے کوئی پیشہ اختیار کرنے کی اجازت نہیں ہوتی توازن دولت عموماً قائم رہتا ہے۔

الحاصل لوگوں سے سرمایہ چھین کر ایک مرکزی منتظمہ یعنی حکومتی پارٹی کے پاس مرتکز ہوجاتا ہے۔اور اس طرح چھوٹے سرمایہ داروں کے بجائے بہت بڑا سرمایہ دار وجود میں آجاتا ہے۔اور وہ اپنی زبردست طاقت سے دوسروں کو کچل کر اور دبا کر حکومت کرتا رہتا ہے ۔ (۸۴)

اشتراکیت کے فوائد

اس نظام کو اپنانے سے حسبِ ذیل چند فوائد حاصل ہو سکتے ہیں:

۱: افراد کے تسلط سے زمین، مشین اور دیگر تمام کاروبار نکال لینے سے یہ فائدہ ہوتا ہے کہ اشیاء کی لاگت اور ان کے بازاری قیمت کے درمیان جو منافع پہلے صنعتکار یا لینڈ لارڈ کی جیب میں جاتا تھا وہ اب سرکاری خزانے میں آنے لگا ہے۔ اس طرح اس کے فوائد سے اجتماعی فلاح کے کاموں میں صرف کیا جا سکے گا گویا انفرادیت کے بجائے اجتماعیت کو مفاد حاصل ہوگا اور اس طرح من حیث القوم ترقی ہوگی سرمایہ داری میں صرف چند لوگ فوائد حاصل کر سکتے ہیں۔ مگر شوشلزم میں ساری جمیعت کو فائدہ حاصل ہوگا اور اس طرح ترقی اور پیش رفتی کے لیئے راستے اور دروازے کھلے گے۔

۲. تمام ممالک کے ذرائع پیدائش ایک ہی نظم ونسق کے قبضہ میں آ جانے سے یہ ممکن ہوگیا کہ ایک طرف طے شدہ منصوبہ کے مطابق ان سب کو زیادہ سے زیادہ ترقی دینے اور زیادہ سے زیادہ مفید طریقے سے استعمال کرنے کی جدوجہد کی جائے اور دوسری طرف سارے ملک کی ضرویات کو سامنے رکھ کر پورا کرنے کی منظم مساعی عمل میں لائی جائے۔ گویا اچھی منصوبہ بندی کے ذریعے تمام وسائل کو اپنے مخصوص وسائل کے مطابق استعمال کیا جائے بے کار ذرائع بھی قومی پیداوار میں اضافہ کرنے کی خاطر معاون ثابت ہو سکتے ہیں۔ حکومت اپنے محدود وسائل کو استعمال کرنے سے زیادہ سے زیادہ مفاد اٹھانے کی خاطر جامع منصوبہ بندی کرنے سے آگاہی بھی ہوتی رہتی ہے اور حالات کے مطابق انہیں استعمال کیا جا سکتا ہے۔

۳: تمام وسائل دولت کو منصوبہ بندی کے ذریعے استعمال کرنے سے روزگار کے مواقع بھی زیادہ حاصل ہو سکتے ہیں۔ اور اس طرح بیروزگار افراد کو کسی نہ کسی کام میں لگایا جا سکتا ہے۔ اور بیروزگاری میں کمی کی جا سکتی ہے۔ اگرچہ جدید دور میں مکمل روزگار کا حاصل کرنا تو دشوار ہے۔ تاہم بیشتر تربیت یافتہ افراد کی کھپت کا انتظام کیا جا سکتا ہے۔ سرمایہ داری کے برعکس اشتراکیت میں بیروزگاری کم ہو سکتی ہے۔ اور اس طرح تعلیم

یافتہ افراد کی صلاحیت و اہلیت سے ملک و قوم کو فائدہ پہنچایا جاسکتا ہے چونکہ سارا انتظام و انصرام حکومت وقت کے ہاتھ میں ہوتا ہے اس لئے اس سنگین مسئلہ کو سمجھایا جاسکتا ہے۔

۴: زراعت، صنعت اور تجارت کے شعبوں سے حاصل ہونے والے منافع کا ایک خاص حصہ ''سوشل انشورنش'' سکیم پر صرف کیا جاسکتا ہے یعنی جو گ عارضی یا مستقل طور پر بیروزگار، محتاج بیمار، وغیرہ ہو جائے تو اس مشترکہ فنڈ سے اس کی استعنت کی جاسکتی ہے وران کا روزینہ مقرر کیا جاسکتا ہے۔تا کہ وہ بھی اپنی روزی حاصل کرسکیں۔

۵: چونکہ تمام ذرائع پیداوار حکومت کی ملکیت میں ہوتے ہیں اس لئے مصنوعی قلت پیدا نہیں کی جاتی بلکہ لوگوں کی ضروریات کے مطابق اشیاء صرف فراہم کی جاتی ہیں اور اس طرح صارفین کی ضروریات کا کماحقہ خیال رکھا جاتا ہے۔اور انہیں یہ اشیاء بروقت مل سکتی ہیں عموماً گرانی بھی زوروں پر نہیں ہوتی کیونکہ ذاتی نفع کا محرک اس نظام میں منقود ہوتا ہے۔اس لئے لوگوں کی سہولت کو پیش نظر رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے اور آنے والے دن کی پریشانیوں سے کم و بیش تر نجات مل جاتی ہے۔اسی طرح چور بازاری اور اسمگلنگ جیسی بیماریوں کا بھی علاج ہوتا ہے۔

۶: بیشتر رقم غیر ترقیاتی کاموں کے بجائے ترقیاتی امور اور منصوبوں پر صرف کی جاتی ہے۔صرف ایسی اسکیمیں تیار کی جاتی ہیں جن سے ساری قوم کو فائدہ حاصل ہوتا ہو۔فضول اور غیر ضروری، اخراجات سے کنارہ کشی اختیار کی جاتی ہے بجٹ سازی اور منصوبہ بندی کی خاص اہمیت ہوتی ہے۔

۷: چونکہ تمام ذرائع پیدائش حکومت کے زیر تسلط ہوتے ہیں اس لئے دولت کی غیر مساوی تقسیم نہیں ہوتی امیر اور غریب کا تفاوت کم ہوتا ہے۔جیسے کہ روس اور چین کی معیشت میں ہے۔امیر طبقہ کے لئے غریبوں کو لوٹنے کے کم مواقع ملتے ہیں اس طرح ہر طبقہ زندگی کی دوڑ میں آگے جانے کی کوشش کرتا ہے کام کے تقریباً یکساں مواقع میسر آتے ہیں۔

۸:    چونکہ دولت کا کم فرق ہوتا ہے۔ اس لئے جن نمائندگان پر یہ مشتمل حکومت اقتدار میں آتی ہے وہ عموماً مستحکم اور مضبوط ہوتی ہے جیسا کہ روس میں کمیونسٹ پارٹی کی حکومت چلی آرہی ہے۔ اور اس طرح چین میں بھی ایک ہی جماعت حکومت پر قابض ہے۔ طرح دیرپا حکومت طویل المیعاد منصوبہ بندی کرتی ہے اور ان کے ہدف حاصل کرنے کی پوری کوشش کرتی ہے نیز اس کی پالیسی ہوتی ہے کہ عوام الناس کا زیادہ سے زیادہ اعتماد حاصل کیا جائے۔ اس قسم کی حکومت سارے ملک کو یکساں فوائد پہنچانے کی کوشش کرتی ہے۔

۹   چونکہ ملک میں اجارہ داریاں اور کارٹل وغیرہ نہیں ہوتے اس لئے رشوت ستانی، بددیانتی، اقربا نوازی کے کم مواقع حاصل ہوتے ہیں زمین اور اچھے افراد کو آگے آنے کا موقع ملتا ہے۔

۱۰:    نظام تعلیم اور معیار زندگی کو اعلیٰ بنانے کی پوری تندہی سے کوشش کی جاتی ہے ملکی ضروریت کے مطابق تعلیمی پالیسی مرتب کی سکتی ہے اور تکنیکی اور فنی ادراے قائم کر کے مختلف ٹریڈز میں تربیت دی جاتی ہے

اشتراکیت کے بنیادی اصول:

اشتراکیت کے مذکورہ بالا فلسفہ کے نتیجہ میں اشتراکی معیشت میں مندرجہ ذیل بنیادی اصول کارفرما ہوتے ہیں:۔

۱: اجتماع ملکیت (Collective Property)

اس اصول کا مطلب یہ ہے کہ وسائل پیداوار یعنی زمین کارخانے وغیرہ کسی شخص کی ذاتی ملکیت میں نہیں ہونگے بلکہ وہ قومی ملکیت میں ہونگے اور حکومت کے زیر انتظام چلائے جائیں گے ذاتی استعمال کی اشیاء ذاتی ملکیت میں ہوسکتی ہیں لیکن وسائل پیداوار پر کوئی ذاتی ملکیت نہیں ہوسکتی اس کا نتیجہ یہ ہے کہ تمام اشتراکی ممالک میں نہ صرف زمینیں اور کارخانے، بلکہ تجارتی دکانیں بھی کسی فرد واحد کی ملکیت میں نہیں ہوتی ان میں کام کرنے والے افراد سب حکومت کے ملازم ہوتے ہیں اور حاصل ہونے والی آمدنی تمام تر سرکاری خزانے میں جاتی ہے اور کام کرنے والے ملازمین کو تنخواہ یا اجرت حکومت کی منصوبہ بندی کے تحت دی جاتی ہے۔

....

۲: منصوبہ بندی (Planning)

اشتراکی نظام کا دوسرا بنیادی اصول منصوبہ بندی ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ تمام بنیادی معاشی فیصلے ،حکومت منصوبہ بندی کے تحت انجام دیتی ہے اس منصوبہ بندی میں تمام معاشی ضروریات اور تمام وسائل کے اعداد وشمار جمع کیئے جاتے ہیں ۔حکومت کی طرف کے معیشت کی منصوبہ بندی کا تصور اصولاً تو اشتراکیت نے پیش کیا تھا لیکن رفتہ رفتہ سرمایہ دار ملکوں نے بھی جزوی طور پر منصوبہ بندی اختیار کرنا شروع کر دی جس کی وجہ یہ ہے کہ سرمایہ دار ممالک رفتہ رفتہ اپنے اس اصول پر مکمل طور پر قائم نہ رہ سکے کہ حکومت معیشت کے کاروبار میں بالکل مداخلت نہ کرے بلکہ مختلف اجتماعی مقاصد کے تحت سرمایہ دار حکومت کو بھی تجارت ومعیشت میں کچھ نہ کچھ مداخت کرنی پڑی۔

یہاں تک کہ مخلوط معیشت (Mixed Economy) کے نام سے ایک نئی اصطلاح وجود میں آئی جس کا مطلب یہ ہے کہ اگرچہ بنیادی طور پر معیشت کو بازار کی قوتوں کے تحت ہی چلایا جائے لیکن ضرورت کے تحت تجارت وصنعت کے بعض شعبے خود سرکاری تحویل میں بھی ہوسکتی ہے جسے بعض سرمایہ دار ملکوں میں ریلوے ،بجلی ،ٹیلی فون اور فضائی سروس وغیرہ سرکاری تحویل میں ہوتی ہے اور جو تجارتیں نجی طور پر چلائی جارہی ہوں حکومت ان کو بھی کچھ قواعد وضوابط کا پابند بنادیتی ہے۔

پہلی قسم کی تجارتوں کو سرکاری شعبہ (Public Sector)

اور دوسری قسم کو نجی شعبہ (Private Sector) کہا جاتا ہے۔

۳: اجتماعی مفاد (Collective Interest)

اشتراکیت کا تیسرا اصول اجتماعی مفاد ہے۔یعنی اشتراکیت کا دعوی یہ ہے کہ سرمایہ دارانہ معیشت میں ساری معاشی سرگرمیاں افراد کے ذاتی مفاد کے تابع ہوتی ہیں ۔لیکن اشتراکی نظام میں منصوبہ بندی کا تابع ہوتی ہیں ۔لیکن اشتراکی نظام میں منصوبہ بندی کے تحت اجتماعی مفاد کو بنیادی طور پر مدنظر رکھا جاتا ہے۔

۴: آمدنی کی منصفانہ تقسیم:

(Equitalbe Dsitribution of income)

اشتراکیت کا چوتھا اصول یہ ہے کہ پیداوار سے جو کچھ آمدنی حاصل ہو وہ افراد کے درمیان منصفانہ طور پر تقسیم ہو اور غریب وامیر کے درمیان زیادہ فاصلے نہ ہوں، آمدنیوں میں توازن ہو۔ شروع میں دعوی یہ کیا گیا تھا کہ اشتراکیت میں آمدنی کی مساوات ہوگی۔ یعنی سب کی آمدنی برابر ہوگی لیکن عملاً ایسا نہیں ہوا۔ لوگوں کی اجرتیں اور تنخواہیں کم زیادہ ہوتی رہیں۔ البتہ اشتراکیت میں کم سے کم یہ دعوی ضرور کیا گیا ہے کہ اس نظام میں تنخواہوں اور اجرتوں کے درمیان تفاوت بہت زیادہ نہیں ہے۔

دونوں نظاموں پر تبصرہ

شتراکیت اور سرمایہ داری کے درمیان ایک صدی سے زیادہ مدت تک شدید معرکہ آرائی رہی فکری سطح پر دونوں کے درمیان بحث ومناظرہ کا بازار بھی گرم رہا اور سیاسی سطح پر جنگ و پیکار کا بھی دونوں طرف سے ایک دوسرے پر جو تنقیدیں ہوتی رہی ہیں اور اس موضوع پر جتنی کتابیں لکھیں گئی ہیں اگر ان سب کو جمع کیا جائے تو ایک پورا کتب خانہ بھر سکتا ہے۔ یہاں ان تمام تنقیدوں کو پیش کرنا ممکن تو نہیں لیکن اختصار کے ساتھ دونوں نظاموں میں اصولی تبصرہ کیا جا سکتا ہے۔ جو میں یہاں مختصراً پیش کرنا چاہتا ہوں۔

اشتراکی نظام پر تبصرہ:

پہلے اشتراکیت پر تبصرہ کرنا اس لحاظ سے مناسب ہے کہ اس کی خرابیوں کو سمجھنا نسبتاً آسان ہے۔ اشتراکیت کی اتنی بات تو واقعی درست تھی کہ سرمایہ دارانہ نظام میں ذاتی منافع کے محرک کو اتنی کھلی چھوٹ دیدی گئی کہ اس کے نتیجے میں فلاح عامہ کا تصور یا تو بالکل باقی نہیں رہا یا بہت پیچھے چلا گیا۔ لیکن اس کا جو حل اشتراکیت نے تجویز کیا وہ بذات خود بہت انتہاء پسندانہ تھا۔ سرمایہ دارانہ نظام نے فرد کو اتنا آزاد اور بے لگام

چھوڑ دیا تھا کہ وہ اپنے منافع کے خاطر جو چاہے کرتا پھرے اس کے مقابے میں اشتراکیت نے فرد کو اتنا گھونٹ دیا کہ اس کی فطری آزادی بھی سلب ہو کر رہ گئی۔ سرمایہ دارانہ نظام نے بازار کی قوتوں یعنی رسد و طلب کو تمام مسائل کا حل قرار دیا لیکن اشتراکیت نے ان قدرتی قوانین کو سرے سے ہی تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ اور اس کی جگہ سرکار کی طرف سے کی ہوئی منصوبہ بندی کو ہر مرض کا علاج قرار دیا۔

درحقیقت ایک معاشرتی مسئلہ ہے اس مسئلے کو اگر صرف خشک منصوبہ بندی کی بنیاد پر حل کرنے کی کوشش کی جائے گی تو اس سے مندرجہ ذیل خرابیاں لازم آئیں گی:۔

(۱) منصوبہ بندی کا کام ظاہر ہے کہ اشتراکی نظام میں حکومت انجام دیتی ہے۔ اور حکومت کے فرشتوں کے کسی گروہ کا نام نہیں جس سے کوئی شخصی یا بد دیانتی سرزد نہ ہو ظاہر ہے۔ کہ حکومت کرنے والے بھی گوشت پوشت کے انسان ہوتے ہیں وہ اپنی خواہشات اور ذاتی مفادات سے بھی مغلوب ہو سکتے ہیں اوان کی سوچ میں بھی غلطی کا امکان ہے۔

دوسری طرف سارے ملک کے تمام وسائل پیداوار انسانوں کے اس گروہ کے حوالے کر دیئے گئے تو ان کی نیت میں فتور آنے کی صورت میں اس کے نتائج بھگتنے پڑیں گے۔ اگر سرمایہ دارانہ نظام میں ایک چھوٹا درسرمایہ دار محدود وسائل پیداوار پر ملکیت حاصل کر کے چند افراد کو ظلم کو نشانہ بنا سکتا ہے تو اشتراکی نظام میں چند برسراقتدار افراد پورے ملک کے وسائل پر قابض ہو کر اس سے کہیں زیادہ ظلم کر سکتے ہیں اور اس کا نتیجہ یہ ہو سکتا ہے کہ بہت سارے چھوٹے چھوٹے سرمایہ دار ختم ہو جائیں اور ان سب کی جگہ ایک بڑا سرمایہ دار وجود میں میں آ جائے جو دولت کے سارے وسائل کو من مانے طریقے سے استعمال کرے۔

(۲) اشتراکیت کا منصوبہ بند نظام ایک انتہائی طاقتور بلکہ جابر حکومت کے بغیر نہ قائم ہو سکتا ہے اور نہ چل سکتا ہے کیونکہ افراد کو ہمہ گیر ریاست کی منصوبہ بندی ایک زبردست قوت قاہرہ کے بغیر کام نہیں کر سکتی چنانچہ اشتراکی نظام میں سیاسی آزادیوں کا خاتمہ لازمی ہے۔

....

(۳) چونکہ اشتراکیت میں ذاتی منافع کے محرک کا بالکل خاتمہ کر دیا جاتا ہے اس لئے لوگوں کی کارکردگی پر اس کا بڑا اثر پڑتا ہے۔ انسان یہ سوچتا ہے کہ وہ خواہ چستی اور محنت کے ساتھ کام کرے یا سستی اور کاہلی کے ساتھ دونوں صورتوں میں اس کی آمدنی یکساں ہے۔ اس لئے اس میں بہتر کارکردگی کا ذاتی جذبہ برقرار نہیں رہتا ذاتی منافع کا محرک علی الاطلاق بری چیز نہیں۔ بلکہ اگر وہ اپنی حد میں ہو تو انسان کی صلاحیتوں کو اجاگر کرتا ہے۔ اور اُسے نت نئی مہم جوئی پر آمادی کرتا ہے اس فطری جذبے کو حد میں رکھنے کے لئے لگام دینے کی بیشک ضرورت ہے۔ لیکن اسکو بالکلیہ کچل دینے سے انسان کی بہت سی صلاحیتیں ضائع ہو جاتی ہیں۔

تمام خرابیاں محض نظریاتی نوعیت کی نہیں ہیں۔ بلکہ اشتراکیت کی پہلی تجربہ گاہ ہیں، رُوس میں چوہتر سال کے تجربے نے یہ تمام خرابیاں پوری طرح ثابت کر دی ہیں۔ ایک زمانے میں ابھی کچھ عرصہ پہلے تک اشتراکیت اور نیشنلائزیشن کا طوطی بولتا تھا۔ اور جو شخص اس کے خلاف زبان کھولتا اسے رجعت پسند اور سرمایہ دار کا ایجنٹ کہا جاتا تھا۔ لیکن سودیت یونین کے خاتمے کے موقع پر خود رُوس کے صدر ریلسن نے کہا ہے کہ:۔

> ''کاش اشتراکیت (Utopian) نظریئے کا تجربہ روس جیسے عظیم
> ملک میں کرنے کے بجائے افریقہ کے کسی چھوٹے رقبے میں کر لیا گیا ہوتا
> تاکہ اس کی تباہ کاریوں کو جاننے لے لئے چوہتر سال نہ لگتے'' (۸۵)

اشتراکی نظام میں پیدائش دولت کی تقسیم:

اشتراکیت کا کہنا یہ ہے کہ حقیقی عوامل پیداوار چار نہیں بلکہ صرف دو ہیں ایک زمین، دوسری محنت، انہی دونوں کے اشتراک سے پیداوار وجود میں آتی ہے سرمایہ کو اسلئے عامل پیداوار نہیں کہ سکتے کہ وہ خود کسی عمل پیدائش کا نتیجہ ہوتا ہے اور آجر کو اسلئے مستقل عامل پیداوار قرار دینے کی ضرورت نہیں کہ اس کا عمل محنت میں داخل ہو سکتا ہے دوسرے خطرہ مول لینے کی صفت کسی شخص یا پرائیوٹ ادارے میں تسلیم کرنے کی اسئے ضرورت نہیں کہ یہ کام اشتراکی نظام میں حکومت کرتی ہے افراد کو کاروباری مہم جوئی کی نہ اجازت ہے اور نہ ضرورت۔

چونکہ اشتراکی نظام میں حقیقی عامل پیداوار صرف زمین اور محنت ہیں۔ زمین کسی کی شخصی ملکیت نہیں ہوتی اس لئے اس کو الگ معاوضہ دینے کی ضرورت نہیں لہذا تقسیم دولت کی خرف ایک مدرہ جاتی ہے اور وہ یہ ہے اجرت جس کا تعین سرکاری منصوبہ بندی کے تحت ہوتا ہے۔

کارل مارکس کا مشہور نظریہ ہے کہ کسی چیز کی قدر میں اضافہ صرف محنت سے ہوتا ہے اس لئے اجرت کا استحقاق صرف محنت کو ہے۔ سرمایہ کا سود زمین کا لگان اور آجر کا نفع ایک فالتو چیز ہے جسے مصنوعی طور پر پیدا کیا گیا ہے۔

اس نظریہ کو ''قدر ے زائد کا نظریہ'' (Theory of surplus Value) کہا گیا ہے۔ اور اس کا عربی نام ''نظریۃ القدر'' ہے۔

اسلامی تعلیمات:

قرآن وسنت میں پیدائش دولت اور تقسیم دولت پر اس انداز سے تو گفتگو نہیں کی گئی، جس طرح کسی معاشیات کی کتاب میں کی جاتی ہے لیکن معیشت کے مختلف ابواب میں قرآن وسنت نے جو احکام عطا فرمائے ہیں ان پر غور کرنے سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ اسلام میں سرمایہ Capital اور آجر Entroprecur کی تفریق کو تسلیم نہیں کیا گیا سرمایہ درانہ نظام میں کاروبار کے نفع ونقصان کا خطرہ آجر پر ڈالا گیا ہے اور سرمایہ کو معین شرح سے سود دیا جاتا ہے۔

اسلام میں چونکہ سود حرام ہے اس لئے نفع ونقصان کا خطرہ خود سرمائے پر عائد ہوتا ہے۔ لہذا ہر وہ شخص جو کسی کاروبار میں سرمایہ کاری کر رہا ہو، اسے نفع کی امید کے ساتھ نقصان کا بھی خطرہ مول لینا پڑیگا اس طرح یا تو یوں کہا جائے کہ اسلامی تعلیمات کی رو سے اگرچہ سرمایہ اور آجر دونوں کا منافع ہے یا یوں کہا جائے کہ سرمایہ اور آجر دو الگ الگ عامل پیداوار نہیں بلکہ یہ ایک ہی عامل ہے اور تقسیم دولت میں اس کو منافع ملتا ہے بہر صورت جس طرح زمین فراہم کر کے ایک شخص معین کرایہ وصول کر سکتا ہے۔

اسی طرح سرمایہ فراہم کر کے معین سود بھی وصول کر سکتا ہے لیکن اسلامی احکام کی رو سے یہ قیاس درست نہیں ۔ صورت حال یہ ہے کہ زمین اور سرمائے میں مندرجہ ذیل تین وجوہ میں زبردست فرق پایا جاتا ہے۔

۱: زمین بذات خود ایک قابل انتفاع چیز ہے اس سے فائدہ اٹھانے کے لئے اسے خرچ نہیں کرنا پڑتا بلکہ اس کا وجود برقرار رکھتے ہوئے اسے عامل پیدائش کے طور پر بھی استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اور اس سے دوسرے فوائد بھی حاصل کئے جا سکتے ہیں ۔ لہذ اس کا کرایہ درحقیقت ان فوائد کا معاوضہ ہے جو زمین براہ راست دے رہی ہے ۔ اس کے برعکس سرمایہ یعنی روپیہ ایسی چیز ہے جو بذات خود قابل انتفاع نہیں ۔ وہ اس وقت تک انسان کو فائدہ نہیں پہنچاتا جب تک اسے خرچ کر کے اس کے بدلے کوئی قابل انتفاع چیز نہ خرید لی جائے لہذا اس پر کرایہ وصول کرنے کا سوال نہیں کیونکہ کرایہ اس چیز کا ہوتا ہے جس سے اس کا وجود برقرار رکھتے ہوئے فائدہ اٹھایا جائے ۔

۲: زمین، مشینری، آلات وغیرہ ایسی چیزیں ہیں کہ ان کے استعمال سے ان کی قدر میں کمی ہوتی ہے۔ اسی لئے ان چیزوں کو جتنا زیادہ استعمال کیا جائے گا۔ ان کی قدر اتنی ہی گھٹتی جائیگی ۔ لہذا ان چیزوں کا جو کرایہ وصول کیا جاتا ہے ۔ اس میں قدر کے نقصان کی تلافی بھی شامل ہوتی ہے۔ اس کے برخلاف روپیہ ایسی چیز ہے کہ محض استعمال سے اس کی قدر میں کوئی کمی نہیں ہوتی ۔

۳: اگر کوئی شخص کوئی زمین، مشینری یا سواری کرایہ پر لیتا ہے تو یہ چیزیں اس کے ضمان (Risk) میں نہیں ہوتیں بلکہ اصل مالک کے ضمان میں رہتی ہیں ۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ اگر یہ چیزیں کرایہ دار کی کسی غفلت یا زیادتی کے بغیر کسی سماوی آفت کے نتیجے میں تباہ ہو جائیں یا چوری ہو جائیں تو نقصان کرایہ دار کا نہیں بلکہ اصل مالک کا ہوگا اور چونکہ اصل مالک ان کی تباہی کا خطرہ برداشت کر رہا ہے اور کرایہ دار کو اس خطرہ سے آزاد کر کے اپنی ملکیت کے استعمال کا حق دے رہا ہے۔ اس لئے وہ ایک معین کرایہ کا بجا طور پر حق دار ہے اس

کے برعکس جو شخص کسی کو روپیہ قرض دے رہا ہے، وہ روپیہ اس کے ضمان (Risk) میں نہیں رہتا بلکہ قرض دار کے ضمان میں چلا جاتا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ قرض دار کے قبضے میں جانے کے بعد اگر وہ روپیہ کسی سماوی آفت سے تباہ ہو جائے یا چوری ہو جائے تو نقصان قرض دینے والے کا نہیں، قرض لینے والے کا ہے۔ یعنی قرض دار شخص اس صورت میں بھی اتنا روپیہ قرض دار شخص اس صورت میں بھی اتنا روپیہ قرض خواہ پر لوٹانے کا ذمہ دار اور پابند ہے اور چونکہ قرض دینے والے نے قرض دے کر اس روپیہ میں کا کوئی خطرہ مول نہیں لیا اس لئے وہ اس پر کسی معاوضے کا حقدار نہیں۔

اس تشریح کی روشنی میں تقسیم دولت کے اسلامی اصول کا سرمایہ دارانہ اصول سے ایک بنیادی فرق تو یہ ہے کہ اس سرمایہ دارانہ نظام میں سرمائے کو معین شرح سود دیا جاتا ہے جبکہ اسلام میں سرمایہ کا حق منافع ہے جو اسے اُسی وقت ملے گا جب وہ نقصان کا خطرہ بھی برداشت کرے۔ یعنی کاروبار کے نفع و نقصان دونوں میں شریک ہو جس کا طریقہ شرکت یا مضاربت ہے۔

اور دوسرا بنیادی فرق یہ ہے کہ سرمایہ داری ہو یا اشتراکیت، دونوں نظاموں میں دولت کا استحقاق صرف عاملین پیدائش کی حد تک محدود رکھا گیا ہے جنہوں نے عمل پیدائش میں ظاہری طور پر براہ راست حصہ لیا۔ لیکن اسلام کی تعلیمات کا خلاصہ یہ ہے کہ ہر چیز پر حقیقی ملکیت اللہ تعالیٰ کی ہے اور ہر چیز کی پیدائش کا اصل کارنامہ اللہ تعالیٰ ہی انجام دیتے ہیں جن کی توفیق کے بغیر کوئی عامل پیدائش یک ذرہ بھی وجود میں نہیں لاسکتا۔ لہٰذا کوئی بھی عامل پیدائش بذات آمدنی کا مالک اور مستحق نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ جس کو مستحق قرار دیں گے وہی مستحق ہوگا۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اگرچہ آمدنی کا اولین مستحق تو عوامل پیدائش کو ہی قرار دیا ہے۔ لیکن دولت کے ثانوی مستحق کی ایک طویل فہرست رکھی ہے جو پیدا شدہ دولت میں اسی طرح حقدار ہیں۔ جس طرح خود عوامل پیدائش یہ ثانوی مستحقین معاشرے کے وہ افراد ہیں جو اگرچہ قلت وسائل کی وجہ سے اس عمل پیدائش میں براہ

راست حصہ نہیں لے سکے لیکن اسی معاشرے کا فرد ہونے کی وجہ سے اللہ تعالی کی پیدا کی ہوئی دولت میں ان بھی حصہ ہے۔

ان ثانوی مستحقین تک دولت پہنچانے کے لئے اسلام نے زکواۃ عشر، صدقات، خراج، کفارت، قربانی اور وراثت کے احکام دیئے ہیں۔ جن کے ذریعے دولت کا بڑا حصہ ان ثانوی مستحقین تک پہنچ جاتا ہے دولت کے اولین مستحق یعنی عوامل پیداوار، آمدنی خواہ کرائے کی صورت میں حاصل ہوئی ہو یا اجرات کی صورت میں منافع کی صورت میں ان میں سے ہر شخص اس بات کا پابند کہ وہ اپنی آمدنی میں سے ایک معتد بہ حصہ ان ثانوی مستحقین تک پہنچائے یہ اس کی طرف سے کوئی احسان نہیں بلکہ اس کے ذمے ان کا حق ہے۔

چنانچہ قرآن کریم میں ارشاد فرمایا:۔

''والذین فی اموالھم حق معلوم للسائل و المحروم''

ترجمہ: اوران کے مالوں میں محتاج اور محروم کا معین حق ہے۔(۸۶)

اسی طرح زرعی پیداوار کے بارے میں ارشاد فرمایا:۔

''واتو احقه یوم حصاده''

ترجمہ: ''اورکھیتی کٹنے کے دن اس کا حق ادا کرو''۔(۸۷)

پیدائشِ دولت پر تینوں نظاموں کے مجموعی اثرات:

یہ تھا اشتراکیت، سرمایہ داری اور اسلام کی معاشی تعلیمات کا ایک مختصر اتعارف۔

تینوں نظاموں میں معیشت پر مجموعی حیثیت سے کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں یہ ایک بہت طویل موضوع ہے جس کی طرف یہاں محض اشارہ ہی کیا جا سکتا ہے۔ جہاں تک پیدائش دولت کا تعلق ہے۔تو پیچھے یہ بتایا جا چکا ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام میں ذاتی منافع کے محرک کو بالکل آزاد چھوڑنے کے نتیجے میں کیا خرابیاں پیدا ہوئیں یہ خرابیاں معاشی بھی ہیں اور اخلاقی بھی۔

اشتراکیت نے ذاتی منافع کے محرک کو بالکل ختم کردیا جس کے نتیجے میں پیداوار کی کمیت (Quantity) اور کیفیت (Quality) دونوں میں کمی آئی کیونکہ اشتراکیت میں ہر کام کرنے والے کو طے شدہ اجرت ہی ملتی ہو تو اس کو اس کام سے ذاتی دلچسپی نہیں ہوتی جو اسے کارکردگی بہتر بنانے پر آمادہ کرتی اس کا تھوڑا سا اندازہ آپ اس بات سے کر سکتے ہیں کہ پاکستان میں بھی ایک مرتبہ مختلف صنعتوں کو قومی ملکیت میں لیا گیا تھا اور یہ اسی اشتراکی پروپیگنڈے کا نتیجہ تھا۔ سالہا سال کے تجربے کے بعد قومی ملکیت میں لئے گئے ادارے مسلسل انحطاط پذیر رہے۔ جس کے نتیجے میں بالآخر انہیں دوبارہ ذاتی ملکیت میں دیا جا رہا ہے۔ جس کے لئے آج کل نج کاری (Privatization) کی اصطلاح استعمال ہو رہی ہے۔

یہی حال روس میں ہوا کہ پیداوار کی کمیت اور کیفیت میں اتنا نقصان آیا کہ ملک دیوالیہ ہونے کے قریب ہو گیا۔ سوویت یونین تو بعد میں شکست و ریخت کا شکار ہوا، لیکن اس سے کئی سال پہلے جب سوویت یونین کے حکمران کمیونزم کو سنبھالا دینے کی کوشش کر رہے تھے اس وقت سوویت کے صدر میخائل گورباچوف نے ملک کی تعمیر نو کا پروگرام اپنی کتاب پیرس ٹرائیکا (Perestroica) پیش کیا تھا۔

اس کتاب میں اس نے کمیونزم کی براہ راست تردید نہیں کی تھی لیکن اس بات پر زور دیا کہ اشتراکیت کی نئی تشریح کی ضرورت ہے اور اس نئی تشریح کی ضرورت ہے اور اس نئی تشریح میں اس بات کا بار بار اعتراف کیا کہ اب ہمیں اپنی معیشت از سر نو تعمیر کرنے کے لئے بازار کی قوتوں (Market Forces) سے ضرور کام لینا پڑے گا۔

اسلام نے ایک طرف ذاتی منافع کے محرک کو تسلیم کیا، جو پیداوار کی کمیت اور کیفیت میں اضافہ کا موجب ہوتا ہے۔ لیکن دوسری طرف اس پر پابندیاں عائد کردی، جو اسے ان معاشی اور خلاقی خرابیوں سے باز رکھ سکیں، جو سرمایہ دارانہ نظام کا لازمی خاصہ ہے اس کے علاوہ سرمایہ دارانہ نظام میں سود کی اجازت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ کسی کاروبار میں سرمایہ فراہم کرنے والا کاروبار کی بہبود سے قطعی لاتعلق رہتا ہے اس کو اس سے غرض نہیں ہوتی کہ کاروبار کو فائدہ ہوا یا نقصان، کیونکہ اس کو ہر صورت میں معین شرح سے سود ملنا ہے۔

اس کے برخلاف اسلام میں چونکہ سُود حرام ہے۔ اس لئے کسی کاروبار میں سرمای فراہم کرنے (Financing) بنیاد شرکت اور مظاربت پر ہی ہوسکتی ہے۔ اس صورت سرمایہ فراہم کرنے والے کی پوری خواہش اورکوشش یہ ہوگی کہ جس کاروبار میں اس نے سرمایہ لگایا ہے۔ وہ ترقی کرے اسے نفع حاصل ہو، ظاہر ہے کہ اس کی پیدائش دولت پر بہتر اثرات قائم ہوں گے۔

تقسیم دولت پر تینوں نظاموں کے اثرات:

جہاں تک تقسیم دولت کا تعلق ہے اشتراکیت نے ابتدائے یہ دعویٰ کیا تھ کہ منصوبہ بند معیشت میں آمدنی کی مساوات قائم ہوگی، جس کا مطلب یہ تھ کہ تمام افراد کو برابر آمدنی مے لیکن یہ ایک نظریاتی خواب تھا اور بعد میں نہ صرف یہ کہ عملاً کبھی مساوت قائم نہیں ہوئی بلکہ نظریاتی طور پر مساوات کا دعوی واپس لے لیا گیا۔ اب وہاں بھی اجرتوں کے درمیان شدید تفاوت قائم ہوا چونکہ اجرتوں کا تعین تمام تر حکومت کرتی تھی، اسلئے اس تعین میں ایک عام مزدور کو کوئی دخل نہیں تھ اور اگر اس کو اجراء کر کے یہ تعین غیر منصفانہ ہوتو اس کے خلاف چارہ جوئی کی بھی کوئی گنجائش نہیں تھی سرمایہ دارانہ نظام میں کم از کم یہ ہوتا ہے کہ اگر مزدور اپنی اجرت بڑھوانا چاہے تو اس کیلئے نہ صرف یہ کہ آواز بلند کرسکتی ہے بلکہ احتجاج کے دوسرے ذرائع مثلاً ہڑتال وغیرہ بھی اختیار کرسکتے ہیں۔

لیکن اشتراکی نظام سیاست میں اس قسم کی آواز بلند کرنے یا احتجاج کے زرائع اختیار کرنے کی بھی کوئی گنجائش نہیں اس لئے عملاً اشتراکی نظام میں مزدور کو کوئی خاص فائدہ نہیں پہنچ، بلکہ آخر میں نتیجہ یہی نکلا کہ اشتراکی ممالک کی محنت کشوں کا معیار زندگی ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام کے مزدور سے بھی کم تر رہا اور بالآخر لوگوں نے تنگ آکر پھر اسی سرمایہ دارانہ نظام کا خیر مقدم کیا، جس سے وہ نکل کر بھاگے تھے۔ یہ نتائج ان ملکوں میں زیادہ واضح طور پر مشاہدہ میں آئیں، جہاں ایک ہی ملک کا کچھ حصہ اشتراکیت کے زیر اثر تھا۔ اور دوسرا حصہ سرمایہ دارانہ نظام کے زیر اثر تھا مثلاً مشرقی اور مغربی جرمنی، مغربی جرمنی، ترقی کرتا ہوا کہیں سے کہیں پہنچ گیا، اور مشرقی جرمنی اس کے مقابلے میں بہت پیچھے رہا وہاں کے مزدوروں کی حالات بھی مغربی

جرمنی کے مقابلے میں پسماندہ رہیں۔ یہاں تک کہ لوگوں نے تنگ آکر دیوارِ برلن توڑ دی، اور اشتراکیت کی ناکامی کا برملا اعتراف کرلیا۔

افسوس یہ ہے کہ جب سے دنیا میں صنعتی انقلاب برپا ہوا ہے اس وقت سے کوئی ملک ایسی مثال پیش نہیں کرسکا، جہاں صنعت اور تجارت کی ترقی کے ساتھ ساتھ اسلام کے معاشی احکام بھی پوری طرح نافذ ہوں اس لئے کسی عملی نمونے کے حوالے سے یہ بات نہیں کہی جاسکتی کہ اسلام کی تعلیمات پر عمل کرنے سے تقسیم دولت میں کس طرح توازن پیدا ہوتا ہے۔ لیکن خالص نظریاتی نقطہءنظر سے غور کیا جائے تک پہنچنے میں دیر نہیں لگے گی کہ اسلامی تعیمات پر عمل کی صورت میں دولت کی تقسیم سرمایہ دارانہ نظام کے مقابلے میں کہیں زیدہ متوازن ہوگی۔ اگر ایک حرمت سود کے مسئلے ہی کو لے لیا جائے تو اس سے بھی یہ بات واضح ہوسکتی ہے۔ کیونکہ سود کے ممنوع ہونے کے بعد کسی کاروبار کو سرمایہ کی فراہمی نفع ونقصان میں شرکت کی بنیاد پر ہی ہوسکتی ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ اگر ایک روپے لینے والے کو نقصان ہوا تو اس میں روپیہ دینے وال بھی شریک ہوگا۔ اور اگر نفع ہوا ہے تو روپیہ دینے والا اس نفع کے فیصد حصے کا احتدار ہوگا۔

لہذا مذکورہ بال مثال میں اگر سرمایہ نے بنک سے نوے لاکھ روپے لیتے وقت شرکت یا مضاربت کی بنیاد پر معاملہ کیا ہوا اور اس سے اس کے اور بنک کے درمیان اگر ساٹھ فیصد اور چالیس فیصد کا تناسب بھی طے ہوا ہو۔ تو پچاس لاکھ کے منافع میں سے کم از کم بیس راکھ روپے اسی بنک کو منتقل کرنے پڑیں گے اور بنک کو دیئے جانے والے نفع کا تعین چونکہ اشیاء کی فروختگی کے بعد ہوگا اس لئے اس کو اشیاء کی لاگت میں شامل کرکے قیمت کا زریعہ عوام سے وصول نہیں کیا جاسکتا۔ پھر جو نفع اس طرح سرمایہ دار کو حاصل ہوگا، اس میں سے بھی زکواۃ اور صدقات وغیرہ کے ذریعے ایک بڑا حصہ غریب عوام کی طرف منتقل کرنے کا پابند اور ذمہ دار ہوگا۔

اس کا واضح نتیجہ یہ ہے کہ دولت کے بہاؤ کا رخ چند سرمایہ داروں کے بجائے ملک کے عام باشندوں کی طرف ہوگا۔ اور جن عوام کی بچتوں سے ملک کی صنعت اور تجارت فروغ پارہی ہے، اس کے منافع میں وہ زیادہ بہتر شرح سے حصہ دار ہوں گے (۸۸)

☆ ☆ ☆

باب چہارم

فصلِ چہارم

کاروبار کی مختلف اقسام (بہ لحاظ ملکیت)

(Different Kind of Business)

اشتراکی نظام میں چونکہ سارانظام حکومتی پالیسی کے تحت چلتا ہے، اس لئے اس میں تو انفرادی اور ذاتی نوعیت کے کاروبار کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا لہٰذا کاروبار کی اقسام پر یہ گفتگو سرمایہ دارانہ نظام پر بنی ہے۔

ملکیت کے لحاظ سے کاروبار کی تین قسمیں:

۱) شخصی کاروبار (Private Proprietorship)

۲) شرکت (Partneship)

۳) کمپنی (Joint Stock Company)

کمپنی کا تعارف:

کمپنی کے لغوی معنی ''شرکت'' ہے اور کبھی ''رفقائے کار'' کو بھی کہا جاتا ہے۔ بعض دکانوں کے نام میں ''فلاں اینڈ کمپنی'' لکھا ہوا آتا ہے، اس سے یہ لغوی معنی ہی مراد ہوتے ہیں، جس کو عربی میں ''فلان و شرکاء'' سے تعبیر کرتے ہیں اس سے وہ معاشی اور اصطلاحی معنی مراد نہیں ہوتے جس کا یہاں تعارف کرایا جارہا ہے لیکن جب ''اینڈ'' کے لفظ کے بغیر کسی تجارتی ادارے کے نام میں کمپنی کا لفظ ہو، مثلاً ''تاج کمپنی'' تو اس سے مراد اصطلاحی کمپنی ہوتی ہے۔ عموماً اس کے ساتھ لمیٹڈ کا لفظ بھی ہوتا ہے۔ جس کی تشریح آگے آئے گی۔

یورپ میں صنعتی انقلاب رونما ہونے کے بعد سترہویں صدی کے آغاز میں بڑے بڑے کارخانوں وغیرہ کے قائم کرنے کیلئے جب عظیم سرمایہ کی ضرورت پڑنے لگی جس کو کوئی شخص اکیلا یا چند افراد ملکر فراہم نہیں کرسکتے تھے تو اس وقت عام لوگوں کی منتشر بچت یکجا کر کے ان سے اجتماعی فائدہ اٹھانے کے لئے کمپنی کا نظام رائج ہوا اس نظام کی سب سے پہلی خصوصیت یہ ہے کہ شرکت میں ہر شریک کی الگ الگ ملکیت مقصود ہوتی ہے مگر اس نظام میں کئی افراد کے مجموعہ کو ایک شخص قانونی قرار دیا جاتا ہے۔ اس شخص قانونی کو ''کارپوریشن'' کہتے ہیں جس کی ایک قسم کی کمپنی ہے۔

ابتداء کمپنیاں عموماً نیم سرکاری ہوتی ہیں، عموماً حکومت کے چارٹر (اجازت نامے) کے تحت غیر ملکی تجارت کے لئے وجود میں آتیں تھیں اور انہیں بہت وسیع اختیارات دیئے جاتے تھے۔ بسا اوقات ان کو قوانین تجارت وضع کرنے کا بھی اختیار ہوتا ہے۔ سکہ ڈالنے اور فوج، اور پولیس رکھنے کا بھی اختیار ہوتا تھا۔

برصغیر پر قابض ہونے والی ''ایسٹ انڈیا کمپنی'' بھی اسی قسم کی کمپنی تھی اب وسیع اختیارات کے ساتھ ایسی ریاستی کمپنی موجود نہیں رہیں، اب صرف تجارتی کمپنیاں ہوتیں ہیں جو حکومت کی اجازت سے قائم ہوتی ہیں کمپنیوں کی تشکیل کی اجازت اور ان کو کنٹرول کرنے کا کام جو ادارہ کرتا ہے اس کو ہمارے ملک میں (Corporate Law Author ty) (کارپوریٹ لاء اتھارٹی) کہا جاتا ہے۔ یہ وزارت خزانہ کا ذیلی ادارہ ہے۔

کمپنی کی تشکیل:

پہلے کمپنی کا اجمالی ڈھانچہ تیار کیا جاتا ہے' جس میں کمپنی کا نام' کاروبار کی نوعیت مطلوبہ سرمایہ' ڈاریکٹرز' آئندہ کے لئے ان کے عزل ونصیب کا طریقہ کار وغیرہ لکھا جاتا ہے' اس کو ''تذکرہ'' (Memorandun) کہتے ہیں۔

پھر کمپنی کے انتظامی ضوابط لکھے جاتے ہیں۔ جس کو عربی میں نظام الجمعية یا لائحة الجمعية

اور انگریزی میں (Articals of Association) کہتے ہیں۔

میمورنڈم (مذکرہ) اور آرٹیکلز آف ایسوسی ایشن کے ساتھ حکومت کی کمپنی کی اجازت کے لئے درخواست دیدی جاتی ہے۔ جب وزارت خزانہ کے ذیلی ادارہ (Corporate Law Authority) (کارپوریٹ لاء اتھارٹی) کی طرف سے اجازت مل گئی تو اب کمپنی وجود میں آچکی ہے۔ اور قانون اب اس کو ایک فرضی شخص قرار دیتا ہے جو بیع وشراء کرے گا' مدعی ومدعی علیہ بنے گا' دائن ومدیون ہوگا۔

اس کو ''شخص'' قانونی (Legal person) یا (Jurist c person) یا (Juridical person) کہتے ہیں۔ بعض مرتبہ اس کو فرضی شخص (Fictitious Person) بھی کہا جاتا ہے۔

جب کمپنی وجود میں آگئی تو اب لوگوں کی حصہ دار بننے کی دعوت دینے کے لئے قانوناً ضروری ہے کہ کمپنی کا پورا طریقِ کار اور اس کا ترکیبی ڈھانچہ شائع کرایا جائے تا کہ عوام کو بھی اس کمپنی پر اعتماد ہو سکے۔ لوگوں کو کمپنی کے بنیادی طریقِ کار اور متعلقہ امور سے واقف کرنے کے لئے جو تحریری بیان شائع کیا جاتا ہے اس کو عربی میں ''نشرۃ الاداد'' اور انگریزی میں پراسپیکٹس (Prospectus) کہتے ہیں۔

کمپنی کا سرمایہ:

حکومت جب کمپنی کو اجازت دیتی ہے تو سرمائے کی تحدید کرتی ہے کہ اتنے سرمائے کے حصے جاری کئے جاسکتے ہیں یا اتنے سرمائے میں لوگوں کو شرکت کی دعوت دی جاسکتی ہے۔ اس کو ''منظور شدہ سرمایہ'' ''راس المال المسموح'' یا ''راس المال المصرح بہ'' (Authorised Capital) کہتے ہیں۔

اس میں سے سرمائے کی کچھ مقدار مقرر کردی جاتی ہے جو کمپنی جاری کرنے والوں کی طرف سے شامل کیا جائے گا۔ اس کو (Sponsores Capital) کہتے ہیں۔ پھر حصص جاری کرنے کے بعد عوام یا کمپنی قائم کرنے والوں نے جتنے سرمائے کے حصص لینے کا وعدہ کیا اس کو ''اشتراک شدہ

سرمایہ''(Subscribed Capital) کہا جاتا ہے۔ پھر جن لوگوں نے کمپنی میں اشتراک (Subscription) کرلیا ہو اور سرمایہ کی ادائیگی ذمے لے لی ہو ان سے سرمایہ فوری طور پر یکمشت شامل کرنا ضروری نہیں ہوتا کبھی قسطوں میں بھی ادا کرتے رہتے ہیں۔

چنانچہ سرمائے کا جتنا حصہ ادا کر دیا گیا ہو اس کو ''اداشدہ سرمایہ'' ''راس المال المدفوع'' (Paid Up Capital) کہتے ہیں۔

کمپنی جس سرمائے کے شیئرز جاری کر کے لوگوں کو حصے لینے کی دعوت دے اس سرمائے کو جاری کردہ سرمایہ ''راس المال المعروض ''(Issued Capital) کہتے ہیں۔ لوگ فارم پر کر کے جتنے سرمائے کے حصے خریدنے کا وعدہ کریں اس کو ''اشتراک کردہ سرمایہ'' ''راس الال المساھھم یا راس المال المکتب''(Subscribed Capital) کہتے ہیں مثلاً کمپنی کو ۱۰۰ ملین روپے سے کاروبار کی اجازت ملی تو ۱۰۰ ملین روپے ''منظورشدہ سرمایہ'' ہے اس میں سے ۲۰ ملین کمپنی قائم کرنے والوں کے ذمہ ہے جس میں سے ۱۰ ملین روپے انہوں نے دیئے۔ یہ اسپانسرز کیپیٹل کا ''اداشدہ سرمایہ'' ہے۔ ۸۰ ملین عوام سے وصول کرنا ہے جس میں سے فی الحال ۶۰ ملین روپے کے حصے جاری کئے جاتے ہیں باقی آئندہ کی کسی ضرورت کے لئے محفوظ رکھ لئے گئے ہیں یہ ۶۰ ملین روپے ''جاری کردہ سرمایہ ہے'' ۶۰ ملین روپے میں سے لوگوں نے ۵۰ ملین روپے کے لئے فارم جمع کرادیئے۔ تو یہ ''اشتراک کردہ سرمایہ'' ہے۔

اگر درخواستیں زیادہ ہوں اور جاری کردہ سرمایہ کم ہو تو قرعہ اندازی کی جاتی ہے اور صرف انہی کی درخواستیں قبول کر کے انہیں حصہ دار بنایا جاتا ہے۔ جن کا نام قرعہ اندازی میں نکل آئے یہ اندیشہ بھی ہوتا ہے کہ درخواستیں سرمائے سے کم وصول ہوں۔ جتنے شیئرز جاری کئے گئے تھے لوگوں نے اتنے شیئرز نہیں لئے تو ان سے نمٹنے کے لئے بنک یا دوسرے مالیاتی اداروں سے اس بات کی ضمانت لی جاتی ہے کہ جو حصے لوگوں نے نہ لئے وہ ہم لے لیں گے۔ اس ضمانت کو ''ضعن الاکیتاب''(Undwer Writing) کہتے ہیں۔

بنک اس ضمانت پر کمپنی سے کمیشن کی شرح طے کرتا ہے۔ مثلاً اس ضمانت پر کل سرمایہ کا ایک فیصد میں سوں گا۔ یہ کمیشن بنک بہرحال لیتا ہے چاہے اس کو کمپنی کے حصص (شیئرز) لینے پڑیں یا نہ پڑیں۔ پھر اگر بنک کو حصے لینے پڑیں تو حصے لے کر عموماً بنک اپنے پاس نہیں رکھتا بلکہ بعد میں ان حصص کو فروخت کر دیتا ہے یہ بات ضمانت ایک بنک سے بھی لی جاتی ہے اور تھوڑے تھوڑے سرمائے پر کئی بنکوں سے بھی لی جا سکتی ہے۔

کمپنی سے حصص (شیئرز):

جب لوگ کمپنی کے حصے لے کر سرمایہ دیتے ہیں تو حصہ دار کو کمپنی ایک سرٹیفکیٹ جاری کرتی ہے۔ جو اس بات کی سند ہوتی ہے کہ اس شخص کا کمپنی میں اتنا حصہ ہے۔ اس سرٹیفکیٹ کو اردو میں حصہ عربی میں ''سہم'' اور انگریزی میں (Share) کہتے ہیں۔

کاروبار جتنے سرمائے سے جاری کیا جاتا ہے اس سرمائے کی اکائیوں پر تقسیم کر کے ایک اکائی کو ایک حصے Share کی قیمت قرار دی جاتی ہے۔ مثلاً آج کل عموماً دس دس روپے کے شیئرز جاری کئے جاتے ہیں۔ یہ قیمت شیئرز کے اوپر لکھ دی جاتی ہے۔ یہ وہ رقم ہے جس کی ادائیگی پر یہ سرٹیفکیٹ جاری ہوا تھا اس قیمت کو عربی میں 'قیمۃ الاسمیۃ' اور انگریزی میں (Face Value) یا (Par Value) کہتے ہیں۔

شیئرز جاری کرنے کے دو طریقے ہیں۔

کبھی شیئرز پر حصہ دار کا نام درج ہوتا ہے اس کو ''السہم المسجل'' (Registered Share) کہتے ہیں۔

کبھی شیئر اس طرح جاری ہوتے ہیں کہ اس پر کسی کا نام درج نہیں ہوتا جس کے ہاتھ میں ہوگا وہی اس کا مالک سمجھا جائے گا۔ اس کو ''السہم لحاملہ'' (Bearer Share) کہتے ہیں۔

ہمارے یہاں زیادہ تر کمپنیوں کے حصص رجسٹرڈ ہی ہوتے ہیں۔ کبھی بیئرر بھی ہوتے ہیں جیسے این آئی ٹی دونوں صورتیں ہیں۔ حصص کی ایک تقسیم حصہ دار کے حقوق کے اعتبار سے ہوتی ہے یعنی نفع وصول کرنے یا

کمپنی کی پالیسی میں مداخلت کے اعتبار سے بھی حصص کی دو قسمیں ہیں:۔

۱) السهم العادی (Ordinary Share)

۲) السهم الممتاز (Preference Share) جس کو ''ترجیحی حصص'' بھی کہتے ہیں۔

ان دونوں قسم کے حصص میں بنیادی فرق یہ ہے کہ 'السهم الممتاز' کے حامل کو نفع تقسیم کرنے یا حق رائے دہی میں 'السهم العادی' کے حامل سے مقدم رکھا جاتا ہے۔ ''السهم الممتاز'' کی ترجیح کی کئی صورتیں ہوتی ہیں:۔

۱) ''السهم الممتاز'' نفع اس کے لگائے ہوئے سرمائے کی خاص شرح کے مطابق مقرر ہوتا ہے۔ (مثلاً اس کے لگائے ہوئے سرمائے کا دس فیصد (10%) پہلے السهم الممتاز کے حاملین میں نفع تقسیم کرکے ان کا معینہ نفع ان تک پہنچایا جاتا ہے اس کے بعد اگر کچھ بچے تو السهم العادی کے حاملین کو ملتا ہے ورنہ وہ نفع سے محروم رہیں گے۔

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی سال کمپنی کو نفع نہیں ہوتو ایسی صورت میں میں بھی 'السهم الممتاز' کا نفع محفوظ رہتا ہے۔' آئندہ سال جب نفع ہوگا تو پہلے ان کو دیا جائے گا اس کے بعد نفع بچا تو السهم العادی کو ملے گا۔

۲) بعض اوقات ترجیحی کی صورت یہ ہوتی ہے کہ 'السهم الممتاز' کے نفع کی شرح 'السهم العادی' سے زیادہ رکھی جاتی ہے۔

۳) کبھی ترجیح اس طرح ہوتی ہے کہ کمپنی کے سالانہ اجلاس میں 'السهم الممتاز' والوں کو ووٹ کا حق ہوتا ہے۔'السهم العادی' والے کو ووٹ کا حق نہیں ہوتا۔

۴) کبھی 'السهم الممتاز' والے کو زیادہ ووٹ کا حق ہوتا ہے۔ اور 'السهم العادی' کو کم ووٹ کا مثلاً یہ کہ 'السهم الممتاز' والے کو دو ووٹ کا اور 'السهم العادی' والے کو ایک ووٹ کا حق ہوگا۔

حاصل یہ ہے کہ 'السهم الممتاز' ترجیحی حصے کا نام ہے' پھر ترجیحی کی شکلیں مختلف ہوسکتی ہیں۔ اس کی ضرورت عموماً اس وقت پیش آتی ہے، جب کہ کسی خاص بڑی پارٹی (مثلاً انشورنش کمپنی وغیرہ) سے سرمایہ لینا ہو۔ اب وہ اس پر آمادہ نہیں کہ عام حصہ دار (شیئر ہولڈر) کی حیثیت سے رقم لگائیں اس لئے کہ اس میں نفع طے شدہ نہیں۔ اور اس پر آمادہ نہیں کہ محض قرض دہندہ (دائن) کی طرح سود پر قرض دے' اس لئے کہ محض قرض دہندہ کی حیثیت میں وہ کمپنی کی پالیسی پر اثر انداز نہیں ہوسکے گی۔ ایسی پارٹی سے سرمایہ لینے کے لئے اس کو ترجیحی حصص دیئے جاتے ہیں' تاکہ اس کو مقررہ نفع بھی ملے اور کمپنی میں حصہ دار بھی ہو۔ چنانچہ یہ ایک اعتبار سے دائن کو اور ایک اعتبار سے حصہ دار ہوتی ہے۔

کمپنی کا انتظامی ڈھانچہ:

کمپنی ایک قانونی شخص ہے جو وجود میں آجانے کے بعد کاروبار کرے گا' لہٰذا اس قانونی شخص کی نمائندگی کے لئے حصہ داروں میں سے ہی چند افراد مشتمل ایک مجلس بنائی جاتی ہے جو کاروبار کرتی ہے۔ اس کو ''مجلس الادارہ''(Board of D rectors) کہتے ہیں۔

اس کا انتخاب تمام شیئر ہولڈرز کی ووٹنگ سے ہوتا ہے۔ پھر یہ بورڈ آف ڈاریکٹرز اپنے میں سے ایک کو سربراہ ادارہ منتخب کرتا ہے۔ اس کو ''العضو المنتدب''(Chief Exective) کہتے ہیں۔

یہ چیف ایگزیکٹو بورڈ آف ڈاریکٹر میں سے بھی ہوسکتا ہے، اور باہر سے بھی کسی کو ملازم رکھا جاسکتا ہے۔ یہ بورڈ کی پالیسی کے ماتحت عملاً کام کرتا ہے۔ تمام شیئر ہولڈرز کا ایک سالانہ اجتماع ہوتا ہے۔ جس کو''الجمعية العمومية السنوية ''(Annual Genral Meeting) کہتے ہیں۔ اسی کا مخفف نام۔ اے، جی، ایم۔(A.G.M) ہے۔ اس میں کاروبار کی پالیسی، اکاؤنٹ، (حسابات) اور آڈٹ رپورٹ پیش کی جاتی ہے آئندہ کے لئے ڈاریکٹران کا انتخاب ہوتا ہے۔ ور ہر حصے کا ایک ووٹ ہوتا ہے۔ مثلاً کسی ہے پاس دس شیئر ہیں تو اس کے دس ووٹ ہوں گے۔ سالانہ اجتماع میں ووٹ

دینے کے بعد شیئر ہولڈر کا کمپنی کے کاروبار میں کوئی عمل، دخل نہیں ہوتا۔

کمپنی کے وجود میں آنے کے بعد ختم ہونے کی دو ہی صورتیں ہیں یا تو اے، جی، ایم میں کمپنی کی تحلیل ہونے کا فیصلہ ہو جائے یا کمپنی دیوالیہ ہو جائے اور اس کے قرضے اثاثوں سے بڑھ جائے ان دونوں صورتوں میں متعلقہ قانونی ادارے سے کمپنی ختم کرنے کی اجازت لینا ضروری ہے، قانونی اجازت لئے بغیر کمپنی کا وجود ختم نہیں کی جاسکتا۔ اور عموماً ایسی صورت میں حکومت کی طرف سے کمپنی کے اثاثوں کو قرض خواہوں یا حصہ داروں میں تقسیم کرنے کے لئے ایک منتظم مقرر کیا جاتا ہے جسے ''ریسیور'' (Receiver) یا تحلیل کندہ (Liquidator) کہتے ہیں۔

منافع کی تقسیم:

کمپنی سال بھر کاروبار کرنے کے بعد سالانہ نفع کا حساب لگاتی ہے۔ اور یہ طے کرتی ہے کہ کتنا نفع ہوا اس کے بعد اس منافع کا کچھ حصہ بطور احتیاط محفوظ کر لیتے ہیں، تاکہ آئندہ کمپنی کو کوئی نقصان ہو تو اس کا تدارک کیا جا سکے اس کو عربی میں ''الاحتیاطی'' اور انگریزی میں Reserve کہتے ہیں اس احتیاطی نفع کا تعین عموماً بورڈ آف ڈائریکٹرز کرتا ہے۔ اور قانوناً بھی اس کی تحدید ہوتی ہے۔ اس لئے کہ احتیاطی نفع منہا کر کے باقی نفع پر ٹیکس لگتا ہے، خطرہ ہے کہ ٹیکس سے بچاؤ کے لئے کوئی کمپنی زیادہ نفع احتیاطی میں رکھ لے، اس لئے قانوناً بھی اس کی تحدید ہوتی ہے۔

احتیاطی نکالنے کے بعد بقیہ نفع شیئر ہولڈرز میں تقسیم ہوتا ہے۔ اب کمپنی کو جو دراصل نفع ہوا ہے وہ ''الربح'' نفع، (Profit) ہے اور جو بطور احتیاط رکھا گیا ہے وہ ''احتیاطی'' یا محفوظ فنڈ (Reserve) ہے باقی نفع جو تقسیم ہو گا وہ ''الربح الموزع'' (Dividend) ہے۔ Profit پرافٹ اور Dividend ڈیویڈنڈ ہے پرافٹ شخص قانونی کمپنی کا نفع ہے اور ڈیویڈنڈ شیئر ہولڈرز کا۔

(Dividend) کی تقسیم کے دو طریقے ہوتے ہیں:

کبھی تو نفع لوگوں کو فراہم کر دیا جاتا ہے کبھی اس نفع کے دوبارہ حصص (شیئرز) جاری کر دیئے جاتے ہیں۔ اس قسم کے حصے کو ''بونس شیئرز'' (Bouns Shares) کہتے ہیں بونس شیئرز جاری کرنے سے کمپنی کا سرمایہ بڑھ جاتا ہے ایسا عموماً اس وقت ہوتا ہے۔' جبکہ کمپنی کے کیش پوزیشن کمزور ہو، یعنی کے پاس نقد رقم کم ہو تو بجائے نقد نفع دینے کے مذید حصص جاری کر دیئے جاتے ہیں۔

مثلاً دس روپے دینے کے بجائے دس روپے کا حصہ دے دیا جاتا ہے۔ لیکن اس کے لئے یہ ضروری ہوگا کہ ''منظور شدہ سرمایہ'' میں اس کی گنجائش ہے۔ مثلاً ۸۰ ملین کی اجازت ملی تھی، ان میں سے ابھی تک ساٹھ ملین جاری کیئے تھے بیس ملین کی گنجائش ہے، اگر منظور شدہ سرمائے میں مذید گنجائش نہیں ہے۔ تو دوبارہ درخواست دے کر اجازت لی جائے گی بونس شیئرز جاری کرنے کے لئے بھی ضروری ہے کہ اس کمپنی شیئرز کی بازاری قیمت (Market Value) قیمۃ اسمیۃ (Face Value) سے کم نہ ہو اگر بازار میں اس کی قیمت گرگئی ہے تو اب بونس شیئرز جاری کرنے کے لئے حصہ داران (شیئرز ہولڈر) کا نقصان ہے مثلاً دس روپے کے شیئرز کی قیمت بازار میں (9) نو روپے ہے تو حصہ دار کو (10) دس روپے کے بجائے (9) نو روپے کا شیئر ملے گا۔ تو اس کا ایک روپے کا نقصان ہوا۔

لمیٹڈ کمپنی کا تصور:

لمیٹڈ کمپنی کو ''الشرکتة المحدودة'' کہتے ہیں اس سے مراد مسئولية (Lability) یعنی ذمہ داری کا محدود ہونا ہے۔ لمیٹڈ کمپنی کے حاملانِ حصص کی ذمہ داری ان کے لگائے ہوئے سرمایہ کی حد تک محدود ہوتی ہے۔ یعنی اگر کمپنی خسارے میں گئی تو ان کو زیادہ سے زیادہ نقصان یہ ہوگا کہ ان کا لگایا ہوا سرمایہ ڈوب جائے گا۔ اگر کمپنی پر قرض زیادہ ہو گیا تو حاملان حصص سے انکے لگائے ہوئے سرمائے سے زیدہ کا مطالبہ نہیں ہوگا۔

اسی طرح کمپنی کی ذمہ داری بھی اس کے اثاثوں کی حد تک محدود ہوگی۔ قرضے ادا کرنے کے لئے

زیادہ سے زیادہ کمپنی کے ساتھ ''لمیٹڈ'' لکھنا ضروری ہے تاکہ قرض دینے والا اس بات کو محفوظ رکھتے ہوئے قرض دے کہ اس مدیون کی ذمہ داری محدود ہوگی عام طور پر تو کمپنیاں ہی لمیٹڈ ہوتی ہیں لیکن کبھی شرکت(Partner Ship) بھی لمیٹڈ ہوتی ہے۔

پرائیویٹ کمپنی:

کمپنی کی دو قسمیں ہیں:

(۱) پبلک کمپنی (شركة عامة)

(۲) پرائیویٹ کمپنی (شركة خاصة)

اب تک جو تفصیلات ذکر کی گئی ہیں وہ ''پبلک کمپنی'' کی ہیں۔ پرائیویٹ کمپنی بھی ایک شخص قانونی ہوتا ہے۔مگر اس کے شرکاء کی تعداد محدود ہوتی ہے۔ (مثلاً ہمارے یہاں کم از کم ۲ اور زیادہ سے زیادہ ''۵۰'' شرکاء ہو سکتے ہیں) یہاں سرمائے کے حصص جاری نہیں کئے جاتے ہیں۔ پراسپیکٹس نہیں شائع کیا جاتا۔ اس کے شیئرز بازار میں حصص (اسٹاک ایکسچینج) میں فروخت نہیں ہوتے ہیں قانونی تقاضہ ہے کہ پرائیویٹ کمپنی کے ساتھ پرائیویٹ لکھنا ضروری ہوتا ہے۔

شرکت اور کمپنی میں فرق:

شرکت(Partner Ship) عربی میں''الشركة''(بكسر الشين وسكون الراء) یا''شركة الاشخاص '' کہتے ہیں اور کمپنی کو شركة المساهمة(بفتح الشين و كسر لراء) کہتے ہیں۔اور کمپنی کو شركة المساهمة (بفتح الشين و كسر الراء) کہتے ہیں۔ اور کمپنی میں کئی امتیازی فرق ہیں:۔

۱: شرکت میں ہر شخص کاروبار کے تمام اثاثوں کے مشاع طور پر مالک ہوتا ہے۔ ہر شریک دوسرے شریک کا وکیل ہوتا ہے ہر شخص کی ذمہ داری یکساں ہوتی ہے مثلاً کوئی دین واجب ہوا تو تمام شرکاء سے برابر

درجے میں مسئولیت ہوگی مگر کمپنی میں ایسا نہیں ہوتا۔ کمپنی ایک ''شخص قانونی'' ہے اس کا الگ وجود ہے۔ اور حصہ داران کا الگ وجود ہے۔ حاملینِ حصص اس حد تک تو کمپنی کے اثاثوں میں شریک ہیں کہ اگر کمپنی تحلیل ہو اور اسکے اثاثے تقسیم ہوں تو ان کو مناسب حصے ملیں گے۔ لیکن کمپنی کی تحلیل سے پہلے قانونِ حاملِ حصص کا یہ حق تسلیم نہیں کرتا کہ وہ کمپنی کے اثاثوں میں تصرف کر سکے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر کوئی حاملِ حصص مدیون ہو اور اس کے اثاثے پر قرق کئے جائیں تو شیئرز اس کے ہاتھ میں ہیں وہ تو قرق ہوں گے مگر اس کے شیئر کے تناسب سے کمپنی کے اثاثوں پر اس کو تصرف کا حق نہیں ہے۔

۲: شرکت میں کاروبار کی طرف سے کی پر دعوی ہو یا کسی کی طرح سے کاروبار پر دعوی ہو تو تمام شرکاء مدعی یا مدعی علیہ ہوں گے۔ مگر کمپنی خود ایک شخص قانونی ہے لہٰذا کمپنی خود ہی مدعی یا مدعی علیہ ہوگی۔ حامین حصص (شیئرز ہولڈرز) نہیں ہوں گے۔ اس شخص قانونی کی نمائندگی عدالت میں انتظامیہ کا کوئی فرد کرے گا۔

۳: شرکت کا کوئی الگ سے قانونی وجود نہیں ہوتا۔ کمپنی کا الگ سے قانونی وجود ہوتا ہے۔ جس کو ''شخص قانونی کہتے ہیں''

۴: شرکت میں کوئی شریک شرکت ختم کر کے اپنا سرمایہ نکالنا چاہے تو نکال سکتا ہے۔ مگر کمپنی میں سے اپنا سرمایہ نہیں نکالا جا سکتا البتہ شیئرز فروخت کئے جا سکتے ہیں۔

۵. شرکت میں عموماً ذمہ داری کاروبار کے اثاثوں تک محدود نہیں ہوتی۔ کمپنی میں ذمہ داری محدود ہوتی ہے۔

کمپنی کے لئے فنڈز کی فراہمی:

کمپنی میں ابتداء کچھ سرمایہ (Sponsers) یعنی بنانے والوں کی طرف سے ہوتا ہے، سرمائے کا بہت سا حصہ وافر حصص کے ذریعے عوام سے حاصل کیا جاتا ہے مگر عموماً یہ سرمایہ کمپنی کے لئے کافی نہیں ہوتا۔ وقتاً فوقتاً مزید سرمایہ حاصل کرنے کی ضرورت بھی پیش آتی رہتی ہے اس کیلئے مختلف طریقے اختیار کئے جاتے ہیں۔

(الف) کبھی مزید سرمایہ حاصل کرنے کے لئے کمپنی مزید حصص جاری کرتی ہے۔ جب کہ منظور شدہ سرمایہ (Authorised) میں اس کی گنجائش ہو یا دوبارہ اجازت لی جائے یہ حصص، میں پرانے حصہ داروں کو ترجیحی حق ہوتا ہے ان کو ''سھام الاولویۃ'' (Right Shares) کہتے ہیں۔ وہ حق شفعہ سے ملتا ہے۔ اسکے قدیم حصہ داران کو دو فائدے ہوتے ہیں۔

(ب) عموماً کمپنی کا کاروبار شروع ہونے کے بعد شیئر بازاری کی قیمت (Market Value) لکھی ہوئی قیمت (Face Value) سے زیادہ ہوتی ہے۔ اس لئے ان کے خریدنے میں نفع ہوتا ہے۔ اس نفع کے لینے کا حق پہلے قدیم حصہ داران کو دیا جاتا ہے۔ مثلاً لکھی ہوئی قیمت ۱۰ روپے اور بازاری قیمت ۲۰ روپے ہے تو شیئر دس روپے میں ملے گا مگر فروخت ہوگا۔ بیس (۲۰) روپے میں، لہٰذا شیئر لینے والے کو دس روپے کا نفع ہوگا۔

(ج) دوسرا فائدہ ی ہوتا ہے کہ مزید سرمائے کے حصص جاری کرنے سے حصہ داران کی شرکت کی نسبت میں کمی آجاتی ہے انکو اپنی نسبت میں کمی آجاتی ہے انکو اپنی نسبت دو فیصد ہے اب جب ایک لاکھ کے مزید حصص جاری کرے گی تو اب کمپنی کا سرمایہ دولاکھ ہوگیا ۔۲ ہزار کے شیئرز لے کر دوبارہ نسبت دو فیصد کرلے۔

(۲) مزید حصص جاری کرنے میں کچھ مشکلات بھی ہوتی ہیں۔ مثلاً سرمائے کی منظوری کی حدود قیود ہوتی ہیں۔ حصہ داران میں اضافہ ہوجاتا ہے۔ اور ن کا کمپنی میں کنٹرول ہوتا ہے۔ اس جیسی مشکلات کی وجہ سے بہت سی کمپنیاں مزید حصص جاری کرنے کا طریقہ پسند نہیں کرتیں۔ بلکہ مزید سرمایہ حاصل کرنے کے لئے قرض لیتی ہیں۔

قرض لینے کی دو صورتیں ہیں:۔

(الف) کسی مالیاتی ادارے سے قرض لیا جاتا ہے۔ جو عموماً سود پر لیا جاتا ہے۔

(ب) عوام کی شیئرز لینے کی نہیں بلکہ قرضے دینے کی دعوت دی جاتی ہے اس کے لئے دو

طرح کی دستاویزات کمپنی جاری کرتی ہے۔جس کو لے کر لوگ قرضے دیتے ہیں۔

۱) سند:(Bond)

بانڈ معینہ مدت کے لئے جاری ہوتا ہے اس وقت تک اس پر سالانہ سوٗد ملتا رہتا ہے۔ مدت کبھی زیادہ ہوتی ہے، کبھی کم۔ ایسا بھی ہوا ہے کہ بانڈز ننانوے سال کے لئے جاری ہوئے۔ بانڈز کا حامل مدت پوری ہونے سے پہلے اس کو فروخت بھی کرسکتا ہے۔

۲) شهادةالاستثمار :(Debenture)

بانڈ اور ڈبینچر میں اتنی بات قدر مشترک ہے کہ ان دونوں کا حامل کمپنی میں حصہ دار نہیں ہوتا محض دائن ہوتا ہے جس کو کمپنی کی طرف سے سالانہ سود دیا جاتا ہے اور وقت مقرر پر رقم واپس کردی جاتی ہے۔اور ان دونوں میں فرق دو طرح سے ہیں۔

ایک تو یہ کہ بانڈ صرف قرضے کی دستاویز ہے اب بعض اوقات قرضوں کے بانڈز کو تحفظ دینے کے لئے ایک دستاویز جاری کی جاتی ہے جس میں ان بانڈز کو کمپنی کی ایک جائیداد یا بہت سی جائیدادوں کے ساتھ متعلق کردیا جاتا ہے کہ اگر یہ قرضے ادا نہ ہوئے تو ان جائیداوں سے ادا کرئیے جائیں گے۔ اس کو (Debenture) کہتے ہیں۔گویا بانڈز قرضے کی دستاویز ہیں ڈبینچر اس کے رہن کا وثیقہ ہے۔

دوسرا فرق یہ ہے کہ اگر کمپنی دیوالیہ ہوجائے تو اثاثوں سے جن لوگوں کا حق متعلق ہوتے ہیں ان حقوق کی ادائیگی کی قانوناً ترتیب ہوتی ہے اس ترتیب میں ڈبینچر اس جائیداد کی حد تک قدر مقدم ہوتا ہے، جس کو رہن بنایا گیا تھا بانڈز کی ادائیگی اس کے بعد ہوتی ہے۔

بانڈ کی ایک قسم ایسی ہوتی ہے جس میں حامل کو یہ اختیار ہوتا ہے کہ وہ بانڈ کو شیئر میں تبدیل کرلے۔ پہلے وہ دائین تھا اب وہ کمپنی میں حصہ دار ہوگا۔ اس کے لئے بھی مدت مقرر ہوتی ہے کہ اتنی مدت کے بعد شیئر میں بدل سکتے ہیں اور کبھی مدت مقرر نہیں ہوتی کبھی۔ مقصود شرائط ہوتی ہیں، کبھی نہیں۔ ایسے بانڈ کو ''سندات

قابلۃللتحویل‘‘(Conver Tible Bonds) کہتے ہیں۔

۳:’’اجارہ‘‘ سرمایہ حاصل کرنے کا ایک طریقہ اور رائج ہوا ہے جس کو’’اجارہ‘‘(Leasing) کہتے ہیں۔ اجارہ دوطرح کا ہوتا ہے۔ایک (Opearting Leas) (آپریٹنگ لیز) یہ وہ اجارہ ہے جو عام طور پر معروف ہے، اس میں واقعتاً فریقین میں موجر ومستاجر کا رشتہ ہوتا ہے۔ یہ اجارہ سرمایہ حاصل کرنے کا ذریعہ نہیں ہوتا۔ سرمایہ حاصل کرنے کا ذریعہ دوسری قسم کا اجارہ ہے جس کو (Financial lease)(فنانشل لیز) کہتے ہیں۔

اس کی وضاحت یہ ہے کہ یہاں صل مقصود اجارے کا رشتہ قائم کرنا نہیں ہوتا، بلکہ کمپنی کو جمد اثاثوں کی (مثلاً مشینری کی) ضرورت ہے تو کمپنی بنک سے قرضہ لے کر خور مشینری خریدنے کے بجائے کسی بنک یا مالعاتی ادارے کو یہ کہتے ہیں کہ یہ مشینری خرید کر ہمیں کرائے پر دے دو۔ اس دوران مشینری کا مالک بنک یا مالیاتی ادارہ ہوگا اور کمپنی کرائے دار ہونے کی حیثیت سے اسے استعمال کرتی ہے ایک مخصوص مدت کیلئے کرایہ اس تناسب سے طے کیا جاتا ہے کہ اس میں مشینری کی قیمت بھی وصول ہو جائے اور اتنی مدت کیلئے اگر یہ رقم قرض دی جاتی تو اس پر جتنا سود ملنا تھا وہ بھی وصول ہو جائے جب یہ مدت گزر جاتی ہے اور کرائے کی شکل میں مشینری کی قیمت بمعہ معینہ شرع سود ادا ہو جاتا ہے تو اب یہ مشینری خود بخود کمپنی کی مملوک بن جاتی ہے یہ بات بھی معاہدے میں لکھی ہوتی ہے اور کبھی کبھی تو نہیں جاتی ،مگر معروف اسی طرح ہے۔ قرض کے بجائے اجارے کا یہ طریقہ اختیار کرنے کے دو مقصد ہوتے ہیں۔

(۱) اس کی وجہ سے بعض صورتوں میں ٹیکس سے بچت ہو جاتی ہے یا ٹیکس میں کمی ہو جاتی ہے۔

(۲) قرض کی وصولیابی کیلئے اجارے کا صریقہ بہ نسبت اقراض کے زیادہ باعث اعتماد ہے۔

اس لئے کہ اجارے میں مشینری موجر کی ملکیت میں ہوتی ہے اس پر اسی کا لیبل لگا رہتا ہے۔ اگر بالفرض رقم نہ ملے تو موجر کو کوئی خطرہ نہیں اس لئے کہ مشینری اسی کی ملکیت میں ہیں۔

یہاں یہ بھی یاد رہے کہ فنانشل لیزنگ سے چونکہ ایک درجہ میں سرمایہ حاصل کرنے میں مدد لینا مقصود ہوتا ہے اس لئے اس کو فنڈز کی فراہمی کا ایک طریقہ شمار کر کے اس کو'تمویل'' (Financing) کے ذیل میں لگایا گیا ہے۔ ورنہ حقیقت میں یہ ''تمویل'' (Financing) نہیں ہے اس لئے تمویل وہ ہوتی ہے جس میں کوئی چیز کمپنی کے مالک میں آجائے۔ اور یہاں وہ مشینری ابھی کمپنی کی ملکیت میں نہیں آئی۔

کمپنی پر ایک نظر شرعی حیثیت سے:

اب تک کمپنی کے بارے میں مروجہ نظام کی تفصیل کا ذکر ہوا ہے۔ کمپنی کی یہ حقیقت معلوم ہونے کے بعد اس کی شرعی حیثیت پر گفتگو مناسب ہوگی۔ اس موضوع پر بحث کو دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

ایک حصہ اصولی اور بنیادی طور پر کمپنی کے جواز یا عدم جواز کی بحث سے متعلق۔

اور دوسرا حصہ کمپنی سے متعلق جزو مسائل کا ہے۔

جہاں تک پہلی بحث کا تعلق ہے تو اتنی بات تو پہلے واضح ہو چکی ہے کہ کمپنی کی جو خصوصیات سامنے آئیں ہیں، ان کے لحاظ سے کمپنی کے معروف اقسام میں سے کسی میں کسی کا داخل نہیں، فقہاء نے شرکت کی چار قسمیں ذکر کی ہیں، اگر مضاربت کو بھی اس میں شامل کرلیا جائے تو پانچ قسمیں بن جاتیں ہیں۔ کمپنی کا یہ نظام ان پانچوں میں سے کسی میں بھی بتمام کمال داخل نہیں، جیسے کہ پہلے شرکت اور کمپنی میں فرق بتائے جا چکے ہیں۔

اب یہاں علمائے معاصرین کے تین نقطہ نظر ہیں۔

ایک یہ ہے کہ چونکہ شرعاً شرکت ان پانچ قسموں میں منحصر ہے اور کمپنی میں ان میں سے کسی میں بھی بتمام و کمال داخل نہیں، لہٰذا یہ جائز نہیں۔

دوسرا نقطہ نظر یہ ہے کہ محض ان بناء پر کہ کمپنی ان پانچ قسموں میں داخل نہیں اس کو ناجائز نہیں کہا جا سکتا، اس لئے کہ فقہائے کرام علیہ نے جو اقسام ذکر کی ہیں وہ مخصوص نہیں بلکہ فقہاء نے شرکت کی مروجہ صورتوں کا استقراء کر کے اس کی روشنی میں تقسیم فرمائی ہے پھر کسی نص میں یا فقیہ کے کلام میں کہیں یہ تصریح نہیں

کہ جو صورت ان اقسام سے خارج ہو جائز نہیں ہوگی لہٰذا اگر شرکت کی کوئی صورت ان اقسام میں داخل نہ ہو اور شرکت کے اصول منصوصہ میں سے کسی کے خلاف بھی نہ ہو تو وہ جائز ہوگی ۔

تیسرا نقطہ حضرت حکیم الامت تھانویؒ کا ہے انہوں نے فرمایا ہے کہ اپنے حقیقی روح کے اعتبار سے کمپنی شرکت عنان میں داخل ہے ۔ اگر چہ کمپنی کی بعض ایسی خصوصیات ہیں جو معروف شرکت عنان میں نہیں پائی جاتیں ، لیکن ان کی وجہ سے عنان کی حقیقت تبدیل نہیں ہوتی ۔ اب کمپنی کی شرعی حیثیت پر گفتگو کے لئے الگ الگ غور کرنا ہوگا کہ وہ شریعت کے مطابق ہے یا نہیں ہو وہ احتیاطاً بازاری قیمت کی زکوۃ دیدے ۔ اور اگر کسی نے شیئر تجارت کرنے (Capital Gain) کیلئے اور آگے بیچ کر نفع کمانے کے لئے خریدا ہے ۔ تو یہ عروض تجارت میں شمار ہوگا اس لئے کے گویا اس نے کمپنی کے اثاثوں کا ایک متناسب حصہ آگے بیچنے کے لئے خرید لیا ہے ۔ اس لئے تمام قیمت پر زکواۃ واجب ہوگی ۔

۳:　فقہی اصول یہ ہے کہ کسی پر قرضہ واجب ہوں تو قرضہ منہا کر کے باقی اموال پر زکواۃ واجب ہوتی ہے مگر آج کل بہت قابل غور ہے کہ اکثر بڑے بڑے سرمایہ داروں نے بنکوں اور دیگر مالیات اداروں سے اتنے قرض لے رکھے ہوتے ہیں کہ ان کے قرضے ان کے قابل زکواۃ سرمائے سے عموماً بڑھ جاتے ہیں ۔

عموماً صورتحال یہ ہوتی ہے کہ اگر ان کے قرضے منہا کئے جائیں تو نہ صرف یہ کہ ان پر زکواۃ واجب نہیں ہوگی ۔ بلکہ بعض صورتوں میں وہ خود مستحق زکواۃ قرار پائیں گے ۔ اس سلسلے میں ایک تجویز تو یہ پیش کی جاتی ہے کہ مشینری پر زکواۃ واجب قرار دی جائے ، لیکن یہ بات اس لئے قابل تسلیم نہیں کہ مشینری کو مال زکواۃ قرار نہیں دیا جاسکتا ، یہ بات منصوص ہے ۔ اس مسئلے کا حل یہ ہے کہ زکواۃ سے قرض کا مستثنیٰ ہونا فقہاء کے ہاں متفق علیہ نہیں حنفیہ اور حنبلیہ کے ہاں تو قرض مستثنیٰ ہوتی ہے ، شافعیہ کے ہاں مستثنیٰ نہیں ہوتے اور مالکیہ کے یہاں نقود میں تو مستثنیٰ ہوتے ہیں غیر نقود میں نہیں ہوتے ۔

احقر کی ناچیز رائے اس مسئلہ کے بارے میں یہ ہے کہ دیکھا جائے جو قرضہ لیا جائے وہ کہا صرف کیا گیا

....

اگر ان قرضوں کے ذریعے ایسی اشیاء خریدی گئیں جو خود قابل زکوۃ ہیں تو یہ قرضے زکوۃ سے مستثنی ہوں گے۔

اور اگر ان قرضوں سے ایسی اشیاء خریدی گئی جو قابل زکواۃ نہیں تو یہ قرضے مستثنی نہیں ہوگے۔ ان قرضوں کے سلسلے میں مالکیہ اور شافعیہ کے قول پر عمل کیا جائے گا۔

یہ رائے قائم کرنے کے بعد حافظ ماردینیؒ کی کتاب ''الجوھر النقی'' میں نظر سے گزرا کہ امام مالکؒ کا قول بھی اس کے قریب قریب ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

''ان کان عنده عروض، تفی مدینه علیه ذکاة العین''. (۸۹)

نظام زر (Monertary System)

زر، نقد (Moeny) کی تعریف:

جو چیز عرفاً آلہء مبادلہ کے طور پر استعمال ہوتی ہو۔ اور وہ قدر کا پیمانہ ہو اور اس کے ذریعے مالیت کو محفوظ کیا جاتا ہو' اسے ''زر'' کہتے ہیں یہ تین خصوصیات جس چیز میں پائی جاتی ہو اس کو معاشی اصطلاح میں عربی میں ''نقد'' اردو میں ''زر'' اور انگریزی میں (Money) کہتے ہیں۔

مالیت کے تحفظ سے مراد یہ ہے کہ کسی کے پاس جنس رکھی ہوئی ہو تو اس کی قیمت کم و بیش ہوتی رہتی ہے۔ نیز ضروری نہیں کہ ہر وقت اس کا کوئی خریدار مل جائے اس لئے .س کی مالیت محفوظ رہتی ہے۔ نیز اس سے کوئی بھی چیز جب چاہیں خریدی جا سکتی ہے۔

زر اور کرنسی میں فرق:

زر وہ چیز ہے جس کے ذریعے سے تبادلہ ہوتا ہو قدر کی پیائش ہوتی ہو اور مالیت کا تحفظ بھی ہو مگر یہ ضروری نہیں کہ قانونی طور پر بھی اس کو جبری آلہ قرار دیا گیا ہو مثلاً چیک یا بانڈز جیسی دستاویزات سے لوگ تبادلہ کرتے ہیں لیکن اگر کوئی شخص انعامی بانڈ سے ادائیگی کرے اور دوسرا شخص اپنا حق انعامی بانڈ کی صورت

میں لینے پر آمادہ نہ ہوتو اس کو قانوناً لینے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ اور کرنسی وہ زر ہے جس کو خاص ملک میں قانونی طور پر آلہ ءتبادلہ قرار دیا گیا ہو جیسے۔ روپیہ۔ اگر کوئی شخص روپے میں ادائیگی کرے تو قانوناً اسے لینے پر مجبور کی جائے گا۔ جیسے کہ اگر کوئی شخص چونیوں سے بڑا قرض ادا کرنا چاہے تو لینے ولا قانوناً لینے سے انکار کرسکتا ہے۔ اور یہ مطالبہ کرسکتا ہے کہ میرا قرض مجھے روپیہ میں ادا کرو۔

اس کو عربی میں '' عملة قانونية محدودة '' اردو میں'' محدود زرقانونی '' اور انگریزی میں (Liited Legal Tender) کہتے ہیں۔

دوسری قسم میں جس میں قانوناً ادائیگی کی کوئی حد مقرر نہ ہو۔ اس کو ''عملة قانونية غير محدودة'' یا غیر محدور زرقانونی (Unlimited Legal Tender) کہتے ہیں۔ جیسے دھات یا کاغذ روپیہ وغیرہ ہے۔

زر کا ارتقاء اور مختلف نظامہائے زر:

ابتدأ لوگوں میں سامان کے بدلے بیع کا طریقہ رائج تھ، جس کو ''مقايضة'' (Barter) کہتے ہیں۔ مگر اس میں متعدد دشواریں تھیں مثلاً یہ کہ سامان کا نقل وحمل مشکل تھا، اس طریقے میں طلب ورسد کا ایک ہی جگہ ملاپ کم ہوتا تھا مثلاً ایک شخص گندم دے کر کپڑے کا خواہش مند ہے اور کپڑے والا گندم لینا نہیں چاہتا۔ اجناس کو چھوٹی چھوٹی اکائیوں میں تقسیم کر کے ان کو کاروبار کی بنیاد بنانا مشکل تھا۔

''مقايضة'' (Barter) کے بعض اہم اشیاء کو ہی ثمن قرار دیا گیا۔ اس لئے کہ یہ عالمی طور پر قابل قبول تھے اور ان کا نقل وحمل بھی آسان تھ۔ ابتدا سونے کے ذریعے مبادلات سکہ ڈھالے بغیر ان کے وزن کی بنیاد پر ہوتے تھے اس کے بعد سکے ڈھالنے کا آغاز ہوا شروع میں ہر شخص کو سکے ڈھالنے کی اجازت ہوتی تھی۔ اس دور کے نظام کو'طلائی معیار'' اور عربی میں 'قاعدة الذهب' اور انگریزی میں (Gold Standard) کہتے ہیں۔ پھر سونے کے علاوہ چاندی کے سکے بھی ڈھالے جاتے تھے'' دودھاتی معیار

’’(Bi metalic Stahdard) کہتے ہیں۔اور عربی میں ’نظام المعدنین‘ کہتے ہیں۔اس کے بعد ایک ایسا دور آیا کہ لوگ سونے، چاندی کے سکے صرافوں کے پاس امانت رکھوادیتے تھے اور صراف اس کے وثیقے کے طور پر رسید لکھ دیتے تھے۔ بوقتِ ضرورت رسید دکھا کر صراف سے اپنا سونا واپس لیا جاتا ہے۔

پھر رفتہ رفتہ لوگوں نے صرافوں کی دی ہوئی رسیدوں سے اشیاء خریدنی شروع کر دی، یعنی بجائے خریدار پہلے صراف سے سونا لے کر بائع کو دے، اور بائع سونا لے کر پھر صراف کے پاس رکھوائے، خریدار بائع کو سونے کی رسید دے جس کا مطلب یہ ہوتا کہ اس رسید کا سونا بائع کی طرف منتقل ہوگیا ہے۔، اس طرح رسیدوں سے لوگ عموماً سونا واپس لینے نہیں آتے تو انہوں نے لوگوں کا رکھا ہوا سونا دوسروں کو قرض دینا شروع کر دیا اس طرح نوٹ اور بینکنگ کا آغاز ہوا یعنی صرّافوں کی جاری کی ہوئی رسیدیں نوٹ بن گئیں۔جس کی تفصیل بینکنگ پر گفتگو کرتے ہوئے ذکر کی جائے گی۔ ابتداً ہر شخص نوٹ جاری کرسکتا تھا۔مگر اس وقت یہ زرقانونی (Legal Tender) نہیں تھی صرف لوگوں کا تعامل کی وجہ سے قابلِ قبول تھی۔ اس مقبولیت اور سہولیت کے پیشِ نظر بعد میں نوٹ کو زرقانونی (Legal Tender) قرار دیا گیا۔لیکن زرقانونی کی حیثیت نوٹ ہر شخص کو جاری کرنے کی اجازت نہ تھی، حکومت کے منظور شدہ (Authorised) ادارے (بنک) جاری کرسکتے تھے۔شروع میں عام تجارت بنک بھی نوٹ جاری کرتے تھے۔ بعد میں یہ اختیار صرف مرکزی بنک کی حد تک محدود کر دیا گیا۔

نوٹ کے (Legal Tender) بننے کے بعد اس پر کئی دور گزرے ہیں۔ایک دور وہ تھا جب نوٹ کے پیچھے سو فیصد سونا ہوتا تھا۔قانوناً اس بات کی پابندی تھی کہ جتنا سونا موجود ہے۔اتنے ہی نوٹ جاری کئے جائیں۔اس نظام کو عربی میں ’’قاعدۃ سبائک الذھب‘‘ اور انگریزی میں (Gold Bullion Standard) کہتے ہیں۔پھر جب دیکھا گیا کہ لوگ سونا لینے کم ہی آتے ہیں تو نوٹ کی پشت پر سونے کی شرح کم کر دی گئی شرح کے تناسب بدلتے رہے یعنی نوٹ کی پشت پر رکھے ہوئے سونے کی

فیصد شرح گھٹتی چلی گئی ۔ ایسے نوٹ کو جس کی پشت پر سو فیصد سونا نہ ہو ''النقود الثقة'' (Fiduciary Money) کہتے ہیں پھر سونے کی شرح کم ہوتے ہوتے صفر رہ گئی اور کم از کم ملکی معاملات کی حد تک نوٹ کی پشت پر سونے کا وجود ضروری نہیں رہا ۔ ایسے نوٹوں کو ''النقود الرمزیۃ'' (Token Money) ان سکوں کی قانونی قیمت حقیقی کی نمائندگی ۔ نہیں کرتی مثلاً سو روپے کے نوٹ کی قانونی قیمت سو روپے ہے مگر اس کی ذاتی قیمت کچھ بھی نہیں ۔ کچھ عرصے تک ''نقود رمزیہ'' کا بھرم اس طرح رہا کہ بیشتر ممالک نے اپنے نوٹوں کو ڈالر سے وابستہ کر رکھا تھا ، گویا ان کے نوٹوں کے پیچھے ڈالر تھے ، اور چونکہ امریکہ نے ڈالر کے بدلے سونا دینے کا اقرار کیا ہوا تھا ۔

اس لئے ڈالر کے پیچھے سونا تھا ، اور اس طرح دوسرے ملکوں کے نوٹ بھی بالواسطہ سونے سے وابستہ تھی لیکن بالآخر کا 1971 میں امریکہ نے بھی سونے سے ڈالر کی وابستگی ختم کر دی ، جس کی تفصیل آرہی ہے ۔ اور اس طرح اب کسی نوٹ کے پیچھے سونا ، چاندی نہیں ہے اب ''نوٹ'' محض ایک اصطلاحی ثمن ہے جو قوت خرید کی نمائندگی کرتا ہے اور بس ۔ (۹۰)

شرح مبادلہ کا تعین :

مختلف ملکوں کی کرنسیوں کے باہمی تبادلے کی شرح کیسے متعین ہوتی ہے اس کے بھی مختلف زمانوں میں مختلف طریقے رائج رہے ہیں ۔ ۱۸۸۰ء سے ۱۹۱۳ء تک دنیا میں طلائی نظام رائج تھا ، مگر جس طرح اس دورانئے میں مکمل طور پر رائج رہا ویسے پہلے رائج نہ تھا ۔

طلائی نظام میں ہر ملک کی کرنسی سونے کی ایک مخصوص مقدار کی نمائندگی کرتی تھی ۔ مثلاً انگلینڈ نے طے کر رکھا تھا کہ ایک پونڈ کے پیچھے سونے کی اتنی مقدار ہوگی ۔ جب یہ طلائی نظام رائج تھا ۔ اس وقت دو ملکوں کی کرنسیوں میں تبادلے کی شرح ان کرنسیوں کی پشت پر موجود سونے کی کتنی مقدار ہے ۔ دو ملکوں کی کرنسیوں کے بدلے میں ملنے والی سونے کی مقداروں میں جو تناسب ہوتا اسی تناسب سے کرنسیوں کا تبادلہ ہوتا تھا ۔ مثلاً اگر

انگلینڈ کے پونڈ کے پیچھے چار تولے سونا ہوا اور امریکی ڈالر کے پیچھے دو تولے سونا ہو تو پونڈ اور ڈالر میں ایک اور دو کی نسبت ہوئی ۔ لہٰذا ایک پونڈ کا دو ڈالر سے تبادلہ ہوگا اس کے بعد رفتہ رفتہ طلائی نظام ختم ہوگیا۔ اس کے بعد شرح مبادلہ کے تعین کا کیا طریقہ رائج ہوا؟ اس کو سمجھنے کے لئے بین الاقوامی تجارتی نظام میں جو تبدیلیاں آئیں ان کی اجمالی وضاحت ضروری ہے۔

پہلی جنگ عظیم کے بعد دنیا کا اقتصادی نظام درہم برہم ہوا۔ پھر ۱۹۳۰ء میں عالمی کساد بازاری ہوئی اور تمام ممالک نے نوٹ پر سونا دینا بند کر دیا۔ پھر دوسری جنگ کے بعد انگلینڈ اور یورپ کے دوسرے ممالک اقتصادی طور پر درہم برہم ہوگئے، مگر امریکہ اقتصادی طور پر خاصا مستحکم تھا۔ اس کے پاس سونے کے کافی ذخائر تھے۔ ۱۹۴۴ء میں امریکہ کے تعاون سے یورپ کی تعمیر نو کے لئے متعدد ممالک کی ایک عظیم کانفرنس منعقد ہوئی ۔ اس کانفرنس کا موضوع یہ تھا کی عالمی تجارت کو کیسے فروغ کیا جائے ؟ سرمایہ کاری (Investment) کو کیسے فروغ دیا جائے؟ اور نیا عالمی نظام زر کس طرح طے کیا جائے جس میں وہ خرابیاں نہ ہوں جو ''طلائی نظام'' میں تھیں ۔ اس کانفرنس نے تین ادارے قائم کرنے کی تجویز منظور کی اور ایک نظام طے کیا گیا۔ پہلے ان تین اداروں کا مختصر تعارف ذکر کیا جاتا ہے پھر نظام پر گفتگو ہوگی ۔

بریٹن ووڈز کانفرنس کے تین ادارے:

۱) پہلا ادارہ جس کا قیام اس کانفرنس میں طے پایا تھا وہ ہے ''بین الاقوامی تجارتی تنظیم'' (International Organization Trade) جس کو عربی میں ''منظمة التجارة الدولية'' کہتے ہیں ۔ اس کا پس منظر یہ ہے کہ سولہویں صدی سے اٹھارویں صدی تک یہ نظریہ بہت مقبول تھا ہر ملک ہر ملک اقتصادی ترقی کے لئے اپنا سونا بڑھائے اور اس کے لئے برامدات کو فروغ دیں اور درامدات میں رکاوٹیں ڈالے ، اس نظریئے کو مرکنٹائل ازم (Mercantilism) اور عربی میں ''مذهب التجاريين'' کہتے ہیں۔

....

لیکن بعد میں یہ نظریہ کامیاب نہ ہوا اور یہ نظریہ مقبول ہوا کہ اقتصادی ترقی کے لئے بین الاقوامی تجارت کو فروغ دیا جائے ایسی پابندیاں نہ لگائی جائیں جو بین الاقوامی تجارت میں رکاوٹ ڈالیں اِسی نظریئے کے پیش نظر اس کانفرنس میں مذکورہ ادارے کا قیام طے ہوا جس کا مقصد یہ تھا کہ ادارہ بین الاقوامی تجارت میں حائل رکاوٹوں کو ختم کرنے کا انتظام کرے گا، مگر امریکہ اس ادارے کا قیام کا مخالف تھا اس لئے کہ امریکہ ایک زرعی ملک ہے، اگر بین الاقوامی تجارت کو فروغ ہوتا تو یورپ کا مال سستے دام امریکہ میں آتا او کسان زراعت کو چھوڑ کر تجارت کی طرف متوجہ ہوتے۔ اس سے امریکہ کی زرعی پالیسی کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ تھا ایک عرصے تک اس ادارے کا قیام امریکہ اور دوسرے ممالک میں باعث نزاع بنا رہا۔ دوسرے ممالک اس ادارے کے قیام کا مطالبہ کرتے تھے اور امریکہ انکار کرتا تھا۔

حتیٰ کہ ۱۹۴۸ء میں باہمی مصالحت ہوئی اور اس کے نتیجے میں ایک اور ادارہ وجود میں آیا جس کو (General Agrieement on Tariff and Trade) جنرل ایگرمنٹ آف ٹیرف اینڈ ٹریڈ) کہتے ہیں جس کے معنی اردو میں یوں کہی جاسکتی ہیں ''مصولات اور تجارت کا معاہدہ عام'' اس ادارہ کو تخفیفاً (Gatt) (گیٹ) کہتے ہیں۔ عربی میں اس ادارے کو ''**الاتفاقية العامة للتصرفات الجمركية والتجارة**'' کہتے ہیں۔ اس معاہدے سے زرعی اجناس کو مستثنیٰ کرلیا گیا تھا زرعی اجناس کے علاوہ دیگر مصنوعات میں بین الاقوامی تجارت کو فروغ دینے کے لئے یہ اصول طے ہوئے۔

۱) کوئی ملک بین الاقوامی تجارت میں کوئی پابندی یا رکاوٹ عائد کرے تو دوسرے ممالک اس رکاوٹ کو ختم کرانے کے لئے ''گیٹ'' میں آواز اُٹھاسکیں گے اور جو ملک اس ''گیٹ'' کے ممبران ہیں ان پر ''گیٹ'' کے فیصلے پر عملدرامد کرنا ضروری ہوگا۔ تجارت میں رکاوٹیں دو طرح کی ہوتی ہیں۔

۲) محصولاتی رکاوٹیں:

کوئی ملک کسی ملک کی مصنوعات پر زیادہ محصول لگاتا ہے، جس کی وجہ سے اس ملک کی مصنوعات اس

ملک میں مہنگی ہو جاتی ہیں اور ان کی خرید وفروخت کم ہوتی ہے۔

۳) غیر محصولاتی رکاوٹیں۔

محصول کے علاوہ کوئی اور پابندی ایسی لگادی جائے جس کی وجہ سے دوسرے ممالک کی مصنوعات منگوانے میں لوگ تنگی محسوس کریں مثلاً فرانس نے جاپان کے VCR پر یہ پابندی لگادی تھی کہ صرف فلاں چھوٹی پورٹ سے ہی آسکے گا۔

۴) دوسرا اصول یہ طے ہوا کہ کوئی ملک کسی ملک کے ساتھ امتیازی سلوک نہیں کرے گا۔ اگر کوئی ملک ایک ملک کے ساتھ بہتر طریقے کے ساتھ تجارت کرے اور دوسرے ملک کے ساتھ اور طریقے سے تجارت کرے۔ تو یہ ملک گیٹ میں آواز اٹھا سکے گا۔

۵) کسی ملک پر امتیازی محصول نہیں لگایا جائے گا۔ اگر کسی ملک پر امتیازی محصول لگایا گیا تو وہ ''گیٹ'' میں آواز اُٹھا سکے گا۔

۶) غریب ممالک کو بیرونی مصنوعات پر محصول زیادہ لگانے کی اجازت ہوگی اس لئے کہ اگر غریب ممالک بھی محصول کم رکھیں گے تو بیرونی مصنوعات سستی ملےگی جس کی وجہ سے ملکی مصنوعات کی مانگ کم پڑے گی اور ملکی صنعت کو نقصان پہنچے گا۔

۷) اگر دو ممالک میں تجارتی نزاع پیدا ہوگا تو ''گیٹ'' کے ذریعے باہمی افہام وتفہیم کے ذریعے سے حل کیا جائے گا۔ (۹۱)



باب چہارم

فصل پنجم

پیشے: (شاہ ولی اللہ کی نظر میں)

پیشوں کی ابتداء اور اہمیت:

آج کل پیشوں کی جو صورت ہے شاہ ولی اللہؒ ان سے مطمئن نہیں تھے اور باتوں کے علاوہ لوگوں نے بعض پیشوں کو حقیر اور بعض کو باعزت سمجھنا شروع کر دیا ہے اس کی وجہ ان پیشوں میں معاشی عدم توازن یعنی دولت کا صحیح طریقے پر نہ دیا جانا ہے۔

آپؒ کی رائے میں تین چیزیں کسی پیشے کو باعزت یا ذلیل بنانے میں کسوٹی کا کام دے سکتی ہیں:۔

۱) ضرورت ۲) محنت ۳) ارتفاق یعنی انسانی ترقی میں مدد

ضرورت یا احتیاج پیشوں کی ابتداء کا بنیادی ذریعہ ہے۔شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ انسان کے پاس زمین تھی لیکن اوزار نہ تھے چنانچہ اوزاروں کی صنعت اور اس سے متعلق پیشوں نے جنم لیا۔ اس کے پاس روئی تھی لیکن کپڑا کیسے پہنے اس لئے کپڑا بننے اور لباس تیار کرنے کی صنعتیں اور پیشے وجود میں آئے اس کے پاس غلہ تو تھا لیکن اپنی ضرورت کی چیزیں کیسے حاصل کرے اس طرح تبادلے کے نظام اور تجارت کی مختلف صورتوں نے جنم لیا۔ چنانچہ جوں جوں ضرورت پیش آتی رہی پیشے وجود میں آتے رہے (۹۲)

انسان جس قدر ترقی کرتا گیا اور اس میں حرص و ہوس بڑھتی گئی اور مختلف ادوار میں قیصر و کسریٰ (جاگیردارانہ) قسم کے باطل نظام پروان چڑھتے رہے لہٰذا دولت کو حاصل کرنے کے لئے ایسے ذریعے اور پیشے بھی وجود میں آتے گئے جن سے انسان کو بیٹھے بٹھائے دولت مہیا ہو جائے اور وہ ان پیشوں کو بھی انسانی ضرورت میں داخل کرنے لگے۔ اس لئے شاہ صاحبؒ کے نزدیک دوسرا بڑا معیار ''محنت'' ہے آپ کے خیال

میں ایسے پیشے جن میں محنت نہیں کرنا پڑتی یا وہ عیش وعشرت اور فضول قسم کے کاموں میں مدد دیتے ہیں انسانیت کے لئے بربادی کا سامان ہیں ان پر جو دولت خرچ ہوتی ہے وہ سب لوگوں کا نقصان ہے چنانچہ محنت اور معونت کے اصولوں پر کسی پیشے کو پرکھنے اس کا صحیح مقام متعین ہوتا ہے۔

چنانچہ ضرورت اور محنت کے ساتھ یہ دیکھنا بھی ضروری ہوگا کہ اس کی اجتماعی ضرورت بھی ہے یا نہیں اگر ہے تو کیا فائدہ مند ہے اگر نہیں تو قوم پر بوجھ اور ملک کی بربادی کا باعث ہے اور خوشحال معاشرہ کے لئے زہر ہے۔ (۹۳)

با مقصد اور ناکارہ پیشے:

با مقصد اور اہم پیشوں کا دارومدار ضرورت، محنت اور ارتفاق کے لئے 'تعاون' پر ہے۔ لیکن یہ کیسے معلوم ہو کہ کن پیشوں کی ضرورت ہے۔ اور کون ان میں بے کار ہیں۔ اس لئے شاہ ولی اللہ علیہ کا خیال یہ ہے کہ معاشرتی بہبود سے متعلق اداروں کو جامع منصوبہ بندی کرنی پڑے گی۔ اور یہ دیکھنا ہوگا کہ ان کے ملک کی آبادی کتنی ہے اور لوگ کن کن پیشوں میں مشغول ہیں اور حقیقت میں انہیں کن پیشوں میں مشغول ہونا چاہئے۔ آپؒ فرماتے ہیں کہ اگر برے اور بے مقصد پیشوں کو ختم کر دیا جائے تو ملک کی معاشی حالت پر اس کا گہرا اثر پڑے گا اور لوگوں کی حالت درست ہو جائے گی۔ (۹۴)

شاہ ولی اللہؒ نے اپنی تحریروں میں مختلف مقامات پر جن پیشوں ذکر کیا ہے، انہیں مندرجہ ذیل حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔-

۱) وہ پیشے جو انسان کی بنیادی ضرورتوں کو پورا کرتے ہیں۔

۲) وہ پیشے جو ان بنیادی ضرورتوں کو پورا کرنے والے اداروں کے لئے سہولت پیدا کرتے ہیں۔ اور شہری زندگی نیز انسانی ترقی کے لئے ڈھال کا کام دیتے ہیں۔

۳) وہ پیشے جو محض عیش وعشرت اور تفریح اور دیگر انسانی دلچسپیوں کے سامان مہیا کرتے ہیں۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے پیشوں کی اس تقسیم کا تجزیہ اس طرح کی ہے کہ :۔

۱) زراعت ،صنعت اور تجارت سے انسان کی بنیادی ضرورتیں پوری ہوتی ہیں ان میں 'زراعت' کے پیشے کو معاشرتی زندگی میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت حاصل ہے۔شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ جب حالت یہ ہو کہ ملک کی آبادی کا انحصار زمین پر ہو اور لوگ اِدھر اُدھر کے پیشوں میں مشغول ہوں تو اس سے ملکی حالت خراب ہو جائے گی اور خود زرعی زندگی اور اس سے متعلق پیشوں کے لوگ بے حد متاثر ہوں گے۔اس لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ زرعی ملک میں اکثریت لوگوں کی زراعت کی طرف متوجہ ہوں اور زراعت کے پیشے کو غذا کی طرح اہم سمجھا جائے تا کہ زیادہ سے زیادہ غلہ پیدا ہو اور ملک کے لوگوں میں اس کی فراوانی ہو غلہ سستا ہو اور لوگ خوشحال ہوں۔

۱) زراعت کے بعد شاہ صاحبؒ صنعت اور تجارت کی بہت اہمیت دیتے ہیں۔اور فرماتے ہیں ،کہ جو لوگ دستکاری اور تجارت میں معاونت اور محنت کے اصول پر انسانوں کی بنیادی ضرورتیں پوری کرتے ہیں۔گویا وہ زندگی کے مقصد کی طرف رواں دواں ہیں۔کیونکہ صنعت وتجارت وغیرہ میں محنت کر کے دولت بڑھانے کے معنی ہیں کہ شہری نظام کو مضبوط کیا جا رہا ہے۔جس کے بغیر شہری زندگی باقی نہیں رہتی۔(۹۵)

۲) ان بنیادی پیشوں کے بعد معاشرے میں کچھ ایسے بھی پیشے ہوتے ہیں جو براہ راست 'دولت' تو پیدا نہیں کرتے لیکن دولت کی پیدائش میں مدد دیتے ہیں۔اس میں عمرانی اور مذہبی تعلیم کے ادارے بھی شامل ہیں۔جن کی بدولت علمی اور فکری طور پر انسان بہتر بنتا ہے۔اور مزید انسانی ترقی کے لئے کوشش کرتا ہے۔ان پیشوں میں ذرائع حمل ونقل اور مواصلات سے متعلق لوگ بھی آجاتے ہیں۔انسان کے لباس اور مکان وغیرہ سے متعلق پیشوں کا شمار بھی اس شق میں ہے اس قسم کے پیشوں میں شہری اور ملکی انتظام سے متعلق سب ہی پیشے آجاتے ہیں جن کے ذریعے لوگوں کی دیکھ بھال ہوتی ہے ان کے حقوق کی نگہداشت ہوتی ہے۔ان کے لئے آرام پہنچانے کے نت نئے طریقے سوچے جاتے ہیں اور ملکی دفاع کرتے ہیں۔

یہ اور اس قسم کے دوسرے پیشے گو کہ ہمیشہ منصوبہ بندی کے محتاج رہتے ہیں لیکن 'دولت' کی پیداوار کی نگرانی، اس کی تقسیم اس کے دیگر انتظامی امور اور مزید ترقی کے لئے ڈھال کا کام کر دیتے ہیں۔

۳) کچھ پیشے ایسے آتے ہیں جن کا تعلق نہ تو براہ راست 'دولت' پیدا کرنے سے ہوتا ہے اور نہ وہ 'دولت' سے متعلق تعمیری اداروں کی فہرست میں آتے ہیں ان میں بعض پیشے تو ایسے بھی ہیں جن کی نہ تو ضرورت ہوتی ہے۔ اور نہ ہی ان میں محنت کا کوئی تصور ہوتا ہے بعض پیشے ایسے ہیں جن میں محنت تو ہوتی ہے۔ لیکن یہ محنت چند لوگوں کی دلچسپی کا سامان پیدا کرنے تک محدود رہتی ہے اس قسم کے پیشوں پر شاہ ولی اللہؒ کڑی تنقید کرتے۔ ملک کی بربادی کا ذمہ دار ٹھہراتے ہیں اور عوام کی بدحالی کا باعث ان ہی لوگوں کو قرار دیتے ہیں۔

ان میں پہلی قسم کے لوگوں پر تو شاہ ولی اللہؒ خوب برستے ہیں براہ راست مخاطب ہوئے فرماتے ہیں:۔

> لوگو! تمہارے اخلاق گر چکے ہیں۔ تمہیں چاہئے کہ ضروریات زندگی کیلئے خود کماؤ اور لوگوں پر بوجھ نہ ہو۔ بلاشبہ خدا کی یہ مرضی ہے کہ تم اپنے ہاتھ سے کماؤ۔ (۹٦)

شاہ صاحبؒ اس قسم کے جن لوگوں سے مخاطب ہیں ان میں پہلے نمبر پر امراء اور جاگیردار ہیں۔ یہ لوگ معاشرے سے دولت تو حاصل کرتے ہیں لیکن خود 'محنت' نہیں کرتے اور معاشرے نے ان پر جو ذمہ داریاں عائد کی ہیں ان کی کوئی پرواہ نہیں کرتے آپ لوگوں سے فرماتے ہیں:۔

> اے امیرو! کیا تمہیں خدا کا خوف نہیں آتا۔ تم دنیا کی فانی اور بوسیدہ لذتوں میں اتنے محو ہو گئے کہ تمہیں عوام کا کوئی خیال نہیں رہا۔ تم جسے کمزور پاتے ہو اسے نگل جاتے ہو اور جسے طاقتور دیکھتے ہو اس کو چھوڑ دیتے ہو۔ تمہاری توجہ لذیذ کھانوں، نرم و نازک عورتوں، اچھے لباس اور اچھے مکان سے باہر نہیں جاتی۔

شعر کہنا برا نہیں لیکن درباری شاعری اور یہ کہ محض شعر کہنا ہی ہمیشہ ہو۔ شاہ صاحبؒ اس کے مخالف ہیں اس طرح بڑے آدمیوں (جاگیرداروں، سرمایہ داروں) کی حاشیہ برداری ارمصاحبت بھی بعض لوگ پیشہ بنالیتے ہیں اس قسم کے پیشوں کے بارے میں شاہ صاحبؒ کی رائے یہ ہے کہ ان لوگوں کی وجہ سے سرکاری خزانے میں بُرا اثر پڑتا ہے۔ یہ لوگ کچھ (محنت) نہیں کرتے بلکہ ایک دوسرے پر کیچڑ اچھالتے ہیں یا پھر بڑے لوگوں کی خوشامد کرتے رہتے ہیں۔ اور اس قسم کی باتیں سوچنے میں اپنا وقت برباد کرتے ہیں۔ (۵۷)

وعظ کہنا اور لوگوں کو اچھی باتیں بتانا بُرا نہیں اس طرح مزارات کی خدمت اور زھد وتقویٰ اختیار کرنا بھی اچھی بات ہے۔ لیکن وعظ کو پیشہ بنالینا، کہنا کچھ اور کرنا کچھ، لوگوں کو دکھلانے کے لئے زاھد اور متقی بننا، اسے ذاتی فائدوں اور 'دولت' کے حصول کے لئے استعمال کرنا یا مزارات پر بیٹھ کر انہیں روزی کا زریعہ بنانا یہ اور اس قسم کی سب باتیں ایسی ہیں جن سے ایسے پیشے جنم لے سکتے ہیں جو محنت کے بغیر ہی حصول دولت کی راہیں ہموار کرتے ہیں۔ اور دوسری صرح اس سے مذہب کی حقیقی روح کو بھی نقصان پہنچتا ہے۔

شاہ صاحبؒ اس قسم کی باتوں اور ایسے لوگوں کی سخت مخالفت کرتے ہیں اور فرماتے ہیں:۔

> ان لوگوں نے عوام کے روپے کو بلا محنت حاصل کرنا اپنا پیشہ بنالیا ہے۔ یہ لوگ کوئی خدمت نہیں کرتے نہ صرف ایک دوسرے کی زندگی مکدر کرتے ہیں بلکہ شہری زندگی یعنی معاشرہ پر بھی ایک قسم کا بوجھ بن جاتے ہیں۔

اس قسم کے لوگوں سے براہ راست خطاب کرتے ہوئے شاہ ولی اللہ کہتے ہیں کہ۔

> اے پیشہ ور واعظو! خود ساختہ زاھدو اور خانقاہوں کو دوکانیں بنانے والو!
>
> تم سیدھی راہ چھوڑ کر ادھر اُدھر غلط راستوں پر بھٹک رہے ہو اور ہر رطب و یاس کو لے کر لوگوں کو من گھڑت اور جھوٹی باتوں کی طرف بلا رہے

ہو۔ کیا محمد ﷺ کا طریقہ یہی تھا اور آپؐ کے ساتھی اور صحابہ یہی کرتے تھے۔

اسلامی تعلیمات، رشد و ہدایت سے پھیلی ہیں اور بزرگوں نے تکلیفیں اٹھا کر عوام کو ان کی منزل دکھائی ہے ان بزرگوں اور مذہب کے عظیم تبلیغی منصوبوں کو بعض لوگوں نے اپنے ذاتی فائدوں کے لئے خوب استعمال کیا شہرت بھی حاصل کی شاہ ولی اللہؒ خود ایک بزرگ صوفی اور باعمل عالم ہیں اس لئے مذہب اور تصوف کی آڑ میں حصول دولت کے لئے اس قسم کے کاروبار کرنے والوں پر ان کی گہری نظر ہے۔

چنانچہ اس قسم کے لوگ آپؒ کے نزدیک عوام کے روپے (سرکار خزانے) پر بوجھ بنتے ہیں۔

آپؒ نہایت سخت الفاظ میں ان لوگوں سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں۔

> اے مشائخ زادو! تم نے اپنے بزرگوں کے پاکیزہ طریقوں کو رسم بنا لیا ہے۔ تم نے راستے کو تو گم کر دیا ہے اور سمجھتے ہو کہ رہبر ہو۔ تم لوگوں کو اس لئے بیعت کرتے ہو کہ خود محنت کئے بغیر ان سے دولت وصول کرو تم لوگ ڈاکو، دجال اور فتنہ پرور ہو۔

شاہ صاحبؒ اس قسم کے معاشرتی پیشوں پر کڑی تنقید کرتے ہیں اور اس قسم کی بلا محنت روزی کی مذمت کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ:

> اس قسم کے پیشے ملکوں کی تباہی کا سبب بنتے ہیں کیونکہ ان کی روزی کا دارومدار محنت کے بجائے عوام کے پیسوں پر ہوتا ہے۔ (۹۸)

دوسرا نقصان اس سے یہ ہوتا ہے کہ جب اس قسم کے پیشوں کی کثرت ہونے لگتی ہے تو لوگوں میں حرام خوری کا مادہ بڑھ جاتا ہے ان کے دلوں کی حالت خسیس ہو جاتی ہے اور اچھے اخلاق سے وہ منہ موڑنے لگ جاتے ہیں اور اس طرح ترقی کے بجائے معاشرہ زوال کی طرف جانے لگتا ہے۔

شاہ ولی اللہؒ نے ان پیشوں کا بھی تفصیلی جائزہ لیا ہے جن میں محنت کا تصور تو موجود رہتا ہے۔ لیکن یہ

محنت چندلوگوں کے لئے عیش وعشرت کا سامان فراہم کرنے کے لئے ہوتی ہے۔ اس سے عوام کی کوئی فائدہ نہیں پہنچتا فرماتے ہیں کہ:

معاشرے میں سے چندلوگوں کا ایک گروہ صرف اس کام میں لگ جاتا ہے کہ وہ رئیسوں کے لئے سونے، ہیرے جواہرات اور دوسری قیمتی دھاتوں کے زیور تیار کریں۔ ایک گروہ ان کے لئے نفیس اور اعلیٰ قسم کے نقش ونگار والے کپڑے تیار کرنے میں لگ جاتا ہے۔ کچھ لوگ بلند وبالا مکانات (کوٹھیاں) تیار کرنے اور ان میں نقش ونگار اور جدت پیدا کرنے کی اختراع میں مصروف ہوجاتے ہیں کچھ لوگ رئیس زادوں اور نوابوں کے لئے لڑکیوں کو ناچ اور گانا سکھانے کے پیشے کو اختیار کر لیتے ہیں اور انہیں سکھاتے ہیں کہ ان بڑے آدمیوں کا دل کیسے بہلایا جائے۔

کچھ لوگ اعلیٰ اور مرغن قسم کے کھانوں کے ماہر بن جاتے ہیں اور کچھ لوگ شراب کشی اور مجسمہ سازی کی صنعتوں سے وابسطہ ہوجاتے ہیں۔ چنانچہ ان پیشوں اور اس قسم کے دوسرے پیشوں میں صنعت وحرفت اور محنت کا تصور تو پایا جاتا ہے لیکن عوام کے لئے نہیں بلکہ دولت مند اور سرمایہ داروں کے لئے جہاں تک معیارِ زندگی اور تفریحات کا تعلق ہے تو یہ بات تو معاشرے کو اجتماعی طور پر منصوبہ بندی سے طے کرنا ہوگی کہ عوام کا معیار کس قدر بلند ہے اور ان کو کن پیشوں کی ضرورت ہے اور کن کی نہیں۔

شاہ صاحبؒ کا خیال یہ ہے کہ جب معاشرے کی اتنی بڑی آبادی ایسے پیشوں کو اپنا لے جن کی حقیقت میں (اجتماعی طور پر) ضرورت نہ ہو تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ زراعت بنیادی ضرورتوں کی صنعت اور تجارت میں لوگ گمراہ جاہیں گے اور ان پیشوں کی طرف زیادہ متوجہ ہوگے اس طرح زراعت وتجارت کے پیشے بری طرح متاثر ہونگے اس کا ایک بڑا نقصان یہ ہوگا جب امراء ان پیشوں پر زیادہ دولت خرچ کریں گے تو ٹیکس بڑھے گا اور بنیادی ضرورتوں کے پیشے ایک تو ویسے ہی کمزور ہوگے دوسرے ٹیکسوں کے بارے اور دب جائیں گے۔

۱) یہ زہر معاشرے میں گویا اس طرح پھیل جاتا جس طرح دیوانے کتے کے کاٹنے کا اثر انسان کے جسم میں پھیل جاتا ہے۔

۲) اس کے لئے ضروری ہے کہ بلاضرورت کے پیشوں کو فورا روکا جائے تاکہ لوگوں کی معاشی حالت بہتر ہو اور وہ خوشحال ہوں۔ (۹۹)

دولت کا استعمال:

دولت کے استعمال پر معاشرے میں پڑھے لکھے اور سمجھدار طبقے کو نظر رکھنا چاہئے اس لئے کہ دولت کی پیدائش کے لئے جب محنت ضروری چیز ہے۔ تو اس محنت کے بعد محنت کرنے والے زندگی کو خوشحال، بنانا بھی ضروری ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ کا خیال ہے کہ اگر ایسا نہ کیا گیا تو معاشرہ انصاف (عدل عمرانی) باقی نہیں رہے گا۔ آپ کی رائے میں معاشرے کو خوشحال بنانے کے لئے یہ ضروری ہے کہ لوگوں کی بنیادی ضرورتیں پوری ہوں اور ان کے رہنے سہنے کا ایک معیار ہو انسان کی بنیادی ضروریات کیا ہیں اگر یہ بنیادی ضرورتیں انسان کو نہیں ملتیں تو ان کی عملی زندگی پر اثر پڑ سکتا ہے اور یہ کہ ان کی ان بنیادی ضرورتوں کا کم از کم معیار کیا ہے؟ ان سب باتوں پر شاہ صاحبؒ نے جو روشنی ڈالی ہے اس کا مختصر جائزہ لیا جاتا ہے۔

بنیادی ضرورتیں

شاہ ولی اللہؒ اور احتیاجات اصلیہ:

زندہ رہنے کے لئے یوں تو انسان کو سینکڑوں اور جس قدر تمدن اور صنعت کی ترقی ہوتی ہے۔ انسان کی روزمرہ کی ضرورتیں بھی بڑھتی رہتی ہیں۔ لیکن ایسی ضرورتیں بھی ہیں جن کے بعد زندگی کی گاڑی چل ہی نہیں سکتی شاہ ولی اللہؒ نے ان ضروریات پر بحث کی ہے اور انہیں حاجات اصلیہ (صحیح معنوں میں زندگی کی ضروریات یا بنیادی ضرورتیں) کہا ہے۔

ان ضرورتوں کے پورا کرنے میں انسان اپنے ہم جنسوں میں برابر ہے یہ ضرورتیں چار ہیں :۔

۱) خوراک ۲) لباس ۳) مکان ۴) نکاح (جنس مخالف کی ضرورت)

شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ:

ان ضرورتوں کو جانور بھی پورا کرتے ہیں اور انسان بھی لیکن انسان ان ضرورتوں کو صرف اپنی حاجت پوری کرنے تک محدود نہیں رکھتا بلکہ ان میں عمدگی اور لطافت چاہتا ہے تاکہ اسے خوشی اور لذت حاصل ہو وہ لذیذ کھانے کھانا چاہتا ہے، عمدہ لباس پہننا پسند کرتا ہے اچھے مکان میں رہنے کی خواہش کرتا ہے اور خوبصورت اور حسین بیوی کے ساتھ زندگی کے دن گزارنے کا آرزومند ہوتا ہے۔

یہ زندگی کی وہ بنیادی ضرورتیں ہیں جن میں اگر کوئی ایک بھی ختم ہو جائے یا اس میں کمی واقع ہو جائے تو انسان کے معاشرے میں توازن باقی نہیں رہے گا۔

شاہ صاحبؒ کے نزدیک خدا کا حکم یہ ہے کہ.

انسانوں میں سے کوئی شخص بھی اس چیز سے جس کو تمدن میں داخل ہے بغیر حاجت ضروری کے خالی نہ رہے۔ (۱۰۰)

بنیادی ضرروتوں کا اعمال پر اثر:

شاہ ولی اللہؒ بنیادی ضرورتوں کو بہت اہمیت دیتے ہیں کیونکہ ان ضرورتوں میں اگر توازن برقرار نہ رہے یا معاشرے میں یہ ضرورتیں آسانی سے پوری نہ ہوں تو انسان کے اعمال اس سے بہت متاثر ہوتے ہیں۔ ان میں پہلی ضرورت 'خوراک' ہی کو لے لیجیے۔ انسان کو اگر اچھی طرح پیٹ بھر کر روٹی نہ ملے تو اس کا دل اور دماغ الجھن میں مبتلا ہو جائے گا۔ اس کو طرح طرح کے خیال ستائیں کے اس کا دماغ شیطان کی

آماجگاہ بن جائیگا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ حیوانیت (حیوانی فطرت) اختیار کرے گا اور جو صورت بھی پیش آئے وہ روئی حاصل کرے گا اس صورت میں اسکے سامنے نہ قانون ہوگا نہ معاشرتی ترقی (ارتفاق) کا خیال اسکے برعکس اگر کسی شخص کو صرف مرغن غذا کھانے کو ملے تو اس کا ذھن بھی اس سے متاثر ہوگا کیونکہ بعض اوقات انسان ایسی مرغن غذائیں کھاتا ہے جو اسکی جنسی قوت کو تیز کرتی ہے جس سے اس میں عورتوں کی طرف میلان کے خیالات تیز ہو جاتے ہیں اور پھر یہی خیالات اسکو بہت سی باتیں کرنے پر آمادہ کر دیتے ہیں بعض اوقات وہ ایسی چیزیں کھاتا ہے جس سے اس کا دل سخت ہو جاتا ہے اس سے اس کے نفس میں غصہ پیدا ہوتا ہے۔(۱۰۱)

اور اکثر اوقات خوراک اس کو اچھے یا برے کام پر آمادہ کر دیتی یہی حال لباس کا ہے اگر لباس بوسیدہ اور پھٹا ہوا ہے تو انسان کے ذہن کی کیفیت کچھ اور ہوگی اور اگر صاف وستھرا اور دھلا ہوا ہے تو اس کی نفسیاتی حالت کا انداز مختلف ہوگا۔ اور اگر اس نے زرق برق اور عمدہ پرتکلف لباس پہن رکھا ہو تو لازمی طور پر اس پر مختلف ذہنی کیفیت طاری ہوگی۔

چنانچہ شاہ صاحبؒ کے نزدیک لباس کی ضرورت میں مختلف قسم کا فرق انسان کو احساسِ کمتری میں بھی مبتلا کرسکتا ہے یہی صورت مکان کی بھی ہے مکان اگر صاف ستھرا کشادہ ہوادار، اچھے ماحول میں ہے تو اس کا ذھن پر بھی اچھا اثر پڑے گا لیکن اگر وہ بدبودار جگہ پر ہے، تنگ ہے اور برے ماحول میں ہے تو ذھن پر اس کے اثرات لازمی طور پر پڑیں گے یہی حال جنسی ضرورت کا ہے دماغ کی اکثر الجھنیں اسی جنس کے مسئلہ سے پیدا ہوتی ہیں اور یہ درست انداز سے حل ہوں تو پھر اس سے سکون بھی ملتا ہے اور دلی خوشی بھی۔

شاہ صاحبؒ نے مختلف جگہوں پر جہاں بھی ان بنیادی ضرورتوں کا ذکر کیا ہے یا ثابت کرنا چاہے کہ انسان کی خوراک، اس کے لباس، مکان اور جنسی جذبات کا اس کے ذہن پر اچھا یا برا اثر پڑتا ہے اس اثر سے اس انسانی کی نفسیات وجود میں آتی ہے اس ذہنی نفسیات کی بدولت وہ اچھے یا برے عمل کرتا ہے۔ چنانچہ انسان کے اعمال کا دارومدار اس کی نفسیات پر ہے اور نفسیات کا دارومدار اس کی بنیادی ضروتوں کے اچھے یا برے

طریقے پر پورا ہونے سے ہے اسلئے شاہ ولی اللہؒ اس بات پر بے انتہا زور دیتے ہیں کہ انسان کی بنیادی ضرورتیں بہتر طور پر پوری ہونا لازمی ہیں۔

ان بنیادی ضرورتوں پر انسان کو ہمیشہ نظر رکھنا پڑے گی تاکہ جب بھی دائی، الکلی (عام فائدہ) کے لئے انہیں کمی یا زیادتی کرنا پڑے تو فوراً ان کی طرف توجہ دی جاسکے اس کمی یا زیادتی کا اندازہ انسان کے معیارِ زندگی سے لگایا جاسکتا ہے۔(۱۰۲)

پیشوں کی تخصیص کی ضرورت:

موجودہ انسانی سوسائٹی پر نظر ڈالنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انسان اپنی معاش مختلف پیشوں کے ذریعے سے پوری کرتا ہے۔

اس کا سبب امام ولی اللہؒ یہ قرار دیتے ہیں کہ یہ ارتفاقات کی دوسری منزل میں انسان کی ضرورتیں اتنی بڑھ گئی کہ اب سب کا فراہم کرنا ایک شخص تو کا ایک خاندان کے بھی بس میں نہ رہا۔ لامحالہ دوسرے خاندانوں کے مدد کی ضرورت بڑھی۔ مثلاً شروع شروع میں انسان اپنے اور اپنے خاندان کی ضرورت کے مطابق بیج بوتا تھا اور جب فصل پک جاتی تو کاٹ کر کام میں لاتا تھا۔ یہ ارتفاق طبعی (Natural Economy) کی منزل تھی، جس میں اشیاء مبادلے (Exchange) کے لئے پید نہیں کی جاتی۔

رفتہ رفتہ پیداوار بڑھانے کے طریقے ایجاد ہو گئے اور مبادلے (Exchange) کے ئے پیداوار ہونے لگی۔ اس تجارتی پیداوار (Commodity Economy) کہتے ہیں۔ اب کاشتکاری کے لئے انسانی مشقت (Humain Labour) کے بجائے حیوانی مشقت (Animal Labour) کی ضرورت پڑی جس کیلئے حیوانوں کو قابو میں لا کر پرورش کرنے کی حاجت ہوئی اس کے علاوہ اچھی کاشتکاری کیلئے نجاری اور حدادی کی ضرورت پڑی اور ظاہر ہے کہ کسی کام میں حسن پیدا کرنے کیلئے اسے بار بار کرنے پڑتا ہے اور اس کے متعلق بہت سی معلومات جمع کرنی ہوتی ہیں اور اس طرح اس کام میں تخصیص

(Specialiation) پیدا کی جاتی ہے مگر ایک انسان کی ایک خاندان بھی یہ سب کام بطریق احسن سرانجام نہیں دے سکتا ایسے ہی اچھا کھانا تیار کرنے کیلئے انسان کو فنِ طباخی (Cookery) اور اچھا لباس تیار کرنے کیلئے فنِ خیاطی کی حاجت ہے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ ایک خاندان والے بڑی کوشش کریں گے کہ تو زیادہ سے زیادہ ارتفاقِ اوّل کی چیزیں پیدا کرسکیں گے۔

پیشہ اختیار کرنے کا اصول:

سوسائٹی میں رہتے ہوئے انسان کو کوئی نہ کوئی پیشہ تو اختیار کرنا پڑتا ہی ہے مگر سوال پیدا ہوتا ہے کہ انسان کیسا پیشہ اختیار کرے اس کا جواب حضرت امام ولی اللہ یہ دیتے ہیں کہ پیشہ وہ اختیار کرے جو انسان کی حاجتیں پوری کرے۔

اس کی تشریح کرتے ہوئے ایک جگہ لکھتے ہیں کہ:

> ''ایک شخص کو بھوک زیادہ لگتی ہے مگر وہ کسب ایسا اختیار کرتا ہے جو اس کی حاجتیں پوری نہیں کرتا وہ ضرور بھیک مانگنے اور ذلیل کام کرنے کی طرف مائل ہو جائیگا بعض لوگ یوں تو قوی ہوتے ہیں لیکن زیادہ کماتے نہیں وہ زنا اور بدکاری کی طرف رجوع کرتے ہیں''

پیشوں کی تقسیم اور حکومت:

معاشرہ میں جب معاملات کی کثرت ہوتی ہے اور ضرورتیں بڑھ جاتی ہیں تو جیسے کہ اوپر لکھا جا چکا ہے کہ ایک آدمی یا خاندان اپنی ساری کی ساری ضرورتیں اچھی طرح پوری نہیں کرسکتا لامحالہ ضروری ہوتا ہے کہ بعض لوگ بعض پیشوں کو مخصوص طور پر اختیار کرکے انمیں مہارت پیدا کرلیں تاکہ اچھے سے اچھا کام ہوسکے لیکن اگر ان پیشوں کو کسی کنٹرول میں نہ رکھا جائے تو اس سے معاشرہ انسانی کو بہت نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔

۱) اگر اکثریت ایک پیشہ یا کسب اختیار کر لے تو دوسرے پیشوں کی ضرورتیں پوری نہیں ہوسکیں گی مثلاً اکثر لوگ صنعت و حرفت میں لگ جائیں یا سرکاری دفتروں میں کلرکی کے پیچھے پڑ جائیں تو مویشیوں کی پرورش اور کاشتکاری کرنے والوں کی تعداد گھٹ جائے گی۔ پیشوں کے اس عدمِ توازن سے سوسائٹی کی اجتماعی زندگی برباد ہو جائے گی۔

۲) بعض لوگ ایسے پیشے اختیار کر لیتے ہیں یا ایسی اشیاء کی صنعت شروع کر دیتے ہیں جس سے سوسائٹی پر برا اثر پڑتا ہے مثلاً فحش، برہنہ دستاویز یا مجسموں کی ساخت کی فروخت یا ایسی مخرب اخلاق کتابوں کی اشاعت یا دل آزار لٹریچر پیدا کرنا ان حالات کے انسداد کیلئے ضروری ہے کہ حکومت پیشوں اور پیشہ وروں پر اور انکی صنعت پر اس طرح سائنٹیفک طریق سے ضبط قائم کرے کہ سوسائٹی کی حالت خراب نہ ہونے پائے۔ (۱۰۳)

ممنوع چیزیں:

عام سوسائٹی کے لئے مفید قانون میں جن اصولی چیزوں کی خرید و فرخت کی ممانعت ہونی چاہئے وہ بقول حضرت امام حسبِ ذیل ہیں:

۱) وہ چیزیں جو سوسائٹی کے عام اخلاق کو برباد کرنے والے ہوں ان میں تو بعض چیزیں ایسی ہیں جو براہ راست اخلاقِ عامہ کو برباد کرتے ہیں انکی خرید و فروخت سے بداخلاقی اور سیاہ کاری کی براہ راست ترویج اور اشاعت ہوتی ہے جیسے شراب ایسی ہی بداخلاقی اور بدکاری میں مدد دینے والی چیزیں بھی ممنوع ہیں مثلاً مغنیہ کا پیشہ۔

۲) گندی اور سڑی ہوئی چیزیں جن سے نہ صرف انسان حسِ پاکیزہ مزاجی کو تکلیف پہنچی ہے بلکہ صحت کیلئے بھی مضر ہے۔

۳) ایسے معاملات جو نزاع (Lihgation) کا موجب ہوں۔ مثلاً قیمت اور مال کا متعین نہ ہونا یا پیمانے کے معین نہ ہونا یا بیع در بیع۔ مثلاً خریدار فروخت کنندہ سے کسی چیز کے خریدتے وقت یہ قید لگا دے

کہ میں یہ چیز تم سے اس رقم میں اس شرط پر خرید تا ہوں کہ تم مجھ سے اتنی رقم میں فلاں چیز خرید و یا بن وہ کھائے مال بیچنا یا خرید وفروخت میں ایسی شرط آجائے جو آگے چل کر جھگڑے کا سبب بنے یا کچے پھل بیچنا یا غیر مقبوضہ چیز کی فروخت۔غرض خرید وفروخت میں معاملہ بالکل صاف، واضح اور بین ہونا چاہئے اور کسی قسم کی پوشیدگی، ابہام اور لاعلمی نہیں ہونی چاہئے لیکن عدم تعین کو مبالغہ کی حد تک نہیں پہنچایا جا سکتا۔عدم تعین صرف وہ مظہر ہے جو موجبِ نزاع بن سکے۔

۴) خرید وفروخت میں مسابقت بھی نقصان رساں ہوتی ہے اس لئے ایک شخص کی بیع میں دخل دینا یا بولی پر بولی دینا یا دوسروں کو خریداری سے روکنے کے لئے بولی بڑھانا ناجائز ہے اور نہ تمدن کے لئے یہ مفید ہے کہ شہری آدمی، دیہاتی کا دلال بنے۔

اس کا ایک نقصان تو یہ ہے کہ دیہاتی لوگ زیادہ نفع کے لالچ میں دلالوں کے پھندے میں پھنس کر خراب ہوتے ہیں۔

دوسرے اس سے اہل شہر کو یہ نقصان پہنچتا ہے کہ دلال مال روک رکھتے ہیں۔اور گراں کر کے بیچتے ہیں۔پس یہ بہتر ہے کہ دیہاتی لوگ بار بار تھوڑا تھوڑا مال لے کر آئیں اور مناسب قیمت پر بیچیں۔

۵) ایسے طریق سے نفع اندوزی (Protneering) جس سے سوسائٹی کے اکثر افراد کو تکلیف پہنچے ممنوع ہیں۔مثلاً احتکار (Hoarding) یعنی زیادہ نفع کمانے کی خاطر غلے وغیرہ کو روکے رکھنا۔

۶) دھوکہ دے کر نفع حاصل کرنا بھی جائز قرار نہیں دیا جا سکتا۔مثلاً مال کا عیب چھپانا یا مال کو حقیقت سے زیادہ اچھا ظاہر کرنا اور مصنوعی طور پر چمک دمک دکھا کر قیمت بٹورنا یا اچھی چیز میں اسے جنس کی ادلیٰ درجے کی چیز ملا کر بیچنا (Adulteration)۔

۷۔ ایسی چیزوں کی بیع بھی ممنوع ہیں۔جو خدا تعالیٰ نے سب انسانوں کے لئے پیدا کی ہیں۔مثلاً قدرتی طور پر بہتا پانی، ایسے پانی کو روک کر بیچنا ناجائز ہے۔

لین دین:

حکمتِ تعاملیہ یا لین دین کے موضوع پر بحث کرتے ہوئے حضرت امام ولی اللہ فرماتے ہیں کہ جب اس شخص نے کسی خاص پیشے میں امتیاز یا تخصیص (Specialisotion) پیدا کر لی، تو معلوم ہوا کہ ایک ہوا کہ ایک ہی کام اس کی ضرتیں پوری نہیں کرتا۔ بعض اوقات اشیاء مفت دینے کی ضرورت پڑی۔ تا کہ لوگوں کی الفت حاصل کی جائے کہ یہ بھی بجائے خود ایک ضرورت ہے۔ کیونکہ اس کے ذریعے سے ضروریات انسانی اور امداد باہمی حاصل ہوتی ہے۔ ایسے ہی بعض اوقات اظہار یا رسم کی وجہ سے روپیہ خرچ کرنے کی ضرورت پڑی تا کہ ارتفاق پایہ تکمیل کو پہنچے پس عنایتِ الٰہی نے انسان کی مبادلے کی طرف رہنمائی کی ہے۔

مبادلے کی شکلیں:

مبادلے کی کئی شکلیں ہیں:۔

۱) بیع: اس میں مال (Goods) کا مبادلہ مال کے ساتھ کیا جاتا ہے۔

۲) ھبہ: اس سے مراد یہ ہے کہ دنیاوی یا آخروی نفع کی امید پر کوئی چیز بلا معاوضہ کسی کو دے دینا۔

۳) اعارۃ: اس میں اعارۃ اور بیع دونوں کی صفتیں پائی جاتی ہیں۔ البتہ اس میں کبھی بیع کے معنی غالب ہوتے ہیں۔ جیسے بیع سلم میں جس میں نقد روپیہ لے کر جنس بعد میں دیر سے دی جاتی ہے اور کبھی عارہ کے معنی غالب ہوتے ہیں۔ جیسے روپے پیسے کا قرض ہے۔ جس میں نقد دے کر اس کے منافع کا عوض نہیں لیا جاتا۔

مبادلے کا اصول:

اس ارتفاق کو معاشرۂ انسانی کے واسطے مفید بننے کے لئے ضروری ہے کہ جس چیز کی خرید و فروخت کی جائے اس کی قیمت، اجرت اور منفعت کے متعلق ہر بات صاف صاف طے کر لی جائے اور ہر فریب دھوکے سے بچے۔ یعنی ایسی چیز نہ لے بیٹھے جو اس کی حاجت پوری نہ کرتی ہو۔

مبادلے میں یہ بھی ضروری ہوتا ہے کہ فریقین سودے کے متعلق ایجاب وقبول کر دیں یا نقدا نقد سودا ہو تا کہ مبادلے میں جانے کی رضامندی کا اظہار ہو جائے نیز یہ بھی لازم ہے کی چیز پر اس مجلس ہی میں غور کر لیا جائے اور اگر لوٹانی ہو تو الگ ہونے سے پہلے لوٹا دی جائے۔ لین دین میں بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ کوئی شخص لینے یا دینے کا وعدہ کر کے مکر جاتا ہے۔ یا انکار کر دیتا ہے۔ قدرت نے انسان کے دل میں یہ بات ڈالی ہے کہ اگر لین دین نقدا نقد نہ ہو تو اسے ضبط تحریر میں لایا جائے۔ جس پر باقاعدہ شہادت ہو۔ قمار بازی اور سودی کاروبار دونوں انسانی معاشرے کے لئے ویسے ہی غیر طبعی ہیں۔ جیسے انسان کی طبعی غذاؤں کے مقابلے میں شراب نوشی اس سلسلے میں مقدار کی کمی بیشی کا سوال بالکل غیر مناسب ہے۔

جس طرح مسکرات میں سے کسی چیز کا استعمال تھوڑی سی مقدار سے بڑھتے بڑھتے بہت بڑی مقدار میں پہنچ جاتا ہے وہی صورت قمار بازی اور سود میں پیش آتی ہے۔ یعنی انسان تھوڑا سود لینا شروع کر دے تو رفتہ رفتہ زیادہ مقدار میں پہنچ جاتا ہے ایسے ہی قمار بازی معمولی حالت میں شروع کی جائے تو آہستہ آہستہ اس کا دائرہ پھیلتا جاتا ہے اس لئے سؤد اور قماری بازی دونوں سوسائٹی سے قطعاً نکال دینا ضروری ہے۔

امدادِ باہمی

معاشرہ انسانی میں رہنے والے ہر ایک انسان کا حق ہے کہ وہ بھوکا نہ سوئے اس کے کھانے پینے کپڑے لتے، مکان، صحت اور تعلیم عام ضرورتیں پوری ہوں لیکن اس حق کے پورا ہونے کے بعد دیکھا جاتا کہ تمام افراد مشین میں بنے ہوئے پرزوں کی طرح یکساں نہیں ہوتے بلکہ قابلیت، اہلیت اور اخلاق وعادات میں فرق ہوتا ہے چنانچہ بعض تیز فہم ہوتے ہیں بعض نسبتاً کند ذہن، بعض کا رجحانِ طبع ایک پیشے کی طرف ہوتا کہ اور بعض کا دوسرے کی طرف یہ فرق مراتب واختلاف رجحان انسان کے لئے طبعی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض لوگ زیادہ کما سکتے ہیں بعض کم۔ زیادہ کمانے والوں کا طبعی فرض یہ ہے کہ اپنے کم قیمت ہم جنس افراد کی کم سے کم طبعی ضرورتوں کا خیال رکھیں ورنہ نظام معاشرہ بگڑ سکتا ہے۔

تعاون کی ضرورت:

اس فرقِ مراتب کی وجہ سے معاش میں خلل پڑ سکتا ہے۔ اس لئے تعاون کی ضرورت۔ مثلاً ایک آدمی کے پاس کچھ زمین ہے جسے وہ خود کاشت نہیں کرسکتا۔ لامحالہ وہ ایسے آدمی کا تعاون حاصل کرسکتا ہے۔ بیل اور بیج سے کام لے کر اس زمین میں کاشت کرے ایسے ہی ایک شخص کو اپنے حق کے استقرار کے لئے دوسرے آدمی کی ضرورت ہے۔ جو اس کے حق کی خاطر جھگڑے اسے اسے وکیل مقرر کرنا پڑتا ہے۔ یا کسی آدمی کو کفالت پر کام دینے کی ضرورت پڑتی ہے۔

تعاون کی صورتیں:

ظاہر ہے کہ سوسائٹی کا نظام محض انفرادی کوششوں سے نہیں چل سکتا ترقی دینے کے لئے آپس میں اشتراک عمل اور تعاون سے کام لینا انسان کا فطری تقاضا ہے۔ ارتقاقاتِ انسانی کی ترقی تو موجوب ہی تعاون واشتراک پر ہے۔ کاروبار (Business) میں بھی تعاون واشتراک نہایت مفید نتائج پیدا کرتا ہے اس سلسلے میں حضرتِ امام بعض مندرجہ ذیل صورتیں بیان کرتے ہیں۔

۱) **مضاربت:** اس میں ایک شخص کا مال ہوتا ہے۔ اور دوسرا اس سے تجارت کرتا ہے اور نفع آپس میں تقسیم کرلیتے ہیں۔

۲) **مفاوضت:** اس میں چند آدمی برابر کا مال شریک تجارت کر کے مشترکہ طور پر خرید وفروخت کرتے ہیں اور نفع آپس میں بانٹ لیتے ہیں اور یہ ایک دوسرے کے وکیل اور کفیل ہوتے ہیں۔

۳) **عنان:** یہ کہ معین مال میں شریک ہوکر کاروبار کیا جائے۔ مگر کوئی شخص دوسرے کا کفیل نہ ہو جس سے وہ آپس میں ایک دوسرے سے مطالبہ کرسکیں۔

۴) **شرکت صنائع:** (Guildism) اس میں ایک پیشے کے لوگ مل کر محنت کرتے ہیں اور اجرت آپس میں تقسیم کرلیتے ہیں۔ ان سب میں یہ شرط ہے کہ آپس میں جھگڑے کی کوئی شکل پیدا نہ ہوسکے۔

۵) مزارات: حضرت امام الہند کاروباری معاونت کی ایک اور شکل مزار بھی لکھتے ہیں۔ جس میں ایک شخص کی زمین ہوتی ہے اور دوسرے کی اور آلات کشاورزی امام ابوحنیفہؒ مخالف ہیں:

اسلامی انقلاب سے پہلے عرب میں عام طور پر مزارعت کا رواج پایا جاتا تھا۔ لیکن عدلِ اسلامی قائم ہونے کے ابتدائی دور میں مزارعت کو ناپسندہ کیا گیا اور جو لوگ مزارعت کرتے تھے، انہوں نے اس بناء پر ترک کر دیا کہ حضرت محمد ﷺ نے منع فرما دیا تھا۔ بعد کے زمانے میں جب ارتجاع (Reaction) شروع ہوگیا۔ بعض بڑے بڑے لوگ مزارعت پر عمل پیرا ہونے لگ گئے۔

لیکن فنِ قانون سازی، فقہ کے بہترین ماہر حضرت امام ابوحنیفہؒ نے جن کی قانونی تفریعات (Bye laws) صدیوں اسلامی حکومتوں میں زیرِ عمل رہیں۔ مزارعت کو جھگڑوں کی بنیاد پر کر خلافتِ قانون قرار دیا حضرت امام ابوحنیفہؒ کی دور اندیشی قابل داد ہے کہ مزارعت کے نقصانات، جس میں آگے چل کر جاگیرداروں کی شکل اختیار کر لی اتنی جلدی بھانپ لئے۔

تاریخ شاہد ہے کہ چھٹی صدی ہجری میں مزارعت اور جاگیرداری کی وجہ سے کاشت کاروں کا حال برا ہوگیا تھا کہ ایک فاضل مصنف ابن تیین کو لکھنا پڑا کہ

''ان المشاهدة الآن اكثر الظلم انماهو علي''

ترجمہ: یعنی ہمارا مشاہدہ ہے کہ سب سے زیادہ مظلوم طبقہ کاشتکاروں کا ہے (۱۰۴)

حضرت امام الہندؒ کا فیصلہ:

حضرت امام الہند شاہ ولی اللہ دہلویؒ کا رجحان بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی اسے جھگڑوں کی بنیاد تسلیم کرتے ہیں۔ اور اسلامی انقلاب کے دورِ اول میں جن لوگوں نے مزارعت کو ناجائز قرار دیا تھا، ان کے فعل کا سبب انہی مناقشات (جھگڑوں) کو قرار دیتے ہیں۔ جو مزارعت میں ضمنی طور پر پیدا ہو جاتے ہیں اور تعاون صرف ان صورتوں کو جائز قرار دیتے ہیں، جن میں جھگڑے پیدا نہ ہوں۔

چنانچہ فرماتے ہیں:۔

فاصل التسبب حیازة الاموال المباحة واستنماء ما اختص بھہ بما یستمد من الاموال المباحة کالتناسل بالرعی والزراعة باصلاح الارض وسقی الماء ویشترط فی ذلک ان لا یضیق بعضھم علی بعضٍ بحیث یفضی الیٰ فساد التمدن. (۱۰۵)

''یعنی معاشی وسائل کو وسیلہ کار بنانے کے لئے بنیادی اصول یہ ہے کی جائز قبضے میں دیا جائے اور اس کو اس طرح ترقی دی جائے جس طرح ترقی دینا جائز ہے۔ مثلاً مویشیوں کی افزائشِ نسل، آب پاشی اور اصلاحِ زمین کے ذریعے زراعت کرنا لیکن اس باہم تعاون سے معاشی وسائل حاصل کرنے کی شرط لازم یہ ہے کہ یہ قبضہ اور یہ حصولِ ترقی معاشرۂ انسانی میں ایک دوسرے کی معاشی زندگی کی تنگی کا یہ باعث نہ بن جائے تاکہ ایسا نہ ہو کہ تمدن پر فساد پیدا ہو جائے''



بابِ چہارم

فصل ششم

معاشیات کے جدید نظریئے:

معاشیات پر جس نظر سے بحث کیا جانا ممکن ہے وہ تین ہیں ''مابعد الطبیعاتی علمی نقطہ ءنظر''، طبیعاتی علمی نقطہ ءنظر'' اور ''تمدنی نقطہ ءنظر'' اور علماءِ معاشیات ان کو حسب ترتیب، معیاری نقطہ ءنظر، ترتیبی نقطہ ءنظر اور انہامی نقطہ ءنظر سے تعبیر کرتے ہیں ''معاشیات معیاری'' کہتے ہیں۔

''معاشیاتِ معیاری کا مقصد معیشت موجودہ کی تشریح اور توجیہ نہیں بلکہ ''معیشتِ صحیحہ'' کا پتہ چلانا ہے وہ محض یہ معلوم کرنے پر قانع نہیں کہ معاشی کل کے پُرزے کیسے کام کرتے ہیں بلکہ وہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ معاشی کل ہونی کیسی چاہیئے؟ معاشیاتِ معیاری کا مطمعِ نظر بہت بلند ہے وہ تو مقاصدِ معاشی کی تعین کرنا چاہتی ہے اور اس تعیین مقاصد کو وہ ''علم'' کا کام بتاتی ہے وہ ان ازلی اور ابدی قوانین کے انکشاف کو اپنا فریضہ عملی جانتی ہے جو سارے عالم اخلاقی میں رائج ہیں اور جن کے زیرِ فرمان معیشتِ انسانیت کا علاقہ بھی ہے۔

ان کا مقصدِ تلاش اور مطلوبِ جستجو ''معیشتِ صحیحہ'' ہے یعنی وہ معیشت جو مقصدِ حیاتِ انسانی اور مقصدِ کائنات کے مطابق اور ان سے ہم آہنگ ہو۔ یہی معیشت صحیح و صالحہ ان معیاریوں کا مرکزی تصور ہے جس سے دوسرے تمام مسائل مثلاً ''مناسب اُجرت''، ''مناسب اور صحیح قیمت''، ''مناسب اور صحیح تقسیم دولت''، ''سود کا جواز وعدم جواز'' خود بخود طے ہو جاتے ہیں ان کے نظام میں قدرِ اعلیٰ ''معیشت صحیحہ'' ہے۔ باقی سب اس سے ادنیٰ اور اس کے ماتحت قدریں ہیں معاشیات کا کام یہ ہے کہ اس قدرِ اعلیٰ کا پتہ چلاتا ہے، ماتحت قدروں کی اس سے مناسب ومطابق تشکیلات کو معلوم کرے اور جو معاشی ادارے واقعی موجود ہیں ان کو اس معیار پر رکھ کر اُن کے کھرے کھوٹے، صحیح یا غلط ہونے کا فیصلہ کرے۔

''ترتیبی معاشیات''علمِ طبیعات کی ایک شاخ ہے جو علوم طبیعی کی اساس و بُنیاد پر اپنی عمارات استوار کرتی ہے مگر عملی زندگی میں اس کی قدر و اہمیت کے اعتراف کے باوجود اُس کا سنگِ بُنیاد کیا ہے۔

''ان تینوں گروہوں (معروضیے، موضوعیے، ریاضیاتی) میں مشترک یہ ہے کہ سب کے سب فلسفہ کے مقابلے میں ''علم'' کے حامی ہیں یعنی جو کچھ ہے اس سے بحث کرنا چاہتے ہیں جو ہونا چاہئے اس سے سروکار نہیں رکھتے تمام ما فوق التجربہ اور مابعد الطبیعی عناصر سے اپنے علم کو پاک اور صاف رکھنا چاہتے ہیں اور معاشیات میں اخلاقی احکام کے سختی سے مخالف ہیں ان سب کے نزدیک علومِ طبیعی زیادہ مکمل علوم ہیں انہیں سے تمام دوسرے علوم میں خصوصا معاشیات میں نمونہ کا کام لینا چاہیئے لہٰذا ترتیبی معاشیات کا مقصد یہ ہے کہ ''قوانین مرتب کرے تاکہ ہر منفرد مظہر معاشی کو کسی قانون کے تحت میں بہ حیثیت ایک مخصوص دفعہ کے لایا جاسکے یہی ان کی نزدیک نظرِ علم کی کُل کائنات ہے۔ (۱۰۶)

علم المعیشت کے مشاہیر علماءِ یورپ اسی نظریئے کے حامی ہیں مثلاً جان اسٹارٹ مل (John Stwat mil) کارل منگر (Carl minger) کارل مارکس (Car Marx) پرٹیو (Parito) وغیرہ۔

''افہامی معاشیات'' کو علم تمدّن کا ایک جزء سمجھنا چاہیئے اور تمدن سے بھی وہ تمدّن مُراد ہے جو انسان ہی کا تمام ساختہ پرداختہ ہے اس لیے کہ افہام کی بنیاد و اساس اس اصول پر قائم ہے کہ ہم جنس ہی کے لئے ہم جنس کا سمجھنا ممکن ہے چنانچہ اس کی تعبیریوں کی جاتی ہے:۔

''افہام کا یہ نظریہء علم اُن بُنیادی افکار پر مبنی ہے کہ ہم جنس کا علم یعنی ہم جنس کا سمجھنا ہم جنس ہی کے لئے ممکن ہے اور یہ کہ ہم پُورے طور اور ہر پہلو سے اس چیز کو جان سکتے، سمجھ سکتے ہیں جسے ہم خود بنا بھی سکیں مظاہر تمدن کے فہم کی کوشش میں چونکہ مدرک بھی ذہنی ہے اور مدرک بھی تشکیل ذہنی، اس لئے دونوں ہم جنس ہیں اور اس لئے پُورا علم ممکن ہے پھر سارا تمدن آدمی کا ساختہ پرداختہ ہے، اسی نے اُسے بنایا ہے اس لئے یہ اُسے سمجھ

سکتا ہے قدرت چونکہ ذہن انسانی کی خارجی شکل نہیں ہے بلکہ امرِ الٰہی کی خارجی تشکیل ہے قدرت انسان کی ساختہ پرداختہ بھی نہیں اس لیے قدرت کا سمجھنا، قدرت کا پورا پورا حقیقی علم ذہن انسانی کے لئے ممکن نہیں ہے۔ لیکن معاشیات افہامی چنکہ صرف تمدّن کے ایک ٹکڑے کو سمجھنا چاہتی ہے متمدّن زندگی یا انسانی زندگی کے مقصد ومنشاءِ مضمر کا پتہ چلانا نہیں چاہتی، اسی لیے افہامی معاشیات فلسفہ یا مابعد الطبیعات یا مذہب نہیں بلکہ سیدھا سادہ تجربی، جماعتی، تمدّنی علم ہے۔ (۱۰۷)

یہ علم المعیشت کے وہ نظریئے جو موجودہ دَور میں اس تمدّنی علم کے مایۂ ناز سمجھے جاتے اور اس کو ایک علم وفن کی حیثیت بخشتے ہیں۔

اسلامی نظریۂ معاشی اور جدید نظریئے:

لیکن اسلامی ''نظامِ معیشت'' کی حدود ان نظریوں سے زیادہ وسیع اور اس کی پروازِ فکر سے اُن سے کہیں زیادہ بلند ہے۔

''اپنے معیاری نقطہءنظر میں اُن تمام افکار کا بھی حامل ہے جن کا ذکر ''مقالہ'' میں موجود ہے اور اُن سے وسیع تر افکار کو اپنی آغوش میں لیے ہوئے ہے اسی طرح وہ افہامی نقطہءنظر سے بہت زیادہ دقیع اور بہت زیادہ نافع نظامِ عمل کا بانی اور مؤسس ہے مثلاً جبکہ ''معیاری معاشیات'' کا اسی تصور ''معیشت صالحہ'' کا تصور ہے تو گزشتہ سطور میں اسلامی نظامِ معاش میں ''معیشت صالحہ'' کی جو تشریح کی گئی ہے کیا اس سے بڑھ کر معیشت کے صالح ہونے کا تصور کسی بھی معاشی نظام میں موجود ہے اور کسی معاشی نظام کا نظریہءفکر اس معراج اور رفعت پر پہنچا ہے کہ وہ ''معاشی نظام'' کی غرض وغایت صرف رفع حاجات واحتیاجات کے وسائل کی درمیانی خلیج کو پر کرنا ہی قرار نہ دیتا ہو بلکہ اس کو ذریعہ بنتا ہو۔ اقوام کی باہمی اخوت وہمدردی اور مساوات ومواسات کا اور وسیلہ قرار دیتا ہو، اخلاقی رفعت اور ابدی سعادت کے حصول اور جبکہ ''افہامی معاشیات'' کا نقطہءنظر، نظر اور فکر کی جگہ موجودہ عملی معاشیات کا محور مرکز ہے اور تمدّن کے اس شعبہ کو جماعتی، تمدنی اور

تجرباتی حیثیت سے بروئے کار لاتا ہے تو آئندہ صفحات اس امر کی شہادت دیں گے کہ تمدن کے اس ٹکڑے کو جس طرح اسلامی ''علم المعیشت'' نے سلجھایا اور اس کو طبقاتی جنگ اور سرمایہ داری کے غلبہ دونوں سے جدا کرکے جس طرح عملی کسوٹی پر کسا اور تجرباتی خراد پر اُتارا اس سے بہتر اس آسمان کے نیچے اور زمین کے اوپر دوسرا کوئی نظام عمل نظر نہیں آتا رہا۔

''ترتیبی معاشیات کا نظریہ'' تو وہ اپنی فلسفیانہ اور طبیعاتی نقطہء نظر کے اعتبار سے اسلامی نظریہء معاشیات سے بالکل جدا بلکہ متضاد ہے البتہ اس کے باوجود بھی اس کے چند جزوی پہلو جو اس نظریہ کی پابندی سے الگ خود اپنی جگہ مُستقل ہونے کی حیثیت سے اپنے اندر بعض خُوبیاں رکھتے ہیں سو داسلام کا نظام معاشی ان خوبیوں سے بھی خالی نہیں ہے۔

مثلاً جبکہ معاشی نقطہء نظر میں سب سے پہلا معاملہ ان عمال سے وابستہ ہے جو رفع حاجات کے وسائل کی درمیانی خلیج کو پاٹتے ہیں تو خواہ کسی اسلوب سے بھی ہوں ان اعمال میں نقص وکمال اور تنزل وترقی کا ہونا لازمی ہے اور یہی سبب بن جاتا ہے ایک ایسے فلسفہ کا جو ترتیبی درجات پر بحث کرتا اور ان کے نقص وکمال کو واضح کرتا ہے اور یہ اسلامی معاشیات میں اگرچہ کوئی خاص فن کی حیثیت نہیں رکھتا تاہم حضرت شاہ ولی اللہ نے اس پر سیرَ حاصل بحث کرتے ہوئے اس کو ''ارتفاقات'' کے ساتھ تعبیر کیا ہے اور اس کے مختلف درجات قائم کئے ہیں اور ان کو عملی معاشی نظام، تدبیرِ منزل سیاست وغیرہ کے لئے ذریعہ اور وسیلہ کی حیثیت دی ہے۔

پس موجودہ علم المعیشت کہ یہ نظریئے ایک علم وفن کی حیثیت سے ''اسلامی معاشیات'' میں کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتے اور وہ اس قسم کی فنی اور علمی کاوشوں کے مقابلے میں ایسے اصول اور ان کے اصول کے ماتحت ایسے عملی نظام کا داعی ہے جو انسانوں کی عام رفاہیت، خوشحالی اور انکے امن واطمینان کے لئے آلۂ کار بنیں اور معاشی راہ سے انسانوں کی درمیان غالب ومغلوب اور ظالم ومظلوم کی تقسیم کو مانع ہوں۔

تجربہ اس بات کا شاہد ہے کہ ''جدید علمی دور'' میں منجملہ دیگر علوم وفنون کے ''علم المعیشۃ'' کو بھی بڑی

حد تک ایک علم وفن کی حیثیت حاصل ہے اور بڑے بڑے علماءِ یورپ وایشیا نے اس پر ضخیم تصانیف پیش کی ہیں لیکن اس تمام این وآں اور چنیں وچناں کے باوجود ''علم المعیشت'' کا اصل مقصد یعنی عام رفاہیت وخوشحالی آج تک نہیں ہوئی ہے اور دولت وذرائع دولت سب سمٹ کر ایک مخصوص طبقہ کے ہاتھ میں اس طرح آ گئی ہیں کہ عام انسانی آبادی کے لئے زندگی ''موت'' سے زیادہ بھیانک بن گئی ہے۔

بخلاف اس دور (دورِ نبوت وخلافتِ راشدہ) کے کہ وہاں معیشت کی یہ علمی اور فنی موشگافیاں اگرچہ عنقا تھیں مگر عام خوشحالی اور رفاہیت کا یہ عالم تھا کہ بلا لحاظ مسلم وکافر، مومن ومشرک، مرد وعورت، صغیر وکبیر اور اجیر ومستاجر سب ہی امن واطمینان کی زندگی بسر کرتے تھے اور معیشت میں فارغ البال تھے اور تاریخ اس بات کا مواد فراہم کرتی ہے کہ اس دور میں ایک وقت مملکت اسلامیہ کے اندر ایسا آیا کہ لوگ صدقات کے مال کو لئے پھرتے تھے مگر اس کا قبول کرنے والا ہاتھ نہ آتا تھا۔ (۱۰۸)

مُعاشی نظام کا منشاً:

یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ دُنیا میں کوئی کام بغیر کسی منشاء اور محرک کے وجود پذیر نہیں ہوتا اور ہر عمل کی پُشت پر ایک خاص ذہنیت کارفرما ہوتی ہے۔ پس کسی ''معاشی نظام'' کے مصلح اور فاسد ہونے کا معیار بھی اس کے محرکات اور اُس کے منشاء کے صالح اور فاسد ہونے پر موقوف ہے۔ سو اگر اس کی پُشت پر فاسد ذہنیت کام کر رہی ہے اور اس کے محرکات سرتاسر فاسد ہیں تو بلاشبہ وہ نظام ''فاسد نظام'' ہے اور اگر اُس کی پشت پناہی ایک صالح ذہنیت کر رہی ہے اور اس کے تمام تر محرکات صالح اور اس کا منشاء خیر ہی خیر ہے تو اس نظام کے صالح ہونے میں پھر کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے۔

اس اصول کے پیش نظر جب ہم ''معاشی نظام'' پر گہری نظر ڈالتے اور فکر عمیق سے کام لے کر جانچتے ہیں تو اس کے محرکات ومنشاء یا اس سے متعلق ذہنیت کو صرف دو صُورتوں میں محدود پاتے ہیں۔

ایک یہ کہ ''معاشی نظام'' کو اس لیے قائم جائے کہ اس کے ذریعہ سے زیادہ سے زیادہ نفع کمایا جائے

اور اس کو لین دین اور سودے کی اسپرٹ میں رکھا جائے تاکہ ''ھل من مزید'' کا نعرہ بازی اور فائدہ طلبی کسی حد پر بھی جاکر ختم نہ ہوسکے۔ یہ نظریہ ''سرمایہ دارانہ نظام'' کا بانی اور مؤسس ہے اور اسی کے زیر اثر یہ نظام پھلتا پھولتا ہے۔

اسلام کا نظام تقسیمِ دولت

دولت کا مالکِ حقیقی اللہ کریم ہے:

اسلام کے نظام تقسیم دولت بیان سے قبل اس حقیقت کا اظہار کرنا نہایت ضروری ہے کہ تمام قسم کی دولت اور ذرائع دولت کا اصل مالک اللہ کریم کی ذات پاک ہے اس سلسلہ کے چند نظائر ملاحظہ ہوں:۔

۱۔ .... لَهٗ مَافِی السَّمٰوٰتِ وَما فِی الاَرْضِ (۱۰۹)

ترجمہ: .... اُس کریم ذات کیلئے ہے جو کچھ آسمانوں میں اور جو کچھ زمین میں ہے۔

۲۔ .... وَلِلّٰهِ مِیراثُ السَّمٰوٰتِ والاَرْض (۱۱۰)

ترجمہ: .... اور اللہ کریم ہی کیلئے آسمانوں اور زمین کی میراث ہے۔

۳۔ .... الاانَّ لِلّٰهِ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِی الاَرض (۱۱۱)

ترجمہ .... یاد رکھو! جتنے کچھ آسمانوں میں ہیں اور جتنے کچھ زمین میں ہیں۔

(یعنی جن وانس اور فرشتے) یہ سب اللہ کریم ہی کے (مملوک) ہیں۔

۴۔ لَهٗ ما فِی السمٰوٰتِ وما فی الارض وما بینهما وَمَا تحتَ الثّریٰ (۱۱۲)

ترجمہ: .... اسی (کریم) کی ملکیت ہیں جو چیزیں آسمانوں میں ہیں اور جو چیزیں زمین میں ہیں اور جو چیزیں ان دونوں کے درمیان میں ہیں اور جو چیزیں تحت الثریٰ میں ہیں۔

یہ ان بے شمار آیات میں سے چند ہیں جن سے زمین وآسمان کی تمام اشیاء مخلوق کا اللہ کریم کی ملکیت ہونے کا اعلان کیا گیا ہے۔ اللہ کریم نے انسان کو بھی جن اشیاء اموال کا مالک بنایا ہے خواہ وہ اللہ کریم ہی کی

بخشی ہوئی توفیق اور طاقت کے ذریعے انہیں کما اور بنا کر مالک بنا ہے یا اللہ کریم کے نازل کردہ قوانین، مثلاً وصیت، دراثت، زکوٰۃ وصدقات، ہبہ وغیرہ کے ذریعے بلا محنت ان کا مالک بنا ہے، اس کی اپنی کمائی ہوئی ور اس کو بغیر کمائی کے بخشی گئی دولت سب اللہ کریم کی ملکیت ہے۔

ا) ''اَوَلَمْ یرَوْا اَنا خَلقنا لَهُم مِماعملت ایدینا انعاماً فهم لها مالکونَ ہ وذلّلنٰها لهم فمنها رکوبهم و منها یأ کلون ہ ولهم فیها منافع وَ مشارب اَفلایشکرونَ''۔

ترجمہ:۔ ''کیا ان لوگوں نے اس پر نظر نہیں کی کہ ہم نے ان کے (نفع کے) لیے اپنے ہاتھوں کی ساختہ چیزوں میں سے مواشی پیدا کیے، پھر یہ لوگ ان کے مالک بن رہے ہیں اور ہم نے ان مواشی کو ان کا تابع بنا دیا، سو ان میں سے بعضے تو ان کی سواریاں ہیں اور بعض کو وہ (بطور گوشت) کھاتے ہیں اور ان (مواشی) میں ان لوگوں کے لیے اور بھی منافع ہیں اور پینے کی چیز بھی ہیں (یعنی دودھ) کیا یہ لوگ پھر بھی شکر نہیں کرتے'' (۱۱۳)

۲) اَفرءیتُم مّا تَحرثُونَ ءَ اَنتم تَزرعُونَه اَم نحنُ الزّٰرِعُون لَو نشاءُ لجعلنٰهُ حُطٰما فظلتم تفکهون انّا لمغرَمُونَ بلْ نحن محرُومُونَ افرءیتم الماءَ الّذی تَشربُونَ ءَ اَنتم انزلتموهُ من المزن ام نحن المنزلون ہ لو نشآءَ جعلنٰهُ اُجاجاً فلولا تشکرون ہ افرءیتم النار التی تورون ءَ انتم انشاتُم شجرَتها ام نحنُ المنشئون ہ نحنُ جعلنٰها تذکرة ومتاعاً للمقوین ہ فسبح باسم ربِّک العظیم ہ

ترجمہ:۔ اچھا پھر یہ بتلاؤ کہ تم جو کچھ (تخم وغیرہ) بوتے ہو اس کو تم اُگانے

والے ہیں اگر ہم چاہیں تو پیداوار کو چورا چورا کر دیں پھر تم متعجب ہو کر رہ جاؤ گے کہ (اب کے تو) ہم پر تاوان ہی پڑ گیا بلکہ بالکل محروم رہ گئے اچھا پھر یہ بتلاؤ کہ جس پانی کو تم پیتے ہو اس کو بادل سے تم برساتے ہو یا ہم برسانے ہیں اگر ہم چاہیں تو اس کو کڑوا کر ڈالیں، سو تم شکر کیوں نہیں کرتے اچھا پھر یہ بتلاؤ کہ جس آگ کو تم سلگاتے ہو اس کے درخت تم نے پیدا کیا ہے یا ہم پیدا کرنے والے ہیں ہم نے اس کو یاددہانی کی چیز اور مسافروں کے فائدہ کی چیز بنایا ہے لہذا اپنے عظیم و جلیل پروردگار کے نام کی تسبیح کیجئے۔ (۱۱۴)

۳) وَاٰتُوهُم مِن مالِ اللهِ الَّذِی اٰتٰکم ،،

ترجمہ:۔ اور اللہ کے اس مال میں سے جو تمہیں دیا گیا ہے انہیں (غلاموں کو) بھی دو۔ (۱۱۵)

ان آیات مبارکہ میں بڑی صراحت کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے کہ:

انسان جن اشیاء و اموال کا مالک ہے یا جن سے وہ استفادہ کرتا ہے وہ تمام اللہ کریم نے ہی انسان کو بخشی ہیں انسان دراصل اس دولت و مال کا نگران ہے اور اُسے اس نے اللہ کریم کے فرمودات و ہدایات کی روشنی میں صرف کرتا ہے ورنہ وہ مجرم ٹھہرے گا اور قیامت کے روز اس سے اس دولت و مال کے استعمال کے بارے میں سوال ہوگا، اس لئے آپ دیکھتے ہیں قرآن مجید نے بار بار انسان کو اس مال و دولت کے صحیح استعمال کی ہدایت فرمائی اور اس کے غلط استعمال کے انجام سے ڈرایا ہے۔

ایک اور جگہ فرماتے ہیں:۔

''اٰمِنُوا بِاللهِ وَ رَسُوْلِه وَ اَنفِقُوا مِمَّا جَعَلَکُمْ مُستخلفِین

فِيهِ فَا لَّذِينَ اٰمَنُو اٰمِنكُم وَالَهُم اَجرٌ كَبِيرٌ،، (١١٦)

ترجمہ:۔تم لوگ اللہ کریم اور اس کے رسول کریم ایمان لاؤ اور (ایمان لاکر) جس مال میں تم کو اس (اللہ کریم) نے قائم مقام کیا ہے اس میں سے (اس کی راہ میں) خرچ کرو سو جو تم میں ایمان لے آئیں اور (اللہ کریم کی رضا کی خاطر) خرچ کریں ان کا بڑا ثواب ہوگا۔

اس آیت میں واضح فرمایا گیا ہے کہ انسان دولت کی ملکیت اور اس کے تصرفات بھی اس کریم کی مرضی کے مطابق ہوں گے، جس نے اس (انسان) کو نگران ٹھہرایا ہے لہٰذا آپ دیکھیں گے کہ قرآن مجید میں دولت کے استعمال کے قواعد وضوابط بیان کیے گئے ہیں مثلاً دولت کو فضول اُڑانے، کم فہم لوگوں کے قبضہ میں دے کر اسے ضائع کرنے، حرام کاری میں اسے برباد کرنے سے منع کیا گیا ہے۔

فضول اڑانے سے روکتے ہوئے فرمایا:۔

''ولاَ تسْرفو اانه لایحب المسرفین''

ترجمہ:۔ اور اسراف نہ کرو، یقیناً وہ (کریم) اسراف کرنے والوں کو پسند نہیں کرتے۔ (۱۱۷)

وَلَاتُبَذِّرْ تَبْذِيراً ٥ اَنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوآ اِخْوانَ الشَّيطِينَ وَكَانَ الشَّيطٰنُ لَرِبِه كَفُوراً.

ترجمہ:۔اور (مال کو) بے موقع فضول مت اڑانا۔ یقیناً بے موقع اڑانے والے شیطانوں کے بھائی بند ہیں۔ اور شیطان اپنے پروردگار کا بڑا ناشکرا ہے۔ (۱۱۸)

کم عقل لوگوں کے قبضہ میں دینے سے منع کرتے ہوئے فرمایا۔

وَلَا تُؤتُوا السُّفَهَآءَ اَموَالَکُمُ الَّتِي جَعَلَ اللّٰهُ لَکُمْ قِیٰماً ہ

ترجمہ:۔اور تم کم عقلوں کو اپنے وہ مال مت دو جن کو اللہ کریم نے تمہارے لئے مایہ ناز زندگانی بنایا ہے۔ (۱۱۹)

قرآن مجید نے ایک نہایت جامع آیت کریمہ میں دولت کے تصرفت کا طریقہ، مقصد اور انجام کی خبر دیتے ہوئے فرمایا ہے۔ (اگر چہ اس آیت میں ارشاد قادن سے تھا۔مگر یہ حکم اُمت مسلمہ کے مالداروں کو بھی شامل ہے۔

ارشاد مبارک ہے:۔

وَابْتَغِ فِیمَآ اٰتٰکَ اللّٰہُ الدَّارَ الاٰخِرَۃَ وَلاَ تَنسَ نَصِیبَکَ مِنَ الدُّنیا وَاَحْسِنْ کَمَآ اَحْسَنَ اللّٰہُ اِلَیکَ وَلاَ تَبغِ الفَسَادَفِی الاَرْضِ ہ اِنَّ اللّٰہَ لَایُحِبُّ الْمُفْسِدِیْنَ ہ

ترجمہ:۔ اور اللہ کریم نے جو کچھ (مال دولت) تجھے عطا کر رکھا ہے اس میں آخرت کے گھر بھی جستجو کیا کرو۔اور دینا سے اپنا حصہ لینا بھی نہ بھول اور جس طرح اللہ کریم نے تجھ پر احسان کیا ہے، تو بھی (اس کریم کے بندوں کے ساتھ) احسان کیا کر۔اور دنیا میں فساد کا خواہاں مت ہو، یقیناً اللہ کریم فسادکرنے والوں کو پسند نہیں کرتے۔ (۱۲۰)

آپ نے دیکھا ہوگا کہ اللہ کریم نے انسان کو جو اپنے مال دولت کی نگرانی کی ذمہ داری تفویض فرمائی ہے، اس میں اُسے بغیر ہدایت اور راہنمائی کے نہیں چھوڑا اور اسے سمجھا دیا ہے کہ ان ہدایات سے روگردانی کر کے اپنی مرضیات سے مال کو اڑائے تو وہ فساد فی الارض کا موجب ہوگا اور فسادیوں کو اللہ کریم پسند نہیں کرتے، لہٰذا ان کا ٹھکانہ دوزخ ہوگا۔

تقسیم دولت کا نظام :

اسلام میں دولت کی تقسیم کی مدات (HEADS) کو مختلف اور متعدد مستحقین کو مدنظر رکھتے ہوئے دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

۱) دولت کی اوّلین مدّات ۲) دولت کی ثانوی مدّات

دولت کی اوّلین مدات :

افراد یا ان کے وسائل کیلئے مخصوص ہیں، جنہوں نے پیدائش دولت کے عمل میں براہ راست حصہ لیا ہو۔ جنہیں معشیت کی اصطلاح میں عاملین پیدائش کہا جاتا ہے یعنی۔

۱) زمین کرائے پر لے لی۔

۲) سرمایہ (سود کے بجائے) منافع میں حصہ لے گا

۳) محنت اگر بطور مزدور کے ہوگی تو اپنی اُجرت لے گا اور بطور ناظم کے ہوگی تو منافع یا حصہ لے گا۔

دولت کی ثانوی مدّات :

تقسیم دولت کی یہ مدات ایسے افراد کے لیے ہیں، جو پیدائش دولت کے عمل میں اگر چہ براہ راست حصہ تو نہیں لیتے مگر دولت کے حقیقی مالک اللہ کریم نے ان کے حقوق بھی دولت میں رکھے ہیں ایسے افراد میں بوڑھے والدین، بیوی، اولاد، قریبی رشتہ دار، ہمسایہ، مسافر مہمان، محتاج، معذور یتیم، وغیرہ بھی شامل ہیں جو زکوٰۃ، صدقات، کفارات، وصیت ورثت، وقف، ھبہ، عاریت، قرض حسن، امانت یا اجازت استفادہ وغیرہ کے ذریعے اپنا حقِ دولت وصول کرتے ہیں۔

ان کے علاوہ دولت کی ثانوی مدات میں اسلامی ریاست کا حق ہے جو کہ بذریعہ ضرائیب (ٹیکس) اموال فاضلہ، خمس وغیرہ وصول کرتی ہے اور اس سے حاصل شدہ آمدنی کو بھی ریستی اُمور دفاعی امور، انتظامی

......

اور عدالتی امور وغیرہ پر خرچ کرتی ہے اگر اسلامی ریاست کے شہری غیر مسلم بھی ہوں تو اُن سے اور اخراج وصول کیا جاتا ہے اور یوں ان کی آمدنی میں بھی اسلامی ریاست کا حق ہے۔

مذکورہ بالا نظام تقسیم دولت کو ایک دوسری صورت میں بھی سمجھا جا سکتا ہے۔ دولت پہلے عاملین پیدائش میں تقسیم کی جائے گی اس کو فنی اصلاح میں تقسیم دولت (DISTRIBUTION OF WEALTH) کہا جائے گا، پھر اُن عاملین پیدائش کے ذریعہ دولت کی تقسیم کا عمل دوبارہ شروع ہو کر دولت کو ان افراد معاشرہ تک لے جایا جائے گا جنہوں نے اپنی مجبوریوں یا دیگر وجود کی باء پر پیدائش دولت کے عمل میں براہ راست حصہ نہ لیا ہو گا۔

اس دوبارہ تقسیم کے عمل کو معاشیات کی اصطلاح میں تقسیم دولت کا اعادہ REDISTRIBUTION OF WEALTH کہا جاتا ہے آج کے معاشی ترقیات کے دور میں فلاحی معاشیات (WELFARE ECONOMICS) کے ماہرین اور حکومتی پالیسیوں کا سارا زور تقسیم دولت کے اعادہ کے عمل کو موثر اور یقینی بنانے پر لگ رہا ہے اور جو حکومت جتنا اس عمل کو زیادہ یقینی اور موثر بناتی ہے۔ اتنی وہ مقبول اور طاقتور ہوتی ہے مگر اسلام کے معاشی نظام نے اس عمل کو اس دور میں بھی یقینی بنا دیا تھا۔ جب نہ معاشی نظریات وجود میں آئے تھے نہ ان کی ترویج پر سرکاری پالیسیاں وضع کی جاتی تھیں۔

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اسلام کا نظام تقسیم دولت اللہ کی نازل کردہ تعلیمات سے ماخوذ ہے لہٰذا جو حقیقت دنیا آج تسلیم کر رہی ہے اور جس کی ضرورت آج محسوس ہو رہی ہے اسلام نے چودہ صدی قبل ہی اُسے قابل عمل بنا دیا مگر اسلام کا نظام روز اول سے ترقی یافتہ ہے سیکولر دنیا آج اس ترقی کا سوچ رہی ہے۔ (۱۲۱)

عاملین پیدائش:

روایتی معاشیات یا سرمایہ دارانہ معاشیات کے ماہرین نے عاملین پیدائش چار بتائے ہیں:۔

۱: محنت　۲: زمین　۳: سرمایہ　۴: تنظیم

مگر اسلامی معاشیات کا نظریہ برائے عاملین پیدائش سرمایہ دارانہ معاشیات کے نظریہ سے مختلف ہے۔ اسلامی معاشیات نے اصل عاملین دو بتائے ہیں۔ یعنی محنت (انسان) اور زمین (قدرتی وسائل)

انسان اپنی محنت کے ذریعے زمین یعنی قدرتی وسائل کو کام میں لا کر جو کچھ پیدا کرتا ہے یہی وہ کچھ ہے جو اس دنیا میں نظر آ رہا ہے۔ اس تمام معاشی خزانوں، معاشی ترقیات اور معاشی فلاح و بہبود کے تمام معاشی نظریات کی اصل دو ہی عاملین ہیں:۔ انسان (محنت) اور زمین (وسائل قدرت)

لہٰذا ہم یوں مساوات بنا سکتے ہیں:

پیدائش دولت = انسان (محنت) + زمین (قدرتی وسائل) کا نتیجہ پھر انسان اپنی محنت کے ذریعے زمین (قدرتی وسائل) کو استعمال کر کے جو دوت پیدا کرتا ہے وہ ساری کی ساری استعمال نہیں کرتا بلکہ اس میں سے کچھ پس انداز بھی کرتا ہے اس پس انداز دولت کو جب وہ مزید دولت کی پیدائش کے لئے استعمال کرتا ہے تو یہ ''سرمایہ'' بن جاتی ہے۔ لہٰذا یوں کہا جا سکتا ہے کہ:

سرمایہ = انسان + زمین کے نتیجہ میں پیدا شدہ دولت کا وہ حصہ

جو انسان بچا کر رکھتا ہے اور مزید دولت کی پیداوار کے لئے خرچ کرتا ہے۔

اسلامی معاشیات میں ''تنظیم'' کو ایک مستقبل عامل پیدائش اس لئے تسلیم نہیں کیا گیا کہ یہ سرمایہ دارانہ نظام کو تقویت دینے کا ایک بڑا ذریعہ اور تمام دوت کا چند ہاتھوں میں سمٹ کر آ جانے کا بہت بڑا آلہ ہے۔

اسلام جس عادلانہ نظام تقسیم دولت کا داعی ہے وہ اس قسم کے استحصال ذریعہ کا وجود برداشت نہیں کر سکتا۔

مختصراً یوں کہہ لیجئے کہ اسلامی معاشیات میں پیدائش دولت کے عاملین تین ہیں:

۱: زمین ۲: محنت ۳: سرمایہ

اب ہم ان تینوں عاملین پیدائش کا تعارف کراتے ہیں:۔

۱) زمین:

اسلامی معاشیات میں زمین سے مُرادصرف قشرالارض (زمین کی سطح) یا زمین ہی مُرادنہیں بلکہ وہ تمام قدرتی وسائل وعطیت مُراد ہیں جو اللہ کریم نے اپنے بندوں کو عطا فرمائے ہیں۔ جن پر محنت کر کے وہ اپنی روزی تلاش کرتے ہیں اور معاشی ترقیات حاصل کرتے ہیں۔

زمین بحیثیت عامل پیدائش میں مندرجہ ذیل عناصر شامل ہیں۔

(۱) زمین کی سطح جو کاشت کاری، تعمیرات اور معاشی سرگرمیوں کو جاری رکھنے کے کام آتی ہے۔

قرآن مجید نے اپنے معجزانہ انداز میں اس طرف یوں اشارہ کیا ہے.

وَاذا الْارْض مُدَّتْ

ترجمہ:۔اور جب زمین پھیلائی جائے گی۔ (۱۲۳)

اَلَّذِیْ جَعَلَ لَکُمُ الْاَرْضَ فِرا شاً وَّ السَّمَآ ءَ بِنَآءً وَّ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مآءً فَاَخْرَجَ بِه مِنَ الثَّمَراتِ رِزْقًالَّکُمْ.

ترجمہ:۔(تمہارا رب وہ ذات ہے) جس نے تمہارے لئے زمین کو بچھونا بنایا اور آسمانوں کو چھت، پھر آسمان سے پانی نازل فرمایا جس سے میوے (پھل) تمہارے رزق کے لئے پیدا فرمائے،،۔ (۱۲۴)

اَلَّذیْ جَعَلَ لَکُمُ الْاَرْضَ مِهٰدًا

ترجمہ:۔ذات پاک، ہے جس نے زمین کوتمہارے لئے بچھونہ بنایا،،۔(۱۲۵)

وَاِلَی الْاَرْضِ کَیْفَ سُطِحَتْ

ترجمہ:۔اورزمین کی طرف (دیکھو اس کی) کیسی سطح بنائی گئی ہے؟ (۱۲۶)

اَللّٰهُ الَّذیْ جَعَلَ لَکُمُ الارضَ قَرارًا

ترجمہ:۔ اللہ کریم وہ ہے جس نے زمین کو تمہارے لئے جائے قرار (وسکون) بنایا۔ (۱۲۷)

وَ اللہ جَعلَ لَکُمُ الاَرْضَ بِسَاطاً.

ترجمہ: اور اللہ کریم نے تمہارے لئے زمین کو بنا دیا بچھونا۔ (۱۲۸)

اَلَمْ نَعلِ الاَرْضَ مِیھَادًا

ترجمہ:۔ کیا ہم نے زمین کو بچھونا نہیں بنایا؟ (۱۲۹)

وَفِی الاَرْضِ قَطعٌ مُتجٰورَاتٌ وَجَنّٰتٌ من اعْنٰبٍ وَزرعٌ وَنجیل صَنْوانٌ وَغَیْرُ صِنْوانٍ یُسْقیٰ بماء وَّاحِدٍ وَنفضل بَعْضِهَا علیٰ بعضٍ فی الاُکُلِ ہ اَنَّ فِیْ ذٰلکَ لاٰلقومٍ تعقلونَ.

ترجمہ:۔ اور زمین میں مختلف کھیت ہیں جو ایک دوسرے سے متصل ہیں اور انگور کے باغات ہیں اور کھیتیاں ہیں اور کھجوریں ہیں۔ ایک کی جڑ دوسرے سے ملی ہوئی اور بعض بن ملی ہوئی۔ حالانکہ انہیں ایک ہی پانی سے سیراب کیا جاتا ہے اور ہم ان میں سے بعض کو بعض پر پھل میں بڑھا دیتے ہیں۔ یقیناً اس میں اُن لوگوں کے لئے نشانایاں ہیں جو غور کرتے ہیں،،۔ (۱۳۰)

''وَلَقَدْ مکنّا کُمْ فِی الارضِ وجعلنَا لکُمْ فِیھاَ مَعَایِشَ''

ترجمہ:۔ اور ہم نے تمہیں زمین میں ٹھکانہ دیا اور ہم نے اسی میں تمہاری معاش رکھ دی سطح زمین پر واقع بند وبالا پہاڑ جن کا پتھر، جن کی وادیاں، جن کے سبزہ زار، جن کے جنگلات اور چراگاہیں انسان کے معاش اور پیدائش دولت میں معاون ہیں۔

اس ضمن میں قرآن مجید کے چند نظائر ملاحظہ ہوں:

وَاَلقیٰ فِی الْاَرْضِ رَوَاسِیَ اَنْ تَمِیْدَ بِکُمْ وَاَنْھٰرًا وَسُبُلًا

لَعَلَّکُمْ تَھۡتَدُوْن

ترجمہ:۔اور زمین پر بھاری بوجھ (پہاڑ) رکھ دیئے کہ کہیں تمہیں

لے کر جھک پڑے

اور دریا بہائے اور راستے بنائے تاکہ تم راہ پاسکو۔ (۱۳۲)

وَالْاَرْضَ مَدَدْ نَا ھَا وَاَلْقَیْنَا فِیْھَا رَوَاسِیَ وَاَنْبَتْنَا فِیْھَا

مِنْ کُلِّ زَوْجٍ بَھِیْجٍ

ترجمہ:۔اور زمین کو ہم نے پھیلا دیا اور اس پر بھاری بوجھ (پہاڑ)

رکھ دیئے اور پھر

اس میں رونق کی ہر ہر شے کو اگا دیا۔ (۱۳۳)

وھُوالَّذِی مَدَّ الارضَ وَجَعَلَ فِیھَارَواسِیَ واَنْھَارًا.

ترجمہ:۔وہی ذات ہے جس نے زمین کو پھیلا دیا اور اس میں بوجھل

پہاڑ رکھ دیئے اور دریا بہا دیئے۔ (۱۳۴)

زمین کی سطح پر رواں دریا، موجیں مارتے سمندر، گہری جھیلیں، ندی نالے، زمین کے اوپر اور اندر آبی ذخائر مراد ہیں جن سے انسان مچھیاں اپنی خوراک کے لئے پکڑتا ہے سمندروں اور دریاؤں کو جہازوں اور کشتیوں کے ذریعے پار کرتا ہے جو اس کے ذرائع نقل وحمل کا کام دیتے ہیں۔ دریاؤں کے بلندیوں سے گرتے پانیوں کے ذریعے بجلی پیدا کرتا ہے جس سے نہ صرف اپنا گھر روشن کرتا ہے، سردی میں تاپتا ہے بلکہ کارخانے، ملیں اور ریل گاڑیاں چلاتا ہے۔اسی پانی سے اپنی بے گیاہ زمین سیراب کرکے اسے لہلہاتے

کھیتوں میں تبدیل کر دیتا ہے، منوں اناج اٹھا کر اپنا اور ابنائے جنس کا پیٹ بھرتا ہے اور آتش شکم ٹھنڈی کرتا ہے زمین کے پانی کی نعمت کیا ہے انسانی زندگی کی رُوح اور جان ہے۔

قرآن مجید نے اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

وَجعلناَ مَن الْمَآءِ کُلَّ شَیءٍ حَیءٍ

ترجمہ:۔اور پانی سے ہم نے ہر شئے کو زندگی بخشی،،۔ (۱۳۵)

پانی بحیثیت معاشی عامل کے متعلق قرآن حکیم کی ان آیات کے علاوہ جن کا ذکر نمبر ۲ کے تحت کیا گیا ہے چند مزید نظائر قابل توجہ ہیں:

وَما اَنزلَ اللّٰہُ مِنَ السَّمآء من رزق مآء فاحیابه الارض بعد موتها

ترجمہ:۔اور پانی اللہ کریم نے آسمان سے نازل کیا، پھر اس سے زمین کو اس کے مُردہ ہونے کے بعد زندہ کیا۔(۱۳۶)

وانزل من السمآءِ مآءً فاخرج به من الثمرات رزقکم.

ترجمہ:۔اور آسمانوں سے پانی نازل کیا اور اس سے تمہارے رزق کے لئے میوہ جات پیدا کئے،،۔(۱۳۷)

انزل من السمآءِ مآء فسالت به بودرها اودیة.

ترجمہ:۔اس نے آسمن سے پانی اتارا پھر اس سے وادیاں (نالے) اپنی اپنی وسعت کے مطابق بہنے لگے۔ (۱۳۸)

هو الذی انزل من السمآءِ مآءً لکم منه شراب ومنه شجر

ترجمہ:۔ وہی ذات ہے جس نے آسمن سے تمہارے لئے پانی

نازل فرمایا جو پینے کے کام آتا ہے اور جس سے اگتے ہیں۔ (۱۳۹)

زمین کے اندر تمام معدنی ذخائر اور دھاتیں جنہیں کام میں لاکر انسان اپنی زندگی کی بنیادی ضروریات پوری کرنے سے لیکر معاشی ترقی کی منازل تک طے کرتا ہے، بھی زمین بحیثیت عامل پیدائش میں شامل ہیں۔

اس سلسلہ میں چند قرآنی نظائر قابل توجہ ہیں:

له مافی السمٰوٰت ومافی الارض ومابینهما وماتحت الثرىٰ

ترجمہ:۔ اسی کے لئے ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے اور جو کچھ گیلی زمین کے نیچے ہے۔ (۱۴۰)

وللہ خزآئن السمٰوٰت والارض

ترجمہ:۔ اور اللہ کریم ہی کے لئے ہیں آسمانوں کے اور زمین کے خزانے۔ (۱۴۱)

زمین بحیثیت عامل پیدائش میں آسمانوں سے نازل ہونیوالی تمام برکات اور زمین اور آسمان کے درمیان فضا میں جمع اور پنہاں شدہ تمام برکات بھی شامل ہیں۔ مثلاً ہوا، گرمی، سردی اور سورج کی روشنی وغیرہ جو انسان میں نشاط پیدا کر کے اسے معاشی عمل کے لئے تیار کرتی ہے جو فصلوں کی کاشت اور برداشت کے لئے لازمی ہیں اور عمل پیدائش کو جاری رکھنے کے لئے ضروری ہیں۔

اس بارے میں یہ نظائر ملاحظہ کریں:

وَفِی السَّمَآءِ رِزْقُکُمْ وَمَا تُوعدونَ

ترجمہ:۔ اور آسمان میں تمہارا رزق ہے اور وہ بھی جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے۔ (۱۴۲)

وَیُنزِلُ لَکُمْ مِنَ السمآ رزقًا

ترجمہ:۔اور وہ آسمانوں سے تمہارے لئے رزق اتارتا ہے۔(۱۴۳)

وَمـآ انـزل اللہُ مِن السمآءِ مِن مّآءٍ فاحیابہ الارض بعد مَوتِھا وَبَثَّ فیھا من کُل دابۃٍ وَتصرِیفِ الرِّیٰحِ وَ السَّحابِ المسخر بین السمآء والارض لاٰیتٍ لقوم یعقلُونَ

ترجمہ:۔اور اس پانی میں جو اللہ کریم نے آسمان سے اُتارا، پھر اس سے زمین کو بے گیاہ ہونے کے بعد زندہ کیا اور اس میں ہمہ قسم جانور پھیلا دیئے اور ہواؤں کے ہیر پھیر میں اور بادل میں جو آسمان اور زمین کے بیچ معلق میں، نشانیاں ہیں اُن لوگوں کیلئے جو سُوجھ سے کام لیتے ہیں (۱۴۴)

اللہُ الذی یرسل الریاح فتثیرُ سحابًا فیبسُطہ فی السمآءِ کیف یشاءُ ویجعلُہ کسفًا فتری الودق یخرج من خِللٰہ فی السمآءِ اصاب بہ من یشاءُ من عبادہ اذا ھُم یُستبشرونَ

ترجمہ ۔ وہ اللہ کریم ہے جو ہواؤں کو چلاتا ہے جو بادلوں کو اُٹھاتی ہیں ۔ پھر وہ بادلوں کو آسمان میں جس طرح چاہے پھیلا دیتا ہے اور انہیں تہہ رکھتا ہے پھر تو دیکھتا ہے کہ مینہ اس کے درمیان سے نکلتا ہے پھر جب وہ اسے اپنے بندوں میں جسے چاہتا ہے اسے پہنچا دیتا ہے تو وہ سبھی خوشیاں کرنے لگ جاتے ہیں۔(۱۴۵)

وما انتم له بخزنين ۔

ترجمہ:۔اور ہم نے رس بھری ہوائیں چلائیں ، پھر ہم نے آسمان سے پانی اُتارا پھر تمہیں اس سے سیراب کیا حالانکہ تم اس کا خزانہ نہیں رکھنے والے۔ (۱۴۶)

الغرض ،ان تمام قرآنی نظر کی روشنی میں زمین بحیثیت عامل پیدائش اللہ کریم کا اپنے بندوں کے لئے ایک ایسا عطیہ ہے جو بہت سے ایسے فوائد کو شامل ہے جن کا تعلق انسانی زندگی کی بنیادی ضروریات سے لیکر اس کی اقتصادی ترقی کی ممکنہ انتہائی صورت تک تمام مدراج سے ہے۔

زمین اور جدید معاشیات کی تنگ دامنی

جدید یا روایتی معاشیات نے زمین بحیثیت عامل پیدائش کو جس انداز میں زیر بحث لایا ہے اس سے زمین کی اہمیت وافادیت ،زمین کی آبادکاری ،ترقی وتوسیع ،زمین کی ملکیت وغیرہ ایسے نہایت اہم موضوعات کے بارے میں اس کی تنگ دامنی پر حیرت ہوتی ہے۔

جدید معیشت نے ''زمین'' کی بحث کو صرف زمین کا تعارف بحیثیت عامل پیدائش اور زمین کا معاوضہ بصورت لگان تک محدود رکھا ہے۔اگر اس نے کہیں بے آباد زمینوں کی آبادکاری کا ذکر ہے تو اس کا مقصد بھی کم ہونے کی صورت میں بھاری شرح لگان سے بچاؤ بتایا ہے۔

ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ روایتی معاشیات کے ماہرین (ریکارڈو وغیرہ) نے لگان کی مقدار ،شرح اور صولی کے مسئلہ کو حل کرنے کے لئے زمین کی باقاعدہ درجہ بندی کا طریقہ بتایا ہے اور یوں اچھی اور آبادی کے قریب زمینوں کو جلد قابل کاشت بنانے اور پھر بتدریج دور دراز کی زمینوں کو آباد کر کے کم لگان دے کر زیادہ فائدہ اٹھانے کا تصور دیا ہے۔

جدید معیشت دانوں نے زمین کے لگان کی بحث کو مکانوں کے کرایہ جات تک بڑھایا ہے اور یہ بھی

بتانے کی کوشش کی ہے کہ شہری علاقہ کے درمیان، ایک کنارہ پر واقع، گنجان آباد علاقہ اور غیر آباد علاقہ میں واقع مسکانات کے کرایوں میں کیوں تفاوت ہوتا ہے۔

مگر جدید معیشت دانوں کی نگاہ سے غالباً زمین بحیثیت عامل اور ذریعہ پیدائش کا اہم ترین پہلو اوجھل رہا ہے کہ زمین اللہ کریم کا عطیہ ہے۔ اس کا تعلق انسانوں کی بنیادی ضروریات زندگی سے ہے اور انسانوں کو دیگر دونوں عاملین پیدائش محنت اور سرمایہ سے زیادہ اس کی ضرورت ہے، اس کے بغیر دونوں عاملین پیدائش کا تصور ہی غیر ممکن ہے۔

اگر آپ ان بنیادی سوالات کا جواب تلاش کرنا چاہیں گے تو جدید سرمایہ دارانہ معاشیات کا رزق اس سلسلہ میں بالکل سادہ نظر آئے گا جبکہ ان مسائل کا تعلق انسانی زندگی کی بنیادی ضروریات سے ہے۔ یا غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ ان زمینی مسائل کا تعلق تیسری دنیا کے غریب ممالک کے غریب باشندوں سے ہے، جہاں بظاہر آبادی زیادہ اور معاشی وسائل بظاہر کم ہیں۔

ترقی یافتہ یا ترقی پذیر سرمایہ دار ممالک کے وہ ماہرین معاشیات جنہوں نے اپنی جدید معاشیات پر کتابیں اپنی کوٹھیوں یا یونیورسٹیوں کی اُن عمدہ عمارات میں بیٹھ کر تحریر کی ہیں جنہیں تیسری دنیا کے ممالک کی دولت بذریعہ سُود اکٹھی کر کے تعبیر کیا ہے۔ یہ ماہرین معاشیات نہ خود غربت سے دوچار ہیں نہ غربت کے مسائل کو سمجھتے ہیں۔

لہٰذا ان کی تحریر کردہ کتب زمین کے ان مسائل کے بیان سے تہی دامن ہیں جن کا تعلق غربت ممالک کی معیشت سے ہے۔ (۱۴۷)

اسلامی معاشیات اور زمین:

اسلامی معاشیات کے ماہرین نے ''زمین بحیثیت عامل یا ذریعہ پیدائش'' کے مسائل کو جامعیت اور شرح وبسط کے ساتھ بیان کیا ہے جن پر کتب حدیث اور فقہ کے مستقل ابواب ہیں

مسلمان فقہاء اور ماہرین اسلامی معاشیات نے اس موضوع پر مستقل کتابیں تصنیف کی ہیں ۔

ہم چاہتے ہیں کہ اس کتاب میں اختصار کیساتھ زمین کے ان تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالی جائے گی جن کا تعلق ہمارے موضوع سے ہے یا جن کا ذکر کرنا ضروری ہے ۔

ہم اپنی بحث کو مندرجہ ذیل عنوانات پر مرتکز کریں گے :

ا) زراعت : اجازت ،مختلف صورتیں ۔

ب) مزارعت : جواز اور عدم جواز کی بحث اور احکام ۔

ج) زراعت کی ترقی کے وسائل ۔

بنجر زمینوں کی آباد کاری

وسائل آب پاشی کی ترقی وتوسیع

لگان ، مالگذاری میں تخفیف وغیرہ

الف : زراعت

الف : جواز

اسلامی معاشیات میں زراعت (زمین کی کاشت کاری) کا موضوع نہایت اہم ہے ۔ درحقیقت زراعت شکار کے بعد کسبِ معاش کا اولین ذریعہ ہےجس سے انسان اپنی روزی کماتا چلا آرہا ہے ۔ زراعت کی تاریخ اتنی ہی قدیم ہےجتنی حضرتِ انسان کی ، نبی کریم ﷺ نے اپنی حدیث پاک میں اس حقیقت کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ حضرتِ آدم علیہ السلام نے اس خطہ اراضی پر آباد ہونے کے جو ذریعہ معاش بنایا وہ زراعت یا کھیتی باڑی ہی تھی ۔

اس کے ثبوت میں ''مستدرک حاکم'' میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم سے مروی حدیث کا یہ حصہ قابل توجہ ہے:

کانَ اٰدمُ حراثًا

ترجمہ:۔''حضرت آدم علیہ السلام کھیتی باڑی کیا کرتے تھے،،

دراصل زراعت کا پیشہ انسانی فطرت کی سادگی کے قریب ترین ہے یہ پیشہ اللہ کریم اوراس کے بندہ (کسان) کے متعلق کی استواری کا ایک ذریعہ بھی بنتا ہے کسان کا مٹی میں بیج محض اس اُمید پر پھینک کر جانا کہ اس کا کریم اپنا کرم کرکے اس بیج کولہلہاتی اور پھراناج میں تبدیل کرے گا اللہ کریم پر بندہ (کسان) کے یقین اورایمان کا زریعہ بنتا ہے۔ اللہ کریم نے کسان کی اس امید کونہایت خوبصورت انداز میں اپنا احسان بتایا اور کسان کے کاشت کرنے کواپنا فعل گردانا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

اَفَرءَیتمُ مَاتحرثوُن. ءَ انتمُ تزعونہٗ. امَ نحنَ الذارِعونَ ہلو'نشاءُ لجعلنٰہُ حطٰاماًفظلتمُ تفکھون. اناَ لمغرمون. (۱۴۸)

ترجمہ: بھلا دیکھو! جوتم بوتے ہو۔ اسے تم کھیتی کرتے ہو یا ہم کھیتی کرنیوالے ہیں اگرہم چاہیں تو اسے روندا ہوا گھاس کرڈالیں پھرتم سر دن باتے بناتے ہوکہ یقینا ہم تو قرض دار ہی رہ گئے بلکہ ہم تو بے نصیب ہو گئے۔

ایک دوسرے مقام پر اللہ کریم نے زراعت کو اپنا انعام اور پنی الوہیت کی ایک نشانی فرمائی:۔

وَھوُالذی اُنشاجنٰتٍ معروُشاتٍ وَالنخلَ و الزرع مختلفً اُکُلہٗ (۱۴۹)

ترجمہ: اور وہی ذات کریم جس نے باغات پیدا کئے جوٹٹیوں پر

....

چڑھائے جاتے ہیں اور ایسے جونہیں چڑھائے اور کھجور کے درخت پیدا کئے اور مختلف انواع کی کھیتی بھی پیدا فرمائی۔ نبی کریم ﷺ نے اپنے ایک ارشاد گرامی میں کھیتی باڑی کے عمل اور نتیجے کو صدقہ سے تعبیر فرمایا ہے۔

عن انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ قال : قال رسول اللہ ﷺ مامن مسلم یغرس غرساً اویزرع زرعاً فیا کل منہ طیرٌ اوانسان اوبھیمۃ اِلا کان لہ بہ صدقہ(۱۵۰)

ترجمہ: حضرت انس ''بن مالک'' سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا جو مسلمان درخت لگاتا ہے یا کبھی کھیتی باڑی کرتا ہے اور اس میں سے جانور یا انسان یا چوپائے اپنی خوراک حاصل کرتے ہیں یہ عمل اس (مومن) کے حق میں صدقہ (یعنی اجر وثواب کا ذریعہ) بنتا ہے۔

اس حدیثِ مبارکہ کے مفہوم میں یہ خوشخبری بھی پنہاں ہے کہ کاشتکار مسلمان خواہ بوقت کاشت اپنی کھیتی میں سے انسانوں، جانوروں اور پرندوں کے کھانے کی نیت کرے یا نہ کرے، اگر اس میں سے انسان پرند اور چرند کچھ کھائیں گے۔ خواں وہ ان کے نہ کھانے اور ان سے بچانے کے لئے حفاظت بھی کرے صدقہ کا ثواب پھر بھی ملتا رہے گا اور اگر وہ اپنا لگایا ہوا درخت فروخت کردے یا اپنی کاشت کردہ اپنی کھیتی بیچ دے تب بھی اس کو ثواب ملتا رہے گا۔ کیونکہ اپنے اس عمل اس نے مخلوق خدا کے رزق میں اضافہ کرنے کی کوشش کی ہے۔

ایک دوسری حدیث میں نبی کریم ﷺ نے اپنی امت اور دنیا کے تمام انسانوں کو زمین کے پوشیدہ خزانوں سے بذریعہ زراعت مستفید ہونے کی ترغیب فرمائی ہے:۔

أطلبوا الرزق فی خبایا الارض (عن عائشہ رضی اللہ عنہا) (۱۵۱)

ترجمہ: رزق کو زمین کی پناہوں میں تلاش کرو شمس الائمہ امام سرخسیؒ اس حدیث کی تشریح میں فرماتے ہیں ''یعنی عمل الزراعۃ'' زراعت کے عمل سے زمین سے رزق تلاش کرو۔

نبی کریم ﷺ نے خود مقامِ ''جرف'' میں کاشتکاری کی ہے اس عمل کو امام سرخسیؒ ہی نے نقل کیا ہے۔

وازرع رسول اللہ ﷺ بالجرف (۱۵۲)

ترجمہ: رسول اللہ ﷺ نے خود مقام جرف میں کاشت فرمائی نبی کریم ﷺ کا یہ مبارک عمل امت کو تعلیم دینے کے لئے تھا اس لئے فقہاء اسلام نے زراعت کے پیشہ کو اس قدر اہمیت دی ہے اسے فرض کفایہ کا درجہ دیا ہے۔ اس بارے میں نظیر قابل توجہ ہے۔

اما الزرع في ذاته سواء كان مشاركة او لا نهو فرض كفاية لاحتياج الانسان والحيوان اليه. (۱۵۳)

ترجمہ: جہاں تک زراعت کا تعلق ہے خواہ یہ شرکت اسے وجود میں آئی یا بغیر شرکت کے اپنی ذات میں فرض کفایہ کا درجہ رکھتی ہے۔ انسان اور حیوان سبھی اس کے محتاج ہیں۔

فقہاءِ اسلام نے اس پر بھی بحث کی ہے کہ زراعت دیگر ذرائع رزق مثلاً صنعت وحرفت، تجارت وغیرہ سے بہتر ہے بعض فقہائکرام دیگر رائے بھی رکھتے ہیں مگر ہمیں اس مسئلے میں پڑنے کی ضرورت نہیں البتہ یہ رائے قائم کی جاسکتی ہے کہ زراعت، تجارت، صنعت کسی ایک کو بھی بالکل ترک کر دینا امت کی معاشی ترقی کی راہ میں رکاوٹ ہوگی۔ لہٰذا ان تمام پیشوں کو اپنانے کی ضرورت ہے۔ جہاں زراعت کے لئے قدرتی حالات

سازگار ہیں وہاں زراعت پر زیادہ توجہ دی جاسکتی ہے۔ جہاں صنعت یا تجارت کے لئے ماحول سازگار ہے وہاں صنعت یا تجارت میں تخصیص حاصل کی جاسکتی ہے اور یوں اپنے اپنے تخصص کے ذریعے دیگر تخصص والوں کی مدد کرسکتے ہیں یہ حال افراد اور اقوام دونوں کا ہوسکتا ہے اور یہ تعاون بذریعہ تخصیص ملکی اور بین الاقوامی سطح پر تبادلہ اشیاء اور تجارت کی اصل بنتا ہے۔

زراعت عدم جواز کا شبہ اور اس کا جواب:

مذکورہ بالا بحث سے نہ صرف زراعت (کاشتکاری) کا جواز ثابت ہوتا ہے۔ بلکہ زراعت کا عمل ذریعہ ترقی وثواب اور زراعت کرنے والا (کاشتکار) اللہ کریم کے نزدیک پسندیدہ بندہ ہے۔ مگر بعض علمائے اسلام نے زراعت کو بطور پیشہ بنانا تنزل اور پستی تصور کیا ہے اور ان کا استدلال نبی کریم ﷺ کے اس ارشادِ مبارک پر ہے جب آپ نے کسی مہم کی واپسی سے سرحد کے ایک مقام پر ہل اور کھیتی باڑی کے دوسرے آلات دیکھ کر فرمایا:۔

عن ابی امامة یا هلی رضی الله تعالیٰ عنه انه رائی سکة وَشیئا من الة الحرث . فقال سمعت النبی صلی الله علیه وسلم یقول لاید خل هذابت قوم الاّ ادخله الله الذّل .

(۱۵۴)

ترجمہ: حضرت ابوامامہ باہلیؓ نے ایک جگہ ہل اور کھیتی باڑی کی دیگر آلات دیکھ کر فرمایا! میں نے جناب رسول ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ جس گھر میں یہ آلات داخل ہوجاتے ہیں اللہ تعالیٰ اس گھر میں ذلت اور مسکنت داخل کردیتا ہے۔

اس حدیث سے بلاشبہ یہ مترشح ہے کہ زراعت ایک ایسا وسیلہ معاش ہے جس کو اختیار کرنے والا ذلت و

پستی کا شکار ہوگا بہ ظاہر اس حدیث اور دیگر احادیث نبوی اور دیگر علیٰ صاحبھا الصلوٰۃ والسلام جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے۔ ان میں اخلاق ہے مگر علمائے اسلام ان پر اللہ کی رحمت ہو نے اس ظاہری تضاد اور مشکل کا جواب بھی اپنی عالمانہ بصیرت سے دیا ہے۔

مثلاً شمس الائمہ امام سرخسیؒ نے امام محمدؒ کے اتباع میں اس حدیث کا جواب یہ نقل کیا ہے کہ:

ظنوا ان لمراد بالنرزام الخراج . ولیس کذاب . بل المراد ان المسلمین ازشضللو بالزراعة واتبعوا ازناب ا سقر وقعد واعن الجهاد كرعليهم عدوهم فجلعلو هم ازلة (۱۵۵)

ترجمہ: اس حدیث کے ظاہری معنی سے لوگوں کا گمان ہوا کہ اکثر زمینوں پر خراج لازم آتا ہے اور خراج کی ادائیگی مسلمان کے لئے جو اعشر ادا کرتا ہے موجب رسوائی ہے لہذا زراعت ذلت ورسوائی کا ذریعہ بنتی ہے حالانکہ مفہوم ہرگز اس طرح نہیں ہیں۔ بلکہ اس حدیث کا حقیقی مفہوم یہ ہے کہ مسلمان زراعت میں یکسوُ ہو کر لگ جائیں۔ کہ بیلوں کی دُمیں پکڑے پکڑے پھرتے رہیں اور اپنے حقیقی مقصد زندگی جہاد سے غافل ہو جائیں یہاں تک کہ ان کے دشمن ان پر چڑھ دوڑیں اور انہیں ذلیل وخوار کر کے چھوڑیں۔

امام محمدؒ کی اس رائے کی روشنی میں یہ حقیقت بالکل اجاگر ہوگئی ہے کہ اگرچہ زراعت ایک بابرکت پیشہ ہے لیکن اگر مسلمان اس میں اس قدر منہمک ہو جائیں کہ اپنے مقصد حیات اللہ کریم کے دین اور نبی کریم ﷺ کے مبارک طریقوں کی ترویج کے لئے جہاد کرنا کو ہی بھول جائیں تو پھر یہ زراعت کا پیشہ ان کے لئے موجب و ذلت ومسکنت ہوگا۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے اس مفہوم کے قریب تر بات کہی ہے فرماتے ہیں ''یہ جان لینا چاہئے کہ نبی کریم ﷺ کو ساری دنیا کی خلافت دے کر معبود فرمایا گیا تھا۔ لہذا ان کا دین تمام (منسوخ ومسخ

شدہ) ادیان پر جہاد اور ذرائع جہاد کی مکمل تیاری کے بغیر ناممکن ہے۔ پھر اگر مسلمان جہاد کا مقصد فریضہ چھوڑ کر بیوں اور گایوں کی دُموں کے پیچھے پیچھے پھرتے رہیں تو (اس کا نتیجہ اس کے سوا کیا ہوگا) کہ ذلت وپستی انہیں گھیر لے گی اور تمام دیگر ادیان والے انہیں مغلوب ومقہور بنا دیں گے'' (۱۵۶)

یہی توجیہ اس حدیث کے مفہوم کے بارے میں امام بخاریؒ نے اور ابن حزم ظاہری کی ہے۔ البتہ محدث داؤدی اور ان کے ہم خیال علمائے اسلام نے اس ارشادِ نبویؐ کا خاص سبب بیان کر کے اس حدیث کو محدود کر دیا ہے گویا ارشادِ عام معلوم ہوتا ہے لیکن اپنے خاص پس منظر کی وجہ سے یہ محدود اور خاص ہے۔ محدث داؤدیؒ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے یہ ارشاد مسلمانوں کی ایک خاص جماعت کو فرمایا۔ جو دشمنوں کی سرحدوں کے قریب آباد تھے اور زراعت میں مشغول تھے مگر الفاظِ حدیث نے اس کے حکم کو عام کر دیا حالانکہ آپ ﷺ کا ارشاد خاص موقع پر خاص قوم کے لئے تھا۔

محدث داؤدیؒ کے الفاظ یہ ہیں:۔

''نبی کریمؐ کی یہ وعید ایسی جماعت کے لئے ہے جو دشمنوں کی سرحدوں کے قریب رہتے ہوں۔ اس لئے اگر اس جماعت کے لوگ کھیتی باڑی میں مشغول ہو جائیں تو پھر وہ فنِ سپہ گری سے بے پروا ہو جائیں گے اور دشمن ان پر غالب ہو جائے گا البتہ جو لوگ ایسے لوگوں کے علاوہ ہیں ان کیلئے زراعت کا کام پسندیدہ ہے''

عظیم وجلیل اللہ کریم کا حکم ہے:

''وعدوا لهم ما استطعتم''. (۱۵۷)

ترجمہ: ''اور تیاری کرو ان دشمنوں کے مقابلے کے لئے جتنی تمہاری استطاعت ہو''

اور یہ جہاد کے لئے تیاری کا حکم ظاہر ہے زراعت کے بغیر نامکمل رہتا ہے کیونکہ جو لوگ سرحدوں پر اور دشمن کے قریب آباد ہیں وہ (بوجہ تیاری جہاد) کاشتکاری میں مشغول نہیں رہتے لہذا مسلمانوں پر واجب ہے کہ وہ ان کی ضروریات (خورد و نوش) کی تکمیل کیلئے زراعت کے ذریعے سے مدد کریں (۱۵۸)

غریب ان پڑھ اور غیر منظم کسانوں کے بیشتر زراعت سے یہ محنت کش طبقہ سے منسلک ہے۔ ابن متینؒ کا یہ مشاہدہ تو چھٹی صدی ہجری کا ہے جب غالباً نہ کارخانے تھے نہ روئی اور اناج غریب کسان کو کارخانہ داران کا سؤدی قرضہ چکانے کے لئے ان کے سپرد کرنا پڑتا تھا نہ امریکہ، برطانیہ مغربی جرمنی اور دیگر سرمایہ کار سرمایہ دار ممالک کا اس قدر غلبہ تھا کہ وہ زرعی ممالک کی خام پیداوار اونے پونے داموں خرید کر اس کی تیار شدہ مصنوعات ان غریب زرعی ممالک کو اتنے مہنگے داموں فروخت کرتے کے خام مال کی خریداری کے لئے ان ممالک کو دی ہوئی رقم بھی واپس لے لیتے۔ اور ساتھ اس قدر نفع حاصل کرتے کہ ان غریب ممالک کو مقروض اور معاشی غلام بنا کر چھوڑتے مگر آج یہ ظلم تمام طریقے اس مہذب انداز میں مروج اور مقبول ہیں کہ غریب کسان اور غریب ممالک سرمایہ داروں کا ظلم بھی برداشت کرتے ہیں اور اسلئے ان ممنون احسان بھی ہیں۔

: ... جو چاہے آپ کا ظلم کرشمہ ساز کرے۔

کس قدر افسوس ناک صورتحال ہے کہ زراعت پیشہ افراد کا اگر قومی اور ملکی سطح پر کارخانہ داران اور سرمایہ داران استحصال کرتے ہیں تو بین الاقوامی سطح پر سرمایہ دار صنعتی اور ترقی یافتہ ممالک زرعی ممالک کا استحصال کرتے ہیں گویا زراعت پیشہ طبقہ قومی اور بین الاقوامی دونوں سطح پر معاشی ظلم و جبر کا شکار ہے۔

اس ضروری بحث کے ساتھ دو سوال اور بھی ذہن میں ابھرتے ہیں جو اپنے جواب کا مطالبہ ہر ذی شعور انسان سے کرتے وہ سولات مندرجہ ذیل ہیں:

۱) کیا کاشتکاروں کے مظلوم طبقہ کی یہ صورت جس کی خبر نبی کریم ﷺ نے اس زمانہ میں دی جب موجودہ دور کے استحصال حربے بھی موجود نہیں تھے اس حقیقت کا اعتراف تو نہیں کراتا کہ آپؐ سچے نبی علیہ

السلام ہیں ۔

۲)   جس سچے نبی علیہ السلام نے وحی الٰہی کی روشنی میں اپنی پیغمبرانہ بصیرت سے بساطِ دنیا کے ان باریک ترین اور دقیق ترین حالات کو بھانپ لیا ہو ۔

اگر اس کا مجوزہ ''اسلام کا اقتصادی نظام'' اس دنیا کے لوگ قبول کر لیں تو کیا معاشی ظلم و تعدی کی تمام شکلیں ختم نہ ہو جائیں ۔ (۱۵۹)

مزارعت اور زمیندارانہ نظام کی شرعی حیثیت :

زراعت کو اسلام کے نظام معشیات میں نہ صرف اجازت بلکہ یہ کارِثواب بھی ہے ۔

اور فقہائے اسلام نے اسے فرض کفایہ کا درجہ دیا ہے کہ اگر تمام افراد امت یا ایک معاشرہ کے تمام افراد زراعت کے پیشے کو ترک کر دیں ۔ تو تمام افراد عنداللہ مجرم ہوں گے ۔ اب زراعت کی دو صورتیں ہی ممکن ہوسکتی ہیں ۔

۱)   کوئی شخص اپنی ذاتی زمین رکھتا ہو، اسے کاشت و برداشت کرتا ہو اور اس کا نفع خود اٹھاتا ہو ۔ اور دیگر انسانوں کو بھی اس سے نفع اٹھانے کا موقع مختلف صورتوں میں دیتا ہو ۔ مثلاً وہ اس کی پیداوار میں حیوان ، جانور ، پرند اور انسان بطور صدقہ خیرات کھا جائیں یا دیگر انسان اس کی پیداوار خرید کر استعمال کریں اور نفع اٹھائیں ۔

۲)   کوئی شخص کسی دوسے شخص کی زمین بٹائی یا اجارہ پے کر کاشت کرے اور مالک زمین کو معاہدہ کے مطابق حصہ یا معاوضہ دے اب جس شخص کی ہو زمین کاشت کرتا ہے اس کی دو شکلیں ہوں گی : یا تو وہ معمولی درجہ کا مالک زمین ہوگا ۔ مثلاً دس ، بیس ایکڑ رکھتا ہو، مگر وہ اپنی زمین خود کاشت نہ کرتا ہوگا اسے دوسرے شخص سے کاشت کراتا ہوگا ۔ دوسری شکل یہ ہے کہ وہ شخص اصطلاحی قسم کا زمیندار ہو جس کی زمین نہ ہو خود سنبھال سکتا ہو نہ اس کے بیٹے (نہ اس وہ اس کی ضرورت سمجھتے ہوں ۔) بلکہ وہ اپنی زمین کاشت ، برداشت اور دیکھ

....

بھال کا کام اپنے ہی جیسے محتاج انسانوں کو مزارعین بنا کر کراتے ہیں ۔ یہاں مالک زمین اپنی زمینداری کو پھلتا پھولتا دیکھنا چھاہتا ہے اور نظام مزارع کا اس کی معاونت کرتا نظر آتا ہے ۔

اب ہم ایک نہایت اہم سوال کی طرف آتے ہیں گو فقہائے اسلام نہایت شرح و بسط سے اس سوال کا جواب دے چکے ہیں اور ہم انہیں کے خیالات نقل کر رہے ہیں ۔ مگر ہمارا اس علمی اور دینی خدمت میں صرف اتنا حصہ ہوگا کہ ہم اس کو آسان اور قابل فہم طریقوں پر ترتیب دینے کی کوشش کریں گے ۔ وہ سوال یہ ہے :۔

کیا اسلام نے مزارعت کی اجازت دی ہے یا پھر اسلام موجودہ نظام زمیندری کی اجازت دیتا ہے ۔؟

اس سوال کا جواب سر کو جنبش نیچے اوپر دے کر اثبات میں میں یا ایک جنبش دائیں بائیں دے کر نفی میں دینا مشکل ہے نبی کریم ﷺ کے بعض صحابہ کرامؓ اور فقہاءِ اُمت کی آراء زمینداری اور مزارعت کے یکسر مخالف ہیں بعض حق میں ہیں اور بعض ان دونوں کے درمیان مشروط اجازت یا تطبیق کرتی ہیں ۔

ہم آسانی کی خاطر اس سوال کا جواب تین حصوں میں تقسیم کرتے ہیں :۔

۱) مزارعت اور زمینداری کے عدم جواز کی حیثیت

۲) مزارعت اور زمینداری کے جواز کی احدیث

۳) تطبیق اور اس سے متعلقہ روایت ہیں ۔(۱۶۰)

جدید اور اسلامی معاشیت کا موازنہ:

(Comparison of Modren and islamic Economics)

موجودہ دور میں اکثر ممالک شوشلزم اور کمیونزم کی گود میں لپکنے کی کوشش کر رہے ہیں ۔ چونکہ سرمایہ دارانہ نظام کو اب فرسودہ خیال کیا جا رہا ہے اور لوگ اس کے مظالم سے تنگ آ کر دوسرے نظاموں میں اپنی خلاصی گردانتے ہیں اسلامی نظام پر عمل درآمد نہیں کیا جا رہا۔ اور مسلمانوں نے اسے نہ صرف نظر انداز کر دیا

ہے۔ بلکہ اس کے ساتھ پیوند کاری بھی ایک گروہ کرنے لگا ہے۔ اس باب میں متروجہ نظاموں آپس میں مقابلہ کیا گیا ہے۔ تاکہ بہتر اور مکمل نظام پر پوری دلجمعی سے عمل کر کے اپنے دکھوں کا امداد کیا جا سکے۔

سید فصاحت ہمدانی نے اپنے مضمون ''معاشی مسائل کا اسلام حل'' میں ان نظاموں پر خوب تبصرہ کیا ہے (معاشی) جد و جہد میں حصہ لینے والوں کے دو طبقے ہیں۔

ایک تو وہ جو مادہ پرست ہیں اور دوسرے روحانیت کے قائل ہیں مادہ پرستوں کا ارتقاء غالباً اس دور سے ہوتا ہے جب نبی اسرائیل کے لئے من وسلویٰ نازل ہوتا تھا اور وہ لوگ معاشی پستی میں جا گرے تھے۔ اور غیر متوقع مصائب میں گھر جانے کے باوجود خدا کے وجود سے منکر نہ تھے اگر چہ بعض منکرین خدا کے وجود کے قائل نہ تھے انہوں عجیب وغریب ملحدانہ نظریات پیش کیے اور ان نظریات نے انسانوں کی فکر کو بدل ڈالا کہ انسانوں کی اصل بندر ہے اور وہ ترقی کی منازل سے گزر کر انسان بنا ہے اس کی بدولت انسان کے معاشی اور سماجی معاملات میں کش مکش جاری ہوئی۔

مشہور ماہر نفسیات ڈاکٹر میکڈوگل کہتا ہے کہ انسانی اعمال و افعال کی ذمہ داری اس کی جبلتوں پر ہے عقل بھی جبلتوں کے تابع ہے یوں انسان فکر معاش کا مسئلہ جبلت کا مرہون منت ہے اور اس میں اخلاقی قدروں کی کمی ہی نہیں بلکہ فقدان ہے۔

فرائیڈ اور بھی آگے نکل گیا تو کہنے لگا کہ انسان جنسی جذبات کی تسکین کے لیے سب کچھ کرتا ہے یعنی مذہب، علم وفکر سب ہی جنسی جذبہ کی تسکین کی خاطر ہیں۔ یعنی جنسی جذبہ کو ان سب سے سکون ملتا ہے، یوں اخلاقی قدروں کی وقعت ہی ختم ہو کے رہ گئی۔

کارل مارکس نے مذہبی تصور کو افیون کی گولی سے تعبیر کیا جو انسان کو بے حس اور بے عمل بنا دیتی ہے اسے ترقی کی منزلوں سے روکتی ہے مارکس کی تعلیم کا لب لباب یہ ہے کہ خدا کو جنت سے اور امارت کی زمین سے نکال دو، یہ مادی تصور ہے جس میں مارکس کا نظریہ حیات پنہاں ہے کہ وسائل معاش کی ترقی ہی وہ چیز ہے

جولوگوں کے باہمی تعلقات پر اثر ڈالتی ہے۔ کیونکہ ہر شخص زیادہ سے زیادہ وسائل پر قبضہ جمانا چاہتا ہے۔

اس کے بعد آج کا دور آتا ہے جس میں سرمایہ دارانہ نظام اور کمیونزم (اشتمایت) ہے ان کے ہیں ایک گروہ دونوں نظاموں سے کچھ خوبیاں تلاش کر کے ان پر چل رہا ہے کمیونزم میں شخصی آزادی کو اہمیت نہیں۔ اور وہ معاشرہ اجتماعی طور پر فلاح و بہبود کے لئے گامزن ہوتا ہے اس میں چونکہ ہر شخص کی صلاحیتیں برابر مان لی گئی ہیں اور یوں اخلاق اقدار پامال ہوگئیں۔

اس نظام میں جبر اور استعمال کے بعد فاضل چیز غیر ترقی یافتہ ملکوں میں کام آتی ہے۔ مگر مسئلہ وہی ہے کہ اخلاقی اقدار پامال ہورہی جائیں تو انسانیت ختم ہو جاتی ہے۔

انسان سرمایہ دارانہ نظام میں سرمایہ کا پرستار ہو جاتا ہے۔ سرمایہ دار کاروبار کرتا ہے۔ سود کا لین دین ہوتا ہے ملک کی دولت غلط طور پر تقسیم ہو جاتی ہے۔

موجودہ تجارت اور اس کے اثرات کے بارے میں پروفیسر جیم ہاروے رابنس کے الفاظ میں سرمایہ دارانہ نظام کی خرابی نظر آتی ہے وہ کہتا ہے کہ (جدید تجارت نے نسل انسانی کے خوش نصیب طبقہ کے لئے ایک قسم کی جنت بنادی ہے جس پر جنگ کا بڑا اثر پڑا اور جسے بہت سے اس کے سابقہ حسن بلکہ وقت کی تبدیلی کے ساتھ اس سے زیادہ حسین وجمیل دیکھنا پسند کرتے ہیں یہ ایک عجیب انسانی کامیابی ہے۔ تجارت قریب قریب ہمارا مذہب بن گئی ہے حکومت اس طرح تمیز کرتی ہے جس طرح کیلما، کا کوئی رومی شہنشاہ اور قرون وسطی کے شہزادے بچاتے تھے)

اس نظام میں دولت مند خوش ہے اور دوسروں سے بے نیاز ہے یوں ہمدردی کا جذبہ بٹ جاتا ہے ہمدردی مٹی تو اخلاقی برائیوں نے قبضہ جمایا اور یوں سرمایہ دارانہ نظام اور کمیونزم باطل ہوگیا۔

یہ ان دونوں نظاموں کا قصور ہے کہ دولتمند اقوام پسماندہ اقوام کو ان کی محبت، ایمان اور رضامندی حاصل کرنے کیلئے اپنی پیداوار سے بچا ہوا دے کر خوش کردیتی ہیں اور حقیقت میں یہ غلامی ہے انسان اپنی تسکین

کیلئے قانون کو ہاتھ میں لئے ہوئے ہوئے ہے چور بازاری، اسمگلنگ ذخیرہ اندوزی ڈاکہ زنی، رشوت ستانی غبن سازی اور بد دیانتی سے دولت کا حصول معمول بن چکا ہے۔

انسان جس طرح مشینی دور الجھا ہوا ہے اور ترقی کی راہ میں پر چل رہا ہے۔ چاند ستاروں پر زندگی کا متلاشی ہے اس کی حیات دنیا میں استوار نہیں وہ غیر یقینی حالت سے دوچار ہے۔ اپنے معاشی مسائل کا حل فطری طریقوں سے سوچتا ہے۔ انسانی معیشت کو نہیں سنبھالتا۔ انسانیت کو سہارا نہیں دیتا جو کو اس کی غلط پالیسیوں کے باعث بلک رہی ہے۔ خود کو سنبھالنے کے لئے اسلحہ کا سہارا لیتا ہے۔

لندن ٹائمز لکھتا ہے''

> اقتصادی خوشحالی کی تدابیر سے اشتراکیت کا مقابلہ کرنا جو مارشل ایڈ پلان کا خاص مقصد تھا کبھی بھی کامیاب نہ ہوگا اشتراکیت کے مذہب اور اس کی گہری حقیقت پر غور کرنا چاہئے کہ آخر ایک سچا مذہب یہی ہے جو جھوٹے مذہب کے ساتھ مقابلہ کرا کے اسے فنا کر سکتا ہے''۔ (۱۶۱)

ٹاؤنی لکھتا ہے:۔

> ''مذہب نے انسانی طمع پر بہت سے قیود عائد کئے رکھے تھے۔ سولہویں صدی کی تجارتی ترقی کے ساتھ ساتھ اس کے (مذہب) کے اقتدار کا مقابلہ میں طلب و رسد کے قانون اور نفع دولت راحت کے نام پر معاشیات اور مذہب کے درمیان ''طلاق'' واقع ہوگئی'' (۱۶۲)

یعنی مذہب اور اقتصادیات جدا جدا ہو گئے۔ اور حرام و حلال کی تمیز اور اچھے اور برے کی پہچان ختم ہو کر رہ گئی ہے۔ اور عملاً مذہب کو معاشیات سے الگ کر دیا۔

اسی طرح ایک تاریخی اعلان جو حضرت شعیبؑ کی قوم نے ان سے کہا تھا۔

اِن نفس فیَ اموالنا ِ ماتشاَ ء یعنی ہم اپنے اموال میں جو چاہیں کریں۔

نہوں نے حضرت شعیبؑ سے دریافت کیا تھا:۔

''تمہاری یہ پوجا پاٹ (صلواۃ) کیا اس سے بھی روکتی ہیں کہ ہم

اپنے مالیات سے متعلق جو چاہیں کریں''

گویا ان کے خیالات کے مطابق مذہبی عبادات کو انسان کے معاشی کاروبار سے کیا تعلق و سروکار ہوسکتا ہے یا وہ یہ سمجھتے ہوں کہ مذہب محض ایک پرسنل (ذاتی) اور شخصی مشغلہ کی حیثیت رکھتا ہے اگر اس صورت میں چاہے تو ہوسکتا ہے۔ مگر زندگی کے مجموعی اور عمومی شعبوں میں اس کی داخل اندازیوں کو برداشت نہیں کیا جاسکتا جیسا کہ آج کل مغرب زدہ چند افراد یہ سمجھتے ہوئے بنے گئے ہیں ان کے سامنے مذہب کوئی اہمیت اور وقعت نہیں رکھتا اور انہیں لوگوں نے قوموں کی زندگیاں تباہ و برباد کی ہیں جن کہ ناقص ذہن مادیت کے بغیر کسی پر ایمان نہیں رکھتے۔

ایک ماہر نقاد نے سرمایہ داری پر ان الفاظ میں ضرب لگائی ہے:۔

''سرمایہ داری کے طوفان بے پناہ نے ہر طرف وہ سراسیمگی پیدا

کردی تھی کہ اچھے اچھوں کے قدم اکھڑ جاتے تھے دولت و افلاس، ثروت و

فلاکت، ترقی و تباہی اور آبادی و بربادی کے محیر القول تضاد نے بے شمار

ایسے مسائل پیدا کر دیے تھے جن کا کسی کی سمجھ میں نہیں آتا تھا''۔

حقیقت یہ ہے کہ اشتراکیت معاشی نظام نہیں بلکہ قدرت کا انتقام ہے کیونکہ یہ سب کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکتا ہے اور جب سرمایہ داری کے سہام ستم جو اس قدر بڑھ گئے کہ لوگوں کا جینا دوبھر ہوگیا۔ تو ایک انقلاب سے اسے تتر بتر کر دیا گیا۔ دماغی اور جسمانی محنت کی اجرت یکساں ہونی چاہئے (اصولِ معاشیات) اعمالِ حکومت کی اجرت ایک کاریگر سے زیادہ نہیں ہونی چاہیے یہ ایک قسم کی غیر فطری تقسیم ہے۔

ڈسگ نے (اصول معاشیات) میں اس طرح تبصرہ قلمند کیا ہے:۔

''بلکہ سچ تو یہ ہے کہ اگلوں کا بالجبرہ تشدد، جسے اگلوں نے روا رکھا تھا صرف زبان اور قلم ہی کے تشدد تک محدود تھا۔لیکن پچھلو نے تو چھاتیوں پر چڑھ کر تلواروں کی دھار سے اپنے اس غیر فطری فعل میں کامیاب ہونے کی کوشش کی۔ بلکہ صحیح سمجھا جائے یا غلط۔مگر دنیا میں آرزوؤں سے دستبرداری کی دعوت دیتے ہوئے کسی نہ کسی شکل میں آئندہ زندگی ہی میں ہے۔

اسلام مکمل نظام حیات ہے جس کی بنیاد اللہ اور تسلسل زیست یعنی موت کے بعد کی زندگی، اچھے اور برے اعمال کی جزا وسزا پر ایمان ہے جناب رسالت مآبؐ ہمارے ہادی و رہبر اعظم ہیں جو سب نبیوں اور رسولوں کے سرتاج ہیں۔جن پر نبوت ختم ہوگئی کیونکہ آپؐ نے اس کا حق ادا کر دیا۔قرآن پاک اس دین کی کتاب ہدایت ہے اسلامی نظام کے برعکس سوشلزم کا باطل نظام ہے یہ بھی مکمل ہونے کا دعویدار ہے۔

یہودی کارل مارکس اس کا بانی تھا اس کی کتاب ''سرمایہ'' سے ہدایت تو کجا البتہ گمراہی ضرور ملتی ہے اسلام کی رد سے انسان اشراف المخلوقات ہے۔اور روئے زمین پر نائب ہے اسے عقل وشعور سے سرفراز کیا گیا۔اس کے اندر روح پھونکی گئی اشیاء کا علم دیا گیا کائنات کی قوتیں اس کی خاطر مسخر کر دی گئیں ہر انسان اپنے افعال کا جوابدہ ہے اسے وہی ملتا ہے جس کی کوشش کرتا ہے اس کے خلاف اشتراکیت میں انسان محض حیوان ہے اس کی ضروریات فقط خرد ونوش، رہائش اور تن ڈھانپنے تک محدود تک ہیں وہ آزادی سے کوئی فیصلہ خود نہیں کر سکتا کیونکہ اس نظام میں فرد کی کوئی اہمیت نہیں انسانوں کو ریوڑوں کی طرح ہانکا جاتا ہے۔اوقات کار اجرت، پیشہ وغیرہ تک مقرر۔سوچ پر پہرے، انداز فکر پر پابندی، کلام پر قدغن۔عمل شکنجے میں، غیرت، حریت خودداری، پاسداری، ذہنی، اخلاقی، روحانی ترقی ایسے الفاظ سوشلسٹ نظام میں شرمندہ معنی نہیں ہوتے۔خاوند باہر جائے تو نوجوان رفیقہ حیات اس کی سلامتی کے لئے دعا، بوڑھی بیوہ کا جوان سال لخت

جگر دہلیز سے باہر قدم رکھے تو والدہ کے دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی ہے کیونکہ ہمہ وقت قید و موت کا خطرہ لاحق رہتا ہے۔

اسلام نے مختلف متضاد معاشی نظاموں کے برعکس راہ اعتدال اختیار کی ہے۔ وہ فرد کو پورے شخصی اور فطری حقوق دیتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی تقسیم دولت کا توازن بھی قائم رکھتا ہے۔ ہر شخص کو ملکیت رکھنے اور اپنے مال میں چند حدود و قیود کے ساتھ تصرف کا حق بھی بخشتا ہے اقتصادی زندگی میں ہر فرد کا مفاد اور تمام افراد کا اجتماعی مفاد ایک دوسرے کے ساتھ گہرا ربط رکھتا ہے اس لئے دونوں میں مزاحمت کی بجائے موافقت و معاونت ہونی چاہئے۔ اسلام کا مقصد ہے کہ جماعت کے تمام افراد کی اقتصادی ضروریات پوری ہوں۔

اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اسلامی نظام معیشت ہی ایسا ہے جو معاشرے میں توازن برقرار رکھتا ہے معاشیات کا ایسا حل پیش کرتا ہے جس سے ہر فرد خوش وخرم رہ سکے۔ اوراس کی بنیادی ضروریات خود بخود پوری ہوتی رہیں۔ زندگی میں بعض لمحات ایسے بھی آتے ہیں جب انسان فاقہ کشی کے باعث انسانیت ورحمانیت تک کو فراموش کردیتا ہے اور وہ بغاوت وسرکشی پہ اتر آتا ہے کیونکہ (A Hungry mains an angryman) یعنی ایک بھوکا آدمی، ناراض شخص کے مترادف ہوتا ہے۔ مگر اسلام ایسی تدابیر عمل میں لاتا ہے کہ ایسی نوبت تک نہیں آتی۔ کیونکہ یہ سچا، مکمل اور خدائی مذہب ہے۔ یہ اخلاقی اقدار کی نہ صرف پابندی کراتا ہے بلکہ ان کی محافظت کا سامان بھی کرتا ہے۔ اسلام معاشی مسئلے کو انسان کی فلاح وترقی کی خاطر بڑی اہمیت دیتا ہے۔ اس نظام کا مقصد لوگوں کو رب تعالیٰ کی مرضی پہ چلانا ہوتا ہے اور اس کی ان گنت عطا کردہ نعمتوں کا صحیح اور جائز استعمال ہے۔

''اس شخص نے فلاح پائی جس نے اپنے نفس کا تزکیہ کرلیا۔ وہ نامراد ہوا جس نے اسے دبادیا۔،، (۱۶۳) یعنی بنیادی مسئلہ تزکیہ نفس ہے جس کی بے شمار مثالیں انبیاء کرام کی زندگی میں ملتی ہیں اسلام میں اعمال کی بنیاد پر جزا وسزا کا تصور پایا جاتا ہے اور موت کے بعد زندگی کا یقین بھی ہے۔ اس سے

انسان میں خوف خدا راسخ ہوتا ہے اور وہ خود اپنا محاسبہ کرنے کی عمل سعی کرتا ہے۔

اسلام سرمایہ کی غلط تقسیم کا حامی نہیں ہے اور نہ ہی وہ مخرب اخلاق حرکات وسکنات کی اجازت دیتا ہے۔ انسان روزی کمانے اور دولت سمیٹنے کی دھن میں سرگردان پھرتا ہے مگر اسے معلوم نہیں کہ روزی رساں تو رب تعالیٰ کی ذات گرامی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:۔

وَلٰکِنْ یُنزِلُ بقدر ما یشاء. (۱۶۴)

ترجمہ: لیکن نازل کرتا ہے وہ (اس رزق کو) اس پیمانے پر جس پر چاہتا ہے۔

قدرت ایک خاص پیمانے کے ذریعے رزق عطا کرتی ہے۔

مزید یوں فرمایا گیا ہے:

وَاِنْ من شیئیٍ الا عندنا خزائنه وما تنزله الا بقدرٍ معلوم. (۱۶۵)

ترجمہ: کوئی چیز نہیں ہے مگر اس کے خزانے ہمارے پاس ہیں اور انہیں نازل کرتے رہتے ہیں ہم ان کو، مگر ایک مقررہ پیمانے پر۔

اسی طرح ایک اور مقام پہ اس امر کی نشاندہی کی گئی ہے:۔

وما من دابه فی الارض الا علی الله رزقها ویعلم مستقرها ومستودعها (۱۶۶)

ترجمہ: اور نہیں ہے کوئی چلنے والا مگر اس کی روزی کی ذمہ داری خدا پر ہے، جانتا ہے اس کی قیام گاہ کو بھی اور جہاں سونپا جائے گا۔ اس کو بھی (جانتا ہے)۔

اسی طرح ایک اور جگہ بھی فرمایا گیا ہے۔ اور کتنے چلنے پھرنے والے ہیں کہ نہیں لادتے پھرتے میں

اپنی روزی کو اللہ ہی روزی پہنچاتا ہے ان کو بھی اور تم کو بھی ۔ وہی سننے والا اور وہی جاننے والا ہے۔،،
اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق کا امتحان بھی لیتا ہے اس لئے کبھی رزق میں کشادگی کر دیتا ہے اور کبھی تنگی کی حالت سے
واسطہ پڑتا ہے۔ چنانچہ قرآن مقدس میں ذکر کیا گیا ہے کہ:۔

(اور اپنی دو آنکھیں نہ اٹھاؤ ان کی طرف جنہیں جوڑے جوڑے کی
شکل میں ہم نے نعمتیں بخشی ہیں ۔ یہ سب پست زندگی کی تازگی ہے کہ ہم
امتحان لیں)

اسی طرح اس مضمون کو ایک اور جگہ پہ فرمایا:۔

ولا تمدن عینیک الی ما متعنا بہ ازواجا منھم ولا
تحزن علیھم (۱۶۷)

ترجمہ: اور اپنی دونوں آنکھوں کو نہ اٹھاؤ ان چیزوں کی طرف جن
سے جوڑے جوڑے رنگارنگ کی شکل میں ہم نے لوگوں کو سرفراز کیا اور نہ ہی
اس پر غم کھانا۔

ولا تتمنو امافضل اللہ بہ بعضکم علیٰ بعض (۱۶۸)

ترجمہ: اور نہ آرزو کیا کرو اس چیز کی جس کی وجہ سے خدا نے بعض کو
بعض پر برتری عطا کی ہے۔

رسول مقبولؐ نے فرمایا:

''من حسن اسلام المرء ترک مالایعنیہ'' .

ترجمہ: آدمی کے لیے اسلام کی خوبی کی دلیل یہ ہے کہ لاحاصل اور
بے نتیجہ باتوں کو ترک کر دے بلکہ یہاں تک کہہ دیا گیا ہے۔

''دنیا سے تیرے لیے یہ کافی ہے کہ جس سے تیری بھوک کا ازالہ
ہو جائے اور جس سے تیری ستر پوشی ہو جائے۔ اوران ہی کے ساتھ اگر کوئی
ایسی چیز بھی تجھے مل گئی جس کے سائے میں تُو ر (کسی کا گھر) تو پھر یہ تو ہے ہی،
اسی کے ساتھ اگر کوئی سواری بھی تجھے مل جائے تو پھر کیا کہنے۔،،
سورۃ طہٰ میں کیا گیا ہے۔

''ورزق ربک خیرو ابقیٰ''۔(۱۲۹)

تیرے مالک کی روزی تیرے لیے خیر بھی ہے ورزیادہ باقی رہنے
والی بھی ہے۔

آنحضورؐ کی بخاری ومسلم کے حوالے سے جو حدیث ملتی ہے۔فرمایا،تم میں سے جس کی نظر ایسے آدمی پر پڑے جسے مال ودولت میں اس پر برتری عطا کی گئی ہو تو چاہیئے کہ دیکھے اس وقت ان لوگوں کو جو مال ودولت کے حساب سے اس سے نیچے ہوں۔ ایک نہایت ہی اہم امر کی نشاندہی اس طرح کی گئی ہے کہ انسان اپنی ضرورتوں کو خدا کے حضور میں پیش کرسکتا ہے۔

چنانچہ ترمذی کی حدیث میں ہے:

(جس شخص پر فاقہ کی مصیبت نازل ہوئی اور اپنی اس حاجت کو اس
نے خدا کے سامنے پیش کیا تو قریب ہے کہ دیر یا سویر اس کے پاس روزی پہنچ
کر رہے گی)۔

مگر صد افسوس ہے کہ آج کے مسلمان نے اسلامی تعلیمات کو فراموشی کی کھونٹیں ڈال دیا ہے غیروں کے در پہ جبیں سائی کرتا ہے اور انکی دریوزہ کا دم بھرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی ضروریات کی تکمیل نہیں ہو پاتی۔

اگر صحیح طور پہ احکام محمدیؐ اور ارشادات قرآنی پہ عمل کیا جائے تو تمام مصائب ومسائل بہتر طور پہ حل ہو سکتے ہیں بالفاظ دیگر انسان توکل کو اپنا شعار بنائے اور اللہ پر بھروسہ کرے کیونکہ:۔

رب المشرق والمغرب لا اله هو. (۱۷۰)

اللہ کے سوا مشرق ومغرب کا اور کوئی پالنے والا نہیں ہے۔

سورۃ کہف میں ارشاد ہے:۔

ترجمہ:۔ اور روکے رکھو اپنے آپ کو ان لوگوں کے ساتھ جو اپنے مالک کو صبح وشام پکارتے ہیں ان لوگوں نے رب تعالیٰ کے وجہ (ذات) کو مقصود بنالیا ہے۔

اور اپنی دونوں آنکھوں کو نہ ہٹاؤ ان سے کیا مقصود بنانا چاہتے ہو پست زندگی کے بناؤ سنگار کو، ان لوگوں کی اطاعت نہ کرنا جن کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے غافل بنادیا ہے اور وہ پیچھے لگ گیا ہے وہ اپنی ہوا (من مانی) کے اور ہے بات اس کی حد سے گزری ہوئی۔ (۱۷۱)

☆ ☆ ☆

باب چہارم حوالہ جات

۱۔ علم معاشیات — پروفیسر ادریس احمد — سندھ ٹیکسٹ بورڈ سکھر ۱۹۷۳ء — ص:۵

۲۔ علم معاشیات — محولہ بالا — ص:۶

۳۔ القرآن الکریم — ۹۵:۴

۴۔ القرآن الکریم — ۵۱:۳

۵۔ القرآن الکریم — ۱:۱

۶۔ اسلام کا معاشی نظام — ڈاکٹر نور محمد غفاری — لاہور مرکز تحقیق سنگھ دیال لائبریری ۱۹۹۲ء — ص ۱۹

۷۔ اسلام کا معاشی نظام — محولہ بالا — ص ۲۰

۸۔ اسلام کا معاشی نظام — محولہ بالا — ص ۲۸

۹۔ حجۃ اللہ البالغۃ — شاہ ولی اللہ — لاہور مکتبہ سلفیہ ۱۲۹۶ء — ج:۲ ص:۷۹

۱۰۔ حجۃ اللہ البالغۃ — محولہ بالا — ج:۲ ص:۳۱۰

۱۱۔ القرآن الکریم — ۳۳،۴۳

۱۲۔ مشکوۃ المصابیح — ابوعبداللہ — کراچی قدیمی کتب خانہ ۱۹۸۵ء — ص:۲۴

۱۳۔ اسلامی معیشت — پروفیسر مہر محمد نواز خان — لاہور الویر نیویکس اردو بازار — ص:۳۹

۱۴۔ مشکوۃ المصابیح — ابوعبداللہ — کراچی قدیمی کتب خانہ ۱۹۸۸ء — ج:۲ ص:۲۴۲

۱۵۔ مشکوۃ المصابیح — محولہ بالا — ج:۲ ص:۲۴۲

۱۶۔ مشکوۃ المصابیح — محولہ بالا — ج:۲ ص:۳۷۵

۱۷۔ مشکوۃ المصابیح — محولہ بالا — ج ۲ ص:۳۷۵

۱۸۔ مشکوۃ المصابیح — محولہ بالا — ج ۲ ص:۳۷۱

۱۹۔ مشکوۃ المصابیح — محولہ بالا — ج ۲ ص:۳۷۳

۲۰۔ مشکوۃ المصابیح — محولہ بالا — ج:۲ ص:۲۴۲

۲۱۔ مشکوۃ المصابیح — محولہ بالا — ج:۲ ص:۳۵۳

۲۲۔ ریاض الصالحین — محی الدین ابو زکریا بن شرف — لاہور سہیل اکیڈمی ۱۹۷۳ء — ص:۳۲

۲۳۔ مجمع الزوائد — علی بن ابی بکر بن سلیمان الہیثمی — بیروت دار الکتب العلمیۃ ۱۹۷۶ء — ج:۴ ص:۶۳

۲۴۔ ابن ماجہ — ابوعبداللہ محمد بن یزید ماجہ — کراچی سعید اینڈ کمپنی ۱۹۸۶ء — ص:۲۸۰

۲۵۔ طبرانی — سلیمان بن احمد طبرانی — بغداد، المکتبۃ الوطنیۃ، ۱۹۸۴ء — ج:۲۰، ص:۹۰

۲۶۔ مشکوۃ المصابیح — محولہ بالا — ج:۲، ص:۲۶۵

۲۷۔ مشکوۃ المصابیح — محولہ بالا — ج:۲، ص:۲۵۸

۲۸۔ القرآن الکریم — ۴۲.۵

۲۹۔ مشکوۃ المصابیح — محولہ بالا — ج:۲، ص:۳۲۶

۳۰۔ القرآن الکریم — ۷:۵۹

۳۱۔ ابوداؤد — ابی داؤد سلیمان — مکۃ المکرمۃ، داراحیاء السنۃ النبویۃ ۱۲۷۵ھ۔ حدیث نمبر
:۱۵۳۹، ج:۲، ص:۹۰

۳۲۔ مشکوۃ المصابیح — محولہ بالا — ص:۴۰۱

۳۳۔ صحیح مسلم شریف — الامام ابی الحسین المسلم بن الحجاج، بیروت، مکتبہ دارالخیر ۱۴۰۳ھ۔ حدیث
:۲۰۲۵، ج:۳، ص:۲۵۲

۳۴۔ صحیح مسلم شریف — محولہ بالا
حدیث:۱۷۲۸، ج:۳، ص:۲۵۵

۳۵۔ ابن ماجہ — محولہ بالا — ص:۲۴۵

۳۶۔ معارف الحدیث — منظور احمد نعمانی — کراچی، دارالاشاعت ۱۹۸۳ء — ج:۶، ص:۱۱۱

۳۷۔ صحیح مسلم — محولہ بالا
حدیث:۱۷۲۸، ج:۳، ص:۲۵۵

۳۸۔ مشکوۃ المصابیح — محولہ بالا — ج:۲، ص:۲۵۸

۳۹۔ مشکوۃ المصابیح — محولہ بالا — ج:۲، ص:۲۴۲

۴۰۔ مشکوۃ المصابیح — محولہ بالا — ج:۲، ص:۳۲۶

۴۱۔ بیہقی — امام بیہقی — حیدرآباد دکن ۱۳۳۵ھ — ص:۱۵

۴۲۔ مشکوۃ المصابیح — محولہ بالا — ج:۲، ص:۴۳۰

۴۳۔ معارف الحدیث — محولہ بالا — ج:۶، ص:۱۱۱

۴۴۔ مشکوۃ المصابیح — محولہ بالا — ج:۲، ص:۲۵۰

۴۵۔ مشکوۃ المصابیح — محولہ بالا — ج:۲، ص:۴۲۴

۴۶۔ مشکوۃ المصابیح — محولہ بالا — ج:۲، ص:۲۵۴

۴۷۔ مشکوۃ المصابیح — محولہ بالا — ج:۲،ص:۲۵۹

۴۸۔ مشکوۃ المصابیح — محولہ بالا — ج:۲،ص:۱۶۲

۴۹۔ مسلم شریف — محولہ بالا — حدیث:۱۵۵۲، ج:۳،ص:۳۹

۵۰۔ مسلم شریف — محولہ بالا — حدیث:۹۹۴، ج ۲،ص:۱۳۵

۵۱۔ مشکوۃ المصابیح — محولہ بالا — ص:۱۹۵

۵۲۔ ترمذی — ابوعیسیٰ محمد بن عیسیٰ کراچی، دارالاشاعت، ۲۰۰۱ء حدیث:۳۴۸۹، ج:۲،ص:۴۸۶

۵۳۔ مشکوۃ المصابیح — محولہ بالا — ج:۲،ص:۴۴۸

۵۴۔ مشکوۃ المصابیح — محولہ بالا — ج:۲،ص:۴۴۳

۵۵۔ مشکوۃ المصابیح — محولہ بالا — ج:۲،ص:۱۶۳

۵۶۔ مشکوۃ المصابیح — محولہ بالا — ج:۲،ص:۱۶۳

۵۷۔ مشکوۃ المصابیح — محولہ بالا — ج:۲،ص:۲۶۵

۵۸۔ صحیح مسلم شریف — محولہ بالا — حدیث:۱۰۰۲، ج:۲،ص:۱۵۰

۵۹۔ مشکوۃ المصابیح — محولہ بالا — ج:۲،ص:۲۶۳

۶۰۔ صحیح مسلم شریف — محولہ بالا — حدیث:۱۰۰۳، ج:۲،ص:۱۵۰

۶۱۔ صحیح مسلم شریف — محولہ بالا — حدیث:۱۰۰۴،ص:۲،ص:۱۵۰

۶۲۔ مشکوۃ المصابیح — محولہ بالا — ص:۲۷۳

۶۳۔ مشکوۃ المصابیح — محولہ بالا — ص:۴۲۲

۶۴۔ مشکوۃ المصابیح — محولہ بالا — ص: ۲۵

۶۵۔ مشکوۃ المصابیح — محولہ بالا — ص:۳۷۵

۶۶۔ مشکوۃ المصابیح — محولہ بالا — ص:۱۷۰

۶۷۔ مشکوۃ المصابیح — محولہ بالا — ص:۴۱۸

۶۸۔ مشکوۃ المصابیح — محولہ بالا — ص:۲۵۰

۶۹۔ مشکوۃ المصابیح — محولہ بالا — ص:۲۲۲

۷۰۔ مشکوۃ المصابیح — محولہ بالا — ص:۲۶۰

۷۱۔ مشکوۃ المصابیح — محولہ بالا — ص ۲۶۴

۷۲۔ مشکوۃ المصابیح — محولہ بالا — ص:۱۵۵

٧٣۔ مشکوۃ المصابیح محولہ بالا ص:٤١٣

٧٤۔ مشکوۃ المصابیح محولہ بالا ص:٢٤٣

٧٥۔ مشکوۃ المصابیح محولہ بالا ص:٤٤٠

٧٦۔ مشکوۃ المصابیح محولہ بالا ص ٤٤١

٧٧۔ مشکوۃ المصابیح محولہ بالا ص ٤٤٢

٧٨۔ اسلامی معیشت محولہ بالا ص ٦٤

٧٩۔ القرآن الکریم ٢٦:١٧

٨٠۔ اسلام اور جدید معیشت وتجارت محولہ بالا ص ٦٩

٨١۔ القرآن الکریم ٣:٥

٨٢۔ اسلامی معیشت محولہ بالا ص ٩٦

٨٣۔ اسلامی معیشت محولہ بالا ص:٩٩

٨٤۔ اسلام اور جدید معیشت وتجارت محولہ بالا ص:٢٩

٨٥۔ اسلام اور جدید معیشت وتجارت محولہ بالا ص:٣٢

٨٦۔ القرآن الکریم ٧٠:٢٥

٨٧۔ القرآن الکریم ١٤١:٦

٨٨۔ اسلام اور جدید معیشت وتجارت محولہ بالا ص:٩٤

٨٩۔ الجواہر النقی حافظ ماردینی حیدرآباد دکن، ١٣٣٥ھ ج ٤، ص:١٤٩

٩٠۔ اسلام اور جدید معیشت وتجارت محولہ بالا ص:٩٦

٩١۔ اسلام اور جدید معیشت وتجارت محولہ بالا ص:١٠٠

٩٢۔ حجۃ اللہ البالغۃ محولہ بالا ج ١، ص:٩٧

٩٣۔ حجۃ اللہ البالغۃ محولہ بالا ج ١، ص:٣٤٠

٩٤۔ حجۃ اللہ البالغۃ محولہ بالا ج ١، ص:٤٠

٩٥۔ حجۃ اللہ البالغۃ محولہ بالا ج ٢، ص:١٠٣

٩٦۔ تاریخ دعوت وعزیمت محولہ بالا ج ٥، ص:٣٢٨

٩٧۔ تاریخ دعوت وعزیمت محولہ بالا ج ٥، ص:٣٢٨

٩٨۔ تاریخ دعوت وعزیمت محولہ بالا ج ٥، ص:٣٣٥

٩٩۔	حجۃ اللہ البالغۃ	محولہ بالا		ج:٢،ص:١٧٩
١٠٠۔	حجۃ اللہ البالغۃ	محولہ بالا		ج:٢،ص:١٨٠
١٠١۔	حجۃ اللہ البالغۃ	محولہ بالا		ج:٢،ص:٥٨
١٠٢۔	حجۃ اللہ البالغۃ	محولہ بالا		ج:١،ص:١٠٤
١٠٣۔	حجۃ اللہ البالغۃ	محولہ بالا		ج:٢،ص:١٥٥
١٠٤۔	حجۃ اللہ البالغۃ	محولہ بالا		ج:٢،ص:١٠٥
١٠٥۔	حجۃ اللہ البالغۃ	محولہ بالا		ج:٢،ص:٠٣
١٠٦۔	معاشیات مقاصد اور منہاج	ڈاکٹر ذاکر حسین		ص:١١
١٠٧۔	معاشیات مقاصد اور منہاج	محولہ بالا		ص:٨٠
١٠٨۔	البدایہ والنہایہ	حافظ ابن کثیر	بیروت، لبنان، دار الفکر ١٤١٨ھ	ج:٥،ص:٢٣
١٠٩۔	القرآن الکریم	٢٢٥:٢		
١١٠۔	القرآن الکریم	١٨٠:٧		
١١١۔	القرآن الکریم	٢٦:١٠		
١١٢۔	القرآن الکریم	٦:٢٠		
١١٣۔	القرآن الکریم	٧١:٣٦		
١١٤۔	القرآن الکریم	٦٣:٥٦		
١١٥۔	القرآن الکریم	٣٣:٢٠		
١١٦۔	القرآن الکریم	٥٧		
١١٧۔	القرآن الکریم	٦١:٦		
١١٨۔	القرآن الکریم	٣٧:٧		
١١٩۔	القرآن الکریم	٥:١٤		
١٢٠۔	القرآن الکریم	٧٧:٢٨		
١٢۔	القرآن الکریم	٦٦:٢٨		
١٢٢۔	اسلام کا معاشی نظام	محولہ بالا		ص:٦٩
١٢٣۔	القرآن الکریم	٣:٨٤		
١٢٤۔	القرآن الکریم	٢٢:٢		

۱۲۵۔ القرآن الکریم ۵۲:۲۰

۱۲۶۔ القرآن الکریم ۳۰:۸۸

۱۲۷۔ القرآن الکریم ۴۰:۳۵

۱۲۸۔ القرآن الکریم ۱۹:۷۱

۱۲۹۔ القرآن الکریم ۲:۷۸

۱۳۰۔ القرآن الکریم ۴۳:۱۳

۱۳۱۔ القرآن الکریم ۱۱۰:۷

۱۳۲۔ القرآن الکریم ۱۵:۱۲

۱۳۳۔ القرآن الکریم ۷:۵۰

۱۳۴۔ القرآن الکریم ۳:۳

۱۳۵۔ القرآن الکریم ۳۰:۸۷

۱۳۶۔ القرآن الکریم ۱۲۴:۲

۱۳۷۔ القرآن الکریم ۲۲:۲

۱۳۸۔ القرآن الکریم ۷:۱۳

۱۳۹۔ القرآن الکریم ۱۰:۱۲

۱۴۰۔ القرآن الکریم ۲:۲۰

۱۴۱۔ القرآن الکریم ۷:۶۳

۱۴۲۔ القرآن الکریم ۲۲:۵۱

۱۴۳۔ القرآن الکریم ۱۳:۳۵

۱۴۴۔ القرآن الکریم ۲۶:۳

۱۴۵۔ القرآن الکریم ۲۸:۳۰

۱۴۶۔ القرآن الکریم ۲۲:۵

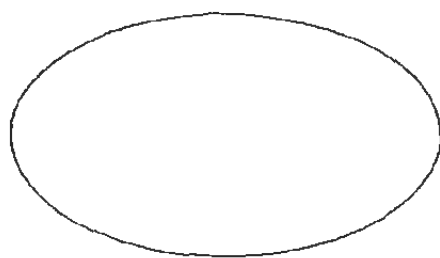
۱۴۷۔ اسلام کا معاشی نظام محولہ بالا ص:۸۱

۱۴۸۔ القرآن الکریم ۲۳:۵۶

۱۴۹۔ القرآن الکریم ۱۴:[illegible]

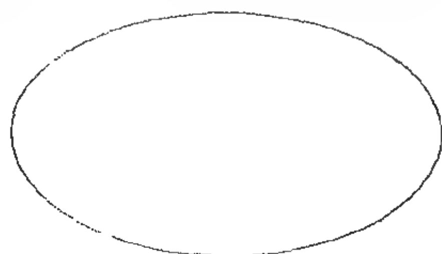
۱۵۰۔ صحیح بخاری امام محمد بن [illegible] قدیمی کتب خانہ ۱۹۶۰ء، ص:۴۵۲

نمبر	کتاب	مصنف	ناشر	حوالہ
۱۵۱۔	مجمع الزوائد	حافظ نورالدین	قاہرہ، مکتبۃ القدوس، ۱۳۵۲ھ	ج:۴،ص:۶۳
۱۵۲۔	المبسوط	شمس الدین السرخسی	مصر، مکتبہ اسعادت، ۱۳۳۱ھ	ج:۲،ص:۲۲
۱۵۳۔	کتاب الفقہ علی المذاہب الاربعۃ	عبدالرحمن جزیری	بیروت، لبنان، ۱۹۷۲ء	ج:۲،ص:۱۲
۱۵۴۔	مشکوۃ المصابیح	محولہ بالا		ص:۲۵۷
۱۵۵۔	المبسوط	محولہ بالا		ج:۴،ص:۸۳
۱۵۶۔	حجۃ اللہ البالغۃ	محولہ بالا		ج:۲،ص:۱۷۳
۱۵۷۔	القرآن الکریم	۶۰:۸		
۱۵۸۔	اسلام کا معاشی نظام	محولہ بالا		ص:۸۷
۱۵۹۔	اسلام کا معاشی نظام	محولہ بالا		ص:۸۹
۱۶۰۔	اسلامی معاشیات	مہر محمد نواز خان	لاہور، ایورنیو بک پبلشرز اردو بازار، ۱۹۹۴ء	ص:۴۰۰
۱۶۱۔	اسلامی معاشیات	محولہ بالا		ص:۴۰۱
۱۶۲۔	اسلامی معاشیات	محولہ بالا		ص:۴۰۳
۱۶۳۔	القرآن الکریم	۴۲:۲۷		
۱۶۴۔	القرآن الکریم	۲۱:۱۵		
۱۶۵۔	القرآن الکریم	۶:۱		
۱۶۶۔	القرآن الکریم	۸۸:۴۹		
۱۶۷۔	القرآن الکریم	۹۳:۴		
۱۶۸۔	القرآن الکریم	۳۲:۴		
۱۶۹۔	القرآن الکریم	۱۳۲:۲۰		
۱۷۰۔	مشکوۃ المصابیح	محولہ بالا		ص:۴۴۷
۱۷۱۔	القرآن الکریم	۹۷:۳		





باب پنجم



باب پنجم

فصل اول

تعاون باہمی معاشیات کی بنیادی قدر

شاہ صاحب کی نظر میں:

شاہ صاحبؒ انسانی معاشرہ میں تعاون اور اشتراک کی کارفرمائی دیکھنا چاہتے ہیں آپ غیر فطری مساوات کے بھی قائل نہیں ہیں بلکہ پورے انسانی معاشرہ کو ایک خاندان یا ایک جسم کے مختلف اعضاء کی طرح دیکھنا چاہتے ہیں وہ تحریر کرتے ہیں:۔

''و ذالک ان اللہ ارادا فی العالم انتظام امرھم وان یعاون بعضھم بدھناوان لا یظلم بعضھم و انیتالف بعضھم ببعض و یصیروا کجسد رجل واحد اذا تالم عضو منہ تداعی لہ سائر الاعضاء بالحی والسھر'' (۱)

ترجمہ ''اللہ تعالیٰ کو دنیا کا انتظام اس طرح قائم رکھنا منظور ہے کہ افراد معاشرہ ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کریں اور ایک دوسرے پر ظلم نہ کریں اور آپس میں محبت والفت قائم رکھیں اور ایسے ہو جائیں جیسے کہ بدن کے اعضاء ہوتے ہیں کہ جب کسی عضو کو تکلیف ہو تو سارا بدن اس کے بخار اور بے چینی کو محسوس کرے''۔

''اعلم انہ اوجبت الحکمۃ ان تکون السنہ بینھم ان ینعاون اھل الحی فیما بینھم، یتمنا صبروا و بتوا سوا وان

يجعل كل واحد ضرر الاخرو نفعه بمنزلة ضرر نفسه''(۲)

ترجمہ: یاد رہے کہ حکمت خداوندی نے لوگوں کے درمیان اس طریقہ کولازم کیا کہ اہل قبیلہ اور اہل محلہ آپس میں ایک دوسرے سے تعاون اور ہمدردی کریں حتی کہ ہرایک ان میں سے ایک دوسرے کے نفع ونقصان کو اپنا فائدہ اورضرورخیال کرے''۔

آپ نے اس ضمن میں باہمی تعاون واشتراک کے مختلف میدانوں اورتقاضوں کا ذکرفرمایا ہے ان پر مختلف عنوانات کے ساتھ بحث فرمائی ہے جن میں سے چندایک مندرجہ ذیل ہیں۔

ا۔حقوق ملکیت:

اللہ تعالیٰ نے انسان کوزمین پر پیدا کر کے اس کی روزی کا سامان بھی یہیں فراہم کر دیا ہے اور سب انسانوں کومساوی طور پر اس سے انتفاع کا حق دیا ہے مگر انسان کی خودغرضانہ مسابقت اور باہمی تنازع کو روکنے کیلئے یہ قاعدہ مقرر کیا گیا ہے کہ جوشخص کسی قطعہ زمین سے سب پہلے نفع حاصل کرنا شروع کر دے وہ اسی کی ملکیت ہوگی اب کسی دوسرے کوحق نہیں کہ اس سے انتفاع کر سکے تاوقتیکہ یہ مالک اول برضائے خود دوسرے کواسے نہ دے یا مبادلہ کے لئے آمادہ نہ ہوجائے اسی کا نام حق ملکیت ہے شاہ صاحب ملکیت زمین پر تحریرفرماتے ہیں۔

''ان الكل مال الله ليس فيه حق لا حد فی الحقيقة لكن الله لما اباح لهم الانتفاع بالارض و مافيها وقعت المشاحة فكان الحكم حينئذ ان لا يهيج احد مما سبق اليه من غير مضارة فالارض الميتة التی ليست فی البلاد ولا فی فناء ها اذا عمرها رجل فقد سبقت يده اليها من غير

مضارة فمن حکمه الا یهیج عنها والارض کلها فی الحقیقة بمنزلة مسجد او رباط جعل وقفا علی ابناء السبیل و هم شرکاء فیقدم السبق فالاسبق و معنی الملک فی الحق الادمی کونه احق بالانتفاع من غیره'' (۳)

ترجمہ: ''سب مال اللہ تعالی کا ہے اسمیں کسی کا حق نہیں ہے لیکن چونکہ اللہ تعالی نے زمین اور اس کی پیداوار سے فائدہ اٹھانے کی اجازت دیدی تو لوگوں نے حرص اور بخل کا اظہار شروع کر دیا اسلئے قاعدہ یہ بنایا گیا کہ جو شخص کسی زمین پر پہلے قبضہ کرے بشرطیکہ اس سے کسی کو نقصان اور ضرر نہ پہنچتا ہو تو اسے فائدہ اٹھانے سے نہ ہٹایا جائے لہذا غیر کاشت شدہ اس زمین کو جو شہر اور اس مضافات میں نہ ہو جو شخص پہلے کاشت کرے، بشرطیکہ اس سے کسی کو نقصان نہ پہنچتا ہو تو اسکا حکم یہ ہے کہ اسے نہ ہٹایا جائے اور ساری زمین حقیقت میں مسجد یا سرائے کی حیثیت رکھتی ہے یہ آنے والوں کیلئے وقف ہے اور سب لوگ اسمیں برابر کے شریک ہیں مگر جو پہلے آکر قبضہ کرے وہ اسکا مالک بن جاتا ہے اور زمین پر کسی کے قبضہ کے صرف یہ معنی ہیں کہ وہ دوسرے شخص کی نسبت اس قطعہ زمین سے فائدہ اٹھانے کا حق رکھتا ہے۔

ملکیت کے اس پس منظر کے بعد اسکے مبادلہ کی مختلف شکلیں سامنے آتی ہیں آپ بتاتے ہیں کہ اس تقسیم اور مبادلہ کیلئے قانونی اور آئینی رو رعایت رکھنا ضروری ہے تاکہ یہ تصرفات لوگوں کیلئے معاشی ابتری کا باعث نہ بننے پائیں یوں اسلام کے نظام معیشت میں ایک فرد کا سرمایہ دوسرے فرد کیلئے رحمت ثابت ہو نہ کہ زحمت۔

۲) مباح اشیاء پر عدم ممانعت:

آپ کے نزدیک تمدن کا ایک طبعی قانون یہ بھی ہے کہ جو چیزیں اللہ تعالی نے عام فائدے کیلئے پیدا کی ہیں انہیں حتی الامکان اسی شکل میں رہنا چاہیے کہ ہر شخص ان سے استفادہ حاصل کر سکے وہ تحریر فرماتے ہیں:۔

''و منها ان یکون الشئی مباح الاصل کالما العد فیتعلب ظالم علیه فیبیة و بذالک تصرف فی مال الله من غیر حق و اضرار بالناس و بذالک نهی النبی ﷺ عن بیع فضل الماء لیباع به الکاء اقول هو ان یتغلب رجل علی عین او وارد فلا یدع احد لیسقی منه ماشیة الا باجر فانه یفضی الی بیع الکلاء المباح یعنی یصیر الرعی من ذالک بازاء مال و هذا باطل لان الماء الکلاء مباحان و هو قوله ﷺ یقول الله تعالیٰ الیوم امنعک فضلی کما منعت فضل مالم تعمل یداک'' (۴)

ترجمہ: منجملہ بیوع محرمہ کے ایک یہ ہے کہ کوئی چیز دار اصل مباح ہو مثلاً چشموں کا پانی لیکن کوئی ظالم اس پر زبردستی قبضہ کر کے اس کو بیچنا شروع کر دے یہ اس لئے منع ہے اور ایسا کرنا اللہ کے مال میں ناحق تصرف کرنا ہے اور اس سے عام لوگوں کو ضرر پہنچتا ہے اسی وجہ سے حضور ﷺ نے فالتو پانی کی فروخت شروع نہ ہو جائے میں (ولی اللہ) کہتا ہوں اس سے مراد یہ ہے کہ ایک آدمی کسی وادی یا چشمے پر قبضہ کر لے اور کسی چوپائے کو اجرت و معاوضہ کے بغیر پانی پینے نہ دے تو نوبت یہاں تک پہنچ جائے کہ مباح

گھاس بھی بکنے لگے گی اور یہ باطل ہے کیونکہ پانی اور گھاس دونوں مباح ہیں اور حضور ﷺ نے یہ فرمایا کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ایسے شخص سے فرمائے گا کہ میں آج اپنا فضل تجھ سے روکتا ہوں جیسے تو نے اس فضل (مباح اشیاء) کو روک رکھا تھا۔

۳: پیشوں کی آزادی:

مختلف پیشوں اور مکاسب کے اختیار میں آپ کے نزدیک حکیمانہ طرز عمل ہے یہ ہے کہ ہر فرد کو اس کی ذہنی وجسمانی استعداد اور ضروریت کے مطابق پیشوں کے اختیار کرنے کی آزادی ہونی چاہیے اسی طرح ایسے مواقع پیدا کرنا بھی ضروری ہے کہ معاشرہ کا کوئی فرد بے کار نہ بیٹھے بلکہ تمدن کی اصلاح وترقی کیلئے ضروری کاموں میں حصہ لے۔

لما كان الناس مدنيين بالطبع لا تستقيم معايشتهم الا بتعاون بينهم والا يخلو احد منهم مماله دخل فى التمدن الا عند حاجة لا يجد منها بدا (۵)

ترجمہ: چونکہ تمام انسان مدنی الطبع ہیں اس لئے ان کی معیشت ان کے باہمی تعاون کے بغیر درست نہیں ہو سکتی۔ اس لئے حکم ہوا کہ تمام لوگ باہمی تعاون سے کام لیں اور یہ بھی حکم ہوا کہ جس چیز کو تمدن میں دخل ہے کوئی آدمی کسی شدید حاجت کے بغیر اس سے خالی نہ رہے''۔

اس کا حاصل یہ ہے کہ معاشی میدان میں مناسب پیشے کا حصول ہر کسی کا حق ہے پیشہ کے اختیار کرنے میں طبائع اور حالات وظروف کی رورعایت رکھنا ضروری ہے تاکہ انسان کے ذہنی وجسمانی وقوی کا مناسب استعمال ہو اور زیادہ سے زیادہ حصول پیداوار میں شریک ہونے کے عمل میں ایک روح کارہوتی ہے جسے شاہ صاحب تعاون باہمی سے یاد کرتے ہیں۔

۴: عدل ومساوات کی روح:

شاہ صاحب معاشرے میں عدل ومساوات کی روح دیکھنے کے خواہاں ہیں وہ اسے انسانی معاشرے کی اصلاح وترقی کا سنگ بنیاد قرار دیتے ہیں وہ صفت عدالت کی مختلف شعبہ ہائے زندگی میں جلوہ افروزی کو یوں بیان کرتے ہیں۔

''والعمدة فی تحصیلها الرحمة والمودة ورقة القلب و عدم قسوته مع الانقیاد الفكار الكیه والنظر فی عواقب الامور'' (٦)

ترجمہ: اس صفت کے حصول کا طریقہ یہ ہے کہ جذبہ ہمدردی ومحبت کو عمل میں لایا جائے اور قساوت قلبی اور سنگدلی سے اجتناب کیا جائے اسکے ساتھ ہی اجتماعی امور (افکار کلیہ) کی رعایت اور دوراندیشی بھی پیش نظر ہو۔

یہی وجہ ہے کہ شاہ صاحب مواسات پر مبنی فضا قائم کرنے کے لئے غیر منصفانہ اور امتیازی سلوک سے نفرت کا اظہار کرتے ہیں وہ گھر جو اجتماعیت کی پہلی اکائی ہے عدل کا آغاز کر کے ملکی سطح پر اس کے تحفظ پر زور دیتے ہوئے درج ذیل حدیث نبوی ﷺ پیش کرتے ہیں۔

''و قال علیه السلام فیمن ینحل بعض او لاده مالم ینحل الا خر ایسرک ان یکونوا الیک فی البر سواء قال بلی قال فلا اذا'' (٧)

ترجمہ ایک صحابیؓ نے اپنے بیٹے کو بخشش دی جو دوسروں کو نہیں دی آپ کو اس کا علم ہوا تو آپ ﷺ نے اس سے فرمایا کیا تم یہ نہیں چاہتے کہ وہ سب تمہارے فرمانبردار ہیں؟ عرض کیا کیوں نہیں! آپ ﷺ نے فرمایا پس اس طرح بے انصافی نہ کرو۔

اس کا حاصل یہ ہے کہ شاہ صاحبؒ زندگی کے تمام شعبوں میں عدل کی حکمرانی چاہتے ہیں اور اس کے نتیجہ میں مواسات وہمدردی پر مبنی تمدن وجود میں آتا ہے۔

۵ : احسان وتبرع:

شاہ صاحب معاشرے کے محروم افراد اور طبقات کی اعانت کی انسانی سوسائٹی کی اہم ضرورت قرار دیتے ہیں اور معاشرے کا ایک ایسا ہمہ گیر اصول قرار دیتے ہیں جو ہر صالح انسانی معاشرے میں ہمیشہ سے ایک مسمہ کلیہ کی حیثیت سے تسلیم کیا جاتا رہا ہے۔

چنانچہ وہ اس کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

> ولما كان انتظام المدينه لا يتم الا بانشاء الفة و محبة بينهم و كانت الالفة كثيرا ما تفضى الى بذل المحتاج اليه بلا بدل او تتوقف عليه انشعبت الهبة والعارية و ولاتتم ايضا الا بمواساة الفقرا انشعبت الصدقة (۸)

> ترجمہ: ''مملکت کا نظام اس صورت میں ممکن ہوسکتا ہے کہ لوگوں کے درمیان محبت اور الفت پیدا کی جائے اور عام طور پر الفت پیدا کرنے کیلئے ضروری ہے کہ ضرورت کی چیز بلا معاوضہ دوسرے کو دی جائے چنانچہ اس وجہ سے ہبہ، قرض اور لین دین کی صورتیں پیدا ہوئیں اور اس طرح فقراء کی ہمدردی کیلئے صدقہ خیرات کی ضرورت پیش آئی''۔

احسان وتبرع کی اس روح کو پانے کی خاطر اس کی مختلف شکلیں ہیں۔

شاہ صاحب نے ان کا احصاء درج ذیل انواع میں کیا:۔

۱: زکوۃ صدقات واجبہ:

(زکوۃ وصدقات واجبہ وغیرہ) اس سے مراد وہ نفقات ہیں جن کا مقصد رضائے الٰہی کا حصول ہو اور

اس کے مصارف وہی ہیں جن کا ذکر قران کی اس آیت میں ہے :۔

''انما الصدقات للفقراء الخ'' (۹)

۲: ہدیہ:

ہدیہ بلاعوض اعطاء ہے جس کا مقصد اپنے دوست کو خوش کرنا ہے اس سے لوگوں کے دمیان رشتہ الفت پیدا ہوتا ہے چنانچہ جس شخص کو کوئی ہدیہ دیا جائے اسے چاہیے کہ ہدیہ کے بدلہ میں اس قسم کا ہدیہ دینے والے کا شکریہ ادا کرے ہدیہ دے کر واپس لے لینا بخل اور کنجوسی ہے اور پھر یہ انسان کے وقار کے بھی خلاف ہے اسیئے احادیث میں اس کی مذمت بیان کی گئی ہے۔ (۱۰)

۳: وصیت:

وصیت بھی تبرع اور احسان کی ایک قسم شاہ صاحب لکھتے ہیں ۔

ووصیة ان کان موقتا بالموت انما بها السنه لان الملک فی بنی آدم عارض لمعنی المشاحة فاذا قارب ان یستغنی عنه بالموت استحب ان یتدارک ماقصر فیه و یواسی من وجب حقه علیه فی المثل هذه الساعة (۱۱)

ترجمہ: تبرع کی ایک قسم وصیت بھی ہے جو موت کے وقت کی جاتی ہے اس کا فلسفہ یہ ہے کہ انسان کو اپنے مال سے طبعاً دل بستگی ہوتی ہے اور اس کو خود سے الگ کرنے میں بخل کرتا ہے لیکن جب موت کا وقت قریب آجائے تو اس مال سے مستغنی ہونے والا ہوتا ہے اسیئے مستحب ہے کہ اس سے اپنی گذشتہ کوتاہیوں کا تدارک کرے اور جن افراد کے حقوق اس کے ذمہ دار ہوں اس آخری گھڑی میں ان کے ساتھ احسان مندانہ سلوک کرے۔

۴ : عمریٰ

شاہ صاحب نے عمری کو بھی تبرع کی اقسام میں شمار کیا ہے عمری سے مراد وہ مسکن ہے جو کوئی شخص کسی اور کو احسان کے طور پر بلا معاوضہ رہائش کیلئے دیدے بے گھر افراد کی اس حاجت براری سے نیک جذبات پروان چڑھتے ہیں اور وحدت ویگانگت وجود میں آتی ہے۔

۵ : وقف

آپ نے احسان کی اقسام میں وقف پر خصوصی طور پر زور دیا ہے وقف کسی چیز کی ملکیت کو ملک میں رکھتے ہوئے اس کے منافع کو حاجت مندوں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے بلا عوض دینا ہے۔اسلامی حکومت کی آمدنی کا ایک ذریعہ وقف بھی ہے۔

٦ : ظالمانہ معاملات اور ان کی حرمت

شاہ صاحب بتاتے ہیں کہ جب انسان کی حاجتیں بڑھیں اور تمدن نے ترقی کی اور مبادلہ جنس (Barter) سے ضروریات پر قابو پانا مشکل ہوگیا یعنی ایک موچی نے ایک جوتے کا جوڑا بنایا اسے توقع تھی کہ اس کے عوض کپڑا مل جائے گا لیکن نورباف کو اس وقت جوتے کی ضرورت نہیں تھی اس لئے موچی اپنی ضروریات اپنی مصنوعات سے پوری نہ کر سکا ۔ جب سوسائٹی میں اس قسم کے واقعات رونما ہونے لگے تو عقل مندوں نے ایسی چیز کی تلاش کی جو خود تو کسی کام کی نہ ہو مگر معاوضہ بننے کی صلاحیت رکھتی ہو اور جلدی خراب بھی نہ ہوتی ہو اس لئے سونے چاندی کا استعمال کیا جانے لگا اور یوں سکے کا رواج شروع ہوگیا۔

انسانوں میں مبادلہ ایک لازمی امر قرار پایا ،مبادلہ میں جماعتوں یا افراد کی باہمی رضامندی سے امور طے پاتے ہیں ۔ جسے معاملات سے یاد کیا جاتا ہے اسلامی فقہ میں معاملات کی جائز و ناجائز اور مختلف شکلیں ہیں مگر معاملات اور تجارت کے لئے بنیادی امر یہ ہے کہ ایسا معاملہ غیر مشروع اور حرام ہے جس کی بنیاد ظلم اور

استحصال پر ہو۔

”فان کان الاستنماء فیھا بما لیس له دخل فی التعاون کالمیسر او بما ھو تراض یشبھا لاقتصاب کالرباء فان المفلس یضطر الی الالتزام مالا یقدر علی ایفائه و لیس من العقود المرضیة و لا سباب الصالحة وانما ھو باطل و سحت باصل الحکمة المدینه“ (۱۲)

ترجمہ: آپس میں ایسے معاملات اور اشتقاد دو کی شکلیں جن میں تعاون کو سرے سے دخل نہ ہو جیسے جوا بازی یا ایسی باہمی رضامندی ہو جیسے سود لینا اس لئے مفلس آدمی مجبور ہو کر ایسا معائدہ کر لیتا ہے جس کے پورا کرنے پر وہ قادر نہیں ہو سکتا اور اسکی ظاہری رضامندی حقیقت میں رضامندی نہیں ہوتی چنانچہ قسم کے عقود نہ تو پسندیدہ ہیں اور نہ ہی تمدن کے صالح اسباب میں سے ہیں۔ سئے یہ باطل ہیں اور سیاست مدینہ کے اعتبار سے قطعاً حرام ہیں۔

امام الہند نے اس ضمن میں ایسے معاملات کا ذکر کیا ہے جن کا تعلق تجارت سے ہے، اور ان بنیادی اصولوں کی نشاندہی کی ہے جن سے باہمی ظلم و تعدی کا انسداد ہو سکتا ہے اس ضمن میں انہوں نے ایک حدیث ذکر کر کے مناسب نتائج اخذ کئے ہیں:

”قال رسول اللہ ﷺ لا تلقوا الرکبان لبیع ولا یبیع بعضکم علی بعض ولا یسم الرجل علی سوم اخیته ولا تناجشوا ولا یبیع حاضر للباد“ (۱۳)

ترجمہ: ''رسول اللہ ﷺ نے فرمایا سواروں کو شہر سے باہر نکل کر مت ملو اور نہ ہی کوئی آدمی دوسرے کی بیع پر بیع کرے نہ کوئی اپنے بھائی کے سودا کرے اور نہ ایک دوسرے پر نرخ بڑھاؤ اور نہ ہی شہری کسی باہر والے دیہاتی کے لئے بیع کرے''

چونکہ ان تمام مذکورہ عقود وافعال میں مساوات وہمدردی کا فقدان ہے اور اس میں طرح کا ظلم پایا جاتا ہے اس لئے آنحضرت ﷺ نے ان امور کو ناپسند فرمایا ہے۔

شاہ صاحب ذخیرہ اندوزی پر تنقید کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

''و قال علیہ اسلام الجالب مرزوق والمحتکر ملعون'' (۱۴)

ترجمہ: آپؐ نے فرمایا کہ باہر بازار میں غلہ لانے والا مرزوق (روزی دیا ہوا) ہے اور محتکر (ذخیرہ اندوز) ملعون ہے۔

شاہ صاحب ذخیرہ اندوزی کے بارے میں مزید یوں بیان کرتے ہیں:۔

''و ذالک لان حبس المتاع مع حاجة اهل البلاد الیه لمجرد طلب الغلاء و زیادة الثمن اضرار بهم بتوقع نفع ما و هو سوء انتظام المدینه'' (۱۵)

ترجمہ: ''اور یہ ذخیرہ اندوزی اس لئے مذموم ہے کہ جب اہل شہر کو سامان تجارت کی ضرورت ہوتی ہے تو صرف مہنگائی اور قیمت زیادہ کرنے کی خواہش میں اسے روکنا اہل شہر کو نقصان پہنچانا ہے کہ ذرا سا نفع کی توقع میں ایسا کرے اور یہ شہر کی بدنظمی کا باعث بھی ہے''

شاہ صاحب کے ہاں مذکورہ انواع کے عقود جن میں کسی بھی لحاظ سے ظلم اور استحصال کا شائبہ ہو پایا جاتا ہے مذموم ہیں شاہ صاحب نے عقود کے ضمن میں جو اصولی امور بیان کیے ہیں ان کا اختصار یہ ہے۔

عقود میں تعاون باہمی ہو:

معاملات کی بنیاد تعاون باہمی پر ہونی چاہیے شاہ صاحب کا یہ قاعدہ قرآن کی اس آیت سے ماخوذ ہے۔

''و تعاونوا علی البر و التقوی و لا تعاونوا علی الاثم والعدوان'' (۱٦)

ترجمہ: ''بھلائی اور پرہیزگاری میں ایک دوسرے کی مدد کرنا اور گناہ اور ظلم پر ہرگز کسی کے ساتھ تعاون نہ کرنا''۔

معاملہ جانبین سے حقیقی رضا کا وجود ضروری ہے اضطراری رضاء معتبر نہیں یعنی یہ نہ ہو کہ ایک شخص برضاو رغبت اس معاملہ کے لئے آمادہ نہیں مگر اس کی اضطراری کیفیت اس کی رضاء کے قائم مقام بن گئی قرآن حکیم کا اعلان ہے:

''یا یھاالذین امنوا لا تاکلوا اموالکم بینکم بالباطل الا ان تکون تجارۃ عن تراض منکم'' (۷)

ترجمہ: اے ایمان والو تم آپس میں ایک دوسرے کے مال کو باطل طریقے سے نہ کھاؤ مگر یہ کہ تجارت کی راہ سے باہمی رضامندی کے ساتھ معاملہ ہو۔

تجارتی شراکت کی شکلیں:

شاہ صاحب لکھتے ہیں کہ چونکہ انسانی معاشرہ میں مختلف قوتوں اور استعدادوں کے مالک افراد بیک وقت موجود ہوتے ہیں اور روزمرہ کی حاجات وضروریات کی تکمیل کے لئے سب کو آپس میں تعاون کی

ضرورت پڑتی ہے اسلئے ضروری ہے کہ ان کے درمیان الفت ومحبت اور باہمی تعاون کے رشتوں کو فروغ ہو۔
شاہ صاحب امداد باہمی کے مختلف شعبوں کی نشان دہی کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

''اما المعاونه فهی انواع منها المضاربة و هی ان یکون المال لانسان والعمل فی التجارة من الاخر لیکون الربح بینهما علی ما یبینانه والمفاوضة ان یعقد رجلان مالهما سوء الشرکة فی جمیع ما یشتریانه و بیعنانه والربح بیننا والعنان ان یعقد الشرکة فی مال معین کذالک و یکون کل واحد وکیلا للاخریفة و شرکة الصنائع کخیاطین اور صباغین اشترکاء علی ان یقبل کل واحد و یکون الکسب بینهما والشرکة الوجوه ان یشترکا ولامال بینهما علی ان یشتریا بوجوهما و یبعیا والربح بینهما والمساقات ان تکون اصول الشجر لرجل فیکفی مونتها الآخر والمخابره ان تکون الارض لواحد والبذر والبقر والعمل من الاخر و نوع اخر یکون العمل من احد هما والباقی.

ترجمہ: معاونت کی بھی اقسام ہیں (۱) مضاربت ہے اور وہ یہ ہے کہ مال ایک شخص کا ہو اور تجارت میں عمل دوسرے فریق کی جانب سے ہو اور منافع آپس میں مقرر کردہ شرائط کے مطابق تقسیم ہو (۲) ایک مفاوضہ ہے اس کا مفہوم یہ ہے کہ دو شخص مشترکہ طور پر تجارت کریں اور سرمایہ جو خرید

وفروخت کے لئے استعمال کیا جائے دونوں کا برابر ہو نفع بھی برابر تقسیم ہو (۳) ان میں سے ایک شرکت عنان ہے وہ یہ کہ مال معین میں ہر ایک دوسرے کا وکیل ہو (۴) ایک قسم شرکت صنائع کی ہے جیسے دو، درزی یا دو ،رنگ ریز اس بنیاد پر شراکت کرتے ہیں کہ محنت ایک کرے اور اجرت دونوں میں تقسیم ہو (۵) ایک قسم شرکت الوجوہ ہے کہ دو آدمی شریک ہو جائیں اور دونوں کے پاس مال نہ ہو اور ہر ایک اپنی ساکھ اور اثر رسوخ کی بنیاد پر کاروبار کرے اور نفع ان کے درمیان تقسیم ہو (۶) ایک قسم مساقات کی ہے وہ یہ کہ درخت بنیادی طور پر ایک شخص کی ملکیت ہوں اور دوسرا ان کی حفاظت اور نگہداشت کرے اور پھل دونوں کے درمیان تقسیم ہو جائیں ایک مزارعت ہے کہ زمین اور بیج ایک آدمی کا ہو اور محنت اور بیل دوسرے کے ہوں ایک اور قسم اس کی یہ ہے کہ محنت تو ایک کی ہو اور باقی سب چیزیں دوسرے آدمی کی ہوں (۹) ایک اجارہ ہے اس میں مبادلہ اور معاونت دونوں کا مفہوم پایا جاتا ہے۔

شاہ صاحبؒ کی مذکورۃ الصدر عبارت سے شرکت کی مختلف انواع پر روشنی پڑتی ہے ان میں سے بعض تجارتی ہیں مثلاً مضاربت مفاوضہ عنان صنائع اور وجوہ وغیرہ اور بعض زراعتی شعبوں سے متعلق ہیں مثلاً مزارعت اور مساقات تجارتی شعبوں سے متعلق شرکت کی بڑی اقسام کی مزید تفصیل یہ ہے:۔

(۱) شرکت مضاربت

مضاربت ایسے تجارتی معاملہ کا نام ہے جس میں ایک جانب راس المال ہوتا ہے اور دوسری جانب فقط محنت ہوتی ہے اور منافع دونوں شرکاء کے درمیان حسب قرار رہتا ہے۔

بہت سے ارباب دولت وہ ہیں جن کے پاس کافی سرمایہ ہیں لیکن تجارتی کاروبار سے وہ قطعاً ناآشنا ہیں اور بہت سے نادار ایسے بھی پائے جاتے ہیں جو باجود تجارتی کاروبار میں دسترس رکھنے کے سرمایہ سے محروم ہوتے ہیں لہذا ان دونوں کو جائز دولت کمانے اور خصوصاً سرمایہ سے محروم کو اپنی محنت کا پھل اٹھانے کے لئے حسن سلوک اور امداد باہمی کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ صاحب مال اپنے مال کو اس دوسرے شخص کو تحفظ سرمایہ کے اطمینان کے ساتھ حوالہ کر دے اور اس کو موقع دے اور وہ کاروبار کرے اور یوں دونوں باہمی فائدہ اٹھائیں رسول اللہ ﷺ نے نبوت سے پہلے بصری (شام) کی منڈی میں خدیجہ الکبریٰ کے مال کی تجارت اسی مضاربت پر کی تھی امام الہند فرماتے ہیں:

> ''مضاربت لوگوں کی ضروریات کے لئے جائز رکھی گئی ہے اس لئے
> کہ بعض مال دار کاروبار سے ناواقف اور نابلد ہوتے ہیں اور بعض غریب،
> کاربار کے ماہر اور مصالح تجارت سے خوب واقف ہوتے ہیں''۔ (۱۹)

لہذا مضاربت کی وجہ سے ایک نادار کی محنت رائگاں ہونے سے بچ جاتی ہے تو دوسری طرف سرمایہ دار کنز و احتکار سے بچ کر دولۃ بین الناس کی صورت میں منتقل ہو جاتا ہے اور یوں غریبوں کی ضروریات پر قفل پڑنے سے تحفظ کی شکل سامنے نکل آتی ہے۔

لہذا شرکت مضاربت تعاون باہمی کی مناسب شکلیں ہیں شرکت میں جانبین کی محنت کا عمل دخل ہوتا ہے جبکہ مضاربت میں ایک جانب سرمایہ دوسری طرف محنت ہوتی ہے

(۲) شرکت مفاوضہ:

شرکت مفاوضہ ایسے تجارتی کاروبار کا نام ہے جسمیں کمپنی کے طور پر چند افراد اپنا اپنا راس المال دے کر شریک بن جاتے ہیں اور نفع نقصان میں بھی شریک اور ایک دوسرے کے وکیل بھی ہوتے ہیں (۲۰) اور اس معاملے کے تمام حالات کے ذمہ دار بھی رہتے ہیں شرکت عنان بھی اسی قسم کی ایک خاص شرکت کا نام ہے۔

(۳) شرکت صنائع:

شرکت صنائع بھی کمپنی طرز پر اس قسم کے کاروبار کو کہتے ہیں جس میں چند ہم پیشہ اور اصحاب صنعت و حرفت اپنے حرفہ کو شرکت کے ساتھ چلاتے ہیں اور نفع اور نقصان کی بنیاد ڈالتے ہیں۔

(۴) شرکت وجوہ:

شرکت وجوہ اس تجارت کا نام ہے کہ بغیر مال چند افراد کے درمیان مساوی عمل و محنت اور کسب و اکتساب پر شرکت ہو جاتی ہے اور خرید و فروخت اور نفع نقصان میں بھی برابر کے شرکت رہتی ہے۔

شاہ ولی اللہ کی نظر میں معاشی تعاون باہمی

اقتصادی معاہدہ بندی ہو یا زندگی کا کوئی اور پہلو ان تمام پہلوؤں میں احکامات کے استخراج کیلئے اسلام کے بنائے ہوئے اصولوں کو اپنانے اور اس کی حدود میں رہ کر فیصلہ کرنے کی ضرورت ہے کیونکہ زندگی کا راز انفرادی اور اجتماعی قوتوں کی آزادی اور نشوونما میں مضمر ہے نہ کہ ان پابندیوں پر اور سختیوں میں اسلام نے ہر آجر کو آزادی دے رکھی ہے کہ وہ شریعت کی تعلیمات کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنی پیداوار بڑھائے اسلام فریقین کے ہر معاملہ میں خواہ معاہدہ بندی ہو یا خرید و فروخت کوئی پابندی عائد نہیں کرتا۔

ارشاد خداوندی ہے:۔

> "اے اہل ایمان! آپس میں ایک دوسروں کے مال باطل طریقوں سے نہ کھاؤ لین دین باہمی رضامندی سے ہونا چاہیے"۔ (۲)

دولت کی پیداوار کیلئے جب افراد مختلف معاشی اداروں (زراعت، تجارت، صنعت) سے وابستہ ہوتے ہیں تو ان میں کوئی مالک ہوگا، نہ مزدور، نہ کسان یا لوگ ایک دوسرے کے ساتھ اقتصادی معاہدہ بندی کر چکے ہوتے ہیں اس صورت حال میں انہیں یہ آزادی حاصل ہوتی ہے کہ ایک فریق اگر دوسرے کے حقوق کو

بطور احسن ادا نہ کرے یہ کسی بھی ذریعے سے ظلم کا مرتکب ہو تو دوسرے کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ معاہدے سے خود کو الگ کرے کہ جس سے آئندہ کیلئے اس قسم کے ظلم و استحصال کے تمام راستے بند کر دیئے جائیں۔

اب اس اقتصادی معاہدہ بندی کے نظام کی بنیاد اصول معاونت پر ہے۔ اس اصول کے مطابق معاشی اداروں میں کام کرنے والے اور کرانے والے ایک دوسرے کے معاون ہیں۔ (۳) معاشرے میں معاونت کے اس اصول کو اس طرح رائج کیا جائے کہ کوئی شخص کسی دوسرے شخص کے لئے معاشی تنگی کا باعث نہ بننے پائے اور ہر شخص خوشحال زندگی بسر کر سکے۔

شاہ ولی اللہؒ ارشاد فرماتے ہیں:

> ''اللہ تعالیٰ نے جب مخلوق کو پیدا کیا اور زمین میں ان کی معاشی حیات کے لئے سب سامان فراہم کر دیا اور ان سب کو سب کے لئے مباح اور عام کر دیا تو ان سے متمتع ہونے میں مخلوقات کے درمیان مزاحمت اور مناقشت شروع ہوگئی۔ تب اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ جب کوئی شخص پہل کر کے کسی شے کو اپنے قبضے میں جکڑنے یا مورث کے قبضہ کی وجہ سے اس کی وراثت میں آ جانے یا ان کے علاوہ ایسے دوسرے طریقوں سے اس کا قبضہ ہو جائے جو اللہ کے نزدیک جائز قرار پا چکے ہوں تو ایسی صورت میں اب کسی شخص کو اس کی مقبوضہ شے میں مزاحمت کا حق نہیں۔ البتہ دوسرے کی مقبوضہ شے کو حاصل کرنے کا جائز طریقہ یہ ہے کہ یا تو خرید و فروخت اور لین دین کے ذریعے تبادلہ کی شکل پیدا کرے یا معتبر طریقوں سے باہمی رضامندی کا معاملہ اس طرح انجام پا جائے کہ ہر دو جانب اس کا صحیح علم ہو اور اس معاملے میں نہ التباس اور دھوکے کا دخل اور نہ غلط ملط کرنے کی کوشش کی گئی

ہو۔ جبکہ انسان مدنی الطبع واقع ہوا ہے اس لئے اللہ تعالیٰ نے باہمی اشتراک عمل کو واجبی قرار دیا ہے اور یہ بھی لازم کر دیا ہے کہ کسی فرد کو ایسے امور سے کنارہ کش ہونے کا حق نہیں جو تمدن میں داخل ہو مگر یہ کہ کسی شخص کو بعض مجبور کن حالات ایسا کرنے پر مجبور کر دیں'' (۲۲)

اس بات کی وضاحت کرتے ہوئے شاہ صاحب مزید لکھتے ہیں۔

"اگر معاشی حالت میں لوگوں کے درمیان باہمی تعاون اور اشتراک عمل کے ذریعے مالی ترقی ونمو بروئے کار نہ آئے تو تمدن کا سالم اور صحیح رہنا دشوار سے دشوار تر ہو جائے گا۔ مثال کے طور پر ایک آدمی چاہتا ہے کہ وہ تجارتی مال کو ایک شہر سے دوسرے شہر لے جائے اور معین مدت کے لئے وہ اس کی گارنٹی چاہتا ہے۔ (یعنی تجارت کو ذریعہ معاش بناتا ہے۔) یا مثلاً کے لئے دوسروں کے مال کی دلالت کرتا ہے (یعنی محنت کو ذریعہ معاش بناتا ہے۔) یا تیسرا شخص اپنی نئی نئی پسندیدہ ایجادات کے لئے دوسروں کے مال کو بیش قیمت اور بہتر بناتا ہے (یعنی صنعت وحرفت کو وسیلہ معاش بناتا ہے) اور اسی طرح دوسرے جائز طریقے اختیار کرتا ہے تو ان سب صورتوں میں تعاون کے بغیر معاشی زندگی میں استواری نہیں پیدا کی جاسکتی۔ بہرحال ان تمام معاملات میں صحیح تعاون اور اشتراک عمل ضروری اور واجب ہے اور اگر یہ مالی ترقی ایسے طریقے سے کی جائے کہ اس میں سرے سے تعاون کا کوئی دخل ہی نہ ہو جیسا کہ جوئے کے تمام کاروبار یا ہر وہ کام جو ایسے طریقوں سے عمل میں آئے کہ اس میں بظاہر تو تعاون نہ ہو لیکن معیشت کے

اعتبار سے اس میں زبردستی پائی جاتی ہو اور حقیقی تعاون نہ ہو جیسے ربو یعنی سود کا کاروبار اس لئے کہ یہ بات بہت صاف ہوتی ہے کہ ایک مفلس اور نادار اپنی معاشی پریشانیوں کی وجہ سے اپنے ذمہ ایسی ذمہ داریوں کو لے لینے کے لئے مجبور ہو جاتا ہے جن کو پورا کرنے کی اپنے میں طاقت نہیں پاتا اور اس کی اس قسم کی رضامندی ہرگز رضامندی نہیں کہلائی جا سکتی پس اس طرح کے کاروبار پسندیدہ اور جائز معاملات نہیں کہلائے جا سکتے اور نہ ان کو معاشیات کے اسباب میں کہا جا سکتا ہے اور بلا شبہ اس قسم کے معاملات حکمت کی نگاہ میں ظلم ہیں۔" (۲۳)

معاشی تعاون باہمی کی روح:

شاہ صاحب چاہتے ہیں کہ آجر اور اجیر دونوں میں معاہدہ بندی اس طور پر ہو کہ نہ تو آجر اور اجیر کا استحصال کرے اور نہ کام چور ہو۔ شاہ صاحب کی تعلیمات میں اعتدال و توازن کا درس ملتا ہے۔ آپ ایسے نظام کے خواہاں ہیں جو انسانی فلاح و بہبود پر مبنی ہو۔ جس میں نہ تو مزدور کا استحصال اور نہ ہی مالک کو جائز منافع سے روکا جائے عام طور پر مفلس مزدور کم اجرت پر بھی کام انجام دے دیتا ہے کیونکہ اسے معلوم ہے کہ اگر وہ زیادہ اجرت طلب کرے گا تو سرمایہ دار اس کے بجائے کسی اور مزدور کو تلاش کر لے گا لہذا وہ مجبور ہو جاتا ہے اور سرمایہ دار مزدور کو اس کی محنت سے نصف یا اس سے بھی کم اجرت پر رضامند کر لیتا ہے اس طرح اسے حق اعتراض نہیں ہوتا اور دوسری طرف مزدور کے خون پسینے کو چوس کر مالک اپنی تجوریاں بھرنے پر زور دیتا ہے۔ دن رات میں اس کی محنت کے عوض صرف اس قدر اسے دیتا ہے۔ جس سے نہ تو وہ اپنا اور نہ ہی اپنی اہل و عیال کا پیٹ بھر سکتا ہے لہذا مزدور مالک کا محتاج ہو جاتا ہے اور ہمیشہ محتاج ہی رہتا ہے اسلام اس معاہدے کو ناجائز اور حرام قرار دیتا ہے۔

اس فلسفہ پر حضرت شاہ ولی اللہ اس طرح روشنی ڈالتے ہیں:

"پس اگر مالی نفع اس طریقے پر حاصل کیا جائے کہ اس میں فریقین کے درمیان تعاون اور عملی محنت کے بجائے زبردستی کی رضامندی کا دخل ہو جیسے سودی کاروبار تو ان صورتوں میں بلاشبہ مفلس اپنے افلاس کی وجہ سے خود پر ایسی ذمہ داریاں عائد کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہو جن کا پورا کرنا اس کی قدرت سے باہر ہوتا ہے۔ اس کی وہ رضامندی نہیں ہوتی اس قسم کے تمام معاملات رضامندی کے معاملات نہیں کہلائے جا سکتے اور نہ ان کو پاک ذرائع آمدنی کہا جا سکتا ہے بلاشبہ یہ معاملات تمدنی حکومتوں کے اعتبار سے قطعاً باطل اور خبیث ہیں۔"

اس قسم کی معاہدہ بندی جو بظاہر تو رضامندی ظاہر کرے لیکن درحقیقت اس کے پیچھے مجبوریوں کا ایک سیلاب ہو جس نے اس مزدور کو ایسی لاچار معاہدہ بندی میں جکڑ دیا ہو، اچھی اور مستحق معاہدہ بندی نہیں کہلا سکتی، کیونکہ "اسلام اپنے نظام میں مفلس اور صاحب حاجت کی اس رضامندی کو مرضی تسلیم نہیں کرتا۔" (۲۴)

نبی کریم ﷺ نے فرمایا اللہ کا ارشاد ہے تین قسم کے انسان ایسے ہیں جن سے قیامت کے دن جھگڑوں گا اور جس سے میں جھگڑوں گا اس کو مغلوب و مقہور ہی کر کے چھوڑوں گا۔ ان میں سے ایک وہ شخص ہے جو مزدور سے کام تو پوری طرح لیتا ہے لیکن کام کی مناسبت سے اجرت نہیں دیتا۔ (۲۵)

اسلام معاہدہ بندی میں فریقین کو مکمل آزادی دیتا ہے۔ اب یہ فریقین کا فرض ہے کہ اس آزادی کو ایک دائرہ میں رہتے ہوئے استعمال کریں اگر اخوت اور بھائی چارے کا نظام قائم ہو جائے تو نہ آجر کا حق لے گا اور نہ آجر کام میں کاہلی کرے گا بلکہ دونوں ہی حدس تو کم گر فتنی کشش میں لگے رہیں گے جس سے ایک صالح معاشرہ وقوع پذیر ہوگا۔

"لیکن اگر ان حقوق میں تصادم پیش آ جائے اور ایک دوسرے کے حقوق پر دست برد کرنے لگیں تو اس قسم کے تمام معاملات میں یعنی تعین مدت عمل، تعین مقدار اجرت اور آسائش و راحت کے انسانی حقوق وغیرہ میں حکومت کو دخل اندازی وغیرہ ہمیں حکومت کو دخل اندازی کرنی چاہیے اور خود عدل و انصاف کے ساتھ ان معاملات کو اس طرح طے کر دینا چاہیے کہ جانبین کے واجبی حقوق میں ظلم کا شائبہ تک باقی نہ رہے چنانچہ نرخ گرانی کی بحث میں فقہائے کرام نے تصریح کی ہے کہ جب ضرر عام اور اجتماعی نقصان کا اندیشہ ہو تو اس وقت حکومت کو مداخلت کا حق ہے۔" (۲۶)

گویا اسلام یہ چاہتا ہے کہ معاہدہ بندی میں عدل ہو کیونکہ اسلام نے عدل کے قیام کو بنیادی اہمیت دی ہے شریعت، انزال کتب اور بعثت رسل کا مقصد نیز دین کا پورا ڈھانچہ، ان سب کا مرکزی خیال قیام عدل وقسط ہے یعنی عدل و انصاف پر مبنی ایک نظام حیات کا قیام گویا اسلام و ایمان کا بنیادی تقاضا ہے۔ لہذا معاہدہ بندی میں بھی اسلام کے اس بنیادی تقاضے (عدل وقسط) کا خیال رکھنا ہوگا اور ایسی ہی معاہدہ بندی صحیح اور درست تسلیم کی جائے گی نہ کہ مجبوری اور بے بسی کی معاہدہ بندی جو اسلامی تعلیمات کے سراسر خلاف ہے۔

تعاون باہمی اور نظریہ محنت:

اقتصادی جدوجہد کے لئے اسلام ہر فرد پر یہ ذمہ داری عائد کرتا ہے کہ وہ خود محنت کرے اور اپنی محنت مزدوری سے اپنی ضروریات زندگی پوری کرے۔ اگر معاشرے کے چند افراد بھی اقتصادی جدوجہد میں حصہ لینا چھوڑ دیں اور دوسروں کی کمائی پر نظر جمائے بیٹھے رہیں تو اس سے صالح معاشرے کا وجود عنقا ہو جاتا ہے اور یہ مفت خورے بھی اپنا وجود کھو دیتے ہیں۔ حضرت شاہ ولی اللہ ہر فرد کی معاشی جدوجہد کو معاشی استحکام کا سبب قرار دیتے ہیں جس کا خلاصہ کچھ اسطرح ہے۔

"معاشی استحکام کے لئے ضروری ہے کہ ہر فرد اپنے لئے خود کمائے
اور کچھ نہ کچھ کام کرے۔ لیکن قیصر و کسریٰ کے نظام کی بدولت کچھ ایسے پیشے

وجود میں آ گئے ہیں جو نہ تو براہ راست دولت کی پیدائش میں مدد دیتے ہیں اور نہ دولت سے متعلق "دولت" سے متعلق دوسرے اداروں کی فہرست میں آتے ہیں ان کا کام عوام کو بہکانے اور بڑے لوگوں کی خوشامد کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ یا پھر دولت مندوں کی عیش وعشرت میں مددگار کے طور پر کام کرتے ہیں۔ ایسے پیشوں سے معاشرہ، اخلاقی اور معاشی، دونوں طرح سے زوال پذیر ہو جاتا ہے" (۲۷)

اسلام اسے نفرت کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور اپنا رزق خون پسینے کی کمائی سے حاصل کرنے کو مستحسن قرار دیتا ہے اس لئے انسان دوسروں پر بوجھ نہیں بنتا بلکہ خود کما کر دوسروں کو کھلانے کا باعث ہوتا ہے جس طرح فرمان الٰہی ہے کہ "دن ہم نے کمائی کے لئے بنایا ہے" اسلام کا مقصد عظیم یہ ہے کہ معاشی جدوجہد میں ہر شخص اپنا بھرپور کردار ادا کرے جب ایسا ہوگا تو اجتماعی انسانی فلاح و بہبود ہوگی۔ اس طرح ایک صالح معاشرہ کا ظہور ہوگا گویا اقتصادی جدوجہد میں سب کی برابر محنت اور کمائی ایک صالح نظام کا پیش خیمہ ثابت ہو سکتی ہے۔ جیسا کہ ارشاد نبوی ﷺ ہے:۔

''بہترین کمائی ہاتھ کی کمائی ہے'' (۲۸)

دولت کی اصل بنیاد محنت ہے اور کاشت کار قوت کا محاسبہ نہیں باہمی تعاون مدنیت (شہریت) کی روح رواں ہے جب تک کوئی شخص ملک اور قوم کے لئے کام نہ کرے، ملک کی دولت میں کوئی حصہ نہیں۔ شاہ صاحب کے نزدیک بنیادی عامل پیدائش محنت ہے باقی تمام عاملین پیدائش محنت کے ساتھ مل کر پیداوار میں اضافے کا باعث بنتے ہیں یا یہ معرض وجود میں آتے ہیں اور ہر ایک کو محنت کا عوضانہ ملنا چاہیے اگر محنت نہیں ہے تو عوضانہ نہیں ہے کوئی محنت بغیر ثمرہ کے نہیں اور کوئی ثمرہ بغیر اجرت کے نہیں ہے۔ اگر یہ اصول اپنایا جائے تو تقسیم آمدنی بھی صحیح رخ کی جانب متعین ہو سکے گی۔ (۲۹)

عہد نبوی ﷺ میں ملامسہ کاروبار کی ایسی صورتیں تھیں جن میں معاونت کا کوئی تصور نہ تھا اسلئے آنحضرت ﷺ کی تعلیمات کے مطابق انہیں ناجائز اور قابل نفرت قرار دیا گیا ان کی بنیاد اسی اصول پر تھی کہ کسی نہ کسی بہانے لوگوں کے مال پر ہاتھ صاف کیا جائے اور بغیر کسی ''محنت'' کے دولت حاصل کی جائے جوا ''لاٹری'' ریس وغیرہ اس دور میں اسی قسم کے کاروبار میں شامل تھے ہیں شاہ صاحب نے ان کی بے پناہ مخالفت کی ہے (۳۰)

آپ کے نزدیک اگر محنت کے اس قسم کی دولت کمانے کے ذریعے پھیلنے لگیں تو پھر زراعت وصنعت پر اس کا بہت برا اثر پڑتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ عام لوگوں کی خوشحالی میں نرخ بھی اہم کردار ادا کرتا ہے۔ اسی سے خریدار کی قوت خرید میں اضافہ یا کمی واقع ہوتی ہے اگر تاجر اور صنعت کار نرخ بڑھا دیں تو ایک طرف لوگوں کا معیار زندگی گر جائے گا اور دوسری طرف تاجر اور صنعت کار خوب فائدہ اٹھائیں گے اور دولت چند لوگوں کی طرف سمٹنا شروع ہو جائے گی اس طرح امیر امیر تر ہونا شروع ہو جائیں گے اور غریب غریب تر ہونا شروع ہو جائیں گے۔

شاہ ولی اللہ کی رائے میں معاشرے میں تاجر، صنعت کار اور خریداروں کے درمیان اس انصاف کے قائم کرنے کے باوجود بھی اگر تجارتی بدعنوانیاں پائی جائیں اور لوگ ان بدعنوانیاں کو محسوس کرنے لگیں تو پھر اس قسم کے تجارتی نظام کو بدلنا اور ان بدعنوانیوں کا فوری خاتمہ کرنا ہوگا۔ اس لئے کہ اگر ایسا نہ کیا گیا تو ملک تباہ و برباد ہو جائے گا۔ (۳۱)

تعاون باہمی اور معاشی مساوات:

معاشی میدان میں یکسانیت کا محض تصور کیا جا سکتا ہے لیکن اس کی کسی واقعیت کا خیال بھی بعد از قیاس ہے۔ یہ تو ایسا ہی ہے جیسے تمام انسانوں کے بیک وقت گورے یا کالے یا لمبے یا کوتاہ قامت ہو جانے کا تصور ہو جس طرح یہ بات ممکنات میں سے نہیں ہے اسی طرح معاشی یکسانیت بھی محال ہے حضرت شاہ ولی اللہ کے

نزدیک تخلیقی میدان میں اختلاف رنگ ونسل کمالات قدرت کا ظہور ہے۔لیکن معاشی میدان میں اختلاف درجات قدرت کی مقرر کردہ فطرت کا نتیجہ ہے۔

اختلاف رنگ ونسل کے لئے قرآن پاک میں ارشاد ہے:۔

ومن آیاته اختلاف السنتکم والوانکم (۳۲)

اور درجات معیشت میں اختلاف کے لئے فرمایا۔

''نحن قسمنا بین هم معشتهم فی الحیوۃالدنیا و رفعنا بعضهم فوق بعض درجات لیتخذ بعضهم بعضا سخریا''(۳۳)

گویا قدرت نے معاشی اعتبار سے درجات میں تفاوت کو کسی طرح بھی عزت وذلت کا معیار نہیں بنایا۔ موجودہ دور میں دولت ومفلسی ہی عزت وذلت کے معیارات ہیں۔شاہ صاحب کے نزدیک انسانیت کو مختلف شعوب وقبائل اور مختلف الوان میں تقسیم قدرت کی جانب سے ضرور ہوئی لیکن انسانوں کیلئے یہ بات کسی طرح بھی زیب نہیں کہ وہ اپنی عظمت وبزرگی کا راز اس تفریق وتقسیم میں تلاش کریں۔عظمت وبزرگی کا تعلق تو انسان کے کردار میں ہے جس کی بنیاد تقوی پر رکھی گئی ہے اگر کوئی شخص اپنی تخلیق پر فخر وغرور کرتا ہے تو قابل مذمت ہے اور یہ بات اس کی کم ہمتی پر دلالت کرتی ہے لیکن محنت سے معیار زندگی بلند کرنا شاہ صاحب کے نزدیک قابل فخر ہے اور اسے خرچ کرتے رہنے ایک مومن کے تقوی اور اس کی بزرگی کو دوچند کرنے کا سبب بنتا ہے۔

شاہ صاحب کے بیان کردہ نظریات کی اہمیت معاشی مساوات سے اجاگر ہوتی ہے۔

جسے شاہ ولی اللہ ان الفاظ میں بیان فرماتے ہیں:۔

''دولت کی پیداوار کیلئے جب افراد مختلف معاشی اداروں (زراعت تجارت ،صنعت) سے وابستہ ہوتے ہیں تو ان میں کوئی مالک ہوتا ہے نہ مزدور اور نہ کسان۔''(۳۴)

شاہ صاحب کا یہ اصول اسلامی نظام معیشت میں معاشی مساوات کی طرف دلالت کرتا ہے۔ نظام معاشیات میں انسانی مساوات کی دو اشکال ہیں:۔

۱۔حق معیشت میں مساوات

۲۔درجات معیشت میں تفاوت

۱۔ حق معیشت میں مساوات:

حق معیشت میں مساوات سے متعلقہ قرآن مجید نے جن اساسی اصولوں کا ذکر کیا ہے وہ حفظ الرحمن سیوہاروی کے بقول یہ ہیں۔

> ''رزق اور معاش کا حقیقی تعلق صرف ذات الہی سے وابستہ ہو اور وہی فرد کا کفیل ہے اور اگرچہ اس کی مصلحت عام کا تقاضا یہ ہے کہ دنیا کے اس متنوع ماحول میں رزق کے اندر تفاوت درجات پایا جائے۔لیکن امارات و غربت کے فطری تناؤ کے باوجود یہاں ایک فرد بھی محروم المعیشت نہ رہنے پائے کیونکہ اس نے حق معیشت کو سب کیلئے مساوی اور برابر رکھا ہے اور کسی کو بھی حق مساوات میں دخل انداز ہونے کا حق عطانہیں فرمایا''۔ (۳۵)

مساویانہ تقسیم دولت یا معیشت کا ہرگز مطلب یہ نہیں کہ ہر شخص کو یکساں طور پر زندگی کی سہولتیں میسر ہوں لیکن ایسا ضرور ہے کہ اسلامی معیشت میں عام لوگوں کو رزق یکساں حق حاصل ہے اور کسی کو اس بات کی اجازت نہیں کہ وہ دوسرے کو حق معیشت سے محروم کردے کیونکہ قرآن پاک میں اللہ تعالی نے یہ بات تو واضح کر دی کہ:

> ''اور زمین پر چلنے والے ہر جاندار کے رزق کی ذمہ داری اللہ تعالی نے اپنے ذمہ لے لی ہے''۔ (۳۶)

''اور تمہارا رزق جس شے کا وعدہ دے گئے ہو آسمان میں (یعنی اللہ کے ذمہ) ہے'' (۳۷)

''اور رکھے اس زمین پر بوجھل پہاڑ اس (کی پیٹھ) پر اور برکت رکھی اس کے اندر اور چار دن میں انداز سے رکھیں اس سے ان کی خوراکیں جو برابر (بلحاظ طلب معیشت) سب حاجت مندوں کیلئے''۔ (۳۸)

اب ان تمام آیات سے یہ بات ثابت کرنے کی کوشش نہیں کی جا رہی کہ چونکہ رازق خدا کی ذات ہے لہذا اب ہاتھ دھر کر بیٹھے رہیں کہ وہ رزق تو دے ہی دے گا اور دے گا بھی سب کو مساوی نہ، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کا کام کوشش اور محنت کرنا ہے اس کے بعد کی ذمہ داری انسان پر نہیں جیسا کہ مفتی اعظم پاکستان معارف القرآن میں فرماتے ہیں کہ:

''انسان کی سعی اور محنت کو درخت اگانے یا پھل نکالنے میں قطعاً کوئی دخل نہیں بلکہ اس کی ساری تدبیروں اور محنتوں کا حاصل "رکاوٹوں کا حاصل" سے زیادہ کچھ نہیں۔ یعنی انسان کا کام صرف اتنا ہی ہے کہ پیدا کرنے والے درخت کی راہ سے رکاوٹیں دور کرے اور بس (۳۹)

دراصل معاشرہ کے لئے کسی ایک فرد کا بھی ایسا طرزِ عمل جو اسلام کے اصولوں کے منافی ہے زہر کا اثر رکھتا ہے اور سارے معاشرے کو خراب کر دیتا ہے۔ 'معیشت صحیحہ' کا قیام اسی وقت ممکن ہے جب معاشرے کے افراد اسلام کے معاشی اصولوں پر سختی سے کاربند ہوں اور کسب معاش کے لئے بھی امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا لحاظ ضروری ہے جدید معاشیات کی اصطلاح میں دراصل 'حصول رزق' کو 'حصول دولت' کہا جاتا ہے اسلامی معیشت میں حصول رزق کے لئے بھی مساوی نہ درس دیا گیا ہے لیکن ہر شخص اپنی صلاحیتوں کو استعمال میں لا کر زیادہ بہتر پیدا کر سکتا ہے۔

حق معیشت میں مساوات کو حضرت شاہ ولی اللہ یوں بیان فرماتے ہیں :۔

"جب کوئی شخص سبقت اور پہل کر کے کسی شے کو اپنے قبضہ میں لے کر یا مورث کے قبضہ کی وجہ سے اس کی وراثت میں آ جائے یا ان کے علاوہ ایسے دوسے طریقوں سے اس کا قبضہ ہو جائے جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک جائز قرار پا چکے ہوں تو ایسی صورت میں اب کسی دوسرے شخص کو اس مقبوضہ شے میں مزاحمت کا حق نہیں ہے "۔(۴۰)

۲۔ درجات معیشت میں تفاوت :

اسلام میں ہر شخص کو "حق معیشت "کے اعتبار سے مساویانہ حق حاصل ہے لیکن اس کے برعکس "درجات معیشت" میں تفاوت پایا جاتا ہے کیونکہ "درجات معیشت" میں تفاوت ایک حد تک فطری بات ہے بالفاظ دیگر یہ ضروری نہیں کہ سب کیلئے سامان معیشت یکساں نوعیت کی ہو مگر بہر حال یہ ضروری ہے کہ وہ سامان ہو سب کے لئے ہو مگر درجات کا یہ تفاوت ایسے اعتدال پر قائم رہنا چاہئے کہ وہ کسی طرح بھی لوگوں کے درمیان کسی بھی ظلم کی وجہ نہ بن سکے یعنی تفاوت درجات تو ضرور ہو لیکن ایسا نہ ہو کہ اس تفاوت سے پیدا ہونے والا معاشی نظام انسان کو دو طبقات میں اس طرح منقسم کر دے کہ ایک طبقہ مسلسل ترقی کی طرف گامزن رہے اور دوسرا مسلسل فقر و افلاس کا اسیر رہے نیز دوسرا طبقہ پہلے طبقے کیلئے اس کے معاشی اغراض کا آلہ کار بن کر نہ رہ جائے لہذا اسی خدشے کے پیش نظر تفاوت درجات پر قرآن حکیم اس طرح روشنی ڈالتا ہے :۔

''دنیوی زندگی میں ہم لوگوں کی معیشت ان کے درمیان تقسیم کر دی ہے اور اس کو اس طرح کر دیا کہ بعض کو بعض پر درجہ معیشت میں بلندی حاصل ہے''۔(۴۱)

دوسری جگہ اسی تفاوت درجات کو یوں بیان کیا۔

''اللہ جس کیلئے چاہتا ہے رزق میں فراوانی دیتا ہے اور جس کیلئے چاہتا ہے اس کیلئے تنگی ڈالتا ہے''۔ (۴۲)

''اور وہی ہے جس نے تمہیں زمین میں ایک دوسرے کا جانشین بنایا اور بعض کو بعض پر مرتبے دیئے تاکہ جو کچھ تمہیں دیا ہے اس میں تمہیں آزمائے''۔ (۴۳)

سورۃ نحل میں ''درجات معیشت'' میں تفاوت کی حکمت پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا:

''خدا تعالیٰ نے تم میں سے بعض کو بعض پر رزق میں برتری دی اور ایسا نہیں ہوتا کہ جس کسی کو زیادہ روزی دی وہ اپنے روزی زیردستوں پر لوٹا دیں کہ اس روزی میں سب برابر ہو جائیں پھر کیا یہ اللہ کی نعمتوں کے صریح منکر نہیں ہو رہے''۔ (۴۴)

پیش کردہ آیات میں جہاں درجات معیشت میں تفاوت کا تذکرہ موجود ہے وہاں اس مضمون کو بھی بڑے زوردار انداز میں بیان کر کے ایک اخلاقی ذمہ داری عائد کر دی ہے معاشرے کے خوش قسمت افراد پر لازم ہے کہ وہ کم خوش قسمت افراد کی معاشی اعتبار سے سطح برابر ہو جائے اس طرح مذکورہ بالا آیات میں انسان پر ایک آزمائش بھی رکھ دی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک جانب صاحب ثروت کو تنہا اپنی ملکیت تصور نہ کرے بلکہ اپنی اس انفرادی ملکیت کے باوجود دوسری طرف وہ اس پر اجتماعی حقوق عائد ہوں گے وہ اس لئے بھی ہے کہ اس کا یقین پختہ ہو جائے کہ اس کی حاصل ہونے والی کمائی صرف اپنی ذات کے لئے نہیں بلکہ وہ ایک مکمل جماعت کا نمائندہ ہے جس میں تمام افراد ایک دوسرے کیلئے کماتے ہوتے ہیں۔

کیونکہ خدائی فلسفہ حیات میں اگرچہ حق معیشت میں سب مساوی ہیں لیکن حصول معیشت (دولت) میں مساوی نہیں ہیں حصول معیشت میں بنی نوع انسان کی ذہنی اور جسمانی استطاعت پر منحصر ہے لہذا یہ ضروری نہیں

کہ سامان معیشت (معیار زندگی) سب کیلئے۔ اسلامی معیشت میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ کسب معاش میں درجات کے تفاوت کو اعتدال پر قائم ہونا چاہیے تاکہ تفاوت معیشت انسانوں کو طبقات میں تقسیم نہ کردے اور اس طرح ایک طبقہ کی معاشی اغراض کا آلہ کار نہ بنا دیا جائے۔

یہاں دولت و سرمایہ کا مقصد زیادہ سے زیادہ نفع بازی نہیں ہے بلکہ اپنی ذاتی ضروریات و حاجات کے ساتھ ساتھ اجتماعی حاجات وضروریات کی تکمیل بھی ہے اسی طرح درجات معیشت میں جو فوائد مضمر ہیں ان میں سے چند یہ ہیں:۔

۱: غیر متمول یہ توقع کرتا ہے کہ وہ متمول افراد کے تمول کو دیکھ کر خدا کے ساتھ ناشکری اور کفران نعمت اختیار نہ کرے اور خود بھی آگے بڑھنے کے جذبہ کو تقویت دے۔

۲: اگر متمول افراد دوسروں کا حصہ نکالتے رہیں گے تو اس طرح دوسرے افراد جو غیر متمول ہیں اپنے دل میں حسد وبغض کو جگہ دینے کی بجائے الفت ومحبت کو تقویت ملے گی اور معاشرتی برائیوں کا خاتمہ ممکن ہوگا۔

۳: غیر متمول افراد کو بھی اسی طرح طمانیت قلب حاصل ہوگی اور خدا کا شکر ادا کریں گے کیونکہ اسلامی نظام میں کسی بھی فرد کو محروم المعیشت نہیں رکھا جاتا۔

۴۔ استحصالی معاشے کا خاتمہ ہوگا جس سے ہر فرد میں عملی جد وجہد میں آگے بڑھنے کا حوصلہ پیدا ہوگا اور اپنی استعداد اور صلاحیت کو استعمال کرتا ہوا وہ تمام حقوق معیشت سے متمتع ہوگا اب اس کیلئے دولت کا حصول ناممکن نہ رہے گا جسے تمام مخلوق خدا کیلئے عام اور مساوی کر دیا گیا ہے۔ مختصر یہ کہ اگرچہ خالق کائنات نے معاش کے سلسلہ میں فراخی دی ہے لیکن ایسے لوگوں کو یہ تنبیہ بھی کی ہے کہ تم اپنی دولت میں سے دوسروں کی بھی کفالت کرتے رہو۔ عقیدہ کے لحاظ سے اللہ تعالی نے اپنے بندوں کو ایک امتحان میں ڈال دیا ہے جس کا مقصد دولت مند بندوں کی آزمائش ہے کہ وہ اللہ کی راہ میں ثابت قدم بھی ہیں یا نہیں جو لوگ احکام الہی سے منحرف ہوں گے ان کیلئے سخت عذاب کی نشان دہی کی گئی ہے اگر متمول حضرات احکام خداوندی کی پیروی کرتے ہیں

اور اپنی دولت میں دوسرے مستحقین کو بھی شریک کرتے ہیں تو اجتماعی خوشحالی کی راہ ہموار ہوسکتی ہے۔ انفرادی خوشحالی کو اس طرح اجتماعی خوشحالی کا ذمہ دار بنایا گیا ہے اور احکام الٰہی کے نفاذ کیلئے خلیفہ وقت کو احکام کے نفاذ کا ذمہ دار قرار دیا گیا ہے اب اگر یہ باہمی اشتراک عمل قائم نہیں کرتے تو ایک صالح نظام کا وجود ناممکن ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں:

> ''جبکہ انسان مدنی الطبع واقع ہوئے ہیں تو ان کی معاشی زندگی باہمی تعاون واشتراک کے بغیر ناممکن ہے اس لئے اللہ تعالیٰ نے تعاون اور باہمی اشتراک عمل کو واجب قرار دیا اور یہ بھی لازم قرار دیا کہ کسی فرد کو بھی ایسے امور سے کنارہ کش ہونے کا حق حاصل نہیں ہے جو تمدن میں دخیل ہے مگر یہ کہ کسی شخص کو مجبور کن حالات ایسا کرنے پر مجبور کردیں" (۴۵)

بہرحال درجات معیشت تو فطری عمل ہے لیکن شاہ صاحب جس بات پر زور دے رہے ہیں وہ اشتراک عمل ہے جو ایک صالح تمدن کیلئے ضروری ہے ایک صالح نظام کا وجود ہی شاہ صاحب کا مشن تھا اس لئے آپ ''درجاتِ معشیت'' میں اشتراک عمل اور باہمی تعاون کو لازم قرار دیتے ہیں۔

☆ ☆ ☆

باب پنجم

فصل دوم

ملکیت کے تصور کا تاریخی جائزہ

انسانوں میں ملکیت کے تصور کی ابتداء :

شاہ ولی اللہؒ انسانی زندگی کے رہن سہن اور اس میں تبدیلیوں کا تاریخی جائزہ پیش کرتے ہیں ان تبدیلیوں کو وہ "ارتفاقات" کہتے ہیں انسان نے پہلے پہل اپنی زندگی کی ابتداء کس طرح کی اس کی تشریح وہ استفاق اول کی بحث میں کرتے ہیں جس کا خلاصہ یہ ہے کہ

انسان نے اس زمین پر جب اپنی تمدنی زندگی کا آغاز کیا تو اس کے پاس صرف قدرتی وسائل یعنی زمین، دریا، پہاڑ، جنگل اور حیوانات تھے۔ اپنا پیٹ پالنے کے لئے لوگوں نے قدرت کی ان نعمتوں سے فائدہ اٹھانا شروع کیا۔ چونکہ ایک شخص ساری نعمتوں سے ایک ہی وقت میں فائدہ نہیں اٹھا سکتا تھا اس لئے یہ بات لازمی ہوگئی کہ انسان ایک دوسرے کی ضروریات (حاجات) پوری کرنے میں ایک دوسرے کی مدد کریں۔

(۱) ایک شخص زمین کھودنے کے اوزار بنائے تو دوسرا زمین کھود کر کھیتی باڑی کرے تیسرا ان دونوں کو دودھ اور گوشت فراہم کرنے کیلئے مویشی پالے اور چوتھا ان سب کیلئے لباس تیار کرے ایک دوسرے کی مدد کرنے کیلئے لین دین کی مختلف شکلیں بنیں اور اس طرح چیزوں کے تبادلے (مبادلت) کا نظام وجود میں آیا۔(۴۶)

(۲) انسانوں میں لوگ اچھے بھی پیدا ہوتے رہے اور برے بھی ان میں بعض سست و کاہل بھی پیدا ہوئے جنہوں نے بیٹھے بٹھائے روزی حاصل کرنا اپنا طریقہ بنا لیا کچھ لوگ ان میں لالچی اور حرص کرنے والے

پیدا ہو گئے جنہوں نے اپنی ملکیتوں ہی بس نہیں کیا بلکہ دوسروں کی زمینوں اور ملکیتوں پر بھی قبضہ کرنا شروع کر دیا۔ اس قسم کے لوگوں کو قابو میں لانے کے لئے ان سے زیادہ زبردست لوگ پیدا ہو گئے وہ خود بھی لالچ میں آ گئے اور زمینوں اور ملکیتوں پر بھی قبضہ کرنے لگے اس طرح ایک طرف ان غاصب زمینداروں کا ایک طبقہ پیدا ہو گیا دوسری طرف حقوق سے محروم ہونے والے لوگ معاون کی بجائے مزدور بن گئے اور تبادلے کی جگہ انہیں مزدوری ملنے لگی ان زمینداروں میں جو سب سے بڑا زمیندار ہوتا تھا وہ سردار کہلانے لگا اپنے علاقوں میں لوگوں کو اپنے قابو میں رکھنے اور انہیں سزائیں دینے کیلئے وہ کچھ لوگوں کو ملازم رکھنے لگا جنہوں نے ایک طرح کی فوج کی شکل اختیار کر لی اس طرح جوں جوں انسانی تمدن میں ترقی ہوئی ایسے لوگ دوسروں کے حق غصب کر کے عیش و عشرت میں غرق ہو گئے۔ (۴۷)

اور پھر زیادہ سے زیادہ حاصل کرنے کی ہوس ان میں تیز تر ہو گئی حتی کہ ہر شخص ذاتی ملکیت بڑھانے میں مصروف ہو گیا۔

ملکیت کی ہوس کے نتائج:

ہزاروں سال تک جب انسانوں میں اپنی ملکیت کو بڑھانے اور دوسروں کے حقوق غصب کرنے کا رجحان بڑھتا رہا تو معاشرے نے ایک خاص شکل اختیار کر لی اور اس کے جو نظام پیدا ہوا اس کی خصوصیت شاہ صاحب کے خیال میں یہ ہو گئی کہ:

(۱) لوگ آخرت کو بھول گئے اور شیطان ان پر غالب آ گیا۔

(۲) دولت کو مزید دولت حاصل کرنے کا ذریعہ بنانے اور زیادہ سے زیادہ نفع کمانے کے لئے استعمال کرنے کا رجحان بڑھ گیا۔

(۳) بڑا آدمی بننے کیلئے راج و تخت، اونچے اونچے محل، حمام، باغات، گھوڑے چمکتے دمکتے قیمتی لباس اور غلاموں کا ہونا ضروری سمجھا جانے لگا۔

(۴) عیش وعشرت اور ارتکافات معاشرے میں عام ہو گئے۔

(۵) غریبوں، کاشتکاروں، دوکانداروں اور دوسرے پیشہ وروں پر ٹیکس لگائے جانے لگے اور پھر ان ٹیکسوں کی رقم کسی نہ کسی بہانے بڑھنے لگی۔

(۶) مزدوروں، غریبوں پر سختی ہونے لگی ان کی قدر و قیمت گدھے اور بیل کی سی ہو کر رہ گئی جن کو امیر لوگ دولت پیدا کرنے کیلئے استعمال کرنے لگے انہیں صرف اتنا کھانے کو ملتا کہ وہ زندہ رہ سکیں اور صرف اتنا آرام کرنے کی مہلت ملتی کہ آئندہ کام کرنے کیلئے تازہ دم ہو سکیں۔

(۷) غریبوں اور مزدوروں کی معاشرے میں کوئی عزت نہ رہی۔

(۸) اس معاشرے میں بے کار اور نکمے لوگ پیدا ہو گئے جن کا کام بڑے لوگوں کی خوشامد ہوتا تھا جس کی بدولت وہ ان ٹکڑوں پر پلتے تھے۔ (۴۸)

دولت کی تقسیم کے اس نظام کو شاہ ولی اللہ "قیصر و کسریٰ کا نظام" کہتے ہیں اور عالمی تاریخ کا جائزہ لیتے ہوئے یہ ثابت کرتے ہیں کہ:

"ایسے نظام کی جن تہذیبوں پر انسان فخر کرتا ہے ان میں تمام برائیاں موجود تھیں خاص کر ایران اور روم کی سلطنتیں تو ان تمام برائیوں کا ہی ملغوبہ تھیں"۔

اسلام اور آنحضرت ﷺ کی بعثت کا مقصد:

دولت کے اس غاصبانہ نظام پر بحث کرتے ہوئے شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ:

"جب انسانیت پر اس قسم کے مصائب بڑھ گئے اور اس میں معاشرتی برائیاں اور زیادہ ہو گئیں تو خدا نے آنحضرت ﷺ کو دنیا کی ہدایت کے لئے بھیجا اور آپ کے نظام کو دنیا کی ہدایت کیلئے میزان عدل (انصاف کی

ترازو) قرار دیا اور اس نبیؐ کے ذریعے خدا نے یہ بات طے کر دی کہ آپ کو ودیعت کیے "دولت کے نظام" کو ختم کر دیا جائے اور ایسی حکومتوں کا قلع قمع کیا جائے چنانچہ دنیا نے دیکھ لیا کہ آنحضرتؐ کے نظام دولت اور نظام حکومت سے قیصر و کسریٰ جیسی حکومتوں کا وجود ختم ہو گیا نہ کوئی قیصر رہا نہ کسریٰ۔(۴۹)

مسلمانوں کا ماضی اور حال:

شاہ صاحب نے آنحضرتﷺ کے دور کا جو نقشہ کھینچا ہے اس سے آپ نے یہ ثابت کرنا چاہا کہ دولت کی تقسیم کے غلط تصورات انسانوں میں پیدا ہوئے جن کی وجہ سے معاشرے میں بیماریاں پھیلیں اور وہ انسانیت کے بدن پر اس قدر پھیل گئیں کہ قدرت نے آپﷺ کے ذریعے ان بیماریوں کا علاج کیا اور قیصر و کسریٰ کے نظام کو ختم کیا۔ اس کی جگہ آپؐ نے ایک ایسا نظام دیا جس سے لوگ امن اور خوشحالی کی زندگی بسر کرنے لگے اور دنیا سے غربت، افلاس، جہالت اور مفاد پرستی جیسی بیماریوں کا خاتمہ ہونے لگا۔ آپﷺ کے بعد اس مشن کو کچھ عرصے تک لوگوں نے خوب اچھی طرح چلایا لیکن پھر ذاتی مفادات، دولت کی فراوانی اور زیادہ سے زیادہ حاصل کرنے کی ہوس وغیرہ جیسی برائیاں مسلمانوں میں بھی پیدا ہو گئیں اور اس قیصر و کسریٰ کے نظام کو اپنا لیا۔

"نبیؐ کی وفات سے نبوت ختم ہوئی اور وہ خلافت جس میں مسلمانوں کے درمیان باہم قتال نہ تھا حضرت عثمانؓ کی شہادت سے ختم ہو گئی پھر حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی شہادت اور امام حسنؓ کی معزولی سے خلافت ہی ختم ہو گئی زیادہ تکلیف دہ بات حکومت صحابہ کے ساتھ بنوامیہ کے جھگڑے ہیں اور ان کی سختیاں ہیں جن کی وجہ سے حضرت معاویہ کی حکومت قائم ہو گئی اس کے بعد جابر و سرکش بنوعباس کی حکومت ہے جنہوں نے قیصر و کسریٰ کے رسوم و رواج کے موافق پھر اپنی خلافت کی بنیاد ڈالی۔(۵۰)

شاہ صاحبؒ نے ان مختصر اور جامع الفاظ میں مسلمانوں کی پانچ سو سالہ سیاسی تاریخ کا نقشہ پیش کیا ہے

ان کے خیال میں مسلمانوں کا حال ان کے ماضی سے بھی خراب ہے قیصر وکسری کے نظام کی ساری باتیں ایک ایک کر کے آج ان میں پائی جاتی ہیں۔ اپنے دور کے مسلمان بادشاہوں اور جاگیرداروں کا تذکرہ کرتے ہوئے شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ:

''ان امیروں اور بادشاہوں کی حالت اگر تم دیکھ لو تو پھر تمھیں قیصر وکسری کے نظام اور انکے حالات بتانے کی بھی ضرورت نہیں رہے گی'' (۵۱)

دولت کی پیداوار کے وسائل اور ملکیت:

جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے شاہ ولی اللہؒ کا خیال یہ ہے کہ جوں جوں انسان کی ضرورتیں بڑھتی گئیں اور اس میں میری اور تیری کا خیال پختہ ہوتا گیا تو قدر اس میں خدا کی نعمتوں کو اپنی ملکیت بنانے کا جنون بھی بڑھتا گیا۔ اس طرح طاقتور کامیاب ہو گیا اور کمزور اس کے ظلم کا شکار ہو گیا۔ اس بات کو آپ نے کہیں انسان کی نفسیات پر بحث کرتے ہوئے بیان کیا ہے اور کہیں تاریخ عالم کا جائزہ لیتے ہوئے دہرایا ہے کہیں آپ ﷺ کے مشن پر روشنی ڈالتے ہوئے بیان کیا ہے اور کہیں اپنے زمانے کے حالات پر تنقید کرتے ہوئے اسے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔

آپ کی رائے میں دولت کی اصل بنیاد قدرتی وسائل ہیں انکے بعد زراعت، انسانی دولت کی پیداوار کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ زراعت سے تجارت وصنعت وجود میں آتے ہیں ان وسائل کو کام میں لانے کیلئے کچھ پیشے بن جاتے ہیں اور پھر یہ دولت محنت اور تنظیم سے معاشرے میں مہیا ہوتی ہے یہی وہ سوال ہیں جن سے ملکیت کا مسئلہ حل ہوتا ہے اسلئے شاہ صاحبؒ قدرتی زرعی، تجارتی وصنعتی وسائل پر خوب بحث کرتے ہیں۔

ملکیت کیا ہے؟

یہاں یہ بات بھی اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ حضرت امام الہندؒ کے نزدیک زمین کی ملکیت سے مراد کیا ہے؟

آپ لکھتے ہیں کہ:

الاصل فیہ ما ائو ماء نا ائن الکلاللہ لیس فیہ حق لاحدٍ فی الحقیقة لکن اللہ تعالیٰ اباح لھمہ الانتفاع بالائرض وما فیھا وقعت المشاحة فکاناالحمہ حینئذاءن لا یھیج اءحد مماسبق الیہ من عیر مضارة ،فالاءرض المیتة التی لیست فی البلاد علا فی فنا ئھا یذاعمرھا رجل فقد سبقت یدہ الیھامن غیر مضارة فمن حکمہ أن لا یھیج عیھا ، و الارض کلھا فی الحقیقة بمنزلة أورباط جعل وفقًا علی أبنا السبیل وھنہ فیقدم الاسبق و معنی الملک فی حق الادمی کونہ أحق بالانتفاع من غیرہ.(۵۲)

یعنی اس میں شک نہیں کہ مال سب کا سب اللہ تعالیٰ کا ہے اصل میں اس میں کسی کا حق نہیں ہے۔ لیکن چونکہ اللہ تعالیٰ نے زمین اور اس کی پیداوار سے فائدہ اٹھانے کی اجازت دے دی، تو لوگوں نے حرص اور لالچ کا اظہار شروع کر دیا (یعنی زیادہ سے زمین پر قبضہ کرنے لگے) اس سے قاعدہ یہ بنایا گیا کہ جو شخص کسی زمین پر پہلے قبضہ کرلے بشرطیکہ اس سے کسی کو نقصان اور ضرر نہ پہنچتا ہو، تو اسے اس کا فائدہ اٹھانے سے نہ ہٹایا جائے۔

لہذا غیر کاشت شدہ زمین کو جو شہر اور اس کے مضافات میں نہ ہو، جو شخص پہلے کاشت کرے، بشرطیکہ اس سے کسی کو نقصان نہ پہنچتا ہو تو اس کا حکم یہی ہے کہ اسے اس سے نہ ہٹایا جائے۔ ساری زمین حقیقت میں مسجد یا سرائے کی حیثیت رکھتی ہے یہی دونوں آنے جانے والوں پر وقف ہیں اور سب لوگ ان میں برابر کے شریک مگر جو پہلے آکر قبضہ کرلے، وہ اسی کی ہو جاتی ہے۔ (لیکن ظاہر کہ کوئی شخص اتنی ہی جگہ پر قبضہ کرنے کا حق رکھتا

ہے ،جتنی جگہ وہ بیٹھے) ایسے ہی زمین پر آدمی کے قبضے کے صرف یہ معنی ہیں کہ وہ دوسرے شخص کی بہ نسبت اس قطعہ زمین سے فائدہ اُٹھانے کا فائق حق رکھتا ہے۔

تعاونِ باہمی اور نظریہ ملکیت:

﴿ پوچھئے کہ زمین اور اس کی ساری موجودات کس کی ملکیت ہیں بتاؤ اگر تمہیں علم ہو۔ وہ جواب دیں گے سب کچھ اللہ کا ہے پوچھو کہ ساری چیزوں کی حکمرانی کس کے ہاتھ میں ہے وہ جواب دیں گے اللہ کے ہاتھ میں ﴾ (۵۳)

﴿ تم نے اپنی کھیتی پر غور کیا ہے اسے تم اگاتے ہو یا اس کے اصل اگانے والے ہم ہیں ؟ تم نے اس آگ پر غور کیا ہے جسے تم سلگاتے ہو؟ اس کا درخت تم نے پیدا کیا ہے یا اس کے پیدا کرنے والے ہم ہی ہیں؟ ﴾ (۵۴)

﴿ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے سب اللہ کا ہے ﴾ (۵۵)

﴿ اور ان مکاتب (غلاموں) کو اللہ کے اس مال میں سے دو جو اس نے تمہیں عطا کیا ہے ﴾ (۵۶)

﴿ اللہ نے جن اموال پر تم کو نائب بنایا ہے ان میں سے (اس کی راہ میں) خرچ کرو ﴾ (۵۷)

آیات بالا اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ انسان اور اس کے پاس موجود مال کا مالک حقیقی اللہ ہی ہے انسان محض نائب کے طور پر تصرف کا مجاز ہے گویا تفویض کردہ حقوق سے یہ تجاوز نہیں کرسکتا۔ اور تجاوز کرنے والا کوئی بھی فرد گمراہی کی راہ اختیار کرنے والا ہوگا۔

تصور ملکیت کا آغاز:

شاہ ولی اللہ انسانی زندگی کے رہن سہن اور اس میں تبدیلیوں کا جائزہ پیش کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:

﴿ انسان نے اس زمین پر جب اپنی تمدنی زندگی کا آغاز کیا تو اس کے پاس صرف قدرتی وسائل یعنی

....

زمین، دریا، پہاڑ، جنگل اور حیوانات تھے۔ اپنا پیٹ بھرنے کے لئے لوگوں نے قدرت کی ان نعمتوں سے فائدہ اٹھانا شروع کیا تو چونکہ انفرادی طور پر کوئی شخص تمام نعمتوں سے ایک ہی وقت میں فائدہ نہیں اٹھا سکتا تھا لہذا یہ بات ضروری ہوگئی کہ انسان ایک دوسرے کی ضروریات کی تکمیل میں ایک دوسرے کے معاون ہوں۔ ایک شخص زمین کھودنے کیلئے اوزار بنائے تو دوسرا زمین کھود کر کھیتی باڑی کرے تیسرا ان دونوں کو دودھ اور گوشت فراہم کرنے کیلئے مویشی پالے اور چوتھا ان سب کے لئے لباس تیار کرے ایک دوسرے کی مدد کرنے کیلئے لین دین کی مختلف شکلوں اور اس طرح چیزوں کے تبادلے (مبادلت) کا نظام وجود میں آیا۔ (۵۸)

محدود ملکیت:

ملکیت کے یہ محدود اختیارات نہ بے مقصد ہو سکتے ہیں نہ بجائے خود کوئی مقصد بن سکتے ہیں۔ جب کائنات میں تمام موجودات کی وہی حیثیت برحق اور مطالبات ہے جو مقصد تخلیق سے ہم آہنگ اور جب انسانی زندگی خود ایک مقصد رکھتی ہے تو انسانی ملکیت کے بجائے خود مقصد بن جانے یا بے مقصد ہونے کے کیا معنی؟ مال و املاک کی صحیح حیثیت صرف یہ ہو سکتی ہے کہ انہیں مقصد زندگی کا ذریعہ سمجھا جائے۔ انسان کو منصب خلافت کے پیش نظر اور دنیا و آخرت میں فلاح و کامرانی حاصل کرنے کے لئے جو کردار ادا کرنا ہے ملکیت کو اسی کردار کے حصول میں مدد کرنی چاہئے اسی مقصد کی خاطر انسان کو یہ حق عطا کیا گیا ہے اور یہی قرآن و سنت کی نظر میں اس کی صحیح حیثیت ہے، جیسا کہ قرآن پاک میں ارشاد ہے:۔

﴿تمہارے اموال جن کو اللہ نے تمہاری زندگی کے قیام کا ذریعہ بنایا ہے﴾ (۵۹)

جان و مال میں حق ملکیت کی وضاحت احادیث نبویؐ میں یوں ملتی ہے

﴿ابو واقدؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا جب نبی ﷺ پر وحی نازل ہوتی تھی تو ہم آپ کے پاس حاضر ہوتے تھے اور آپؐ ہمیں سناتے تھے۔ ایک دن آپ نے ہم سے فرمایا کہ اللہ عزوجل نے فرمایا ہے:۔

﴿یہ ہم نے مال اس لئے دیا ہے کہ نماز قائم کی جائے اور زکوۃ ادا کی جائے﴾

ابن آدم (حرص کا یہ عالم ہے کہ اس) کے پاس اگر ایک وادی (یعنی چراگاہ) ہو تو وہ چاہے گا کہ ایک اور مل جائے اور اگر اس کے پاس دو وادیاں ہوں تو وہ چاہے گا کہ ان کے ساتھ ایک اور بھی ہو۔ ابن آدم کا پیٹ صرف مٹی سے بھر سکتا ہے پھر جو توبہ کرے گا اور باز آجائے گا اللہ اسے معاف کر دے گا۔ (۶۰)

آپ ﷺ نے فرمایا کہ:

''اللہ کا تقویٰ اختیار کرنے میں مال بڑا اچھا مددگار ہے''۔ (۶۱)

یہی بات ایک دوسری حدیث میں بھی کہی گئی ہے:

''ہم سے موسیٰ بن علی بن رباح نے یہ حدیث بیان کرتے ہوئے کہا ہے کہ میں نے اپنے باپ کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ عمرو بن العاص نے کہا، مجھے رسول اللہ ﷺ نے بلایا۔ میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا آپ نے حکم دیا کہ میں اپنے کپڑے اور ہتھیار لے کر آؤں چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا اور آپ کی خدمت میں حاضر ہوا آپ وضو فرما رہے تھے آپ نے نظر اٹھا کر مجھے دیکھا پھر نگاہ نیچی کر لی اور فرمایا ''عمرو، میرا ارادہ ہے کہ تجھے ایک فوج کا کمانڈر بنا کر بھیجوں تاکہ اللہ تجھے مال غنیمت دلائے اور محفوظ بھی رکھے میری خواہش ہے کہ تجھے مال میسر آجائے'' عمرو کہتے ہیں کہ اس پر میں نے یہ کہا کہ ''اے اللہ کے رسولؐ میں مال کی طلب میں اسلام نہیں لے آیا ہوں بلکہ میری غرض صرف اسلام ہے اور یہ کہ اللہ رسول ﷺ کے ساتھ رہوں آپ نے یہ سن کر فرمایا کہ اے عمرو! صالح آدمی کے لئے صالح مال کتنی عمدہ چیز ہے''(۶۲)

لامحدود ملکیت کی ہوس اور تعاون کش رویہ:

انسانوں میں اچھے لوگ بھی پیدا ہوتے رہے ہیں اور برے بھی ان میں بعض سست اور کاہل بھی پیدا ہوئے جنہوں نے گھر بیٹھے روزی حاصل کرنا اپنا طریقہ بنا لیا تھا کچھ لوگ ان میں لالچی اور حرص کرنے والے پیدا ہو گئے جنہوں نے اپنی ملکیت ہی میں ہی نہیں کیا بلکہ دوسروں کی زمینوں اور ملکیتوں پر بھی قبضہ کرنا شروع کر دیا۔ اس قسم کے لوگوں کو قابو میں لانے کیلئے ان سے زیادہ زبردست لوگ پیدا ہو گئے وہ خود بھی لالچ

میں آ گئے اور زمینوں اور ملکیتوں پر بھی قبضہ کرنے لگے اس طرح ایک طرف ان غاصب زمینداروں کا ایک طبقہ پیدا ہو گیا دوسری طرف حقوق سے محروم ہونے والے لوگ معاون کی بجائے مزدور بن گئے اور تبادلے کی جگہ انہیں مزدوری ملنے لگی ان زمینداروں میں جو سب سے بڑا زمیندار ہوتا تھا وہ سردار کہلانے لگا۔ اپنے اپنے علاقوں میں لوگوں کو اپنے قابو میں رکھنے اور انہیں سزائیں دینے کے لئے وہ کچھ لوگوں کو ملازم رکھنے لگا جنہوں نے رفتہ رفتہ فوج کی شکل اختیار کر لی اس طرح جوں جوں انسانی تمدن میں ترقی ہوئی ایسے لوگ دوسروں کے حقوق غصب کر کے عیش وعشرت میں غرق مزید) نے ہر شخص ذاتی ملکیت بڑھانے میں مصروف ہو گیا۔

ملکیت کی ہوس کے نتائج:

جب انسان میں انفرادی سوچ غالب آئی تو ملکیت کو بڑھانے اور دوسروں کے حقوق غصب کرنے کا رجحان بھی بڑھا تو معاشرے میں کچھ اس طرح کی برائیاں رونما ہونے لگیں۔

(۱) لوگ آخرت کو بھول گئے اور شیطان ان پر غالب آ گیا۔

(۲) دولت کو مزید دولت حاصل کرنے کا ذریعہ بنانے اور زیادہ سے زیادہ نفع کمانے کے لئے استعمال کرنے کا رجحان بڑھ گیا۔

(۳) بڑا آدمی بننے کیلئے تاج وتخت، اونچے اونچے محل، حمام، باغات، گھوڑے چمکتے دمکتے قیمتی لباس اور غلاموں کا ہونا ضروری سمجھا جانے لگا۔

(۴) عیش وعشرت اور تکلفات معاشرے میں عام ہو گئے۔

(۵) غریبوں، کاشتکاروں، دوکانداروں اور دوسرے پیشہ وروں پر ٹیکس لگائے جانے لگے اور پھر ان ٹیکسوں کی رقم کسی نہ کسی بہانے بڑھنے لگی۔

(۶) مزدوروں، غریبوں پر سختی ہونے لگی ان کی قدر و قیمت گدھے اور بیل کی سی ہو کر رہ گئی جن کو امیر لوگ دولت پیدا کرنے کے لئے استعمال کرنے لگے۔ انہیں صرف اتنا کھانے کو ملتا کہ وہ زندہ رہ سکیں اور

صرف اتنا آرام کرنے کی مہلت ملتی کہ آئندہ کام کرنے کے لئے تازہ دم ہوسکیں۔

(۷) غریبوں اور مزدوروں کی معاشرے میں کوئی عزت نہ رہی۔

(۸) اس معاشرے میں بے کار اور نکمے لوگ پیدا ہوگئے جن کا کام بڑے لوگوں کی خوشامد ہوتا تھا جس کی بدولت وہ ان ٹکڑوں پر پلتے تھے۔

شاہ ولی اللہ کا خیال ہے کہ جوں جوں انسان کی ضرورتیں بڑھتی گئیں اس میں ''میری'' اور ''تیری'' کا خیال پختہ ہوتا گیا یوں تعاون باہمی کی جگہ طبقاتی کشمکش نے لے لی تو اسی قدر اس میں خدا کی نعمتوں کو اپنی ملکیت بنانے کا جنون بھی بڑھتا گیا، اس طرح طاقتور کامیاب ہوگیا اور کمزور اس کے ظلم کا شکار ہوگیا۔

اس بات کو کہیں آپ نے انسانی نفسیات پر بحث کرتے ہوئے بیان کیا ہے اور کہیں تاریخ عام کا جائزہ لیتے ہوئے، اپنے زمانے کے حالات پر تنقید کرتے ہوئے اسے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔(۶۳)

تعاون باہمی اور مارکیٹ اکانومی کا نظریہ:

معاشیات اسلام منڈیوں کی میکانیت کی بھی منکر نہیں ہے۔ بلکہ اس میں بھی اقتصادی معاہدہ بندی کے احیاء کی ترغیب دیتی ہے کیونکہ نجی ملکیت کا ادارہ منڈیوں کی میکانیت کے بغیر کمزور ہوجاتا ہے۔ جبکہ دوسری طرف صارفین اشیائے صرف کی ترجیحات کے اظہار سے قاصر ہوں گے، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اگر صارف اور آجر شریعت کی حدود میں رہ کر آزادانہ طور پر طلب کا اظہار اور رسد بہم پہنچانا چاہتے ہوں تو منڈیوں کی میکانیت کا وجود درمیان میں لازمی ہوگا یعنی صارف اپنی مرضی کے مطابق اشیاء کی خریدے یا طلب کرے اور آجر اپنی مرضی کے مطابق اشیاء پیداوار کی فروخت کرے۔

معاشیات اسلام ''معاہدہ بندی میں'' نفع کے محرک کو بھی جائز تصور کرتی ہے لیکن نفع کے حصول میں پر کوئی پابندی نہیں ہے مگر اس شرط کے ساتھ کہ وہ جائز طریقے پر کمایا گیا ہو، نفع کا خواہش مند صرف آجر ہی نہیں بلکہ صارف بھی ہوتا ہے جس مقام پر فریقین معنوں میں رضامند ہوں گے نفع کی وہ سطح قابل ہوگی اور یہی صحیح تر

اقتصادی معاہدہ بندی ہے۔

نفع کے محرک کی وجہ سے وسائل کی کارکردگی میں اضافہ ہوتا ہے لیکن اس کے حصول میں اسلام کے بنیادی مقاصد سے روگردانی نہیں ہونی چاہئے تاکہ سماجی اور معاشی انصاف اور منصفانہ تقسیم کے حصول میں کوئی رکاوٹ نہ آسکے۔ اسلام میں آزاد معاشی سرگرمیوں اور نفع کے محرک سے یہ معنی اخذ نہیں کرنے چاہئیں کہ معاشیات اسلام جدید مغربی معاشیات قریب تر یا اس پر انحصار کرتی ہے۔ ایسا ہرگز نہیں ہے فرق مندرجہ ذیل وجوہات کی بنیاد پر ہے۔

۱) انسان اللہ تعالیٰ کا خلیفہ ہے، اور نجی ملکیت پر اس کا حق ایک امانت سے زیادہ نہیں ہے۔

ارشاد ربانی ہے:

''آسمانوں اور زمینوں میں جو کچھ ہے سب اللہ کا ہے'' (۲۴)

۲) انسان ان تمام شرائط کی پابندی کرے جو ایک امین ہونے کی صورت میں اس پر عائد ہوتی ہے، حلال وحرام میں تمیز کرے، اخلاقی اقدار کا پاسبان ہو، معاونت اسلامی تعلیمات کے مطابق حاصل کی جائے اور اس کا تصرف بھی اسلام کے مقاصد کے مطابق ہو۔

درج بالا دونوں وجوہات سرمایہ دارانہ معیشت کی منڈیوں کی میکانیت پر کچھ حدود متعین کرتی ہیں جو درج ذیل ہیں:

۱) منڈی کے نظام میں تمام فیصلے براہ راست صارف کی رائے کو سامنے رکھ کر ہوتے ہیں، صارف اپنی رائے کا اظہار کرنسی کی اکائی خرچ کرنے سے کرتا ہے، یعنی کرنسی کی اکائی ووٹ کا کام سرانجام دیتی ہے، منڈی کے نظام کے تحت وسائل کی مختص گی صارفین کی رائے کو شمار کرنے کے بعد خود بخود طے پا جاتی ہے اگر صارفین شراب پر دودھ کی نسبت زیادہ خرچ کر رہے ہوں تو وسائل کا رخ خود بخود شراب کی پیداوار کی طرف ہو جائے گا، قیمتوں کے نظام کے تحت وسائل کی مختص گی بہتر انداز میں انجام پاتی ہے۔ یعنی یہ کہنا صحیح ہوگا کہ

منڈی کے نظام کی حیثیت اس منصف کی سی ہے جو اخلاقی طور پر غیر جانبدار ہوتا ہے اور اس کا ہر فیصلہ صارف کی رائے اور پسند کی بنیاد پر ہوتا ہے لیکن اسلام کا نظام جس کی بنیاد اخلاقی ترقی کو نشوونما دینا ہے وہ اخلاقی اعتبار سے کس طرح غیر جانبدار ہوسکتا ہے اسلام میں وسائل کی نامزدگی کی بہتر صورت یہ ہے کہ سب سے پہلے یہ پرکھا جائے کہ مختصگی کی اسلامی تعلیمات اور اصولوں کے ساتھ مطابقت ہو اور اس کے بعد اس کا صارف کی رائے سے مطابقت کا جائزہ لیا جائے ایک حقیقی اسلامی معاشرہ میں وسائل کی پختگی اور شریعت کے اصولوں کے درمیان کسی قسم کا کوئی تفاوت نہ ہوگا اگر کسی وجہ سے تفاوت پیدا بھی ہوا تو ریاست مداخلت کرے گی اور ایسی رائے عامہ تشکیل دے گی جو اسلامی تعلیمات کے عین مطابق ہو اور دوسری طرف وسائل پختگی کو پیداوار کی میکانیت اور تقسیم کا رخ بھی اسلامی اصولوں اور مقاصد سے مطابقت رکھے گا۔

۲) منڈی کے نظام میں صارفین کی خواہشات اور ضروریات کا تقابلی جائزہ اشیاء کی قیمتوں سے کیا جاتا ہے، یعنی جس شے پر زیادہ کرنسی خرچ ہو وہ زیادہ خواہش والی ہوگی اور جس پر کم کرنسی خرچ ہو وہ کم ضرورت والی ہوگی اگر دو افراد ایک جیسا خرچ کریں اور بیت (یعنی کرنسی کی اکائیاں) کا استعمال کریں تو ان کی ضرورتوں کی سطح بھی ایک جیسی تصور کی جائے گی اگر دو افراد کی ذاتی ضرورتوں کا مقابلہ ممکن ہو تو منڈی کی آزاد قوتیں وسائل کو مختص کریں گے لیکن اس کیلئے اولین شرط آمدنی کی منصفانہ تقسیم ہوگی۔

لیکن اگر معیشت میں آمدنی کی منصفانہ نہ ہو تو وسائل کی مختصی منڈی کی قوتوں کی وجہ سے صارف کی ایک کثیر تعداد کی خواہشات سے مطابقت نہیں رکھے گی منڈی کا نظام دولت مند طبقے کو اس بات کی اجازت دیتا ہے کہ وہ کرنسی کے ووٹ کے ذریعے اپنی خواہشات کو تسکین پہنچائے اور وسائل کی مقدار، جسامت اور سمت کا رخ معاشرتی اعتبار سے کم حامل پیداوار کی طرف کردے نتیجۃً وسائل کی مختصگی میں بھی کم ترجیحات حامل ہوگی کیونکہ قیمتوں کے نظام کا اس بات سے کوئی تعلق نہیں ہوتا کہ فرد کتنے ووٹ رکھتا ہے بلکہ اس کا تعلق مجموعی ووٹوں سے ہوتا ہے جو شے کی حمایت میں مقابلہ دوسری شے کیلئے ہوتے ہیں اسلئے نظام اسلام میں قیمتوں کے ذریعے

وسائل کی مختصگی منصفانہ تقسیم آمدنی کے بعد ہی ممکن ہے۔

۳) اجارہ داری یا ایسی صورتیں جن میں قیمتیں حقیقی لاگت یا فوائد کو صحیح صور پر ظاہر نہیں کرسکتیں یا جس کی وجہ سے منڈی کی قوتوں کے عمل کارکردگی میں ناکاملیت پیدا ہو جاتی ہے اس سے نہ صرف یہ کہ قیمتوں میں مواقع کی لاگت کے اعتبار سے تفاوت پیدا ہوگا بلکہ سماجی لاگت اور فوائد بھی شمار کرتے وقت نظرانداز کر دیئے جائیں گے اگر غائرانہ نظر سے دیکھا جائے تو سماجی فلاح و بہبود کے اعتبار سے یہ لاگت اور فوائد کافی اہم ہوتے ہیں اور نظام اسلام کی بنیاد فلاح پر انحصار کرتی ہے ان تمام معاشی تفاوتوں کو قیمتوں کے خودکار نظام کے ذریعے ختم کرنے کیلئے ایک عرصہ درکار ہوگا منڈی کے نظام میں خود ناکاملیت پائی جاتی ہے جبکہ کوئی خاص فرد یا فرم بھی اس سلسلے میں کوئی خاص صلاحیت نہیں رکھتے۔

جب اس قسم کی ناکاملیت منڈی میں پائی جائے تو بغیر کسی رہنمائی یا کنٹرول کے جو فلاحی حکومت کی جانب سے ہو تو منڈی کا کلی نظام اس قابل نہیں ہو سکتا کہ وہ وسائل کی پختگی صحیح طور پر کر سکے۔

۴) سرمایہ دارانہ نظام میں افراد جن اشیاء کی ملکیت رکھتے ہیں ان کے استعمال پر مکمل آزادی رکھتے ہیں ان اشیاء کا تصرف بھی اپنی خواہش اور تسکین کو مدنظر رکھتے ہوئے کرتے ہیں۔

آجر اگر قیمتوں میں اضافہ چاہتا ہے یا ان کو مناسب سطح پر رکھنے کا خواہاں ہے تو وہ اپنی مصنوعات اور پیداوار کو ضائع بھی کرسکتا ہے اور ان کے تلف کرنے پر آجر پر کوئی پابندی یا اخلاقی سزا عائد نہیں ہوتی لیکن نظام اسلام میں انسان کی حیثیت اللہ کے نائب اور ایک امین کی سی ہے۔ اگر وہ جان و مال کو ضائع کرتا ہے تو وہ ایک بہت بڑے اخلاقی جرم کا مرتکب ہوگا جیسے کہ ارشاد خداوندی ہے۔ جب اسے اقتدار حاصل ہو جاتا تو زمین میں اس کی ساری دوڑ دھوپ اس لئے ہوتی ہے کہ فساد پھیلائے کھیتوں کو غارت کرے اور نسل انسانی کو تباہ کرے حالانکہ اللہ فساد کو ہرگز پسند نہیں کرتا۔ (۶۵)

۵) منڈی کو بظاہر عمل میں صحیح کارکردگی پیدا کرنے کے لئے مکمل مقابلے کی شرط لازمی ہے۔ لیکن اس

کے باوجود بے روزگاری معاشی بحران اور سماجی اشیاء کی منصفانہ تقسیم صحیح رخ وسمت کی جانب گامزن نہیں ہوتی لیکن جوحکومت فلاح کومقصد سمجھتی ہے وہ ان تمام مسائل کوکم از کم وقت میں حل کرسکتی ہے۔

۶) مقابلہ کی جدوجہد میں ایسی کامیابی ممکن سمجھی جاتی ہے جو سماجی اور اخلاقی مقاصد سے ٹکراتی ہو۔لیکن ایک فلاحی حکومت کی موجودگی میں اس قسم کی کامیابی کی قطعاً اجازت نہیں۔ہاں !ایسی کامیابی کی اجازت ضروری ہے جو اخلاقی وسماجی انصاف کے حصول میں معاون ثابت ہو اور منصفانہ تقسیم آمدنی کا باعث بنے۔

اسلام منڈیوں کے نظام سے اس لئے منکر نہیں ہے کہ یہ معاشرے میں افراد کی آزادی کا ضامن اور نہ ہی یہ نظام واجب التعظیم اور نہ تبدیل ہونے والا ہے بلکہ سب سے زیادہ اہمیت کی بات معاشیات میں انسانی فلاح ہے جو کہ اسلام کے مقاصد میں ہے جبکہ منڈی کے نظام کا مقصد معاشی مقاصد کا حصول افراد کی آزادی کے ذریعے ہے اگر اسلام منڈیوں کے نظام کو قبول کرتا ہے تو اس میں کچھ ترامیم کے ساتھ قبول کرے گا،تاکہ صحیح اقتصادی معاہدہ بندی ممکن ہو سکے اور نظام آئیڈیل بن سکے۔نیز اسلام کی تعلیمات اور قوانین میں یہ قوت موجود ہے کہ وہ منڈی کے نظام کو صحیح سمت نیز معاشی اور سماجی انصاف اور فلاح و بہبود کی جانب موڑ سکے اسلئے کہ سرمایہ کاری کی کھلی چھوٹ اور ساری دنیا کو ایک کھلی منڈی تصور کرنے کا وہ راستہ جس پر زمانہ حال میں سرمایہ داری نظام کو اپنانے والے ممالک (بطور خاص امریکہ) چل رہے ہیں اور انہیں اس پر فخر بھی ہے دراصل وہ اسلام کے نظامِ معیشت کے اس پہلو سے آشنا ہی نہیں ہیں بلکہ موجودہ منڈی سسٹم ارتکازِ زر کو خطرناک حد تک ممکن بنا دیتا ہے جو کہ اسلامی نظام معیشت میں تعاونِ باہمی کو ختم کرنے والی بات ہے اسی خطرے کے پیش نظر یہ کہنا بھی قبل از وقت نہیں کہ یک نہ ایک دن امریکہ ارتکاز کی اسی لعنت کے نتیجہ کے طور پر باقی دنیا سے تصادم کی راہ پر چل نکلے گا۔

☆ ☆ ☆

باب پنجم

فصل سوم

پاکستان کے قدرتی وسائل

(NATURAL RESOURESES OF PAKISTAN)

کسی ملک کی معاشی ترقی کا انحصار اس کے قدرتی وسائل اور ان کے صحیح استعمال پر ہے اگر ان وسائل سے پوری طرح استفادہ کیا جائے، تو ملک معاشی ترقی کی منزلیں بہت جلد طے کر لیتا ہے اور اگر ان کو غیر مستعمل اور بیکار پڑا رہنے دیا جائے، تو قدرتی وسائل کی کثرت کے باوجود ملک غریب اور کم ترقی یافتہ رہے گا۔

قائداعظمؒ نے قیام پاکستان کے ساتھ ہی یہ فرمایا تھا:

> ''ابھی ہم سیاسی طور پر آزاد ہوئے ہیں۔خدا نے ہمیں بیش بہا قدرتی وسائل سے نواز ہے۔اگر ہم ہمیشہ کے لئے اپنی سیاسی اور معاشی آزادی برقرار رکھنا چاہتے ہیں۔تو ان وسائل کو زیادہ سے زیادہ کام میں لانا چاہئے۔''

پاکستان کے قدرتی وسائل کون کون سے ہیں:

پاکستان کی اہمیت اس کے محل وقوع سے بہت زیادہ ہوگئی ہے دنیا کی تجارت میں قدرت نے اسے ایک ممتاز مقام عطا کیا ہے۔وہ ہر ملک سے تجارت کرنے کیلئے بہت موزوں ہے اس کے پاس زرخیز زمینوں کے بڑے بڑے حصے ہیں جن پر کھیتی باڑی کی جاتی ہے اور غذائی اور غیر غذائی پیداواریں حاصل کی جاتی ہیں۔اس کے بڑے بڑے فلک بوس پہاڑوں میں معدنیات کے خزانے موجود ہیں۔اس کے بڑے بڑے دریا کھیتوں کو

سیراب کر رہے ہیں اس کے جنگلات بعض صنعتوں کے لئے، خام اشیاء کی رسد کا بہت بڑا ذریعہ ہیں۔ اس میں ہر قسم کی صنعت کے قیام کیلئے، مختلف قسم کی موزوں آب و ہوا پائی جاتی ہے، غرض کہ پاکستان کی معاشی ترقی کے سامان قدرت نے مہیا کئے ہیں اس کی جنوبی سمندر سے گھری ہوئی ہیں جہاز رانی کی تمام تر سہولتیں اسے حاصل ہیں اس کے بندرگاہ مشرقی نصف کرۂ زمین کے انتہائی مرکزی اور اہم مقام پر واقع ہیں۔

پاکستان کے قدرتی وسائل میں، قدرت کے وہ تمام تحائف شامل ہیں۔ جن کے توسط سے اہل پاکستان اپنے تمام تر معاشی احتیاجات کی تکمیل کرتے ہیں، جن کو انھوں نے اپنی انتھک کوششوں کے ذریعہ اپنایا ہے ان میں خصوصی طور پر آبادی، زمین، جنگلات، جزائر، معدنیات، طاقت پیدا کرنے کے ذرائع اور آب و ہوا قابل ذکر ہیں۔

(۱) معدنی وسائل (Mineral Resources)

جن ملکوں میں معدنی وسائل زیادہ اور جدید استعمال ہوتے ہیں وہ صنعتی ترقی کی منزلیں بہت تیزی کے ساتھ طے کر لیتے ہیں ان معدنیات کی کان کی وسیع پیمانے پر ہونی چاہیئے۔ جن کا براہ راست تعلق صنعتی ترقی سے ہوتا ہے ہمارے ملک میں بھی حکومت پاکستان نے منصوبہ بندی کے تحت یہ کام شروع کر رکھا ہے کیوں کہ اب ہمارے پاس کان کنی کی جدید ترین مشینوں کی کمی نہیں ہے کانوں میں کام کرنے کے لئے جدید سائنسی سہولتیں بھی فراہم ہیں اس کے علاوہ دشوار گزار مقامات تک پہنچنے کے لئے جدید قسم کی سڑکیں ریلیں اور دیگر ذرائع رسل ورسائل موجود ہیں۔ پاکستان میں بھی شروع کرنا ہے ارضیاتی نقشوں کی تیاری اور مالاکنڈ ایجنسی کے علاقے قلعہ شاہ کوٹ میں، کرومائٹ کے ذخائر کی تلاش پر توجہ دی گئی۔ چلغازی میں فولاد اور کرہ سلطان کے علاقے میں، گندھک کے ذخائر کی دریافت کے لئے کوشش کی گئی۔ وسائل کی تلاش کے لئے غیر ممالک سے بھی ماہرین ارضیات بلائے گئے ہیں۔ اپنے ملک کے ماہرین کو بھی تحقیقی تعلیم مہیا کی جا رہی ہے۔ پاکستان کے وسیع ریگستانی علاقوں کو دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ پاکستان کو قدرت نے وسیع معدنی ذخائر عطا کیے ہیں۔ حکومت پاکستان کو

....

کنیڈا کے ماہر ارضیات، مسٹر میک آرتھر نے یہ بتایا تھا کہ ''چٹگام'' کے پہاڑی علاقوں میں سونے کی کانیں موجود ہیں۔ اس وقت تک جن ذخائر کا پاکستان میں پتا چلا ہے۔ جو کہ مندرجہ ذیل ہیں:۔

(۱) سوئی گیس (۲) پیٹرولیم (۳) کومائیٹ (۴) جپسم (۵) کوئلہ (۶) لوہا (۷) نمک (۸) چونے کا پتھر (۹) گندھک (۱۰) سلکاریت (۱۱) ابراق (۱۲) سونا وغیرہ وغیرہ (۶۶)

(ii) جنگلات (Forests)

جنگلات بھی کسی ملک کے باشندوں کی معاشی زندگی پر اثر انداز ہوتے ہیں:۔

معاشین (Economists) کا خیال ہے کہ ہر ملک میں تقریباً ایک چوتھائی رقبہ زمین پر جنگلات کا ہونا ضروری ہے، تاکہ وہ ملک کی ضروریات کو پورا کر سکیں تقسیم ہند سے پاکستان کے حصہ میں، جنگلات کے کل علاقے کا صرف 4% فی صد حصہ آیا اس وقت جنگلات 94 لاکھ ایکڑ رقبے میں پائے جاتے ہیں۔ اس میں سے 93 لاکھ ایکڑ جنگلات مشرقی پاکستان میں پائے جاتے ہیں پانی کی کمی کی وجہ سے پاکستان میں بڑے اور گھنے جنگلات نہیں ہیں۔

پاکستان میں جنگلات کی معاشی اہمیت
(Economic Importance of Pakistan Forests)

جنگلات کی معاشی اہمیت کا تعلق ہے وہ یہ ہے کہ ہزاروں باشندوں کو روزگار مہیا کرتے ہیں، کیونکہ ان کی پیداوار سے مختلف قسم کی اشیاء تیار کی جاتی ہیں، جنگلات سے ایسی اشیاء تیار کی جاتی ہیں جو براہ راست برآمد کی جا سکتی ہیں، اور انکے ذریعے مبادلہ کمایا جاتا ہے ملک کے باشندوں کو ان سے ایندھن ملتا ہے کام کی اشیاء صنعتوں میں کام آتی ہیں وہاں سے جانوروں کیلئے چارہ (Fodder) بھی ملتا ہے حکومت کو بھی ٹیکس کے ذریعے آمدنی ہوتی ہے وہ جانوروں کی رسد کا بھی ذریعہ ہیں پاکستان کے جنگلوں کی خصوصی پیداوار گھاس، چس، بانس، گول پتا، بید، دباغت کی چھال وغیرہ بھی ہیں لکڑی فرنیچر کے کام آتی ہے کھیل کا سامان

تیار کرنے والی صنعت بھی، ان ہی جنگلات کی وجہ سے قائم ہے،

پاکستان میں جنگلات کی اس کمی کے باوجود، بہت سی صنعتیں ان ہی کی بدولت چل رہی ہیں۔ وہ لوگوں کو روزگار مہیا کرنے کے علاوہ، مفید اور کار آمد اشیاء بھی سپلائی کرتے ہیں۔ پاکستان میں کھیلوں کا سامان مثلاً ھاکی، بلا، ریکٹ وغیرہ سب سیالکوٹ میں تیار کئے جاتے ہیں، کیوں کہ ان کی لکڑی میں شہتوت کی لکڑی استعمال کی جاتی ہے یہ لکڑی چھنگا منگا سے با آسانی حاصل ہوتی ہے، ہری پور، ہزارہ اور کشمیر کے بعض جنگلات میں بھی اس قسم کی لکڑی ملتی ہے جو اس سامان کی تیاری میں استعمال ہوتی ہے، اب یہ صنعت لاہور میں بھی قائم کی گئی ہے، ماچس کی تیلیوں کیلئے نرم اور ریشہ دار لکڑی بھی ان ہی جنگلات سے دستیاب ہوتی ہے۔ ماچس کی ڈبیاں بنانے کیلئے بھی پرت دار لکڑی یہی جنگلات سپلائی کرتے ہیں حکومت پاکستان ان جنگلات کی اہمیت سے بخوبی واقیف ہے ہماری حکومت کا ''محکمہ جنگلات'' ان جنگلات کے تحفظ پر پوری توجہ دے رہا ہے۔

(iii) پاکستان کے حیوانی وسائل
(Animal Resources Of Pakistan)

عام طور پر زراعتی ملکوں میں حیوانی وسائل کو زیادہ اہمیت دی جاتی ہے، کیوں کہ وہاں کھیتی باڑی انہی کے ذریعہ کی جاتی ہے، پاکستان میں اس وقت مویشیوں کی تعداد چار کروڑ اسی لاکھ ہے۔ ان کی ضرورت اور اہمیت کا اندازہ لگا کر پاکستان میں (Veterinary Department) ادارہ قائم کیا گیا ہے، تاکہ مویشیوں کی دیکھ بھال ہو سکے۔ ان کی پرورش سائنٹیفک طریقے پر ہو، اور ان کے افزائش نسل میں مدد ملے۔ موجودہ حکومت نے مویشیوں کا تجرباتی اسٹیشن (Tha Pakistan Anima Husbandry Research Institute) کے نام سے قائم کیا ہے۔ اس سے مویشیوں کی پرورش کی جاتی ہے، اور وہاں بہتر قسم کے مویشی حاصل کئے جاتے ہیں۔

☆☆☆

باب پنجم

فصل چہارم:

زمین (Land)

زمین کا مفہوم:

علم معاشیات میں زمین کو بہت زیادہ وسیع معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے اس میں وہ تمام قدرتی ذرائع اور قدرتی قوتیں شامل ہیں جن سے ہم کو پیدائش دولت میں مدد ملتی ہے اس کا مطلب یہی ہے کہ سطح زمین کے علاوہ زمین کی معدنی دولت اور آسمان کے نیچے جتنی بھی اشیاء ہیں سب زمین کے تحت آتی ہیں یعنی ہر چیز جو قدرت نے ہم کو مفت عطا کی ہے اس میں شامل ہے اس وجہ سے ان تمام اشیاء کو ''عطیاتِ قدرت'' Gifts of nature کہا جاتا ہے بعض ماہرین معاشیات نے ان کو ''قدرتی ذرائع پیدائش'' کہا ہے ان میں سے بعض عطیات لازمِ حیات ہیں مثلاً ہوا، پانی اور دھوپ وغیرہ۔

ہر شے اس وقت تک عطیہ قدرت کہلاتی ہیں جب تک کہ اس پر لاگت نہیں آتی مگر جیسے ہی اس پر رقم خرچ کی جاتی ہے وہ سرمایہ بن جاتی ہے مثلاً سوئی گیس جس وقت تک تلاش نہیں کی گئی وہ عطیہ قدرت تھی مگر جیسے ہی اس پر روپیہ خرچ کر کے اسے معلوم کر لیا گیا وہ پاکستان کی دولت یا اصل بن گئی۔ اس طرح پاکستان کے تمام قدرتی وسائل مثلاً جنگلات حیوانات وغیرہ اس کی دولت ہیں۔

پروفیسر مارشل نے زمین کی تعریف یوں کی ہے

''زمین سے مراد وہ قوتیں اور مادے ہیں جو قدرت نے پانی، ہوا،
روشنی، زمین اور حرارت کی شکل میں انسان کی مدد کیلئے مفت عطا کئے ہیں''

مگر ریکارڈو نے یہی کہا ہے کہ:

''قدرت عطیات دینے میں کنجوسی سے کام لیتی ہے'' (۶۷)

جس طرح دوسرے عاملین پیدائش اپنی خصوصیات کے علیحدہ علیحدہ حامل ہیں بالکل اسی طرح ''زمین'' بھی اپنی خصوصیات کی حامل ہے، جو اسے اصل اور دوسرے عاملین پیدائش سے ممتاز کرتی ہے۔

وہ خصوصیات یہ ہیں:

(۱) زمین قدرت کا مفت عطیہ ہے:

(Free Gift of Nature)

یہ دراصل ایک نعمت ہے، جو قدرت نے معاوضہ کے بغیر انسان کو عنایت کی ہے اگر انسان یہ چاہے کہ وہ زمین کا کوئی جزو تیار کرے تو اس کی حقیقت میں نہیں ہے انسان نے زمین پر سے جنگل صاف کر کے عالیشان عمارتیں اور فیکٹریاں قائم کیں زمین کی تخلیق میں انسان کی کوششوں کا کوئی حصہ نہیں ہے وہ صرف اس کا ایک جزو ہے۔

(۲) زمین کی رسد محدود ہے:

(Land is Limited inSupply)

انسان زمین کے اس مقدار میں جو قدرت نے اسے عطا کی ہے نہ کمی کر سکتا ہے اور نہ اضافہ دوسرے الفاظ میں زمین کی رسد بالکل محدود ہے، مگر دوسری عاملین پیدائش کی مقدار میں وہ کمی اور اضافے پر قادر ہے اگر وہ شجر کاری کا کام انجام دیتا ہے تو وہ زمین نہیں کہلائی جا سکتی، وہ اصل بن جائے گی۔

(۳) زمین میں نقل پذیری نہیں ہے:

(Land is Non-Transferable)

ہماری روزانہ کی زندگی میں بہت سی چیزیں ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کی جا سکتی ہیں مگر زمین کا ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنا ممکن نہیں ہے ایک جگہ کے قدرتی حالات وہاں کے انسانوں، جانوروں، فصلوں، ترکاریوں اور پھلوں پر اثر انداز ہوتے ہیں اسی وجہ سے دو جگہوں کے باشندوں کے حالات و عادات واطوار میں زبردست فرق پایا جاتا ہے اگر زمین میں نقل پذیری موجود ہوتی تو آج ہر شخص ذخائیر پر قبضہ کر کے بیٹھا رہتا پہاڑوں، جنگلوں اور ریگستانوں میں کون رہتا مگر زمین کی اس خصوصیت کی وجہ سے ہر شخص مجبور ہے اور اسے اپنی بقائے حیات کیلئے اشیاء حاصل کرنا پڑتی ہیں۔

۴) زمین کی نوعیت میں فرق:

(Difference in quality)

ہر علاقے کی پیداوار مختلف ہوتی ہے کیوں کہ ہر علاقے کی زمین کی خصوصیات علیحدہ ہوتی ہیں کہیں کی زمین زیادہ زرخیز ہوتی ہے اور کہیں کی کم، کوئی زمین کسی چیز کی پیدائش کیلئے موزوں ہوتی ہے اور کوئی کسی اور چیز کے لئے، غرض کہ مختلف زمینوں سے مختلف اشیاء ملتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کہیں غذائی پیداوار حاصل ہوتی ہے اور کہیں صرف پھول کے کہیں میوے کے درخت ہوتے ہیں۔ پہاڑی علاقوں اور جنگلوں کی پیداوار بھی ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہے یہ سب فرق صرف زمین کی نوعیت کے فرق کی وجہ سے ہوتا ہے

۵) زمین ایک مستقل عامل پیدائش:

(Land is a Permanent Factor of Production)

انسان کی محنت جمع نہیں کی جا سکتی اگر آج انسان محنت نہیں کرے، تو وہ کل برباد ہو جائے گا مگر زمین کی تمام تر صفات بالکل اسی طرح کا نقصان پہنچ جاتا ہے، تو وہ اپنی خصوصیت کو دوبارہ جمع کر لیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صد ہا برس سے زمین پر کھیتی باڑی کی جا رہی ہے مگر اس کی زرخیزی ختم نہیں ہوئی اسے قدرت نے دوبارہ قوت حاصل کرنے کے صلاحیت عطا کی ہے۔

(۲) محدود پیداوار (Linited Product)

اگر کوئی انسان اس بات کی خواہش کرے کہ وہ ایک قطعہ اراضی سے لامحدود پیداوار حاصل کرے، تو یہ ناممکن ہے۔ کیونکہ اصولاً ہر قطعہ زمین کی زیادہ سے زیادہ پیداوار کی ایک حد ہوتی ہے ہم اس پر لامحدود سرمایہ لگا کر پیداوار کو لامحدود طور پر نہیں بڑھا سکتے۔

زمین کی کارکردگی (Efficiency of Land)

زمین کی کارکردگی سے ہماری مراد یہ ہے، کہ زمین کی قوت پیداوار سے ہم کس طرح کب اور کن حالات میں زیادہ سے زیادہ پیداوار حاصل کر سکتے ہیں مندرجہ ذیل عناصر زمین کی کارکردگی پر اثر انداز ہوتے ہیں۔

(۱) قدرتی حالات (Natural Condition)

کسی زمین کے قدرتی حالات جس قدر زیادہ بہتر اور موزوں ہوں گے اسی قدر زمین کی پیداوار بھی زیادہ ہوگی۔ اس کی پیدائش کی طاقت کا انحصار آب وہوا پر ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ اس کے کیمیاوی اجزاء بھی اس کی پیدائش اجناس میں اضافہ کرتے ہیں اس کی معدنیات کی پوشیدہ قوتیں ملک کو صنعتی بنا دیتی ہیں۔ اگر کسی ملک کی زمین زرخیز ہے تو وہ اسے زراعتی ملک بنا دیتی ہے اس کا مطلب یہ ہوا کہ قدرتی حالت کے مطابق، اگر وہاں کی آبادی ان کو صحیح اور نئے ڈھنگ پر استعمال کرے تو وہ ملک پیداوار کی فراوانی سے ایک خوشحال ملک بن جائے گا۔

(۲) انسانی وسائل (Human Resources)

ہر ملک کی ترقی وہاں کی آبادی پر منحصر ہوتی ہے۔ اگر کسی ملک کے لوگ تیز اور چست و چالاک ہوتے ہیں تو وہ ملک بہت کے جلد ترقی کر جاتا ہے اور اگر وہاں کے باشندے سست ہوتے ہیں تو ملک کی حالت روز

بروز ابتر ہوتی چلی جاتی ہے۔ مگر جب حکومت اور آبادی دونوں مل کر وسائل کا صحیح استعمال کرتے ہیں تو ملک بہت جلد ترقی کر جاتا ہے۔ قوم کی خوشحالی کا راز اس ملک کی محنت میں مضمر ہے۔ اگر کسی ملک کے باشندے اپنے قدرتی وسائل کو استعمال کرنے لگتے ہیں تو وہ ملک بہت جلد ترقی کرتا ہے اور وہاں دولت کی فراوانی ہوتی ہے قوم کا معیار زندگی بلند ہو جاتا ہے اور پھر اس میں قوت کارکردگی پیدا ہو جاتی ہے جو دولت کی مزید پیدائش میں استعمال ہوتی ہے۔

(۳) معاشرتی یا عمرانی حالات

(Social Conditions)

جس ملک کے لوگ مہذب ہوتے ہیں وہ اپنے سماجی حالات بہتر رکھتے ہیں وہاں پر طرح طرح کی آسانیاں حاصل ہوتی ہیں۔ بازار اور منڈیاں بھی وہاں ہوتے ہیں ذرائع آمد و رفت بہت زیادہ ترقی یافتہ ہوتے ہیں، وہ ملک کی صنعتی ضروریات پورا کرتے رہتے ہیں وہ پیداوار ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرتے ہیں جہاں وہ زیادہ منافع پر فروخت کی جاتی ہیں۔

''کاشت وسیع اور کاشت عمیق'':

(Extentive & Intensive Cultivation)

آج کل کاشت کے دو طریقے ہیں ایک کاشت وسیع اور دوسرا کاشت عمیق۔ کاشت وسیع وہ طریقہ ہوتا ہے جس میں زمین کے ایک قطعہ کو ایک بار زیر کاشت لایا جاتا ہے اور اسے ایک مقررہ مدت کے لئے چھوڑ دیا جاتا ہے تاکہ وہ اپنی زرخیزی، ہوا دھوپ، پانی اور روشنی دوبارہ حاصل کر سکے جب تک دوسرے قطعات پر کاشت کی جاتی ہے ہر بار زیر کاشت علاقے کو کچھ دنوں کے لئے چھوڑ دیا جاتا ہے اور نئے زمین پر کاشت کی جاتی ہے۔ مگر یہ صرف ان ملکوں میں ہوتا ہے جہاں آبادی کم ہوتی ہے اور زمین کافی مقدار میں موجود ہوتی ہے جیسے جیسے آبادی بڑھتی جاتی ہے، نئے علاقے مستقل طور پر زیر کاشت آجاتے ہیں۔ پرانے زمانے میں جب

کہ آبادی کم تھی پر علاقے میں یہ طریقہِ کاشت رائج تھا اُس وقت زمینوں میں قدرتی زرخیزی پورے طور پر موجود تھی، اور ذرا سی محنت سے کافی پیداوار حاصل ہو جاتی تھی۔

کاشت عمیق کا طریقہِ عہد حاضر دور میں تمام ممالک میں رائج ہے کیوں کہ آجکل ہر ملک کو زیادہ آبادی کی ساتھ، غذائی مسئلہ حل کرنا پڑ رہا ہے نئی زمین نہ ہونے کی وجہ سے زیادہ غذائی پیداوار حاصل کرنے کے لئے اسی قطعہِ زمین پر مزید محنت اور اصل لگایا جاتا ہے۔ اس سسلہ میں کاشت کے نئے طریقے ایجاد کیے گئے ہیں، تا کہ ان سے زیادہ پیداوار حصل ہو۔ اور زمین بر بار کاشت کر کے اس سے کئی فصلیں حاصل کر سکیں اس طریقہ کاشت کو ''کاشت عمیق'' کہتے ہیں۔

پیدائش دولت میں زمین کی اہمیت:

(Importance of Land in Priduction)

زمین کے بغیر کسی قسم کی دولت پیدا نہیں ہو سکتی کیوں کہ قدرت نے انسان کے لئے طرح طرح کے عطیات پیدا کئے ہیں۔ ان عطیات پر انسانی وسائل لگائے جاتے ہیں اور ان سے افادہ حاصل کیا جاتا ہے اس کا مقصد یہ ہوا کہ زمین ہی ''بنیادی عاملِ پیدائش ہے'' زندگی کی بقا کے لئے ہر شخص کو زمین ہی سے ملتی ہے۔ غذائی پیداوار غیر غذائی پیداوار اور معدنیات سب زمین ہی سے حاصل ہوتی ہیں اسی بنا پر بعض ماہر معاشیات نے اسے ''دولت کی ماں'' کہا ہے اس حقیقت سے کسی طرح بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کیوں کہ کسی ملک کی ترقی کا انحصار بھی انہی وسائل پر ہوتا ہے۔

اگر کسی ملک کے پاس قدرتی وسائل اچھے نہیں ہوتے تو وہ ترقی نہیں کر سکتا، مگر جن ملکوں کے پاس قدرتی وسائل موجود ہیں وہ جلد ترقی کر جاتے ہیں موجودہ زمانے میں نئی نئی ریلیں اور نئے نئے کارخانے سب زمین ہی سے بنائے جا رہے ہیں اس سے فیض حاصل کیا جا رہا ہے نئی صنعتوں کا قیام بھی اس پر ہو رہا ہے دولت کی پیدائش کی نوعیت بھی ہر علاقے کی زمین پر منحصر ہوتی ہے۔ جنگلات، پہاڑ، دریا، ریگستان اور میدان

....

وغیرہ ملک کی پیدائشِ دولت میں مدد کرتے ہیں ہمیں غذا، پھل پھول اور ترکاریا سب کچھ زمین ہی کی بدولت حاصل ہوتے ہیں ۔غرض کہ تمام عالمین پیدائش میں زمین کو بہت اہمیت حاصل ہے ۔ (۶۸)

شاہ ولی اللہ کی نظر میں زرعی وسائل

زمین کی ملکیت کے بارے میں شاہ صاحبؒ کے خیالات کی بنیاد آپ کا ''عمرانی عدل'' (معاشرہ میں صحیح انصاف) کا فلسفہ ہے جس کی روح یہ ہے کہ نہ تو دوسروں پر ظلم کرو اور نہ ظلم ہونے دو۔

آپ کے نزدیک فلسفہ ملکیت کا دارومدار انسان کی تو بیت اور اس کی محنت پر ہے اور ان جائز ذرائع پر ہے جو قدرت نے انسان کو فطری طور پر عطا کئے ہیں ۔عدل عمرانی کے تقاضوں کو سامنے رکھتے ہوئے حضرت شاہ ولی اللہؒ نے زمین کی ملکیت کے مسئلے پر چند بنیادی باتیں کہی ہیں ۔انہیں آپ نے کسی ایک بحث کے تحت بیان نہیں فرمایا۔

زمین کی حقیقی ملکیت:

زمین کا حقیقی مالک صرف اور صرف خدا ہے۔

انسانوں کیلئے زمین کی حیثیت:

خدا کی یہ ساری زمین سب انسانوں کے لئے ایک مسجد اور سرائے کی طرح وقف ہے۔جس طرح ایک وقف میں سب مسافروں کو فائدہ اٹھانے کا پورا حق ہوتا ہے۔اسی طرح سب لوگ خدا کے کے اس وقف (زمین) سے فائدہ اٹھانے میں برابر کے شریک ہیں۔ (۶۹)

زمین سے فائدہ اٹھانے کا اصول:

خدا کی زمین سے فائدہ اٹھانے کا طریقہ تو یہ ہے کہ زمین اجتماع (خلیفہ یا حکومت) کے پاس چلی جائے اور وہ افراد کی اہلیت اور ان کی محنت کے مطابق اس کو تقسیم کرے۔دوسری صورت یہ ہے کہ جو شخص اس سے

فائدہ اٹھا رہا ہو اسی کو اس کی دیکھ بھال اور معاملات کا ذمہ دار بنا دیا جائے۔ اس صورت میں جو پہلے اپنے تصرف میں لائے وہی حقدار ہو گا۔ نہ اس کو تنگ کیا جائے نہ اس کو کسی قسم کا نقصان پہنچایا جائے۔ بلکہ آنحضرت ﷺ کے فرمان کے مطابق یہ اصول بنا لیا جائے کہ: (۷۰)

''جس نے غیر آباد زمین آباد کیا وہ اسی کی ہے''

ملکیت کا مفہوم:

جو شخص خدا کی زمین اپنے تصرف میں لا رہا ہے اور اس زمین کے معاملات کے ذمہ دار ہونے کی حیثیت سے اس کا ملک ہے تو شاہ صاحبؒ کے نزدیک ملکیت سے مراد یہ ہے کہ ''دوسرے لوگوں کی نسبت اس زمین سے فائدہ اٹھانے کا زیادہ حقدار ہے۔ (۷۱)

کاشتکاری یا معائدہ ''منفیعت زرعی''

ملکیت کی اصلی بنیاد تو یہ ہے کہ انسان خود اپنے ہاتھوں سے فصل بوئے اور کھیت میں کام کرے لیکن ایک صورت یہ بھی ہے کہ ایک انسان کسی مجبوری یا اور کسی وجہ سے خود تو کھیت میں کام نہیں کر سکتا لیکن جسمانی کام کے علاوہ اس کی دوسری قانونی ذمہ داریاں قبول کرتا ہے وہ اگر کسی دوسرے شخص سے اس زمین میں محنت (جسمانی کام) کرنے کا معائدہ کر لے تو اسلامی قانون کی اصطلاح میں اس کو ''مزارعت'' کہتے ہیں اس میں دونوں معائدہ کرنے والے پیداوار میں برابر کے شریک ہوتے ہیں اس طرح درخت تو ایک آدمی کے ہوتے ہیں اور دوسرا آدمی انہیں پانی دیتا ہے اور ان کی دیکھ بھال کرتا ہے جب پھل پک کر اتریں تو دونوں آپس میں بانٹ لیں گے اس کو ''مساقات'' کہتے ہیں۔

چنانچہ زمین فائدہ اٹھانے کیلئے اس قسم کے زرعی معائدوں (مزارعت، مخابرت، مساقات وغیرہ) کا شاہ ولی اللہ بھی ذکر کرتے ہیں (۷۲)

اس مسئلے پر مسلم علماء نے کافی بحثیں کی ہیں تاکہ لوگ بڑی بڑی زمین کے مالک ہو کر خود ہاتھ پر ہاتھ

رکھکر نہ بیٹھ جائیں خود عیش کریں اور دوسرے انسانوں کو ایک طرح کا غلام بنالیں اس لئے ہر بڑے عالم نے اس اہم مسئے پر اپنی رائے بیان کی ہے۔

ان میں کچھ لوگوں کا خیال یہ ہے کہ چونکہ آنحضرت ﷺ نے خیبر کے یہودیوں کو زمین اس شرط پر فائدہ اٹھانے کیلئے دی تھی کہ اس میں جو بھی پیداوار ہو اس کا آدھا ہو سرکاری خزانے (بنت المل) میں دیا کریں گے اس کے علاوہ بھی آنحضرت ﷺ کے زمانے میں ایسی مثالیں ملتی ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ زمین کے مالک اور کاشتکار کے درمیان اس قسم کا معائدہ ہوسکتا ہے۔

لیکن کچھ مسلم علماء سر بیے کے اسلامی نظام کی روح کے پیش نظر اسلامی ترغیبات اور حضور ﷺ کے اقوال کی روشنی میں اس قسم کے معائدے کے قائل نہیں تھے۔ان کے خیال میں اس طرح پھر جاگیرداری اور زمینداری کا نظام پھلے پھولے گا ور قیصر وکسری کے دور کی خرابیاں مسلمانوں میں بھی پیدا ہو جائیں گی جس سے زراعت کے بارے میں اسلامی روح کو نقصان پہنچے گا۔چنانچہ یہ علماء حضور ﷺ کے اس ارشاد کو دیلک مانتے ہیں جس میں آپؐ نے فرمایا:

> ''کسی شخص کے پاس زمین ہو تو اس کو نہ بٹائی (مضاربت) پر دے اور نہ نقد لگان (ٹھیکہ یا اجارہ) پر دے اور تم میں سے جس کے پاس بھی زمین ہو یا تو وہ خود کاشت کرے یا اپنے مسلمان بھائی کو کاشت کے لئے مفت دے دے'' (۷۳)

ایک دوسری جگہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ:

> ''کسی کے پاس زمین ہو تو اس کو چاہیے کہ خود کاشت کرے یا دوست کو مفت کاشت کے لئے دیدے اور دونوں میں سے کوئی بات نہیں کرنا چاہتا تو زمین کو روک لے'' (۷۴)

شاہ ولی اللہؒ کے سامنے قرآن وحدیث کی تعلیمات بھی تھیں، مسلم علماء کے افکار بھی اور مسلمانوں کے ماضی اور حال خاص طور پر ہندوستان کے مسلمانوں کی حالت بھی آپ نے کاشتکاروں کے ان معاہدوں کو ''معاونت'' (امداد باہمی) قرار دیا جن کی روح سے کاشتکار اور زمین کا ملک نفع میں برابر کے شریک ہوجاتے ہیں۔ اور بتایا کہ:

جب تک دونوں میں ''عدل عمرانی'' (معاشرتی انصاف) کی بنیاد پر تعاون ہے دونوں کی روزی بہتر طور پر چلے گی اور جب کسی طرف سے بھی اس میں خرابی واقع ہوگئی تو انسانوں کی معاشرتی زندگی میں فساد برپا ہوجائے گا اسلئے ''معاونت'' کی شرط یہ ہے کہ زمین کا مالک ہو یا کاشتکار کوئی بھی کسی کو تنگ نہ کریگا کیونکہ مقصد کاشتکار بننا یا زمین کا مالک بننا نہیں ہے بلکہ خدا نے جو مال زمین کی صورت میں جائز کردیا ہے اس سے فائدہ اٹھانا ہے ملکیت (زمین) سے مراد صرف یہ ہے کہ زمین کے مالک کو دوسروں کی نسبت (جن کی وہ زمین ملکیت نہیں ہے) نفع حاصل کرنے کا حق زیادہ ہے ورنہ حقیقت میں سب ہی لوگ اس فائدہ میں شریک ہیں۔(۷۵)

چنانچہ زمین کو ان مختلف قسم کے معاہدوں (مزارعت، مضاربت اور اجارہ وغیرہ) کے تحت ان اصولوں کو سامنے رکھ کر دینے میں شاہ ولی اللہؒ کے نزدیک کوئی حرج نہیں ہے۔

زمینداری اور جاگیرداری کا وہ نظام جس میں کاشتکاروں پر ظلم ہوتا ہے شاہ صاحبؒ کے نزدیک باطل اور قابل نفرت نظام ہے اس کو بار بار شاہ صاحبؒ قیصر و کسریٰ کے نظام سے یاد کرتے ہیں۔

اس زمینداری نظام کی شاہ صاحبؒ خصوصیات بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:

زمیندار عیش و آرام میں رہنے لگتا ہے اس عیش کوشی کے لئے وہ اپنے مزارعین پر ''رواج'' اور ''رسوم'' اور دیگر ناموں سے بھاری ٹیکس لگا دیتا ہے تاکہ مزارعہ کے پاس دولت کم رہے وہ خود پیداوار کا اکثر حصہ اپنے گھر لے جائے۔ ان ٹیکسوں کو وہ بیچارے مزارعہ سے سختی سے وصول کرتا ہے

> اگر وہ پھر بھی ادا نہ کریں تو ان سے لڑائی جھگڑا کرتا ہے اور طرح طرح کی تکلیفیں دیتا ہے۔ ان کو حیوانوں کی طرح سمجھنے لگتا ہے اور اپنی فصلوں کو پانی دینے، فصل اگانے اور کاٹنے کے لئے استعمال کرتا ہے۔ انہیں صرف اس قدر دیتا ہے کہ وہ زندہ رہ سکیں آرام بھی اتنا ہی دیتا ہے کہ وہ پھر کام کرنے کے لئے تازہ دم ہو سکیں۔

ان باتوں کو بیان کرتے ہوئے شاہ صاحبؒ اپنے زمانے کے ہندوستان کی حالت کا بھی ذکر کرتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ یہی حالت اس وقت ہندوستان کی ہے بلکہ اس قدر بدتر ہے کہ قیصر و کسریٰ کا زمانہ بھی اس کے سامنے کچھ نہیں۔ اس لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ اس قسم کے نظام کو ختم کیا جائے اور صحیح اسلامی کاشتکاری نظام لایا جائے۔ (۷۶)

زرعی نظام:

مزدوروں کی اجرت کی طرح اسلامی حکومت کی یہ بھی اختیار ہے کہ وہ کسانوں کے لئے بٹائی کی ایک کم از کم شرح متعین کر دے جو کسانوں کی محنت کا مناسب صلہ بھی ہو اور ان کی ضروریات زندگی کی معقول کفالت بھی کر سکے اس غرض کے لئے بھی ایک بورڈ قائم ہونا چاہئے تھا جس میں کسانوں، زمینداروں اور حکومت کو بھی مساوی نمائندگی حاصل ہو مزرعت (بٹائی) کے معاملات میں جو ظلم و ستم زمینداروں کی طرف سے کسانوں پر ہوتے ہیں۔ ان کی اصل وجہ مزارعت (بٹائی) کا جواز نہیں بلکہ وہ فاسد شرطیں ہیں جو زمیندار کسانوں کی بیچارگی سے فائدہ اٹھا کر ان پر قولی یا عملی طور سے عائد کر دیتے ہیں جو اسلام کی رو سے قطعاً ناجائز اور حرام ہیں اور ان میں سے بہت سی بیگار کے حکم میں آتی ہیں ایسی تمام شرائط کو خواہ وہ زبانی طے کی جاتی ہوں یا رسم و رواج کے ذریعے ان پر عمل آتا ہو۔ قانوناً ممنوع قرار دے دیا جائے تو مزارعت کا معاملہ کسانوں کے حق میں بالکل بے ضرر ہو جائے گا۔

مزارعت کے معاملے میں جس ظالمانہ رسم و رواج نے جکڑ لی ہے اور جس کی وجہ سے کسانوں پر ناجائز شرطیں عائد کی جاتی ہیں اگر اس پر فوری طور سے قابو پانا ممکن نہ ہو تو اسلامی حکومت کو یہ اختیار بھی حاصل ہے کہ وہ ایک عبوری دور کے لئے یہ اعلان کر دے کہ اب زمینیں بٹائی کے بجائے ٹھیکہ پر دی جاتیں یا یہ طریقہ تجویز کر دے کہ کاشت کار بٹائی کے بجائے مقررہ اجرت پر زمیندار کے لئے بحیثیت مزدور کام کریں گے اس اجرت کی تعین بھی حکومت کر سکتی ہے اور بڑے بڑے جاگیرداروں پر یہ شرط بھی عائد کر سکتی ہے کہ وہ عبوری دور تک زمین کا کچھ حصہ سالانہ اجرت کے طور پر مزدور کاشت کاروں کو دیں گے۔

احیاء اموات کے شرعی قوانین نافذ کئے جائیں یعنی جو کاشت کار غیر محوکہ غیر آباد بنجر زمینوں کو آباد کریں گے ان کو ان زمینوں پر مالکانہ حقوق دیئے جاتیں جو زمینیں جاگیرداروں کو آباد کرنے کے لئے دی گئیں اور انھوں نے ان کو خود آباد کرنے کے بجائے کاشت کاروں کو بٹائی پر دے دیا وہ کاشتکاروں کی ملکیت ہو گئیں کاشت کاروں کو ان پر مالکانہ حقوق دیئے جائیں اور پیداوار کا جو حصہ وصول کیا وہ واپس دیا جائے۔

زمین کے رہن کے جتنے رائج ہیں ان سب کو یکسر ممنوع قرار دیا جائے گا اور جو زمینیں اس وقت ناجائز طریقوں سے زیر آب ہیں ان سب کو چھڑا کر ان غریب اور مستحق مالکوں کی طرف لوٹا جائے۔ اس عرصے میں قرض خواہوں نے رہن زمین سے جو نفع اٹھایا ہے اس کا کرایہ ان کے ذمہ واجب ہے، اس کرائے کو قرض دار کو دلوائی جائے۔

ہمارے یہاں بڑی بڑی جاگیروں کے ارتکاز کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے، کہ بہت سی زمینوں میں سالہا سال سے وراثت جاری نہیں ہوئی اسلامی حکومت ایسی زمینوں کی تحقیق کے لئے بھی بورڈ قائم کرے جو ایسی زمینوں کو ان شرعی مستحقین میں تقسیم کرے اگر اسلام کا قانون وراثت صحیح طریقے سے جاری ہو تو ایک ہاتھ میں بڑی بڑی جاگیریں جمع ہونے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

انتقال جائیداد کے طریقوں کو سہل بنایا جائے اور زمینوں کی آزادانہ خرید و فروخت کی حوصلہ افزائی کی

جائے کاشت کاروں کیلئے حکومت کی طرف سے غیر سودی قرضوں کا انتظام کیا جائے۔

کاشت کاروں کے لئے آسان قسطوں پر زرعی آلات مہیا کئے جائیں اور زراعت کی بہتر تعلیم وتربیت کا انتظام کیا جائے زرعی امدادِ باہمی تحقیق میں ایسی باہمی کاشت کے طریقے کو فروغ دیا جائے جس میں کھاد، بیج اور آلات کی فراہمی انجمن کے ماتحت ہو۔

ہمارے معاشرے میں زرعی پیداوار کی فروخت اتنے واسطوں سے ہوکر گزرتی ہے کہ ہر درمیانی مرحلے پر قیمت کا حصہ تقسیم ہوتا چلا جاتا ہے آڑھتیوں، دلالوں اور اس طرح کے دوسرے درمیانی اشخاص (Middle Men) کی بہتات سے دوطرفہ نقصان ہوتے ہیں ایک طرف کاشت کاروں کو پیداوار کا مناسب معاوضہ نہیں مل پاتا اور دوسری طرف بازار میں گرانی پیدا ہوتی ہے۔اسی لئے احادیث کی رو سے اسلام میں دیہی کاشت کار اور شہری خوردہ فروش کے درمیانی واسطوں کو پسند نہیں کیا گیا اسلامی نظام میں موجودہ طریقے کو بدل کر یا تو ایسے منظم بازار (Organised Markets) کافی تعداد میں قائم کیے جائیں۔جن میں کاشتکار خود بلاواسطہ پیداوار کو فروخت کرسکیں یا پھر فروخت پیداوار کا کام لینے کیلئے آڑھتیوں اور دلالوں سے کام لینے کے بجائے امدادِ باہمی کی ایسی انجمنیں پیداوار فروخت کریں تاکہ قیمت کا جو بڑا حصہ درمیانی اشخاص کے پاس چلا جاتا ہے اس سے کاشت کار اور عام صارفین فائدہ اٹھا سکیں۔

نفقات:

نفقات کے بارے میں اسلامی قانون کو تمام وکمال نافذ کیا جائے اور بیوی بچوں کے علاوہ جن خاص خاص رشتہ داروں کی معاشی کفالت اسلام نے خاندان کے کشادہ دست افراد پر ڈالی ہے اس کو قانونی شکل دے کر یتیموں، بیواؤں اور اپاہجوں کے معاش کا بندوبست کرے۔

زکوٰۃ:

زکواۃ کی نگرانی کے لئے مستقل محکمہ قائم کیا جائے جو مندرجہ ذیل کام کرے:

(الف) قیام پاکستان سے لے کر اب تک جن سرمایہ داروں نے زکواۃ ادا نہیں کی ان سے زکواۃ وصول کر کے غریبوں میں تقسیم کرنے کا انتظام کرے۔

(ب) ہر سال مویشیوں کی زکواۃ وصول کر کے اسے غریبو میں تقسیم کرے۔

(ج) سونے چاندی کی سالانہ زکواۃ اور زرعی پیداوار کا عشر مالکان خود ادا کریں گے لیکن یہ محکمہ اس بات کی نگرانی کرے انھوں نے زکواۃ اور عشر ادا کیا ہے یا نہیں۔

روزگار:

ملک کے باشندے کیلئے روزگار فراہم کرنا بھی حکومت کی ذمہ داری ہے اور کوشش کے باوجود جو افراد بیروزگار رہ جائیں ان کیلئے روزگار کی فراہمی تک اور بیروزگار الاؤنس جاری کئے جائیں۔

فلاحی فنڈ:

حکومت کی طرف سے ایک ''فلاحی فنڈ'' قائم کیا جائے اور عام چندوں کے ذریعہ بھی اس رقم میں کیا جائے اس فنڈ کے ذریعے بھاری صنعتیں بھی قائم کی جا سکتی ہیں تا کہ اس رقم کے ذریعہ ملکی صنعت کو فروغ بھی ہوا اور ان کے منافع سے ''فنڈ'' میں اضافہ بھی ہوتا رہے۔ اس فنڈ کے ذریعہ غریبوں مزدوروں اور کسانوں کی رہائش کا معیار بلند کرنے کیلئے آسان قسطوں پر متوسط درجے کے مکانات تعمیر کیے جائیں کثیر تعداد میں مفت شفا خانے قائم کیے جائیں بتدریج میٹرک تک کی تعلیم مفت کی جائے اور عوام کی معاشی حالت بہتر بنانے کے لئے دوسرے اقدامات کیے جائیں۔

کسی قوم کی معاشی حالت محض پیسوں کی کثرت سے نہیں سدھر سکتی جب تک وہ بیہودہ یا مخرب الاخلاق چیزوں میں پیسہ خرچ کرنے سے اور ضرورت کے کاموں میں اسراف سے پرہیز نہ کرے۔ یوں تو انفرادی ملکیتوں میں بھی حرام اور ناجائز ہے لیکن جو رقم کسی شخص کی انفرادی ملکیت نہ ہو بلکہ قومی ملکیت ہو اس میں فضول خرچی کی حرمت اور زیادہ شدید ہو جاتی ہے لیکن ہمارے معاشرے میں سب سے زیادہ فضول خرچی قومی

خزانے میں ہوتی ہے ہر سال خزانے کا بلا مبالغہ کروڑوں روپیہ شاہانہ تقریبات، سرکاری دوروں، سرکاری عمارتوں کے سامان تعیش اور زینت و آرائش کے بہانے قطعی طور پر بند کرنا تو ممکن نہیں لیکن ان مقاصد کے لئے جس بیدردی کے ساتھ قومی روپیہ بہایا جاتا ہے اس کا کوئی شرعی، عقلی اور معاشی جواز نہیں ہے بسا اوقات ایک ایک دعوت پر ایک ایک لاکھ روپیہ خرچ کیا گیا ہے اور اگر حساب لگایا جائے تو قیام پاکستان کے بعد سے اب تک یقیناً اربوں روپیہ ان فضول خرچیوں میں صرف ہوا ہے۔ اسلامی نظام میں قومی دولت کے اس ضیاع کی کوئی گنجائش نہیں۔ لہذا تقریبات اور سرکاری دوروں کے لئے اخراجات کی ایک مناسب حد مقرر کر کے اس کی سختی کے ساتھ پابندی کرائی جائے اور اس طرح جو خطیر رقمیں بچیں انھیں ''فلاحی فنڈ'' میں داخل کیا جائے۔

قومی دولت:

قومی دولت کی ایک بہت بڑی مقدار آجکل مقدار آجکل ان مقاصد پر صرف ہو رہی ہے جو شرعی طور پر حرام اور ناجائز ہیں مثلاً شراب فلموں اور دوسری حرام اشیاء کی درآمد پر کروڑوں روپیہ سالانہ خرچ ہوتا ہے۔ زرمبادلہ کے اس زبردست نقصان کو بالکل بند کیا جائے اور اس خطیر رقم کو عوامی فلاح کے کاموں میں صرف کیا جائے۔ غیر مسلموں کو شراب استعمال کرنے کی اجازت ہوگی۔ لیکن درآمد کرنے کی نہیں۔ (۷۶)

زراعت کی ترقی کے وسائل

اسلام زراعت کے جواز سے زیادہ اس کے کارِ ثواب ہونے کا داعی ہے اور زراعت ایسا پیشہ ہے جو نہ صرف انسان کی بنیادی ضروریاتِ زندگی کا کفیل بن سکتا ہے بلکہ دیگر معاشی پیشوں مثلاً تجارت، صنعت، و حرفت وغیرہ کا مدار بھی اسی سے خام مال کی فراہمی پر ہے تو یہ سوچنا پڑتا ہے کہ اس معاشی عمل کو زیادہ سے زیادہ ترقی دی جائے اور ایسے تمام وسائل بروئے کار لائے جائیں جو اس ترقی و توسیع میں مدد و معاون ثابت ہوں۔

اسلام کا معاشی نظام جو دونوں جہانوں کی فلاح و خوش حالی کا ضامن ہے وہ انسانی زندگی کے اس قابل

اعتماد معاشی وسیلہ (زراعت) کی ترقی کے لئے چند ذرائع و وسائل تجویز کرتا ہے جو مندرجہ ذیل ہیں:

ا) بنجر زمینوں کی آباد کاری اور اس کے لئے عطیات زمین کا طریقہ۔

ب) مسائل آب پاشی کی ترقی و توسیع۔

ج) لگان و مال گذاری کی تخفیف۔

د) کاشت کاروں (مزارعین) کے لئے خصوصی مراعات۔

ا) بنجر زمینوں کی آباد کاری:

زراعت کی ترقی کے لئے ایک نہایت قابل اعتماد وسیلہ یہ رہا ہے اور ہے بھی کہ بے آباد زمینوں کو آباد کیا جائے ایسی زمینیں صحراؤں، جنگلوں، پہاڑوں، چٹیل میدانوں اور خشک نیوں کی شکل میں پڑی ہوئی ہیں۔ ایسی زمینیں انسانی محنت، صبر اور توکل کا امتحان لے کر آباد کی جا سکتی ہیں سخت جان اور مسلسل محنت کر کے بھی مایوس نہ ہونے والی قوم یا افراد ایسی زمینوں کے ثمرات سمیٹ سکتے ہیں۔ تنِ آسان، آرام اور صرف کاغذی منصوبے بنانے والے اور محض تمناؤں کے گھوڑے دوڑانے والے افراد اس معاشی ذریعہ سے کبھی فائدہ نہیں اٹھا سکتے اسلام کا معاشی نظام اپنے پیروکاروں کو یہ ترغیب دیتا ہے کہ دنیا کی زندگی کی خوشحالی کے لئے اور زراعت کے بابرکت پیشہ کو ترقی دینے کے لئے یہ ضروری ہے کہ غیر مزروعہ، بنجر اور بے آباد زمینوں کو سخت محنت کر کے آباد کیا جائے۔

نبی ﷺ نے اس سلسلہ میں امت کو ترغیبات دی ہیں۔ مثلاً:

''من عمّر أرضا ليست لأحد فهو أحق بها (۷۷)

ترجمہ ''جس شخص نے کسی زمین کو کاشت کے قابل بنالیا کو کسی کی ملک نہیں تو وہ شخص ہی اس کی ملکیت کا مستحق ہے''

''من أحيا أرضا ميتة فهي'' (۷۸)

ترجمہ ''جس کسی نے مُردہ زمین کو زندہ کیا (قابل کاشت بنایا) وہ اسکی ہوگئی۔

''من أحاط حائطًا على الارض فهي لهٗ'' (۷۹)

ترجمہ: ''جس نے کسی (بنجر افتادہ) زمین پر احاطہ کھینچ لیا وہ زمین اسی کی ہوگئی''

فقہاءِ اسلام کے نزدیک بنجر زمین، سخت زمین، ریتلی زمین یا ریت چڑھی ہوئی زمین، پتھریلی زمین ٹیلے جو آبادی سے دور ہوں جن کا نہ کوئی ملک ہے یا ملک کا پتہ نہیں چلتا، خلاصہ کلام یہ کہ جو زمین ناکارہ پڑی ہو اور اس کی یہ خرابی قدیم اور عادی ہو (یہ سب موات، مردہ زمینیں ہیں) لہٰذا اگر کوئی مسلمان یا ذمی (کافر رعایا) خلیفہ کی اجازت سے اسے قابل کاشت بنالے تو یہ زمین اس کی ملکیت میں چلی جائے گی۔

آبادکاری کے طریقے:

ایسی زمینوں کی آبادکاری کے دو طریقے ہوسکتے ہیں:

پہلا طریقہ: اسلامی ریاست کا سربراہ (امیر المومنین) ضرورتمند کسانوں اور صاحبِ استطاعت و استعداد افراد کو ترغیب دے کہ وہ ایسی زمین آباد کرنے کے لئے فراغ دلی سے کام لیں۔ یہ ترغیب مختلف طریقوں سے ہوسکتی ہے مثلاً:

ا) انہیں دو تین سال کا لگان معاف کردے۔

ب) آسان قسطوں پر بلاسود قرضے اور آلات مشینری وغیرہ دے۔

ج) سب سے زیادہ موثر ترغیبی طریقہ یہ ہوگا کہ انہیں ان زمینوں کا مالک بنادیا جائے۔ اسکو اسلامی معاشیات کی اصطلاح میں اقطاع یا جاگیر دینا کہتے ہیں۔ ہم اس تیسرے طریقہ ترغیب پر روشنی ڈالتے ہیں۔

طریقہ اقطاع:

نبی کریم ﷺ سے لیکر آخرت تک کے تمام اسلامی خلفاء بنجر زمینوں کی آبادکاری کے لئے انہیں مختلف افرادِ اُمت کو بطور اقطاع یا جاگیر دیتے آئے ہیں۔ چند نظائر ملاحظہ ہوں:

۱) نبی کریم ﷺ کی عطا کردہ جاگیریں:

۱)عن أسماء بنت أبی بکر رضی اللہ عنہا : أن رسول اللہ ﷺ أقطع الزبیر رضی اللہ عنہ أرضا بخیبر فیہا شجر و نخل، (۸۰)

ترجمہ: حضرت زبیرؓ کو خیبر سے ایک قطع زمین بطور جاگیر عنایت فرمایا جسمیں درخت اور کھجور کے پیڑ تھے''

۲)وفی روایۃ ابی داؤد واحمد انہ صلی اللہ علیہ وسلم اقطعہ حضر فرسہ فاجری فرسہ حتی قام رنی بسوطہ فقال :اعطوہ من حیث یلغ السوط ، ''(۸۱)

ترجمہ: ''ابوداوؒدؒ اور امام احمدؒ کی روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے حضرت زبیرؓ کو وہاں تک زمین عنایت فرمانے کا حکم دیا جہاں تک ان کا گھوڑا دوڑ سکتا تھا۔ انہوں نے اپنا گھوڑا دوڑایا یہاں تک کہ وہ تھک کر رک گیا ۔ پھر انہوں نے اپنا کوڑا پھینکا ۔ آپ ﷺ نے فرمایا ۔ انہیں وہاں تک زمین دے دو جہاں تک ان کا کوڑا پہنچا ہے''

۳)عن ابن عباس رضی اللہ عنہ ان رسول اللہ ﷺ أقطع بلال بن الحارث المزنی رضی اللہ عنہ معاون القبلیہ وھی من أعمال الفرع، ''(۸۲)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت بلال بن الحارث المزنیؓ کو معاون قبلیہ (مکہ اور مدینہ منورہ کے

درمیان) کی اونچی زمین بطور جاگیر عطا فرمائی ۔ ایک دوسری روایت میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے پوری وادی وقیق عنایت فرمائی ۔

۴)''عن عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ : أن رسول اللہ ﷺ اقطع فرات بن حیان العجدی أرضاًبالیمامہ، ''(۸۳)

ترجمہ: حضرت عدی بن حاتمؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرات بن حیان العجیؓ کو یمامہ میں زمین بطور جاگیر عطا فرمائی ۔

۵)''عن عمرو بن دینار رضی اللہ عنہ : لما قدم النبی ﷺ اقطع لأبی بکر و اقطع لعمر بن الخطاب رضی اللہ عنہما، ''(۸۴)

ترجمہ: حضرت عمرو بن دینارؒ کہتے ہیں کہ جب نبی کریم ﷺ مدینہ تشریف لائے تو آپؐ نے حضرت ابوبکر وعمرؓ کو زمینی قطعات عنایت فرمائے (۸۵)

۶) نبی کریم ﷺ نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کو انصار یا وفاء کے گھروں اور کھجوروں کے درمیان کچھ قطعات عطا کئے ۔

۷) حضرت علقمہ بن وائلؒ اپنے والد محترم سے روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے انہیں حضرموت میں ایک جاگیر عنایت فرمائی اور حضرت امیر معاویہؓ کو اُن کے ساتھ بھیجا تاکہ وہ زمین ناپ کر دیں۔

زمینوں کی آبادی اور اقطاع الارض (زمین کو بطور جاگیر دینا) میں ان قواعد کو مفصل بیان کیا ہے یہاں ان قواعد وضوابط کو مختصراً بیان کیا جا رہا ہے ۔

۱) وہ زمین اسلامی ریاست کے کسی مسلم ذمی رعایا کی ملکیت نہ ہو۔

امام ابو یوسفؒ تحریر فرماتے ہیں:

''وللامام ان یوطع کل موات و کل ما کان لیس لأ

حد فی ید احد''

ترجمہ: ''امام کو چاہیئے کہ وہ تمام بنجر زمینیں بطور قطوات دیدے اسی طرح

ایسی تمام زمینیں بھی جو نہ تو کسی کی ملکیت ہوں نہ کسی کے قبضہ میں

ہوں'' (۸۶)

۴) وہ زمین رفاہِ عام اور مصالح عامہ کے کام نہ آتی ہو یا نہ آسکے اور شہر یا گاؤں سے دور واقع ہو۔

وقد كان أبو حنيفة يقول: من أحياء أرضاً موتا بغير

اذن الامام فليست له، وللامام ان يخرجها من رده ويصنع

فيها مارأى من الاقطاع والاجارة عغير ذلك. (۸۷)

ترجمہ: ''حضرت امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں: جس کسی نے موات

زمین خلیفہ کی اجازت کے بغیر آباد کی وہ اس کی نہیں ہو جائے گی اور خلیفہ کو

اختیار ہوگا کہ وہ (اگر چاہے تو وہ) زمین اس کے قبضہ سے نکال کر اس میں

جو کرنا چاہتا ہے کر سکتا ہے۔ وہ کسی کو زمین بطور اقطاع دے سکتا ہے اور

اجارہ وغیرہ پر بھی دے سکتا ہے''۔

اقطاع یا احیاء الموات میں یہ شرط ہے کہ جس شخص نے مردہ زمین کو احاطہ کر کے آباد نہ کیا یا جسے وہ آبادکاری کی غرض سے دی گئی مگر اس نے اسے تین سال تک آباد نہ کیا جس سے اقطاع اور احیاء الموات کا مقصد اور زمین کی آبادکاری فوت ہو گیا تو یہ زمین اُس شخص کے قبضہ سے نکال کر بحق سرکار رکھی جائے گی یا کسی دوسرے شخص کی آبادکاری کی شرط پر دے دی جائے گی۔ اس ضمن میں نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

''عادی الارض اللہ ولرسول ، ثم لکم من بعد فمن احیاء ارضاً میتتاً فھی لہ، ولیس لمر حتجر حق بعد ثلاث''. (۸۸)

ترجمہ: (غیر مملوکہ) افتادہ زمین اللہ کریم اور رسول کریم ﷺ (اسلامی ریاست) کی ہے پھر ان کے بعد تمہارے لئے ہے۔ جس شخص نے مردہ زمین کو زندہ (آباد) کرلیا وہ اسی کی ملکیت ہوگی مگر بے کار اور کاشت روکے رکھنے والے کا حق تین سال کے بعد ساقط ہو جائے گا۔

اس سلسلہ میں حضرت بلال بن حارثؓ اور حضرت عمرؓ کا مکالمہ بڑا دلچسپ ہے۔ روایات میں آتا ہے کہ حضرت بلال بن حارثؓ کو نبی کریم ﷺ نے معادن قبیلہ کے درمیان کی بنجر زمین آباد کاری کیلئے بطور جاگیر عطا فرمائی۔ یہ بہت بڑا مربوط تھا۔ جسے حضرت بلالؓ کاشت نہ کر سکے اور اس کا ایک بڑا حصہ بے کاشت پڑا رہا۔ جب حضرت عمرؓ کا دورِ خلافت آیا تو آپ نے حضرت بلالؓ سے کہا کہ نبی کریم ﷺ نے آپ کو ایک بڑا قدعہ زمین بطور جاگیر دیا تھا مگر آپ نے اسے کما حقہ کاشت نہیں کیا اور بڑا حصہ بیکار پڑا ہے۔ لہذا آپ جتنا حصہ آباد کر سکتے ہیں وہ اپنے پاس رکھیں باقی زمین خلافت کو واپس کر دیں۔

فقال بلالؓ: لاافعالو اللہ شیاً اقطعنیہ رسول اللہ ﷺ. فقال عمرؓ: واللہ لتفعلنّ فاخذ منہ فاکیز عن عمارتہ فقسمہ بین المسلمین. (۸۹)

ترجمہ: ''حضرت بلال بن حارثؓ نے جواب دیا: اللہ کریم کی قسم! میں تو اس میں ہرگز کوئی شئے نہ دوں گا یہ جاگیر تو رسول کریم ﷺ کی عنایت کردہ ہے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا اللہ کی قسم تجھ کو یہی کرنا ہوگا''۔

اور وہ جس قدر زمین کو آباد کرنے سے عاجز تھے وہ واپس لے کر مسلمانوں میں تقسیم کر دی۔

مردہ زمین کو آباد کرنے یا جاگیر دینے کی پانچویں شرط یہ ہے کہ وہ کنویں، باولی تالاب، چشمہ وغیرہ کی حریم نہ ہو۔ جنگل میں کنویں، باولی، چشمہ اور آبادی کے قریب تالاب، چشمہ کی ضروریات اور ان کی حفاظت کیلئے چاروں طرف جو جگہ چھوڑی جاتی ہے اس کو حریم یا باڑہ کہتے ہیں۔ نبی کریم ﷺ کے ارشاد گرامی کی رُو سے حریم کے مسائل یوں ہیں:

۱) جو کنویں چوپاؤں کے پانی پلانے، پینے کے لئے بنائے گئے ہیں ان کے چہار جانب چالیس '۴۰' گز زمین چھوڑی جائے۔

۲) جو کنویں زراعت کی آبپاشی کی غرض سے بنائے گئے ہیں انکی حریم ساٹھ '۶۰' گز مربع زمین ہے۔

۳) چشموں کے لئے حریم پانچ گز مربع ہے۔ (۹۰)

بنجر زمین کی آبادکاری کا دوسرا طریقہ:

بنجر زمین کی آبادکاری کا دوسرا طریقہ یہ ہے کہ سلامی ریاست ایسی زمینوں کو اپنے قبضہ میں رکھے اور انہیں خود کاشت کرائے۔ یہ زمینیں سلامی ریاست ہی کی ملکیت میں رہیں گی۔ اور حکومت ان پر لگان مقرر کر کے وصول کرے گی جو زراعت کی ترقی کے ساتھ ساتھ سرکاری خزانہ (بیت المال) کی آمدن (اور اس میں اضافہ) کا ذریعہ بنے گا۔

ان سرکاری زمینوں کے فقہی احکام:

۱) اگر زمین کسی ذمی کو کاشت کرنے کیلئے دی گئی تو اس سے خراج وصول کیا جائے گا اس پر تمام ائمہ کا اتفاق ہے۔

۲) اگر یہ زمین کسی مسلمان کو کھیتی باڑی کے لئے دی گئی تو حضرت امام ابو یوسفؒ اور دوسرے ائمہ کے نزدیک اگر وہ زمین عشری سے ملی ہوئی ہے تو اس سے عشر وصول کیا جائے گا اور اگر خراجی زمینوں سے ملحق ہے تو

اس پر خراج کے قوانین کا اطلاق ہوگا۔

امام محمدؒ کے نزدیک اگر یہ زمین عشری زمینوں کے پانی سے سیراب ہوتی ہے تو اس سے عشر اور اگر خراجی زمینوں کے پانی سے سیراب ہوتی ہے تو اس سے خراج لیا جائے گا۔

وسائل آبپاشی کی توسیع و ترقی:

زراعت کی ترقی کا اگر کلیتہ دار و مدار آبپاشی کے وسائل پر تسلیم کر لیا جائے تو اس میں کسی قسم کا مبالغہ نہ ہوگا دراصل کریم نے پانی ہی کو ہر شے (انسان وحیوان) کی زندگی کا ذریعہ بنایا ہے زراعت کی ترقی کے لئے ضروری ہے کہ وسائل آبپاشی کو ترقی و توسیع دی جائے تاکہ دور افتادہ اور بنجر زمینوں کو سیراب کرکے قابل کاشت بنایا جائے۔

اسلام کے اقتصادی نظام نے وسائل آبپاشی کے بہتر استعمال اور ان کی توسیع و ترقی کے لئے چند اصول وضوابط ترتیب دیئے ہیں جن کا مختصراً ذکر یہاں کیا جاتا ہے:۔

۱) اگر کوئی کنواں، تالاب، نالہ، چشمہ وغیرہ کسی فرد کی ذاتی ملکیت نہ ہو اس سے آبپاشی کا حق تمام انسانوں کے لئے یکساں ہوگا۔ گویا کہ تمام انسانوں کی مشترکہ ملکیت ہیں جنہیں نہ کوئی فرد بذریعہ قوتِ بازو یا سرکاری عطیہ اپنی ذاتی ملکیت بنا سکتا ہے نہ ہی کسی کو ان سے استفادہ کرنے سے روک سکتا ہے۔

''نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: تمام مسلمان تین اشیاء پانی، گھاس اور آگ میں برابر کے شریک ہیں'' دوسری روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا ''تمام انسان ان تینوں چیزوں میں کے حصہ دار ہیں'' (یہ روایت پہلی روایت کے مقابلے میں عام ہے کیونکہ اس میں مسلمان اور کافر سب کی شرکت اک اعلان ہے اور حقیقت بھی یہی ہے کہ تمام انسان ان اشیاء میں برابر کے حصہ دار ہیں کیونکہ یہ ان کی بنیاد ضروریات زندگی سے متعلق ہیں) جہاں تک پانی کا تعلق ہے تو یہ شرکت داریوں کے پانی اور دریاؤں مثلاً سیحون جیحون، فرات، دجلہ اور نیل وغیرہ کے پانیوں میں ہے۔ اس لئے کہ ان سے فائدہ اٹھانا ایسا ہے جیسے

سورج کی تپش اور ہوا سے فائدہ حاصل کرنا ہے کیونکہ اس میں تمام دنیا کے انسان برابر کے شریک ہیں ۔ اور کسی کو یہ حق ہرگز حاصل نہیں ہے کہ وہ اس افادہ سے دوسرے کو منع کر دے ۔

یا اس کی مثال راستہ یا شارع عام کی سی ہے جس پر مسلم و کافر سب کو چلنے کا برابر کا حق ہے، یہاں لفظ شرکت سے مراد اباحتہ (اجازت) اور انتفاع (نفع اٹھانے) میں تمام انسان کا برابر ہونا مراد ہے ۔ لیکن انتفاع کی اس انسانی مساوات کا یہ مطلب نہیں کہ وہ (پانی) ان میں سے کسی کی ملک بن جائے گا کیونکہ وادیوں اور دریاؤں میں پانی کی بھی ملکیت نہیں ہوتی ۔ (۹۱)

ج) لگان و مالگذاری میں تخفیف :

آیئے پہلے لگان اور مالگذاری کا مفہوم سمجھ لیجئے ۔ لگان اور مالگذاری کو اپنی اصل کے اعتبار سے ایک ہی ہیں مگر ان کے اصطلاحی معانی میں فرق ہے ۔ فرق یہ ہے کہ اگر کاشت کار خود زمین کا مالک ہے تو جو ٹیکس وہ حکومت کو دے گا وہ مالگذاری کہلاتا ہے اور اسی طرح اگر حکومت اور کاشت کار کے درمیان زمیندار ہے تو جو ٹیکس زمیندار سے لیتی ہے وہ بھی مالگذاری کہلائے گا زمیندار اپنی زمین کی کاشت کے عوض جو حصہ یا محصول کاشت کار سے لیتا ہے وہ لگان ہے ۔ مختصراً زمیندار اپنی زمین کی کاشت کے عوض جو حصہ یا محصول کاشتکار سے لیتا ہے وہ لگان ہے ۔ اور جو ٹیکس حکومت زمیندار سے لیتی ہے وہ مال گذاری
ہے خواہ زمیندار اپنی زمین خود کاشت کرتے یا کسی دوسرے شخص سے کاشت کرائے ۔

لگان اور مالگذاری میں ایک اور طریقہ سے بھی فرق کیا گیا ہے اگر حکومت یا کوئی جماعت یا کوئی فرد اپنی زمین کاشت کار کو ایک مقررہ شرح حصہ پر کاشت کیلئے دے کر جو محصول یا حصہ وصول کرے گا وہ لگان ہے اور اگر حکومت زمین پر سالانہ محصول مقرر کر کے زمیندار سے وصول کرے اسکو مالگذاری کہتے ہیں ۔ (۹۲)

لگان اور مالگذاری کو زراعت میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت حاصل ہے اور اس کی کمی یا زیادتی کا زمیندار یا کاشت کار کے جذبہ کاشت کاری کو متاثر کرتی ہے اگر ایک غریب کسان کو اتنا لگان ادا کرنا پڑے جو

اس کی محنت کے پیدا کردہ فصل کا اکثر حصہ لے جائے تو وہ صرف معاشی پریشانی کا شکار ہوگا بلکہ اس کی کارکردگی بھی متاثر ہوگی اور اگر اسے لگان میں چھوٹ دی جائے یا اس کی شرع عادلانہ مقرر کردی جائے تو وہ کھیتی باڑی کے کام میں زیادہ سے زیادہ دلچسپی لے گا اور اس کا نتیجہ زراعت کی ترقی کی راہیں کھلیں گی۔

بالخصوص بنجر زمین کو آباد کرانے کے لئے اگر کاشتکار یا مالک کو دو تین سالوں کا لگان یا مالگذاری معاف کردے۔ یہ زراعت کی ترقی کے لئے مہمیز کا کام دے گا۔ اسلام کے معاشی نظام عدل نے زراور کے عمل میں زمیندار اور کاشت کار دونوں کی اہمیت کو برابر تسلیم کیا ہے۔ وہ دونوں زراعت کی گاڑی کے دو بیل ہیں جنھوں نے اس گاڑی کو مساوی زور لگا کر اور محنت کر کے چلانا ہے۔ اگر ان میں سے ایک اپنا برابر کا بوجھ دوسرے پر ڈال دے یا ایک زیادہ طاقتور اپنے نوکیلے سینگوں سے دوسرے کو مارے اور اپنے تیز سموں سے دوسرے کو لتاڑے تو نتیجہ ظاہر ہے کمزور اپنی جان بچانے کے لئے بھاگے گا۔ یوں جوا بھی ٹوٹ جائے گا اور گاڑی بھی اپنی منزلِ مقصود تک نہیں پہنچ سکے گی۔

حضرت عمرؓ نے ایک مرتبہ حضرت حذیفہ بن الیمانؓ کو دجلہ کی اور حضرت عثمان بن حنیفؓ کو فرات کے کنارے کی اراضی پر خراج وصول کرنے کے لئے روانہ فرمایا۔ جب ان دونوں حضرات نے واپس آکر خراج کی ایک بڑی مقدار حضرت عمرؓ کو پیش کی تو آپ نے مشکوک انداز میں ان سے دریافت فرمایا:

''کیف و ضعتما علی الارض ؟ لعلکما کلفتما أهل عملکما ما الأرض مالا تطیق؟ فقال حذیفة ،لقد ترکت فضلا و قال عثمان ،لقد ترکت الضعف ولو شئت لأخذت''(۹۳)

ترجمہ: ''تم نے زمین پر خراج کس مقدار سے مقرر کیا مجھے لگتا ہے کہ تم نے کاشت کاروں پر اُن کی طاقت سے زیادہ بوجھ ڈالا ہے''۔ ایک دوسری

روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا: ''شاید تم نے زمین کی حیثیت سے زیادہ خراج وصول کیا ہے؟ یہ سن کر حضرت حذیفہؓ نے جواب دیا: میں نے اُن کے لئے بہت زیادہ چھوڑا ہے اور حضرت عثمان بن حنیفؓ نے عرض کیا، میں ان کے پاس دُگنا چھوڑ آیا ہوں اور اگر میں چاہتا تو اس میں سے بھی وصول کر سکتا تھا۔

حضرت عمر بن الخطابؓ کے پاس جب عراق کا خراج وصول ہو کر آتا تو عراق کے متمدن شہروں مثلاً کوفہ، بصرہ وغیرہ دس دس آدمیوں کا وفد بلاتے اور ان سے چار چار مرتبہ قسم دلا کر پوچھتے کہ کیا اُن پر ظلم کر کے تو خراج وصول نہیں کیا گیا وہ قسم کھا کر شہادت دیتے کہ ان پر کوئی ظلم اور زیادتی نہیں کی گئی تب کہیں جا کر امیر المومنین کی تسلی ہوتی، انہیں یہ یقین دہانی بھی کرائی جاتی تھی کہ نہ کسی مسلمان پر ظلم ہوا ہے اور نہ کسی ذمی پر (۹۴)

حضرت عمرؓ نے ایک دفعہ خراج کی وصولی کا طریقہ اسطرح بیان فرمایا:

''فلم نحملهم مالا يطيقون ولم ناخذ هم من الخراج الا بما تحتمله ارضهم،''

ترجمہ: ''ہم ان پر ان کی طاقت سے زیادہ لگان مقرر نہیں کریں گے اور نہ اُن کی اراضی کی حیثیت سے زیادہ ان پر بوجھ ڈالیں گے'' (۹۵)

امام ابو یوسفؒ نے خراج کیلئے نہایت بلیغ انداز میں دو اصول بیان کئے ہیں:

ا) ''لا يكون فيها حمل على اهل الخراج ولا يكون على السلطان ضرر''

ترجمہ: ''نہ تو خراج اس قدر زیادہ لگایا جائے کہ وہ اہل خراج پر

بار بن جائے اور نہ اسقدر کم کہ حکومت ہی کو نقصان پہنچے'' (۹۶)

ب)'' فخذه فی رفق و تسکین لا هل الارض ''

ترجمہ: ''تم خرج اسطرح لو کہ کاشکار کو اس کے دینے میں آسانی ، نرمی اور سکون رہے''(۹۷)

مذکورہ بحث سے یہ معلوم ہوگیا کہ اسلام کا قانونِ خراج کاشتکار پر اس کی طاقر اور وسعت سے زیادہ خراج لگانے کو جرم سمجھتا ہے تاکہ وسعت سے بھی کم کی سفارش کرتا ہے اب طاقت و وسعت کی حد کیا ہے؟ فقہاءِ اسلام کا نقطہ نظر اس بارے میں یہ ہے:

''وقالوا: ونهاية الطاقة ان يطلغ الواجب نصف الخارج لايزاد عليه التنصيف عين الانصاف ''

ترجمہ: ''اور طاقت و برداشت کی حد یہ ہے کہ خراد پیداوار سے نصف ہو اور اس سے بڑھانا جائز نہیں ہے اسلئے کہ یہ نصف کرنا ہی انصاف ہے''(۹۸)

امام ابوحنیفہؒ کی رائے میں حضرت عمرؓ نے جو مقدار خراج مقرر کی تھی اس سے بڑھانا جائز نہیں ہے ان کی رائے ہے کہ:

''واما اذا اراد الامام توظيف الخراج على ارض ابتداء عزاد عكى وظيفة عمرؓ فانه لا يضوز (عندابى حزيفة) وهو الصحيح لسن عمرؓ لم يزد لما اخبر ابادة الطاقة ''(۹۹)

''لیکن جن امام کسی زمین پر ابتداء میں لگان لگانا شروع کرے تو حضرت امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک

حضرت عمرؓ کی مقدار سے زیادہ لگانا جائز نہیں ہے اور درست بھی یہی ہے کیونکہ اہلِ خراج کے زیادہ طاقت رکھنے کی خبر ملنے کے باوجود حضرت عمرؓ نے خراج کی مقدار نہ بڑھائی''۔

''حضرت عمرؓ کی مقرر کردہ حدِ خراج:

مسلمان فقہاءِ کرام اور ماہرینِ اقتصادیات کے حضرت عمرؓ کے مقرر کردہ خراج کو بطور نمونہ اور قانون تسلیم کیا ہے حضرت عمرؓ نے حضرت عثمان بن حنیفؓ جو پیمائش کے ماہر تھے کو عراق کی تمام قابلِ کاشت زمین کی پیمائش کرنے کا حکم دیا انہوں نے پہاڑ جنگلات، نہروں، تالابوں اور دریاوں وغیرہ کو نکال کر قابل کاشت زمین کا کل رقبہ تین کروڑ ساٹھ لاکھ خراب قرار دیا۔ اس میں سے شاہی جاگیروں، آتش کدوں کے اوقاف، لاوارثوں، مفروروں اور باغیوں کی جائیدادوں، دریا برد زمینوں شاہراہوں، ڈاک کے مصارف کی زمینوں اور جنگل کو خالصتہً قرار دے کر رفاہِ عام کے لئے وقف کر دیا جس کا تخمینہ ستر لاکھ درہم سالانہ ہوتا تھ اور باقی زمینیں ان کے مالکان کی ملک تسلیم کر کے ان پر لگان مقرر کر دیا۔ (۱۰۰)

آپؓ نے گیہوں پر فی جریب پانچ درہم، انگور پر فی جریب دس درہم، کھجور پر فی جریب دس درہم، تل پر فی جریت آٹھ درہم اور سبزیات پر فی جریب تین درہم مقرر کر دیے۔



باب پنجم

فصل پنجم

تجارتی وصنعتی وسائل

انسان نے جب کھیتی باڑی شروع کی تو اسے اوزاروں کی ضرورت پڑی اور جب فصلیں تیار ہوگئیں تو پھلوں اور اناج کو اس نے اپنی ضرورتیں پوری کرنے کے لئے استعمال کرنا شروع کیا اور چیزوں کے تبادلے کرنے لگا۔ چیزوں کے لین دین سے تجارت کا آغاز ہوا اپنی ضرورتیں پوری کرنے کے لئے انسان کو جن اوزاروں اور استعمال کی چیزوں کی ضرورت پڑی ان کی بدولت مختلف صنعتیں پیدا ہوئیں۔ اس طرح تجارت اور صنعت بھی دولت پیدا کرنے کا اہم ذریعہ بن گئے۔

شاہ ولی اللہؒ کا خیال ہے کہ انسان جس رفتار سے ترقی کرتا رہا اسی رفتار سے اس کی ضرورتیں بڑھتی گئیں ان بڑھتی ہوئی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے تجارت اور صنعت سے بھی سرمائے کے اجارہ داروں نے زیادہ سے زیادہ دولت کمانی شروع کردی اور ایسے طریقے ایجاد کرکے جن کی بدولت دولت کی پیداوار کے ان وسائل میں بھی مزدوروں، دستکاروں اور معمولی لوگوں کو غلام بنانا شروع کردیا ان لوگوں کی زندگیاں دوسروں کیلئے کام کرنے تک محدود ہوکر رہ گئیں۔ ان کا حصہ سرمایہ دار صرف اتنا دیتا تھا کہ وہ زندہ رہ سکیں اور ان کے بئے جانوروں کی طرح کام کرتے رہیں۔(۰۱)

تجارت وصنعت کا بنیادی اصول:

تجارت ہو یا صنعت جب دو انسان اپنی ضرورتیں پوری کرنے اور زندہ رہنے کیلئے کام کرنے کا ارادہ کرتے ہیں تو ایک دوسرے سے معاہدہ کرتے ہیں معاہدہ کرنے والے دونوں فریقوں پر معاہدہ کی پابندی کرنا ضروری ہے شاہ صاحبؒ کا خیال ہے کہ اگر ان دونوں فریقوں میں سے کوئی ایک بھی دوسرے پر زیادتی

کرنے لگے تو تو معاشرے میں زندگی گزارنے کا توازن بگڑ جاتا ہے ور اسمیں ظلم اور فساد کی ابتدا ہو جاتی ہے جس سے قیصر و کسریٰ کا نظام پیدا ہو جاتا ہے تجارت وصنعت کی مختلف صورتوں میں انسان جو معاہدہ ایک دوسرے سے کرتے ہیں شاہ صاحب کی رائے میں ان کا دارومدار ''اصول معاونت'' اور ''عدل عمرانی'' پر ہے۔اس اصول کی رو سے نہ تو کوئی شخص کسی کا نوکر ہے اور نہ کوئی آقا نہ ہی کوئی دستکار صرف مزدور ہے اور صنعت کار مالک یا سیٹھ، بلکہ دونوں ایک دوسرے کے مددگار ہیں اور دونوں کا ایک دوسرے سے ''معاونت'' کا معائدہ ہوتا ہے۔تجارت وصنعت میں ان معائدوں کی مختلف صورتیں ہوتی ہیں۔

تجارت:

تجارت میں انسان ایک دوسرے سے جو معائدہ کرتا ہے ان کا شاہ صاحبؒ نے تفصیل سے ذکر کیا ہے ان کیلئے خاص فقہی (قانونی) اصطلاحیں استعمال کی ہیں اور تجارت کی مختلف صورتیں بنائی ہیں جن میں چند مندرجہ ذیل ہیں:

۱) ایک شخص کاروبار میں پیسہ لگاتا ہے۔اور دوسرا اس کاروبار کے لئے محنت کرتا ہے۔نہ پہلا شخص مالک ہے،اور نہ دوسرا مزدور بلکہ دونوں ایک دوسرے کے مددگار ہیں۔

۲) ایک دوسری صورت یہ ہے کہ دو آدمی کاروبار کیلئے سرمایہ بھی مہیا کریں اور مل کر کام بھی کریں۔اسطرح وہ منافع میں برابر کے شریک ہوں گے یہ طریقہ پہلے طریقے سے بہتر ہے۔تجارت کے اس طریقے کو ''مفاضت'' کہتے ہیں

۳) ایک تیسری صورت یہ بھی ہے۔وہ یہ کہ سرمایہ مختلف لوگوں کا ہو یا پورے طور پر اجتماعی یعنی حکومت کا اور اس اداروں میں جو لوگ کام کریں منافع ان سب میں تقسیم کر دیا جائے۔

یہ طریقہ پہلے دونوں طریقوں سے زیادہ موثر اور فائدہ مند ہے۔اس طریقہ تجارت کو شاہ ولی اللہؒ ''شرکت الوجود'' کہتے ہیں۔ (۱۰۲)

صنعت :

تجارت کی طرح صنعت میں بھی ''اصول معونت'' (امداد باہمی) کا اصول بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ اس اصول کی بنیاد پر مالک اور مزدور میں وہ فرق نہیں رہتا جس سے سرمایہ دارانہ نظام پیدا ہو۔

صنعت کی صورتوں پر شاہ صاحبؒ نے بحث فرمائی ہے ان میں چند ایک صورتیں ذیل ہیں :۔

۱) جو شخص کسی صنعتی پیشے میں سرمایہ لگائے اور جو لوگ اس پیشے میں کام کریں دونوں فائدہ اٹھانے میں شریک ہیں اور دستکاروں کو اتنا فائدہ ملنا ضروری ہے جس سے ان کی زندگی کی بنیادی ضرورتیں اچھی طرح پوری ہو جائیں اور وہ خوشحال زندگی بسر کریں اگر ایسا نہ ہوا تو قیصر و کسریٰ اور اسلامی نظام میں کوئی فرق نہیں رہے گا۔

۲) ایک دوسری صورت بھی ہے وہ یہ کہ ایک ہی پیشے کے دستکاروں کا ایک صنعتی ادارہ ہو اس طرح مختلف صنعتی ادارے قائم ہوں ان کے لئے سرمایہ (حکومت کی طرف سے) مہیا کیا جائے اور پھر (اصل سرمایہ اور اس کے منافع کے حساب سے) منافع ان دستکاروں میں برابر تقسیم کر دیا جائے۔ صنعت کا یہ طریقہ ''شرکت الضائع'' کہلاتا ہے۔ (۱۰۳)

یہ طریقہ عمرانی عدل اور ''اصول'' کے زیادہ قریب ہے۔ اس سے معاشرے میں فوری خوشحالی لائی جاسکتی ہے۔

بلا محنت کے کاروبار :

صنعت و تجارت میں شاہ ولی اللہؒ کے نزدیک بنیادی اصول ''معاونت'' (امدار باہمی) ہے اس میں صنعت کا کوئی نہ کوئی پہلو ضرور موجود ہوتا ہے لیکن ایسے کاروبار جن میں محنت کو بالکل دخل نہ ہو یا جن کے ذریعے دولت صرف چند لوگوں میں جمع ہو کر رہ جائے، خدائی زمین میں فساد کا باعث ہیں ان سے ''عدل عمرانی'' (معاشرتی انصاف) باقی نہیں رہتا کیونکہ کچھ لوگ تو عیش و آرام کی زندگی گزارنے لگتے ہیں اور کچھ کی

زندگی جانوروں کی طرح گزرتی ہے۔ اور ان کی بنیادی ضرورتیں بھی پوری نہیں ہوتیں آنحضرت ﷺ کے زمانے میں ملامسۃ، منابذۃ اور بیع صفات کاروبار کی صورتیں تھیں جن میں ''معاونت'' کا کوئی تصور نہیں تھا اسلئے حضور ﷺ کی تعلیمات کے مطابق انہیں ناجائز اور نفرت کے قابل قرار دیا گیا ان کی بنیاد اس اصول پر تھی کہ کسی نہ کسی بہانے لوگوں کے مال پر ہاتھ صاف کیا جائے اور بغیر کسی ''محنت'' کے دولت حاصل کی جائے جوا، لاٹری، ریس وغیرہ اس دور میں اسی قسم کے کاروبار ہیں۔ شاہ صاحبؒ نے ان کی بے پناہ مخالفت کی ہے۔ (۱۰۴)

دولت کے ذریعے بغیر محنت کئے دگنی، چوگنی دولت پیدا کرنے کو ربوا کہتے ہیں۔ جب کسی شخص کو کسی ضرورت کیلئے رقم کی ''احتیاج'' ہو۔

پہلی صورت یعنی احتکار میں تو تاجر وصنعتکار کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ اس کو جائز منافع کے بجائے کافی منافع ملے اور وہ راتوں رات دولت مند بن جائے۔ دوسری صورت یعنی اکتناز میں اس کی نیت یہ ہوتی ہے کہ اس کا اپنا حق ہے چاہئے جمع کرے چاہے اپنی ذات پر خرچ کرے یا کسی کاروبار میں لگائے۔ اور اس دولت کا مالک (سرمایہ دار) ہے۔

تاجر اور صنعت کار کی انہی خواہشوں کو سامنے رکھتے ہوئے شاہ ولی اللہؒ نے احتکار پر کافی بحث کی ہے۔ اور اس قسم کے رجحان پر کڑی تنقید کی ہے۔ آپ احتکار کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ منافع حاصل کرنے کے لئے تاجر دو صورتیں اختیار کرسکتا ہے۔ ایک تو یہ کہ وہ مال روک لے اور جب مال کی کمی کی وجہ سے بازار میں نرخ (بھاؤ) بڑھ جائے تو فروخت کرے، دوسری صورت یہ ہے کہ وہ کم سے کم نفع میں مال فروخت کرے، پھر لائے اور فروخت کرے یعنی ''کم نفع'' اور 'فوری فروخت' کے اصول کو اپنائے۔ (۱۰۵)

ان دونوں صورتوں سے معاشرے میں لوگوں پر جو اثر ہوگا اس کا ذکر کرتے ہوئے شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ 'کم نفع اور فوری فروخت' کا اصول شہری زندگی کی بہتری کے عین مطابق ہے اس سے لوگ 'عوام' پھلیں پھولیں گے خوشحال ہوں گے۔

جہاں تک دوسری صورت کا تعلق ہے یعنی (تجارت وصنعت کا) مال روکو اور زیادہ فائدے میں مال فروخت کرو، اس سے تو کھلم کھلا یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ لوگوں کو نقصان پہنچایا جائے اور ملکی انتظام میں خلل ڈالا جائے، ظاہر ہے اس قسم کی صورت ملک کے لئے تباہ کن ہے اس میں لوگوں کی بھلائی کے بجائے ان سے دشمنی کا پہلو نکلتا ہے جس سے قیصر وکسریٰ کا نظام مضبوط ہوتا ہے اور عدل عمرانی ختم ہو جاتی ہے۔ تجارت وصنعت میں ان غلط قسم کے طریقوں کی حضرت شاہ صاحبؒ سخت مذمت کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ یہ سب طریقے حرام اور باطل ہیں اور یہ ایسا ہی ہے کہ لوگوں سے ان کا مال چھین لیا جائے۔

اکتناز پر بحث کرتے ہوئے شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ بس نہیں درہم اور گھر کی ضرورت کا سامان استعمال کی چیزیں ہیں اور رات دن کاروبار کیلئے استعمال ہونے والی رقم 'کنز' (دولت کا ذخیرہ) نہیں ہیں لیکن جب احتکار کی صورتیں عام ہونے لگتی ہیں اور بھاری منافع اور دولت سمٹ کر چند افراد کے ہاتھوں میں جمع ہونا شروع ہو جاتی ہے تو اس سے ایک ایسا نظام خود بخود جنم لے لیتا ہے جس سے اکتناز (دولت کا ذخیرہ کرنا) خود بخود پیدا ہو جاتا ہے۔

تجارت وصنعت:

تجارت وصنعت کی حیثیت عہد نبویؐ اور خلافت راشدہ میں اس قدر ترقی یافتہ نہ تھا جیسی آج ہے، تاہم سودی کاروبار کی ممانعت تھی اور خرید وفروخت میں دھوکے کی گنجائش نہیں تھی صنعت اور تجارت بھی نجی طور پر رائج تھی جائز قسم کی تجارت یعنی 'بیع' اور دیگر تمام تجارتی امور جن میں شرعی حدود میں رہ کر کاروبار کرنے کی کھلی اجازت تھی جو اجتماعی مفادات سے ہم آہنگ ہوں اور جائز منافع کمانے کا حق بھی حاصل تھا غیر ملکی تجارت میں حضرت عمرؓ نے عشور نافذ کیا جسے ہم آج کی زبان میں ٹیکس عائد کرنے کی اجازت نہیں تھی،

ہاں اموال تجارت پر زکوٰۃ کا وصول کیا جانا ضروری تھا اسی طرح صنعت کے قیام کی کھلی اجازت تھی لیکن ایسی چیز کی پیداوار کیلئے صنعت نہ قائم کی جائے جو اسلامی حدود سے باہر ہو یا انسانیت کیلئے ضرر رساں ہو۔

....

شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں:

''سب سے پہلے تو انسان کو زمین پر محنت کرنے کے لئے اوزاروں کی ضرورت پیش آئی ،فصلیں تیار کیں تو پھلوں اور اناج سے اس نے ضروریات پوری کرنا شروع کیں اس طرح چیزوں کا تبادلہ (تجارت) کا آغاز ہوا پھر اپنی ضروریات کی تکمیل کے لئے انسان کو جن اوزاروں کی ضرورت پڑی ان کی بدولت مختلف صنعتیں وجود میں آئیں اس طرح تجارت اور صنعت بھی دولت پیدا کرنے کے کا اہم ذریعہ بن گئے''۔(۱۰۶)

آپ کا خیال ہے کہ انسان جس رفتار سے ترقی کرتا رہا اسی رفتار سے اس کی ضروریات بھی بڑھتی گئیں ان بڑھتی ہوئی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے تجارت اور صنعت سے بھی سرمائے کے اجارہ داروں نے زیادہ سے زیادہ دولت کمانا شروع کردی اور ایسے طریقے ایجاد کرکے جن کی بدولت دولت کی پیداوار کے ان وسائل میں بھی مزدوروں ،دستکاروں اور معمولی لوگوں کو غلام بنانا شروع کر دیا ، ان لوگوں کی زندگیاں دوسروں کے لئے کام کرنے تک محدود ہو کر رہ گئیں ،اس کا صلہ سرمایہ دار صرف اتنا دیتا تھا وہ زندہ رہ سکیں اور اس کے لئے جانوروں کی طرح کام کرتے رہیں۔ (۱۰۷)

تجارت:

تعاون باہمی کا بہت بڑا ذریعہ تجارت ہے،لہذا اس کو تعاون کے اصول پر ہی جاری رہنا چاہئے، پس جس طرح تاجروں کیلئے جائز نہیں کہ وہ بلیک مارکیٹنگ (Black Marketing) یا غلط قسم کے کمپی ٹیشن (Competiton) سے روح تعاون کو نقصان پہنچائیں ،ایسے ہی حکومت کے لئے بھی درست نہیں کہ بھاری ٹیکس لگا کر تجارت کے فروغ وترقی میں رکاوٹ پیدا کرے یا رخنہ ڈالے ،شاہ صاحبؒ نے تجارت کی مختلف صورتیں بیان کی ہیں جن میں سے درج ذیل ہیں۔

۱) مضاربت:

ایک شخص کاروبار میں پیسہ لگاتا ہے اور دوسرا اس کے لئے محنت کرتا ہے، نہ پہلا شخص مالک ہے اور نہ دوسرا مزدور بلکہ دونوں ایک دوسرے کے مددگار ہیں اور کاروبار سے ہونے والے نفع میں برابر کے شریک ہیں اس طریقہ کو ''مضاربت'' کہتے ہیں، لیکن اگر خسارہ ہو جائے تو فقط سرمائے والا ہی نقصان برداشت کریگا اس لئے کہ اگر محنت کرنے والا بھی نقصان میں شامل ہو جائے تو یہ شکل مضاربہ کی نہیں رہے گی قرض کی ہو جائیگی اور قرض خواہ نفع کا حصہ دار نہیں ہوا کرتا اور اگر ہو تو سود کی شکل بن جاتی ہے۔

مضاربت لوگوں کی ضروریات کے لئے جائز رکھی گئی ہے اس لئے بعض مال دار کاروبار سے ناواقف ہوتے ہیں اور بعض غریب کاروبار کے ماہر اور مصالح تجارت سے خوب واقف ہوتے ہیں، نیز نبی اکرم ﷺ کی بعثت سے پہلے بھی یہ طریق تجارت جاری تھا آپ ﷺ نے اس بہتر سمجھ کر جاری رکھا اور صحابہ نے اس پر عمل کیا اور حضرت عباس کی شرئط مضاربت کو آپؐ نے پسند فرمایا۔

قرآن مجید میں بھی اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد موجود ہے اور ایک جماعت ہے زمین میں چل پھر کر اللہ کے رزق کو تلاش کرتی ہے یعنی صاحب مال تو مال لگاتے ہیں اور محنت والے اس کے ذریعہ سے ملکوں اور شہروں میں جا کر تجارت کرتے ہیں (۱۰۸) گویا اس شکل میں سرمایہ دار کا سرمایہ لعنت نہیں بلکہ رحمت بن جائے گا اور ناداروں کی محنت اور کاروباری ہوش مندی اور استعداد ضائع اور رائیگاں ہونے کی بجائے کارآمد اور نفع بخش ثابت ہوگی اور دونوں تعاون باہمی کے اصول پر عمل کرتے ہوئے ایک دوسرے کے معاون بنیں گے۔

۲) مفاوضت:

ایک دوسری صورت یہ ہے کہ دو آدمی کاروبار کے لئے سرمایہ بھی مہیا کریں اور مل کر کام بھی کریں۔ اس طرح وہ نفع میں برابر کے شریک ہونگے، یہ طریقہ پہلے طریقے سے بہتر ہے تجارت کے اس طریقہ کو مفاوضت کہتے ہیں۔

۳) شرکت الوجوہ:

ایک تیسری صورت یہ بھی ہے کہ بغیر مال کے چند افراد کے درمیان مساوی عمل ومحنت اور کسب و اکتساب پر شرکت ہو جائے اور خرید وفروخت اور نفع ونقصان میں برابر کی شمولیت ہو گویا سرمایہ مختلف لوگوں کا ہو یا پورے طور پر اجتماعی یعنی (حکومت) کا اور اس سے مختلف تجارتی ادارے بنائے جائیں، ان تجارتی اداروں میں جولوگ کام کریں منافع ان سب میں تقسیم کر دیا جائے، یہ طریقہ پہلے دونوں طریقوں سے زیادہ موثر اور مفید ہے۔اس طریقہ تجارت کو شاہ صاحبؒ ''شرکت الوجوہ'' کہتے ہیں۔ (۱۰۹)

۴) صنعت:

تجارت کی طرح صنعت میں بھی ''اصول معاونت'' (امداد باہمی) کا اصول بنیادی حیثیت رکھا ہے اس طرح مالک اور مزدور کی تفریق پیدا نہیں ہوتی کہ وہ سرمائے دارانہ نظام کا موجب ہو۔تجارتی کاروبار بھی بڑی حد تک صنعت ہی کا بین منت ہے۔صنعت کی صورتوں پر شاہ صاحبؒ نے بھی بحث فرمائی ہے ان میں سے دو صورتیں درج ذیل ہیں۔

جو شخص کسی صنعت یا پیشہ میں سرمایہ لگائے اور جولوگ اس پیشے میں کام کریں دونوں فائدہ اٹھانے میں شریک ہیں اور دستکاروں کو اتنا فائدہ ملنا ضروری ہے جس سے ان کی زندگی کی بنیادی ضرورتیں اچھی طرح پوری ہو جائیں اور وہ خوش حال زندگی بسر کریں، اگر دونوں میں تفریق پیدا ہو گئی تو نظام اسلامی اس منشاء کو پورا نہ کر سکے گا جس کے لئے اس نظام کو خالق کائنات نے بنایا ہے (یعنی قیصر وکسریٰ کے نظام کی جگہ نظام عدل) نے لے لی ہے۔

۵) شرکت الصّنائع:

ایک دوسری صورت یہ بھی ہے کہ ایک ہی پیشے کے دستکاروں کا ایک صنعتی ادارہ ہو، اس طرح مختلف

صنعتی ادارے قائم ہوں، ان کے لئے سرمایہ (حکومت کی طرف سے) مہیا کیا جائے اور پھر (اصل اور راس کے منافع کے حساب سے) منافع ان دستکاروں میں برابر تقسیم کر دیا جائے، صنعت کا یہ طریقہ ''شرکت الصنائع'' کہلاتا ہے، چونکہ یہ طریقہ عمرانی عدل کے زیادہ قریب ہے، لہذا اس سے خوش حال معاشرے کی امید لگائی جاسکتی ہے۔ (۱۱۰)

شاہ صاحبؒ کی رائے میں تجارت وصنعت کی مختلف صورتوں میں جب انسان ایک دوسرے سے معاہدے کرتے ہیں تو انکا دارو مدار ''اصول معاونت'' اور ''عدل اجتماعی'' پر ہوتا ہے، لہذا تجارت ہو یا صنعت معاہدہ کرنے والے فریقین پر معاہدے کی پابندی لازمی امر ہے۔ آپ کا خیال ہے کہ فریقین میں سے کوئی ایک بھی اگر دوسرے پر زیادتی کرنے لگے تو معاشرے میں زندگی گزارنے کا توازن بگڑ جاتا ہے۔

تعاونِ باہمی اور ارتکازِ دولت:

تعاون باہمی کے اصول سے انحراف اور ارتکاز دولت کی صورت میں معاشی ناہمواری جنم لیتی ہے یہی وجہ ہے کہ شاہ صاحبؒ اجتماعی یا سماجی بہبود کو ہمیشہ مقدم رکھتے ہیں۔ آپ کا مقصد ومنہاج اجتماعی طور پر انسانیت کی فوز وفلاح ہے لیکن جب دولت چند ہاتھوں میں سمٹ آئے گی تو شاہ صاحبؒ کے مطابق معاشرے میں بہت سی قباحتیں اور اکتاہٹیں جنم لیں گی لہذا دولت کے جمع اور ذخیرہ کی وہ تمام صورتیں جن میں دولت کی تقسیم سے انکار کیا گیا ہو شاہ صاحبؒ اسے ناپسندیدہ قرار دیتے ہیں نیز نظام معیشت کو معتدل رکھنے کے لئے فرماتے ہیں کہ دولت جمع اور ذخیرے کے لئے نہیں بلکہ تقسیم اور گردش میں رہنے کے لئے ہے تاکہ اجتماعی طور پر افراد معاشرے میں دولت مرتکز ہونے کی بجائے صحیح طور پر متوازن رہے اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے جبکہ اہل ثروت، تنگ دست اور مفلوک الحال افراد معاشرے کو اپنے و فر مال میں حصہ دار بنائیں۔

شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں

''ایسے معاشی اداروں کو جڑ سے ختم کر دینے کی ضرورت ہے جن

میں دولت کی پیدائش بغیر محنت کے ہو یا جن کے ذریعے دولت چند ہاتھوں میں جانے کا موقع مے یا جن کے ذریعے دولت کا ذخیرہ کیا جا سکے۔ (۱۱۱)

اسلامی نظام معیشت کا بنیادی اصول ارکتاز دولت کی ممانعت ہے شاہ صاحبؒ کے مطابق حلال اور جائز ذرائع سے کمائی جانے والی دولت کو سمیٹ سمیٹ کر رکھنے کی بجائے اسے انسانی فلاح کی خاطر رشتہ داروں، عزیز و اقارب یا ضرورت مندوں اور اشاعت اسلام یا بھلائی کے دوسرے کاموں میں صرف کیا جائے، دوت و مال کو جمع کرنے سے اس کی گردش رک جاتی ہے۔

معاشرے میں معاشی ناہمواری اور کساد بازاری پیدا ہوتی ہے، اور دولت مند طبقہ امیر سے امیر اور غریب طبقہ غریب سے غریب تر ہوتا چلا جاتا ہے۔ معاشی ناہمواری کے باعث ایسے بے شمار مسائل پیدا ہو جاتے ہیں جو معاشرے کی معاشی حالت بہتر بنانے کی بجائے اس کے بگاڑ کا باعث بنتے ہیں اسی بات کے پیش نظر اسلام نے دولت کو اس کے حرص کے ساتھ جمع کرتے رہنے کی سخت ممانعت کی ہے۔

حضرت عمرؓ فرماتے ہیں:

''جس بات کا مجھے آج اندازہ ہوا اگر اس کا پہلے سے اندازہ ہو جاتا ہے تو میں کبھی تاخیر نہ کرتا اور بلاشبہ ارباب ثروت کی فاضل دولت لے کر فقرا، مہاجرین کو دے دیتا'' (۱۱۲)

حضرت علیؓ کا ارشاد گرامی ہے:

''اللہ تعالیٰ نے اہل دولت کے اموال پر ان کے غریبوں کی معاشی حاجت کو بدرجہ کفالت پورا کرنا فرض کر دیا ہے''

اللہ تعالیٰ نے مال و دولت کو جمع کرنے اور اسے گن گن کر رکھنے کی سخت مذمت فرمائی ہے اور مسلمانوں کو ایسے فعل قبیح سے منع فرماتے ہوئے ایسا کرنے والوں کو سخت عذاب کی وعید دی ہے۔

ارشادِ ربانی ہے:

''جو لوگ سونا اور چاندی جمع کرتے ہیں اور اسے اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے انہیں دردناک عذاب کی خبر سنا دو'' (۱۱۳)

''ہلاکت ہے اس شخص کے لئے جو طعن وتشنیع کرنے والا اور لوگوں کی برائیاں کرنے والا ہے جو مال جمع کرکے اسے گن گن کر رکھتا ہے گمان کرتا ہے کہ اس کا مال ہمیشہ اس کے پاس رہے گا''۔ (۱۱۴)

مال جمع کرنے والا اور اسے خرچ نہ کرنے والا آدمی جہاں دوسری بے شمار برائیوں کا شکار ہو جاتا ہے وہاں بخل جیسی قبیح اور بدترین اخلاقی، معاشرتی مذہبی برائی بھی اس میں پیدا ہو جاتی ہے جس کا نتیجہ نہ اس کے اپنے حق میں اچھا نکلتا ہے اور نہ ہی من حیث القوم پورے معاشرے کی بہتری کے لئے ہوتا ہے۔

چنانچہ ارشادِ ربانی ہے۔

ترجمہ: ''جو لوگ اللہ کے دیئے ہوئے فضل میں بخل کرتے ہیں وہ یہ گمان نہ کریں یہ فعل ان کیلئے اچھا ہے بلکہ درحقیقت یہ ان کے حق میں بہت برا ہے، جس چیز کو وہ جمع کرتے ہیں قیامت کے دن اس کا طوق ان کے پہنایا جائیگا۔

ارشادِ ربانی ہے:

''کی لا یکون دولۃ بین الاغنیاء منکم'' (۱۱۵)

ترجمہ: ''تاکہ ایسا نہ ہو کہ مال و دولت صرف دولت مندوں تک ہی محدود ہو کر رہ جائے''۔

جہاں قرآن مجید میں اللہ نے ارتکازِ دولت کی ممانعت فرمائی ہے وہاں دولت کو صرف کرنے کے

احکامات بھی عطا فرمائے ہیں یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اسلام دولت کے ارتکاز کی مذمت تو کرتا ہے مگر جو دولت زائد از ضرورت ہو اسے کس طرح خرچ کیا جائے؟ کیا اس دولت پر اسی دولت مند حق نہیں؟

اگر حق ہے تو اسے اس بات کا بھی حق حاصل ہونا چاہئے کہ دولت کو جس طرح چاہئے اور جہاں چاہے خرچ کرے لیکن اسلام چونکہ فطرت انسانی کو ہر معاملے میں سامنے رکھتا ہے اسلئے اللہ اور اس کے رسولؐ نے ارتکاز دولت کی ممانعت کرتے ہوئے ان تمام شبہات کا ازالہ کر دیا جو فطری طور پر انسانی ذہن میں پیدا ہو سکتے تھے اور ذرائع بھی بتا دیئے جہاں زائد از ضرورت دولت کو صرف کیا جائے چنانچہ اس کے لئے واضح ہدایت مرحمت فرمائیں۔

ارشاد ربانی ہے:

''اور جو ہم نے تم کو دیا ہے اس میں سے اس سے پہلے ہی خرچ کر لو کہ تم میں سے کسی کے پاس موت آئے موجود ہو''۔ (۱۱۶)

موت کے آنے سے قبل ضرورت سے زائد مال و دولت کے خرچ کی تلقین کرتے ہوئے اللہ رب العزت نے یہ بھی بتا دیا کہ مال و دولت کو کہاں خرچ کیا جائے۔

چنانچہ ارشاد ربانی ہے:

''صدقات اور کسی کے لئے نہیں ہیں صرف فقیروں اور مسکینوں کیلئے اور ان کیلئے جو صدقات کے وصول کرنے پر مامور ہیں اور ان کیلئے جن کے دلوں میں کلمہ حق کی الفت پیدا کرنی ہے۔

اور ان کیلئے جن کی گردنیں آزاد کرانی ہیں اور قرض داروں کے لئے جو قرض کے بوجھ سے دبے ہوئے ہیں اور اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کے لئے اور مسافروں کے لئے یہ اللہ کی جانب سے ٹھہرائی ہوئی بات ہے اور اللہ سب کچھ جاننے والا حکمت والا ہے۔ (۱۱۷)

اللہ تعالیٰ نے مال جمع کرنے کی ممانعت کرتے ہوئے جہاں یہ بتا دیا کہ دولت کو کہاں خرچ کیا جائے وہاں مال جمع کرنے اور دولت کو خرچ نہ کرنے کا نتیجہ بھی واضح کیا اور وہ سبب بھی بتا دیا جس کے باعث ایسا کرنے کا حکم دیا جا رہا ہے۔

ارشاد خداوندی ہے:۔

''وانفقوا فی سبیل اللہ ولا تلقوا بایدیکم الی التھلکۃ''

''اور اللہ کی راہ میں خرچ کرو اور اپنے ہاتھوں سے اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو'' (انفاق فی سبیل اللہ سے رک کر خود کو ہلاکت میں ڈالنا ہے)۔(۱۱۸)

احادیث مبارکہ چونکہ قرآن کی توضیح، تشریح اور تفسیر ہیں تو لہذا یہ بات کس طرح ممکن تھی کہ جن اہم معاشی امور کی طرف قرآن نے احکامات نافذ کئے ہوں ان کی تشریح کے لئے رسولِ خدا نے کچھ ارشاد نہ فرمایا ہو جس طرح دن کے اجالے کا انکار نہیں کیا جا سکتا اسی طرح اس بات سے انکار بھی ممکن نہیں کہ رسول پاکؐ نے وہی کچھ کہا جس پر عمل کر کے رکھا اور جس چیز پر عمل کیا اسی کو ارشاد فرمایا آپ نے اسلامی نظام معیشت کے اس اہم اور بنیادی اصول کی تشریح و عملی صورت پیش کرنے کیلئے مسلمانوں کو واضح ہدایات مرحمت فرمائیں جن پر صحابہ نے عمل کیا اور ایک ایسا معاشی نظام قائم کر دیا جس کی نظر رہتی دنیا تک قائم و دائم رہے گی۔

ارشاد نبویؐ ہے:

''جس شخص کے پاس قوت و طاقت کا سامان اپنی حاجت سے زائد ہو اسے چاہئے کہ زائد سامان کمزور کو دیدے اور جس شخص کے پاس سامان خورد و نوش حاجت سے زائد ہو اس کو چاہئے کہ فاضل سامان نادار اور حاجت مند کو دیدے''۔

حضرت سعید خدری سے روایت ہے کہ نبی ﷺ اسی طرح مختلف انواع اور مال کا ذکر فرماتے رہے حتیٰ کہ ہم نے یہ گمان کرلیا کہ ہم میں سے کسی کو اپنے فاضل مال پر کسی قسم کا کوئی حق حاصل نہیں۔ (۱۱۹)

قرآن و حدیث سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ حق و معیشت میں تمام کائنات انسان مساوی اور برابر کے شریک ہیں کسی مالدار کا مال غریبوں کی غربت میں اضافے کے لئے نہیں بلکہ وہ خدا کی امانت ہے جو اجتماعی نظام کے زیر فرمان غرباء و مساکین کی غربت ختم کرنے کیلئے ہے یعنی غربت کیلئے رحمت ہو زحمت نہ ہو اور سرمایہ دار اس عادلانہ نظام کو منظور نہ کرے تو لازم ہے کہ اسلام کے اقتصادی نظام کے تحت قانون اس کو مجبور کرے اور اس سے سرمایہ حاصل کر کے حق معیشت کی مساوات کو بروئے کار لائے اسلام نے جہاں ارتکاز دولت کی ممانعت کی ہے وہاں احتکار مال کی بھی شدید مذمت فرمائی ہے اسلامی نظام معاشیات میں احتکار مال یا ذخیرہ اندوزی کے خاتمے کے لئے اصول وضوابط وضع کئے گئے ہیں۔

احتکار مال سے مصنوعی قلت پیدا کرنا ممنوع ہے۔ چنانچہ ارشاد نبوی ہے:۔

''جس نے (۴۰) چالیس دن غلہ روکے رکھا اور پھر خیرات کر دیا تو اسے کچھ ثواب نہیں ملے گا''۔ (۱۲۰)

اسی لئے اسلام نے ذخیرہ اندوزی کو بہت بڑی لعنت قرار دیا ہے، کیونکہ اس کی وجہ سے لوگ دوسروں کی مجبوریوں سے فائدہ اٹھاتے ہیں انہیں اپنے آگے جھکنے پر مجبور کر دیتے ہیں اور مصنوعی قلت کے ذریعے لاکھوں روپے کما کر غریبوں کا حق مارتے ہیں یہ وہ چیز ہے جس سے کسی دوسرے کی ذات متاثر ہو لہٰذا اسلام کی نگاہ میں ناپسندیدہ ہے۔

احتکار:

تجارتی اور صنعتی مال کو خریداروں تک پہنچنے کی بجائے صرف اس لئے روکنا کہ اس کے دام بڑھ جائیں تو فروخت کیا جائے، اس طرح مال روکے رکھنے کو احتکار کہتے ہیں۔

اکتناز:

تجارت، صنعت یا زراعت سے جو روپیہ سونا چاندی وغیرہ بطور سرمایہ حاصل ہو اس کو اس لئے جمع رکھنا کہ یہ دولت ہمارے پاس اکٹھی ہوتی رہے۔ اس سے لوگ فائدہ نہ اٹھائیں اور اس کی گردش (تجارتی یا صنعتی کاروبار کی صورت میں) نہ ہو اس طرح ''دولت'' کے روکے رکھنے کو اکتناز کہتے ہیں۔

اسلام نے ان دونوں صورتوں کو حرام قرار دیا ہے، شاہ صاحبؒ کا خیال ہے کہ استحصالی نظام کی جڑ یہی دو صورتیں ہیں۔ پہلی صورت یعنی احتکار میں تو تاجر و صنعت کار کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ اس کو جائز منافع کی بجائے زائد منافع ملے اور وہ راتوں رات دولت مند بن جائے اور دوسری صورت یعنی اکتناز میں اس کی نیت یہ ہوتی ہے کہ دولت اس کا اپنا حق ہے چاہے جمع کرے چاہے اپنی ذات پر خرچ کرے یا کسی کاروبار میں لگائے وہ اس دولت کا مالک (یعنی سرمایہ دار) ہے۔ (۱۲)

راتوں رات دولت مند بن جانے کی خواہش رکھنے والوں پر شاہ صاحبؒ نے کڑی تنقید کی ہے، آپ فرماتے ہیں کہ نفع حاصل کرنے کے لئے تاجر دو صورتیں اختیار کر سکتا ہے۔

۱) پہلی صورت یہ ہے کہ وہ مال روک لے اور جب مال کے کسی وجہ سے بازار میں نرخ بڑھ جائیں تو فروخت کرے اس کو احتکار کہتے ہیں۔

۲) دوسری صورت یہ ہے کہ وہ کم سے کم نفع پر مال فروخت کرے پھر لائے اور فروخت کرے یعنی ''کم نفع'' اور ''فوری فروخت'' کے اصول کو اپنائے۔ (۱۲۲)

شاہ صاحبؒ کے نزدیک یہ کم نفع اور فوری فروخت کا اصول شہری زندگی کی بہتری کے عین مطابق ہے اس سے لوگ تعاونِ باہمی کے اصول پر عمل پیرا ہوں گے۔

جہاں تک پہلی صورت کا تعلق ہے یعنی (تجارت و صنعت کا) مال روکو اور زیادہ فائدے میں مال فروخت کرو اس سے تو واضح بات یہی آتی ہے کہ لوگوں کو نقصان پہنچایا جائے اور ملکی نظام میں خلل ڈالا جائے

....

، ظاہر ہے اس قسم کی صورت ملک کے لئے تباہ کن ہے جس میں لوگوں کی بھلائی کے بجائے ان سے دشمنی کا پہلو نکلتا ہو جس سے قیصر و کسریٰ کا نظام جڑ پکڑتا ہے اور عدل عمرانی ختم ہو جاتا ہے۔

اکتناز پر بحث کرتے ہوئے شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں دس بیس درہم اور گھر کی ضرورت کا سامان، استعمال کی چیزیں اور رات دن کاروبار میں استعمال ہونے والی رقم کنز (دولت کا ذخیرہ) نہیں ہیں، لیکن جب احتکار کی صورتیں عام ہونے لگتی ہیں تو بھاری منافع کی صورت میں دولت سمٹ کر چند افراد کے ہاتھوں میں جمع ہونا شروع ہو جاتی ہے جس سے خود بخود ایک ایسا نظام جنم لیتا ہے جس سے اکتناز (دولت کا ذخیرہ کرنا) کا محرک خود بخود پیدا ہو جاتا ہے جو انسانوں میں فساد اور معاشرے میں برائیوں کی پیدائش بنتا ہے۔ (۱۲۳)

شاہ صاحبؒ کے بقول جب انسانیت پر (دولت کے غاصبانہ نظام کی وجہ سے) مظالم بڑھ گئے اور اس میں معاشرتی برائیاں اور زیادہ ہوگئیں تو خدا نے آنحضرت ﷺ کو دنیا کی ہدایت کے لئے بھیجا اور آپ کے نظام کو دنیا کی ہدایت کے لئے میزان عدل قرار دیا اور اس نبی ﷺ کے ذریعے خدا نے یہ بات طے کر دی کہ آپ کو ودیعت کئے گئے ''دولت کے نظام'' سے ان جاگیرداروں کے ''دولت کے نظام'' کو ختم کر دیا جائے اور ان کی حکومتوں کا قلع قمع کیا جائے۔

چنانچہ دنیا نے دیکھ لیا کہ آنحضرت ﷺ کے ''نظام دولت'' اور ''نظام حکومت'' سے قیصر و کسریٰ جیسی حکومتوں کا وجود ختم ہو گیا نہ کوئی قیصر رہا اور نہ کوئی کسریٰ اس کی جگہ آپ نے ایک ایسا نظام دیا جس سے لوگ امن اور خوشحالی کی زندگی بسر کرنے لگے اور دنیا سے غربت و افلاس اور جہالت اور مفاد پرستی جیسی برائیوں کا خاتمہ ہونے لگا گویا ریاست پر یہ ذمہ داری آتی ہے کہ وہ کسی بھی قسم کے استحصالی نظام کو ختم کر دے تاکہ ارتکاز دولت کے عوامل پیدا نہ ہونے پائیں یہ ریاست کے فعال کردار پر منحصر ہے لہذا اگر ریاست پوری دیانت داری اور حکمت عملی سے اپنے فرائض سرانجام دے تو رعایا خوش حال اور پرامن زندگی بسر کر سکتی ہے اس کے برعکس افراتفری بے چینی اور اضطراب کا عام ہو تو معاشرہ کی خستہ حالی کا گراف ایک دم بڑھ جاتا ہے، اگرچہ شاہ

صاحب کے مطابق حاکمیت ذات باری کو حاصل ہے تاہم وہ اپنی مخلوق کی بھلائی اور ترقی کیلئے نیابت کا تاج انسان کے سر پر فائز کرتا ہے۔

تعاون کش معاملات:

معاونت کی ناپسندیدہ صورتوں میں صرف وہی صورتیں شامل نہیں ہیں جو عام طور پر ناپسندیدہ تصور کی جاتی ہیں جیسے جوا، سٹہ، قمار، اسمگلنگ [illegible] وغیرہ بلکہ ان میں وہ تمام [illegible] شامل ہیں جو تجارت [illegible] تصور کی جاتی ہیں اس لئے کہ ایسی تمام صورتیں ملک کے اقتصادی نظام کو تباہ کر کے اس کے توازن کو ختم کر دیتی ہیں اور وجہ [illegible] بلکہ انسان کو شرمندہ تعبیر کر [illegible] یا پھر کوڑی کوڑی کا [illegible] جاتا ہے۔

جوا:

قرآن پاک میں جوایا قمار کے لئے میسر کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ جوئے میں چونکہ کھیلنے والا بغیر محنت اور مشقت کے دوسرے کا مال حاصل کر کے خوش حال اور تونگر بننے کی سعی کرتا ہے اسی لئے بقول قاضی ثناءاللہ پانی پتی صاحب کے کہ ''مظہری اسے میسر کہتے ہیں'' تمام صحابہ اور تابعین اس بات پر متفق ہیں کہ میسر میں جوئے کی تمام صورتیں داخل ہیں۔

مولانا عبدالماجد دریابادی لکھتے ہیں کہ:

> میسر کا لفظ وسیع معانی رکھتا ہے اور اس میں جوئے کی تمام اقسام شامل ہیں چوسر (نرد) شطرنج وغیرہ (بشرطیکہ اس میں مال کی ہار جیت پائی جاتی ہو)۔(۱۲۴)

جوئے یا میسر کی اس تعریف میں موجودہ دور کے ہار جیت کے تمام کھیل جن میں کسی بھی حوالے سے مال موجود ہو سب آجاتے ہیں جیسے لاٹری، سٹہ بازی، معمہ بازی، گھڑدوڑ اور برج وغیرہ۔ جوئے کا کھیل چونکہ ایک شخص کے نفع اور دوسرے کے نقصان پر موقوف ہوتا ہے لہذا جیتنے والے کو نفع ہی نفع اور ہارنے والے کو

نقصان ہوتا ہے، اس سے انسانی اخلاق پر برا اثر پڑتا ہے نیز باہمی تعاون کی فضا میں گندگی کے سبب معاشرے میں خلق، ایثار، ہمدردی اور محبت کی بجائے دشمنی، نفرت، عداوت اور تعصب پھیلتا ہے۔

''قمار بازی، لاٹری، سرعت رفتار کا جنون، سینما کا جنون، جنونِ محبت، مینڈھے اور بیل لڑانے، کبوتر بازی وغیرہ کا جنون یہ سب روحانی کھوکھلے پن کا مظہر ہیں'' جوئے کی لت میں پڑ کر بڑے بڑے مشاہیر واکابر اپنی دولت وسلطنت تک گنوا بیٹھے جب کہ ہندوستان کے قدیم ترین قصہ مہا بھارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس قبیح عادت کے شکار بعض جوری تو اپنی بیویاں تک داؤ میں ہار دیتے ہیں۔

بہر حال اسلام کے اقتصادی نظام میں اس قسم کے کسی تجارتی کاروبار کیلئے مطلق جگہ نہیں ہے جو جوا یا صریحاً قمار ہوں اور یا انکی تہہ میں مالی ترقی کا وہی جذبہ کارفرما ہو جو قمار میں پایا جاتا ہے اور اگر ''علم الاخلاق'' دونوں کے ماہرین سے اس بارے میں دریافت کیا جائے تو بغیر کسی اختلاف کے وہ بھی یہی رائے دیں گے کہ ''قمار'' کی قسم کے تمام معاملات اجتماعی زندگی اور سوسائٹی کیلئے تباہ کن ہیں۔

قمار اور سٹہ شاہ صاحبؒ کی نظر میں

> ''جب اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو پیدا فرمایا اور بساط ارض پر ان کے معاش کا انتظام کیا اور اس سے نفع حاصل کرنے کا موقع بہم پہنچایا تو انسان کے درمیان جنگ وجدل اور کشمکش کی پراگندہ فضا پیدا ہوگی تب خدا کے قانون نے یہ فیصلہ کیا کہ جو شخص ذاتی محنت وو راثت یا دوسرے کسی جائز اور صحیح طریقہ سے کسی چیز کا مالک بنے تو دوسرا کوئی شخص اس چیز میں مزاحمت اور کشمکش کا حق نہیں رکھتا، البتہ دوسرے کو بدل کے ذریعہ خریداری اور معتبر وصحیح رضامندی کے ساتھ معاملت سے اس چیز کو حاصل کرنے کا حق ہے، بشرطیکہ فریقین (بائع ومشتری) کے اس معاملے کا علم ویقین ہو اور فریب

چالبازی اور دھوکہ اس میں ہرگز شائبہ نہ ہو اور جبکہ انسان مدنی الطبع ہے اور اس کی معیشت باہمی تعاون کے بغیر ناممکن ہے تو حق تعالیٰ نے باہمی تعاون و معاونت کو بھی ضروری قرار دیا ہے، یعنی اگر کوئی معاملہ اس طور پر کیا جائے کہ اس میں نہ تو صحیح بدل موجود ہو اور نہ ہی تعاون پایا جائے بلکہ دوسرے کے نقصان سے نفع حاصل کرنا مقصود ہو جیسے قمار یا جس میں صحیح رضامندی نہ ہو جیسے [illegible] تو یہ تمام طریقے باطل [illegible] ہیں، اور ایسے معاملات [illegible] اور [illegible]

سود یا ربوا:

ربوا کے لفظی معنی بڑھنے اور ترقی کرنے کے ہیں، اصل میں 'ربوا' راس المال یا کسی چیز پر اضافے کا نام ہے لیکن شریعت میں خاص قسم کی بڑھوتری اور زیادتی پر یہ لفظ بولا جاتا ہے اہل عرب اس لفظ کو زائد رقم کے لئے استعمال کرتے ہیں جو قرض خواہ اپنے قرض دار سے ایک طے شدہ شرح کے مطابق اصل کے علاوہ وصول کرتا ہے اسی کو ہماری زبان میں سود کہتے ہیں۔

اسلام نے سود کو اس کی ہر شکل میں حرام قرار دیا ہے کیونکہ یہ معاشی ظلم کا سب سے اہم ذریعہ ہے اور اس کا لینا گویا خدا سے اعلان جنگ کرنا ہے۔ قرآن پاک میں ہے کہ:

''یا ایہا الذین امنوا لاتاکلوا الربوا اضعافا مضعفة واتقوا اللہ لعلکم تفلحون''

''اے ایمان والو سود کئی کئی حصے بڑھا کر نہ کھاؤ اور اللہ سے ڈرتے رہو تاکہ تم فلاح پاؤ'' (۲۶)

اللہ تعالیٰ نے سورۃ البقرہ میں سود کے تمام اقسام حرام قرار دی ہیں اور سود خوروں کے لئے چار وعیدیں نازل ہوئی ہیں:۔

۱) ان کا انجام پاگلوں جیسا ہوگا۔

۲) دوزخ ان کا ہمیشہ ہمیشہ کا ٹھکانہ ہوگا۔

۳) اللہ سود کو مٹاتا ہے (لہٰذا یہ باز آئیں) ورنہ،

۴) اللہ اور اسکے رسول ﷺ کی طرف سے ان لوگوں کیلئے اعلان جنگ ہے۔ (۱۲۷)

مزید برآں سود کو خواہ کسی بھی حیثیت سے دیکھا جائے لیکن یہ بات تو بالکل واضح ہے کہ سود دراصل زر پرستی، خودغرضی، مفت خوری، سنگدلی اور بخل جیسی رذیل صفات کا نتیجہ ہے اور یہ انہی صفات کو انسان میں نشوونما بھی دیتا ہے ظاہر ہے کہ جس معاشرے کے افراد ایک دوسرے سے خودغرضی کا معاملہ کریں، کوئی شخص اپنی ذاتی اغراض اور ذاتی فائدے کے بغیر کسی کے کام نہ آئے ایک آدمی کی حاجت مندی کو دوسرا آدمی اپنے لئے نفع اندوزی کا موقع سمجھے اور مال دار طبقے کا مفاد عوام الناس کے مفاد کی ضد ہو جائے تو باہمی تعاون سے خالی معاشرہ کبھی بھی مضبوط و مستحکم نہیں ہوسکتا، اس کے افراد میں آپس کی محبت کی بجائے باہمی بغض وحسد، بے دردی اور بے تعلقی نشوونما پاتی ہے اور اس کے اجزا ہمیشہ منتشر و پراگندہ بلکہ ایک دوسرے سے متصادم رہتے ہیں۔

شاہ صاحبؒ کے نزدیک سود کی دو اقسام ہیں:۔

۱) ربواء حقیقی (۲) ربواء فضل۔

''ایک حقیقی ربوا کہلاتا ہے جس کو بغیر قید و بند کے حرام قرار دیا گیا ہے، دوسرا ربوا فضل کہلاتا ہے جیسا کہ سونے چاندی کا کمی بیشی سے لین دین کرنا وغیرہ اس لئے ان اشیاء کی خرید وفروخت کے جواز کو تسلیم کرتے ہوئے ان تمام صورتوں کو حرام بتایا گیا ہے جن کا نتیجہ سودی لین دین کے موافق نکلتا ہے تاکہ اس غیر فطری کاروبار کا پوری طرح انسداد ہو جائے۔ (۱۲۸)

اسلام میں سود کی ممانعت محض اخلاقی بنیادوں پر ہی نہیں بلکہ اس کے دوررس خطرناک، اقتصادی معاشرتی اور سیاسی اثرات کی بنا پر بھی ہے سود کی لعنت جہاں متعدد قدیم معاشروں کی تباہی کا باعث بنی وہاں آج بھی جدید سرمایہ دارانہ معاشرے کی جڑوں کو کھوکھلا کر رہی ہے، چونکہ استحصال اور ظلم کے اس طریقہ کار میں ملک کی معیشت چند سرمایہ داروں کے قبضے میں آجاتی ہے جس سے صحت مند معاشی جدوجہد ممکن نہیں رہتی لہذا عدم تعاون کے سبب معاشرت اور معیشت میں عدم استحکام پیدا ہوجاتا ہے۔

دنیا کا کوئی بھی ملک ایسا نہیں ہے جہاں ساہوکار افراد ادارے سود کے ذریعے سے محنت کش عوام اور مزدور طبقے کا خون نہ چوس رہے ہوں ان کے لئے ایک تو ان کی ناداری جیسے سود کی بھاری شرح جان لیوا ثابت ہوتی ہے۔ سودی قرض کے جال میں پھنسے ہوئے یہ لوگ ہر وقت کی فکر اور پریشانی سے اس قدر گھل جاتے ہیں کہ ان کی صحتیں تک ٹھیک نہیں رہتیں پھر تنگ دستی کی وجہ سے متناسب غذا اور صحیح علاج بھی مشکل ہوجاتا ہے اور یہ سودی قرض معاشرے میں دولت کی آزادانہ گردش کو روک دیتا ہے بلکہ دولت کی گردش کا رخ ناداروں سے مالداروں کی طرف پھر جاتا ہے کیونکہ چند افراد تو لاکھوں آدمیوں کا خون چوس چوس کر موٹے ہوتے جارہے ہیں لیکن بحیثیت مجموعی پوری قوم تباہی اور ہلاکت کے عمیق غار میں گر جاتی ہے انجام کار خون چوسنے والے افراد خود بھی ان نقصانات سے نہیں بچ سکتے۔

عیش پسندی:

شاہ صاحب "عیش پسندی کو تمدن و معیشت کیلئے زہر قاتل قرار دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

''اسی طرح تمدن کی تباہی و ہلاکت کے امور میں سے یہ ہے کہ امت کے مالدار لوگ زیورات، لباس مکان، خورد و نوش اور عورتوں کے حسن و زیبائش، وغیرہ کی باریک بینیوں اور دقیقہ سنجیوں میں منہمک ہوجائیں اور حاجات و ضروریات سے زیادہ عیش کی زندگی میں مشغول رہنے لگیں جس کا بالآخر نتیجہ یہ ہو کہ:

''لوگوں پر اس کی وجہ سے سخت مصیبت آن پڑے اور آخر کار یہ

ضرر آہستہ آہستہ ایک عضو اجتماعی سے دوسرے عضو میں سرائیت کرتا گیا یہاں
تک کہ امت ایک عام تباہی میں گرفتار ہو جائے''

یہی وجہ ہے کہ نبیؐ نے ایک تو ان باتوں کی طرف ناپسندیدگی کا اظہار فرمایا اور دوسرے اس قسم کی چیزوں کی ممانعت بھی فرمادی اور حکم دے دیا کہ اس طرح کی مصنوعی اور تباہ کن عیش پسندی کو ختم ہو جانا چاہئے اور سادہ زندگی کو اختیار کیا جائے۔(۱۲۹)

شاہ صاحبؒ کے بقول: ''جوء، سٹہ عیاشی کے اڈے ختم کیے جائیں جن کی موجودگی میں تقسیم دولت کا صحیح نظام قائم نہیں ہو سکتا اور بغیر اس کے قوم اور ملک کی دولت میں اضافہ ہو، دولت بہت سی جیبوں سے نکل کر ایک طرف سمٹ آتی ہے'' غیر مساوی اور غیر منصفانہ تقسیم آمدنی محنت کو نظر انداز کرنے سے وجود میں آتی ہے آپ کے نزدیک دولت کا ارتکاز نہیں ہونا چاہئے اور ایسے تمام پیشے اور اشغال جو تقسیم دولت کا صحیح نظام قائم نہیں کر سکتے ان کو ختم اور تلف کر دیا جائے تا کہ معاشرے میں سکون اور انصاف کا رجحان ہو۔

شاہ صاحبؒ کی اجتماعی زندگی کی تعلیمات کے مطالعہ کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ وہ:

''قومی زندگی میں ہم فرد کی بجائے انسانی اجتماع کو اہم مانتے
ہیں، اور ہم نے شاہ صاحبؒ کی کتابوں میں دیکھا ہے کہ وہ بھی انفرادیت کی
بجائے اجتماعیت پر بہت زور دیتے تھے۔(۱۳۰)

بہر حال شاہ صاحبؒ کے بقول جو پیداوار یا آمدنی تعاون باہمی کے اصول پر نہ ہو وہ خلاف قانون ہے جس سے ایک صالح معاشرے کا وجود قائم نہیں رہ سکتا لہٰذا ضروری ہے کہ ہر کام خواہ اس کا تعلق صنعت سے ہو یا تجارت، حرفت سے تعاون باہمی کے اصول پر ہی ہونا چاہئے اس صورت میں امید کی جا سکتی ہے کہ معاشرے کے کم خوش قسمت افراد بھی صحیح اور باعزت زندگی بسر کر سکتے ہیں۔

☆ ☆ ☆

باب پنجم

فصل ششم

معاشی زندگی کا ارتقاء

(STAGES OF ECONOMIC LIFE)

آج کا انسان معاشی اعتبار سے کافی ترقی یافتہ ہے، مگر اس نے یہ ترقی مختلف ادوار سے گزر کے حاصل کی ہے۔

۱) شکار اور ماہی گیری کا دور:

(Hunting and Fishing Stage)

ایک زمانہ وہ تھا جب کہ انسان غیر مہذب اور وحشی تھا۔ وہ جنگلی جانوروں کی طرح پہاڑوں اور درختوں پر رہتا تھا اسے جب کبھی بھوک لگتی تو وہ جانوروں کا شکار کر کے ان کا گوشت کھاتا یا مچھلیاں پکڑتا اور انھیں کچا کھا جاتا تھا کبھی پھل کھا کے اپنا گزارا کر رہا تھا، جب اسے پیاس لگتی تو وہ دریاؤں اور جھیلوں کے کنارے جا کر پانی پی لیتا، اس دور میں نہ تو کوئی مکان بنایا اور نہ کوئی جھونپڑی وہ کھانے کی تلاش میں ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتا رہتا، لباس کے معاملہ میں اس نے کوئی ترقی نہیں کی وہ جانوروں کی کھالوں اور درختوں کے پتوں سے اپنا جسم ڈھانک لیتا تھا تاکہ وہ اپنے آپ کو موسمی تبدیلیوں سے بچا سکے۔ اس زمانے میں انسان جانوروں کی طرح محدود احتیاجات رکھتا تھا اور براہ راست جدو جہد کر کے اپنی احتیاجات کی تسکین کر لیتا تھا، شکار کرنے کیلئے اس نے پتھر اور جانوروں کی ہڈیوں کے اوزار بنا رکھے تھے یہی اس کا سرمایہ تھا، معاشی زندگی کے اس ابتدائی دور میں انفرادی جدو جہد ہی اس کی احتیاجات کی تسکین کا ذریعہ تھی۔

۲) گلہ بانی کا دور(Pastoral Stage)

ابتدائی دورانسانی زندگی کا سخت ترین دورتھا، کیونکہ انسان کو ہر ضرورت کی تسکین کے لئے ہر بار علیحدہ علیحدہ جدوجہد کرنا پڑتی تھی وہ زندگی میں کچھ سہولت اور آسانی چاہتا تھا، اس لئے اس نے ایک نئی صورت پیدا کی اس نے دودھ دینے والے جانور پالنا شروع کیے جن سے وہ نہ صرف دودھ حاصل کرتا بلکہ ان کا گوشت ہڈیاں اور چمڑہ بھی استعمال میں لاتا، ہر جانوروں سے باربرداری کا کام لیا جاتا تھا ان کے ئے چارے کی تلاش میں وہ ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتا اوراس وقت تک وہاں قیام کرتا جب تک کہ اس کے جانوروں کے ئے وہاں چارہ ملتا، وہ اس جگہ قیام کرتا جہاں اسے سبزہ زار نظر آتا، چراگاہ کی تلاش ان کا مقصد حیات ہو گیا تھا، اور وہ بدوؤں (Nomads) کی زندگی گذارتا تھا۔

وہ لوگ جو شکار کر کے یا جانور پال کر اپنی غذا حاصل کرتے، بیٹھ کر چھوٹے موٹے اوزار اور دوسرا سامان تیار کرتے اور گلہ بانوں سے اس کے بدلے غذا حاصل کرتے، اس طرح محدود پیمانے پر تقسیم کار (Division of Labour) اور اشیاء کے تبادلے کی ابتدا ہوئی۔ ملکیت کا خیال بھی اسی زمانے میں پیدا ہوا، مویشی دراصل ان کی جائیداد تھی، باپ کے انتقال کے بعد بیٹا ان جانوروں کا مالک ہوتا اس طرح وراثت کی منتقلی کی بنیاد بھی پڑی وہ کبھی کبھی قبیلوں میں تقسیم ہو جاتے اور بعض علاقوں کو اپنے قبضے میں کر لیتے وہ اسے اپنا وطن کہتے۔ دوسرے لوگوں کا وہاں داخلہ ممنوع ہوتا، اگر کوئی اس پر قبضہ کرنے کی کوشش کرتا تو جنگ چھڑ جاتی ہارنے والوں کو غلام بنالیا جاتا، اسی دور میں رفتہ رفتہ غلامی کی بنیادیں بھی پڑیں اس دور کی خصوصیات یہ ہیں: ''تقسیم کار، ملکیت، غلامی''

۳) زراعتی دور(Agricultural Stage):

مویشیوں کے پالنے سے غذا کی سہولت کے ساتھ ساتھ ایک اور فائدہ بھی ہوا وہ یہ کہ جانوروں سے بار برداری کے علاوہ کھیتوں میں ہل کھینچنے کا کام بھی لیا جانے لگا انسان کو اب تک معلوم ہو چکا تھا کہ زمین

....

زرخیزی رکھتی ہے اور وہ کھیتوں کو جوت کر زمین سے غذا حاصل کرسکتا ہے اس نے کھیت بوئے ،لہلاتی ہوئی کھیتیاں دیکھیں اوران کے نزدیک اس نے اپنی جھونپڑیاں بھی بنائی تاکہ وہ دشمنوں اور جانوروں سے فصلوں کی حفاظت کرسکے اس طرح گاؤں یا بستی کی ابتدا ہوئی ۔ جابجا آبادیاں نظرآنے لگیں زندگی میں ایک نظم پیدا ہوگیا مرد کھیتوں میں کام کرتے عورتیں گھروں کی دیکھ بھال کرتیں اور بچے مویشی چراتے ان کسانوں کو ہل سہاگ کھرپی اوراس قسم کے دوسرے اوزاروں کی ضرورت پڑنے لگی ، کچھ لوگوں نے بڑھئی کا کام اختیار کیا لکڑی کا ہل تیار کیا گیا لوہاروں نے لوہے کی چیزیں تیار کیں ،کمہاروں نے مٹی کے برتن بنائے کسان اناج کے عوض انھیں خریدتے ۔

اس طرح بالواسطہ طور پر جدوجہد کے ذریعے احتیاجات کی تسکین کی جاتی جانوروں کے بجائے زمین کی ملکیت کا تصور ابھرا زمین کے مالک زمیندار کہلانے لگے اور پیداوار کے مالک قرار پائے انھوں نے غلاموں کو کھیتوں پر کام کرنے پر مامور کیا ،غلاموں کو ان کی محنت کا معاوضہ دیا جانے لگا ، یہ دور ترقی کے لحاظ سے ابتدائی دونوں ادوار سے زیادہ ممتاز ہے ،اس کی خصوصیات یہ ہیں ۔''بستیوں کا ظہور،منظم زندگی کی ابتدا'''' کاروبار کی تقسیم ،زمین کی ملکیت ، پیدائش دولت ،احتیاجات کی بالواسطہ تسکین''

۴) دستکاری اور گھریلو صنعتوں کا دور:

(Handicraft and Domestic Industries)

اس دور میں انسان نے آلات بنا کر دوسری اشیاء پیدا کرنا شروع کردی تھیں ،وہ اپنی ضروریات کی تکمیل کے لئے ایسی اشیاء بناتا جو دوسروں کی احتیاجات کو تسکین پہنچاتیں ۔شروع میں اس نے کاشتکاری کے لئے ہل بنائے اورعمدہ قسم کی درانتیاں تیار کیں ،بڑھئی ،لوہار ،اور کمہار وغیرہ کے کام کو فروغ ہو ۔بعض انسانوں نے کپڑا بنانے کا کام شروع کیا مختلف فنکاروں نے طرح طرح کے کپڑے بنائے جت سازوں نے جوتے بنانے میں اپنا کمال دکھایا۔

یہ سب کام چھوٹے پیمانے پر ہوتے ، مال اسی دیہات یا علاقے کے لوگوں کی احتیاجات کی تسکین کے لئے تیار کیا جاتا ، گھر کا مالک خود ہی سرمایہ دار ہوتا اور خود ہی زمیندار وہ خود ہی مزدور اور خود ہی آجر ہوتا اسطرح الگ الگ گھروں میں الگ الگ اشیاء پیدا کی جانے لگی گھریلو صنعتوں کا آغاز یہیں سے ہوا انسان نے خام اشیاء کو مصنوعات کی شکل میں تبدیل کرنا شروع کیا اور انھیں منافع پر فروخت کرنے کی کوشش کی ۔ مشینوں کو انسانی یا حیوانی قوت سے چلانا شروع کیا۔ گھریلو صور پر تقسیم کار ہوتی ، باپ ماں بیٹے اور بیٹیاں سب مل کر اپنی صنعت کو کامیاب بناتے ۔

۵) صنعتی دور: (Indudtrial Stage)

اس دور کی ابتدا انگلستان میں صنعتی انقلاب (Industrial Revolution) کے ساتھ ہوئی جو ۱۷۶۹ء میں رونما ہوا یہ دور انسانی معاشی ترقی کا حالیہ دور ہے ۔ عہد حاضر کے تمام ترقی یافتہ ممالک اس دور سے گزر کر ترقی کی منزل پر پہنچے ہیں اور ترقی پذیر ممالک جلد از جلد اس دور میں داخل ہونے کی کوشش کر رہے ہیں اس دور میں بڑے بڑے کارخانوں میں زیادہ سے زیادہ اشیاء مشینوں کے ذریعہ پیدا کی جانے لگیں ۔ مشینیں برقی قوت سے چلنے لگیں اور ان کی تیز رفتاری کی وجہ سے اشیاء زیادہ مقدار میں پیدا ہونے لگیں دراصل دستکاری کے دور میں ہی یہ مشینیں تیار ہونے لگی تھیں اور رفتہ رفتہ ان کے ذریعے بڑھتی ہوئی آبادی کی احتیاجات کے لئے اشیاء پیدا کی جانے لگی تھیں آمد و رفت کے ذرائع بھی تیز تر ہو گئے تھے اس زمانے میں نئے ملک بھی دریافت ہو گئے تھے خام اشیاء کی پیداوار میں بھی اضافہ ہو گیا تھا ذرائع نقل و حمل بہتر ہوئے تو تیار شدہ اشیاء دور دراز ملکوں میں فروخت کرنے کے لئے بھیجی جانے لگیں ۔

چنانچہ یہیں سے درآمد اور برآمد کی ابتدا ہوئی جس نے زرمبادلہ (Foreign Exchange) کے پیچیدہ مسائل پیدا کر دیئے بڑے پیمانے پر پیدائش دولت کے لئے کارخانوں کا قیام لازمی ہو گیا بجلی یا دوسری قوتوں سے مشینوں کو سرمائے کی کمی کی وجہ سے بڑی فیکٹریوں کے چلانے میں ناکام

رہے وہ ان فیکٹریوں میں ''مزدور'' کی حیثیت سے شامل ہوگئے۔محنت اور سرمائے کا نزاعی مسئلہ پیدا ہوگیا ،مزدوروں نے (Trade Union)''ٹریڈ یونین بنانا شروع کی۔مگر حکومتوں نے انہیں غیر قانونی قرار دے دیا۔فیکٹریوں کے معاملات نے تنازعات کی شکل اختیار کرلی صارفین کو مشین کی تیار شدہ اشیا ملنے لگیں یہ چیزیں گھریلو صنعتی دور کی تیار شدہ اشیاء سے بہتر اور سستی ہوتیں،ان کی طلب میں اضافہ ہوگیا۔نقل و حمل کی سہولت کے باعث اشیاء ہر وقت دور دراز ملکوں کے بازاروں میں پہنچنے لگے۔وسعت کے لحاظ سے بازار کے مسائل اور پیچیدہ ہوگئے چنانچہ حکومت نے منصوبہ بندی شروع کردی اور بین الاقوامی تجارت کو محدود کردیا۔(۱۳۱)

پیشے

پیشوں کی ابتداءاور اہمیت:

آج کل پیشوں کی جو صورت ہے شاہ ولی اللہؒ اس سے مطمئن نہیں اور باتوں کے علاوہ لوگوں نے بعض پیشوں کو حقیر اور بعض کو باعزت سمجھنا شروع کردیا ہے،اس کی وجہ ان پیشوں میں معاشی عدم توازن یعنی دولت کا صحیح طریقے پر نہ دیا جانا ہے آپ کی رائے میں چیزیں کسی پیشے کو باعزت یا ذلیل بنانے میں کسوٹی کا کام دے سکتی ہیں۔

(۱) ضرورت (۲) محنت (۳) ارتفاق یعنی انسانی ترقی میں مدد

ضرورت یا احتیاج پیشوں کی ابتداء کا بنیادی ذریعہ ہے۔شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ انسان کے پاس زمین تھی لیکن اوزار نہ تھے چنانچہ اوزاروں کی صنعت اور اس سے متعلق پیشوں نے جنم لیا،اس کے پاس روئی تھی لیکن کپڑا کیسے پہنے اس کیلئے کپڑا اور لباس تیار کرنے کی صنعتیں اور پیشے وجود میں آئیں۔اس کے پاس غلہ تو تھا لیکن اپنی ضرورت کی چیزیں کیسے حاصل کرے اس طرح تبادلے کے نظام اور تجارت کی مختلف صورتوں نے جنم لیا (۱۳۲)

چنانچہ جوں جوں ضرورت پیش آتی رہی پیشے وجود میں آتے رہے۔ انسان جس قدر ترقی کرتا گیا اس میں حرص و ہوس بڑھتی گئی اور مختلف ادوار میں قیصر و کسریٰ (جاگیردارانہ) قسم کے باطل نظام پروان چڑھتے رہے لہٰذا دولت کو حاصل کرنے کے لئے ایسے ذریعے اور پیشے بھی وجود میں آتے گئے جن سے انسان کو بیٹھے بٹھائے دولت مہیا ہو جائے اور وہ ان پیشوں کو بھی انسانی ضرورت میں داخل کرنے لگے اس لئے شاہ صاحبؒ کے نزدیک دوسرا بڑا معیار ''محنت'' ہے آپ کے خیال میں ایسے پیشے جن میں محنت نہیں کرنا پڑتی یا وہ عیش و عشرت اور فضول قسم کے کاموں ہی میں مدد دیتے ہیں انسانیت کے لئے بربادی کا سامان ہیں ان پر جو دولت خرچ ہوتی ہے وہ سب لوگوں کا نقصان ہے، چنانچہ محنت اور معارف کے اصولوں پر کسی پیشے کو پرکھنے سے اس کا صحیح مقام متعین ہوتا ہے۔

تیسری بنیادی بات یہ ہے کہ پیشے انسانی ترقی میں مدد کریں، ایک پیشہ جسے لوگ اس لئے اختیار کرتے ہیں کہ چند سرمایہ دار یا جاگیردار قسم کے لوگوں کو اس کی ضرورت ہے اس پیشے میں ہوں تو انھیں محنت بھی کرنا پڑتی ہے لیکن مجموعی طور پر اس کا فائدہ عام لوگوں کو نہیں پہنچتا، اس لئے ظاہر اس قسم کے پیشے کی پوری قوم یا معاشرے کو کیا ضرورت؟

چنانچہ ضرورت اور محنت کے ساتھ یہ دیکھنا بھی ضروری ہوگا کہ اس کی اجتماعی ضرورت بھی ہے یا نہیں اگر ہے تو کیا فائدہ مند ہے اگر نہیں تو قوم پر بوجھ اور ملک کی بربادی کا باعث ہے، اور خوشحال معاشرہ کے لئے زہر ہے۔ (۳۳)

بامقصد اور ناکارہ پیشے:

بامقصد اور اہم پیشوں کا دارومدار ضرورت، محنت اور ارتفاق کے لئے تعاون پر ہے، لیکن یہ کیسے معلوم ہو کہ کن پیشوں کی ضرورت ہے اور کون سے ان میں بیکار ہیں، اس کے لئے شاہ ولی اللہ کا خیال یہ ہے کہ معاشرتی بہبود سے متعلق اداروں کو جامع منصوبہ بندی کرنی پڑے گی اور یہ دیکھنا ہوگا کہ ان کے ملک کی آبادی

کتنی ہے اور لوگ کن کن پیشوں میں مشغول ہیں، اور حقیقت میں انھیں کن پیشوں میں مشغول ہونا چاہیے آپ فرماتے کہ اگر برے اور بے مقصد پیشوں کو ختم کر دیا جائے تو ملک کی معاشی حالت پر اس کا گہرا اثر پڑے گا اور لوگوں کی حالت درست ہو جائے گی (۱۳۴)

شاہ ولی اللہؒ نے اپنی تحریروں میں مختلف مقامات پر جن پیشوں کا ذکر کیا ہے انھیں مندرجہ ذیل حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:۔

۱) وہ پیشے جو انسان کی بنیادی ضرورتوں کو پورا کرتے ہیں۔

۲) وہ پیشے جو ان بنیادی ضرورتوں کو پورا کرنے والے اداروں کے لئے سہولت پیدا کرتے ہیں اور شہری زندگی نیز انسانی ترقی کے لئے ڈھال کا کام دیتے ہیں۔

۳) وہ پیشے جو محض عیش وعشرت اور تفریح اور دیگر انسانی دلچسپیوں کے سامان مہیا کرتے ہیں۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے پیشوں کی اس تقسیم کا تجزیہ اس طرح کیا ہے کہ:

۱) زراعت، صنعت اور تجارت سے انسان کی بنیادی ضرورتیں پوری ہوتی ہیں ان میں زراعت کے پیشے کو معاشرتی زندگی میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت حاصل ہے شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں، کہ جب حالت یہ پیدا ہوں کہ ملک کی آبادی کا انحصار زمین پر ہو اور لوگ ادھر ادھر کے پیشے میں مشغول ہو جائیں اور صحیح معنوں میں بہت کم لوگ زراعت میں مشغول ہوں تو اس سے ملکی حالت خراب ہو جائے گی اور خود زرعی زندگی اور اس سے متعلق پیشوں کے لوگ بے حد متاثر ہوں گے اس لئے ضرورت اس سے بات کی ہے کہ زرعی ملک میں اکثر لوگوں کی زراعت کی طرف توجہ ہو اور زراعت کے پیشے کو غذا کی طرح اہم سمجھا جائے (۱۳۵)

تا کہ زیادہ سے زیادہ غلہ پیدا ہو اور ملک کے لوگوں میں اس کی فراوانی ہو غلہ سستا ہو اور لوگ خوشحال ہوں۔

زراعت کے بعد شاہ صاحبؒ صنعت اور تجارت کو بہت اہمیت دیتے اور فرماتے ہیں کہ جو لوگ

دستکاری اور تجارت میں معاونت اور محنت کے اصول پر انسانوں کی بنیادی ضرورتیں پوری کرتے ہیں گویا وہ زندگی کے مقصد کی طرح رواں دواں ہیں ۔ کیونکہ صنعت وتجارت وغیرہ میں محنت کر کے دولت بڑھنے کے معنی ہیں کہ شہری نظام کو مضبوط کیا جا رہا ہے جس کے بغیر شہری زندگی باقی نہیں رہتی ۔ (۱۳۶)

۲) ان بنیادی پیشوں کے بعد معاشرے میں کچھ ایسے بھی پیشے ہوتے ہیں جو براہ راست ''دولت'' تو پیدا نہیں کرتے لیکن دولت کی پیدائش میں مدد دیتے ہیں ۔ اس میں عمرانی اور مذہبی تعلیم کے ادارے بھی شامل ہیں جن کی بدولت عملی اور فکری طور پر انسان بہتر بنتا ہے اور مزید انسانی ترقی کیلئے کوشش کرتا ہے ، ان پیشوں میں ذرائع حمل ونقل اور مواصلات سے متعلق لوگ بھی آ جاتے ہیں انسان کے باس اور مکان وغیرہ سے متعلق پیشوں کا شمار بھی اس شق میں ہے ۔

اس قسم کے پیشوں میں شہری اور ملکی انتظام سے متعلق سب ہی پیشے آ جاتے ہیں ، جن کے ذریعے لوگوں کی دیکھ بھال ہوتی ہے ، ان کے حقوق کی نگہداشت ہوتی ہے ، ان کے لئے آرام پہنچانے کے نت نئے طریقے سوچے جاتے ہیں اور پھر مختلف محکمے ان پر عمل کر کے معاشرتی سہولتیں پیدا کرتے ہیں ، اور ملکی دفاع کرتے ہیں یہ اور اس قسم کے دوسرے پیشے کو کہ ہمیشہ منصوبہ بندی کے محتاج رہتے ہیں لیکن دولت کی پیداوار کی نگرانی ، اس کی تقسیم ، اس کے دیگر انتظامی امور اور مزید ترقی کے نئے ڈھال کا کام کر دیتے ہیں ۔

۳) تیسرے نمبر پر ایسے پیشے آتے ہیں جن کا تعلق نہ تو براہ راست ''دولت'' پیدا کرنے سے ہوتا ہے اور نہ وہ ''دولت'' سے متعلق تعمیری اداروں کی فہرست میں آتے ہیں ان میں بعض پیشے تو ایسے ہیں جن کی نہ تو ضرورت ہوتی ہے اور اور نہ ہی ان میں محنت کا کوئی تصور ہوتا ہے ۔

بعض پیشے ایسے ہیں جن میں محنت تو ہوتی ہے لیکن یہ محنت چند لوگوں کی دلچسپی کے سامان پیدا کرنے تک محدود رہتی ہے اس قسم کے پیشوں پر شاہ ولی اللہ کڑی تنقید کرتے ہیں ، ملک کی بربادی کا ذمہ دار ٹھراتے ہیں اور عوام کی بدعملی کا باعث ان ہی لوگوں کو قرار دیتے ہیں ۔

ان میں پہلی قسم کے لوگوں پر تو شاہ ولی اللہؒ خوب برستے ہیں اور براہ راست مخاطب ہوتے ہوئے فرماتے ہیں۔

''اے لوگوں! تمہارے اخلاق گر چکے ہیں، تمہیں چاہئے کہ ضروریاتِ زندگی کے لئے خود کماؤ اور لوگوں پر بوجھ نہ بنو، بلاشبہ خدا کی مرضی یہ ہے کہ تم اپنے ہاتھ سے کماؤ'' (۱۳۷)

شاہ صاحبؒ اس قسم کے جن لوگوں سے مخاطب ہیں ان میں پہلے نمبر پر امراء اور جاگیردار ہیں، یہ لوگ معاشرے سے دولت تو حاصل کرتے ہیں لیکن خود ''محنت'' نہیں کرتے، اور معاشرے نے ان پر جو ذمہ داریاں عائد کی ہیں ان کی کوئی پرواہ نہیں کرتے آپ ان لوگوں سے فرماتے ہیں۔

اے امیرو! ''کیا تمہیں خدا کا خوف نہیں آتا، تم دنیا کی فانی اور بوسیدہ لذتوں میں محو ہو گئے ہو کہ تمہیں عوام کا کوئی خیال نہیں رہا، تم جسے کمزور پاتے ہو اسے نگل جاتے ہو اور جسے طاقتور دیکھتے ہو اس کو چھوڑ دیتے ہو تمہاری توجہ لذیذ کھانوں، نرم و نازک عورتوں، اچھے لباس اور اچھے مکان سے باہر نہیں جاتی۔ (۱۳۸)

شعر کہنا برا نہیں، لیکن درباری شاعری اور یہ کہ محض شعر کہنا ہی پیشہ ہو شاہ صاحبؒ اس کے مخالف ہیں اس طرح بڑے آدمیوں (جاگیرداروں اور سرمایہ داروں) کی حاشیہ برادری اور مصاحب بھی بعض لوگ پیشہ بنا لیتے ہیں۔ اس قسم کے پیشوں کے بارے میں شاہ صاحب کی رائے یہ ہے کہ ان لوگوں کی وجہ سے سرکاری خزانے پر اثر پڑتا ہے، یہ لوگ کچھ (محنت) نہیں کرتے، بلکہ ایک دوسرے پر کیچڑ اچھالتے ہیں یا پھر بڑے لوگوں کی خوشامد کرتے رہتے ہیں اور اس قسم کی باتیں سوچنے میں اپنا وقت برباد کرتے ہیں (۱۳۹)

وعظ کہنا اور لوگوں کو اچھی باتیں بتانا برا نہیں اسی طرح مزارات کی خدمت اور زہد و تقویٰ اختیار کرنا بھی اچھی بات ہے لیکن وعظ کو پیشہ بنا لینا کہنا کچھ اور کرنا کچھ اور، لوگوں کو دکھلانے کے لئے زاہد اور متقی

بنا، اسے ذاتی فائدوں اور ''دولت'' کے حصول کیلئے استعمال کرنا یا مزارات پر بیٹھ کر ہی انھیں روزی کا ذریعہ بنانا، یہ اور اس قسم کی سب باتیں ایسی ہیں جن سے ایسے پیشے جنم لے سکتے ہیں جو محنت کے بغیر ہی حصول دولت کی راہیں ہموار کرتے ہیں، اور دوسری طرف اس سے مذہب کی حقیقی روح کو بھی نقصان پہنچتا ہے۔

شاہ صاحبؒ اس قسم کی باتوں اور ایسے لوگوں کی سخت مخالفت کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ:

''ان لوگوں نے عوام کے روپے کو بلا محنت حاصل کرنا اپنا پیشہ بنا لیا ہے یہ لوگ کوئی خدمت نہیں کرتے نہ صرف ایک دوسرے کی زندگی مقدر کرتے ہیں بلکہ شہری زندگی یعنی معاشرے پر بھی ایک قسم کا بوجھ بن جاتے ہیں۔

اس قسم کے لوگوں سے براہ راست خطاب فرماتے ہوئے شاہ صاحبؒ کہتے ہیں۔

تم سیدھی راہ چھوڑ کر ادھر اُدھر غلط راستوں پر بھٹک رہے ہو اور ہر رطب و یابس کو لے کر لوگوں کو من گھڑت اور جھوٹی باتوں کی طرف بلا رہے ہو کیا محمد ﷺ کا طریقہ یہی تھا۔ اور آپ کے اچھے ساتھی اور صحابہ کرتے تھے۔ (۱۴۰)

اسلامی تعلیمات، رشد و ہدایت سے پھیلی ہے اور بزرگوں نے تکلیفیں اٹھا اٹھا کر عوام کو ان کی منزل دکھائی ہے۔ ان بزرگوں اور مذہب کے عظیم تبلیغی منصوبوں کو بد ذاتوں نے اپنے ذاتی فائدوں کے لئے خوب استعمال کیا اور شہرت بھی حاصل کی لوگوں کو الٹی سیدھی باتیں بھی بتائی اور بلا محنت کئے، دولت، الگ حاصل کی شاہ ولی اللہؒ خود ایک بزرگ صوفی اور باعمل عالم ہیں اس لئے مذہب اور تصوف کی آڑ میں اصول دولت کے لئے اس قسم کے کاروبار کرنے والوں پر ان کی گہری نظر ہے۔ چنانچہ اس قسم کے لوگ آپ کے نزدیک عوام کے روپے (سرکاری خزانے) پر بوجھ ہیں۔

آپ نہایت سخت الفاظ میں ان لوگوں سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں:

اے مشائخ زادو!'' تم نے اپنے بزرگوں کے پاکیزہ طریقوں کو رسم بنالیا ہے، تم نے راستے کوتو گم کردیا ہے اور سمجھتے ہو کہ راہبر ہو، تم دوسروں کو اس لئے بیعت کرتے ہو کہ خود کئے بغیر ان سے ''دولت'' وصول کرو تم لوگ ڈاکو، دجال، جھوٹے اور فتنہ پرور ہو''۔ (۱۴۱)

شاہ صاحبؒ اس قسم کے معاشرتی پیشوں پر کڑی تنقید کرتے ہیں اور اس قسم کی بلا محنت روزی کی مذمت کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ۔

''اس قسم کے پیشے ملکوں کی تباہی کا سبب بنتے ہیں کیونکہ ان کی روزی کا دارومدار محنت کی بجائے عوام کے پیسے پر ہوتا ہے، دوسرا نقصان اس سے یہ ہوتا ہے کہ جب اس قسم کے پیشوں کی کثرت ہونے لگتی ہے تو لوگوں میں حرام خوری کا مادہ بڑھتا ہے، ان کے دلوں کی حالت خسیس ہو جاتی ہے اور اچھے اخلاق سے وہ منہ موڑنے لگ جاتے ہیں، اور اس طرح ترقی کے بجائے معاشرہ زوال کی طرف جانے لگتا ہے۔ (۱۴۲)

شاہ صاحبؒ کا خیال ہے کہ جب معاشرے کی اتنی بڑی آبادی ایسے پیشوں کو اپنا لے جن کی حقیقت میں (اجتماعی طور پر) ضرورت نہ ہو تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ زراعت بنیادی ضرورتوں کی صنعت اور تجارت میں لوگ کم رہ جائیں گے اور ان پیشوں کی طرف زیادہ متوجہ ہوں گے، اس طرح زراعت وتجارت کے پیشے بری طرح متاثر ہوں گے۔

اس کا ایک بڑا نقصان یہ ہوگا جب امراء ان پیشوں پر زیادہ دولت خرچ کریں گے تو ٹیکس بڑھے گا اور بنیادی ضرورتوں کے پیشے ایک تو ویسے ہی کمزور ہوں گے دوسرے ٹیکسوں کے بارسے اور دب جائیں گے، یہ زہر معاشرے میں گویا اس طرح پھیل جائے گا جس طرح دیوانے کتے کے کاٹنے کا اثر انسان کے جسم میں پھیل

جا تا ہے، اسلئے ضروری یہ ہے کہ بلا ضرورت کے پیشوں کو فوراً روکا جائے تاکہ لوگوں کی معاشی حالت بہتر ہو تو وہ خوشحال ہوں۔(۱۴۳)

دولت کا استعمال:

دولت کے استعمال پر معاشرے کے پڑھے لکھے اور سمجھدار طبقے کو نظر رکھنا چاہئے اس لئے کہ دولت کی پیدائش کیلئے جب محنت ضروری چیز ہے تو اس محنت کے بعد محنت کرنے والے کی زندگی کو خوشحال بنانا بھی ضروری ہے حضرت شاہ صاحبؒ کا خیال ہے کہ اگر ایسا نہ کیا گیا تو معاشرے میں انصاف (عدل عمرانی) باقی نہیں رہے گا آپ کی رائے میں معاشرے کو خوشحال بنانے کیلئے یہ ضروری ہے کہ لوگوں کی بنیادی ضرورتیں پوری ہوں اور ان کے رہنے سہنے کا ایک معیار ہو، اگر یہ بنیادی ضرورتیں انسان کو نہ ملیں تو ان کی عملی زندگی پر کیا اثر پڑسکتا ہے اور یہ کہ ان بنیادی ضرورتوں کا کم از کم معیار کیا ہے ان سب باتوں پر شاہ صاحبؒ کے جو روشنی ڈالی ہے اس کا مختصر جائزہ لیا جاتا ہے۔

بنیادی ضرورتیں

شاہ ولی اللہؒ اور احتیاجات اصلیہ:

زندہ رہنے کیلئے یوں تو انسان کو سیکڑوں چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے اور جس قدر تمدن و صنعت کی ترقی ہوتی ہے انسان کی روزمرہ کی ضرورتیں بھی بڑھتی رہتی ہیں، لیکن ایسی ضرورتیں بھی ہیں جن کے بغیر زندگی کی گاڑی چل ہی نہیں سکتی، شاہ صاحبؒ نے ان ضروریات پر بحث کی ہے اور انھیں حاجات اصلیہ (صحیح معنی میں زندگی کی ضروریات یا بنیادی ضرورتیں) کہا ہے ان ضرورتوں کے پورا کرنے میں انسان اپنے ہم جنسوں میں برابر ہے یہ ضرورتیں چار ہیں:۔

(۱) خوراک (۲) لباس (۳) مکان (۴) نکاح (جنس مخالف کی ضرورت) (۱۴۴)

شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ:

ان ضرورتوں کو جانور بھی پورا کرتے ہیں اور انسان بھی، لیکن انسان ان ضرورتوں کو صرف اپنی حاجت پوری کرنے تک محدود نہیں رکھتا بلکہ ان میں عمدگی اور لطافت چاہتا ہے تاکہ اسے خوشی اور لذت حاصل ہو وہ لذیذ کھانے کھانا چاہتا ہے عمدہ لباس پہننا پسند کرتا ہے اچھے مکان میں رہنے کی خواہش کرتا ہے اور خوبصورت وحسین بیوی کے ساتھ زندگی کے دن گزارنے کا آرزومند ہوتا ہے۔

یہ زندگی کی وہ بنیادی ضرورتیں ہیں جن میں اگر کوئی ایک بھی ختم ہو جائے یا اس میں کمی واقع ہو جائے تو انسان کے معاشرے میں توازن باقی نہیں رہے گا۔

شاہ صاحبؒ کے نزدیک خدا کا حکم یہ ہے کہ:

''انسانوں میں سے کوئی شخص بھی اس چیز سے جس کو تمدن میں دخل ہے بغیر حاجت ضروری کے خالی نہ رہے (۱۴۵)

بنیادی ضرورتوں کا اعمال پر اثر:

شاہ صاحبؒ بنیادی ضرورتوں کو بہت اہمیت دیتے ہیں کیونکہ ان ضرورتوں میں اگر توازن برقرار نہ رہتے یا معاشرے میں یہ ضرورتیں آسانی سے پوری نہ ہوں تو انسان کے اعمال اس سے بہت متاثر ہوتے ہیں ان میں پہلی ضرورت خوراک ہی کو لیجئے، انسان کو اگر اچھی طرح پیٹ بھر کر روٹی نہ ملے تو اس کا دل اور دماغ الجھن میں مبتلا ہو جائے گا اس کو طرح طرح کے خیال ستائیں گے اس کا دماغ شیطان کی آماجگاہ بن جائے گا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ حیوانیت اختیار کرے گا اور جو صورت بھی پیش آئے وہ روٹی حاصل کرے گا اس صورت میں اس کے سامنے نہ قانون ہوگا نہ معاشرتی ترقی (ارتفاق) کا خیال اس کے برعکس اگر کسی شخص کو صرف مرغن غذا

کھانے کو ملے تو اس کا ذہن بھی اس سے متاثر ہوگا، کیونکہ بعض اوقات انسان ایسی مرغن غذائیں کھاتا ہے جو اس کی جنسی قوت کو تیز کرتی ہے، جس سے اس میں عورتوں کی طرف میلان کے خیالات تیز ہو جاتے ہیں اور پھر یہی خیالات اس کو بہت سی باتیں کرنے پر آمادہ کر دیتے ہیں، بعض اوقات وہ ایسی چیزیں کھاتا ہے جن سے اس کا دل سخت ہو جاتا ہے اس سے اس میں غصہ پیدا ہوتا ہے۔(۱۴۶)

اور اکثر اوقات خوراک اس کو اچھے یا برے کام پر آمادہ کر دیتے ہیں یہی حال لباس کا ہے، اگر لباس بوسیدہ اور پھٹا ہوا ہے تو انسان کے ذہن کی کیفیت کچھ اور ہوگی اور اگر صاف ستھرا اور دھلا ہوا ہے تو اس کی نفسیاتی حالت کا انداز مختلف ہوگا اور اگر اس نے زرق برق اور عمدہ پر تکلف لباس پہن رکھا ہو تو لازمی طور پر اس پر مختلف ذہنی کیفیت طاری ہوگی۔

اس لئے شاہ صاحبؒ اس بات پر بے انتہا زور دیتے ہیں کہ انسان کی بنیادی ضرورتیں بہتر طور پر پوری ہونا لازمی ہیں ان بنیادی ضرورتوں پر انسان کو ہمیشہ نظر رکھنا پڑتے گی تاکہ جب بھی رای الکلی (عام فائدے) کیلئے انھیں کمی یا زیادتی کرنا پڑے تو فوراً ان کی طرف توجہ دی جاسکے، اس کمی یا زیادتی کا اندازہ انسان کے معیار زندگی سے لگایا جاسکتا ہے۔(۱۴۷)

پیشوں کی غلط تقسیم اور مخرب اخلاق پیشوں کا ظہور:

اس ضمن میں شاہ صاحبؒ ایسے مخرب اخلاقی پیشوں پر کڑی نظر رکھنے کی ضرورت پر زور دیتے ہیں جو بے جا معاشرتی خرابیوں اور معاشی عدم توازن کا موجب بنتے ہیں۔

تمدن کی ترقی کے ساتھ ساتھ جن پیشوں کی تعداد ورشاخیں بڑھ جاتی ہیں تو۔ اس وقت ان پر کنٹرول نہایت ضروری ہو جاتا ہے اس ضمن میں شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ اگر اکثریت ایک پیشہ یا کسب اختیار کرے مثلاً لوگ صنعت وحرفتی میکنیکل یا سرکاری ملازمتوں کے پیچھے پڑ جائیں تو مویشیوں کی پرورش زراعت، و کاشتکاری جیسے بنیادی شعبے متاثر ہو جائیں گے پیشوں کے اس عدم توازن کا سوسائٹی پر برا اثر پڑے گا۔

اس طرح بعض لوگ ایسے پیشے اختیار کر لیتے ہیں یا اشیاء کی صنعت سے وابستہ ہو جاتے ہیں جو معاشرے کی بربادی کا باعث بنتے ہیں اسلئے کہ جب ایسی اشیاء جن پر زندگی کا مدار نہ ہو، معرض وجود میں آجاتے ہیں تو ان کی کھپت کی بھی ضرورت پڑ جاتی ہے اور لوگوں کو اس طرف متوجہ کرنے کے لئے مہم بازی کی جاتی ہے عوام کیلئے ذرائع آمدنی کی فطری راہیں مسدود ہو جاتی ہیں۔

یہ نکتہ آج کل کے زمانہ میں توجہ کا مستحق ہے اس لئے کہ بہت سی اشیاء کو صرف پروپیگنڈا اور تشہیر کے ذریعے انسان کی بنیادی ضروریات میں داخل کیا جا رہا ہے اس طرح ایک مصنوعی پیاس پیدا کی جا رہی ہے۔

شاہ صاحب فرماتے ہیں:۔

وان تکسبوا بعصارة الخمر و صناعة الا صنام کان ترغیبا للناس فی استعمالها علی الوجه الذی شاع بینهم فکان سببا لهلاکهم فی الدین فان وزعت المکاسب واصحابها علی الوجه المعروف الذی تعطیه الحکمة وقبض ایدی المکتسبین بالا کساب قبیحة صلح حالهم.(۱۴۸)

﴿ترجمہ﴾ اگر لوگ شراب نچوڑنے اور مجسمہ سازی وغیرہ سے روزی کمانے لگیں تو، عام لوگوں میں اشیاء کی ترغیب پیدا ہوگی اور یہ دین کے معاملے میں ان کی ہلاکت کا سبب بنے گی اور اگر حکمت کے معروف طریقوں کے مطابق پیشوں اور پیشہ وروں کی تقسیم کا انتظام کیا جائے اور بُرے پیشوں پر پابندی لگائی جائے تو ان کی حالت درست ہو جائے گی۔

حاصل اس اقتباس کا یہ ہے کہ لوگوں کو حاجات انسانی سے متعلق پیداوری

پیشے اختیار کرنے کی ترغیب دی جائے اور غیر صرفی پیداوار کی پیشہ اختیار کرنے والوں کی حوصلہ شکنی کی جائے تا کہ انسان صلاحیتیں مخرب ، اخلاق اشیاء کی پیداوار میں صرف ہونے کے بجائے۔ صرف حاجت انسانی کی تکمیل میں صرف ہوں اور یوں معاشی انحطاط سے بچاؤ کا سامان ہو۔

شاہ صاحب کی نظر میں سود کی حرمت:

شاہ صاحب معاشرے کیلئے سود قاتل خیال کرتے ہیں اس ضمن میں آپ فرماتے ہیں:۔

''واضح رہے کہ سود حرام ہے، یہ بھی قمار (جوا) کی طرح لوگوں کے مالوں کو زبردستی اچک لیتا ہے، اس کی تہہ میں جہل، امید باطل کو حرص و دھوکہ فرمارہتا ہے اور اس میں امداد باہمی تعاون کا ادنیٰ سا بھی دخل نہیں اور حرام ہے، اس کا مدار ظلم پر ہے اس لئے کہ اس قسم کے قرض لینے والے عام طور پر مفلس اور مضطر ہوتے ہیں، وہ بیشتر مدت تعین پر رقم ادا کرنے سے کوتاہ رہتے ہیں اور یہ ''سود در سود'' کے نام سے بڑھتا رہتا ہے جس قوم یا ملک میں یہ بے محنت روپیہ رقم حاصل کرنے کا رواج جڑ پکڑ جاتا ہے۔ وہاں عوام کی ذرائع آمدن کی فطری راہیں بند ہو جاتی ہیں معاملات میں اس سے زیدہ باریک اور پیچیدہ دوسرا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ جس میں ظاہری نفع کی صورت میں حقیقی تباہی و بربادی مضمر ہے'' (۱۴۹)

شاہ صاحب نے حرمت سود کے جو مضمرات بیان کئے ہیں۔ وہ محتاج بیان نہیں ، البتہ وضاحت کے طور پر ان امور کو یوں سلسلہ وار طریقہ بیان کیا جا سکتا ہے۔

۱) سود دراصل وہ قرض ہے جس میں مقروض اس بات کا پابند ہوتا ہے کہ وہ قرض خواہ (سود خور) اصل

زر سے زیادہ اور بہتر مقدار میں واپس کرے، یہ حرام اور باطل ہے۔

۲) قرض عام طور پر وہ لوگ لیتے ہیں جو مفلس ہوں اور اپنی حاجت کسی اور ذریعے سے پوری نہیں کر سکتے لہٰذا مجبور ہو کر وہ سود پر رقم لے لیتے ہیں۔

۳) اکثر مقروض، وقت پر سود کی اصل رقم کی ادائیگی نہیں کر سکتے اور اس طرح ان کا قرض بڑھتا جاتا ہے جس سے ساری عمر خلاصی ممکن نہیں ہوتی۔

۴) سود لینے اور دینے والوں کے درمیان سخت عداوت اور نفرت کا تعلق ہوتا ہے، جو باہمی منافرت پر منتج ہوتا ہے۔

۵) سودی کاروبار کا انسانی اخلاق پر برا اثر پڑتا ہے، سودی کاروبار کرنے والے افراد میں مروت کی روح بالکل مرجاتی ہے۔

۶) سود ارتکاز دولت کا بنیادی عامل ہے جس سے ملکی پیداواری ذرائع پر براہ راست اثر پڑتا ہے اور معیشت کی بربادی کا بڑا محرک ثابت ہوتا ہے۔

سود کے استحصالی نتائج:

سود کے ضمن میں یہ بیان کرنا حسب حال ہے کہ یہ ارتکاز دولت کا بڑا سبب ہے قوم کے اکثر افراد کے مجتمع سرمایہ سے جو نفع حاصل ہوتا ہے وہ اس سودی نظام کی وجہ سے سارے کا سارا سرمایہ چند افراد کی ملکیت میں چلا جاتا ہے وہ لوگ بینک سے قرضے لے کر بڑی بڑی تجارتیں کرتے ہیں۔

اس طرح ایک طرف تو سرمایہ دار نفع کی بڑی مقدار حاصل کر کے غریب عوام کا استحصال کرتے ہیں اور دوسری طرف وہ بازار کے حکمران بن جاتے ہیں، وہ مصنوعی قحط اور گرانی پیدا کرتے ہیں یوں ملکی سطح پر ایک ہی طبقہ سرمایہ کا مالک بن جاتا ہے اور معاشی توازن بگڑ کر رہ جاتا ہے۔

ہمارے ملک عزیز کا بھی یہی حال ہے اس وقت یہ ملک ۱۲۵ ارب روپے کا مقروض ہے۔ اس پر ہمیں نو ارب سالانہ سود دینا پڑتا ہے اور برآمدات سے حاصل ہونے والے زر مبادلہ کا ۳۳ فیصد ان ادائیگیوں (بیرونی قرضے) میں صرف ہو جاتا ہے لہٰذا ہمیں داخلی اور خارجی سطح پر سود ترک کر دینا چاہئے۔

اس مسئلہ پر مدت دراز سے عالم اسلام کے مختلف حصوں میں سوچا جا رہا ہے اور اس پر بہت سا علمی اور تحقیقی کام ہو چکا ہے سب سے جامع، مفصل اور تحقیقی رپورٹ وہ ہے جو اسلامی نظریاتی کونسل نے علماء کرام اور ماہرین معاشیات (و بنکاری) کی مدد سے مرتب کی ہے۔ اس نوع کی تمام کاوشوں کو سامنے رکھنے کے بعد یہ بات تقریباً عام تجاویز میں مشترک نظر آتی ہے۔

جوا بازی:

جوا درحقیقت تعاون باہمی کے بجائے دوسروں کے مال کو چھین کر لینے کی خواہش کا نام ہے، اس میں بھی حرمت کے وہی اسباب پائے جاتے ہیں جو قوم میں موجود ہیں۔ بلا محنت اور گھنٹوں میں کروڑ پتی بننے کی خواہش بے عملی کا ذریعہ بن جاتی ہیں۔

شاہ صاحب میسر یعنی جوا بازی کی حرمت کے فلسفہ کو یوں بیان کرتے ہیں:۔

> اِعلم ان المیسر سحت باطل لانہ اختطاف لاموال الناس عنھم معتمد علی اتباع الجھل و حرمتوا میۃ باطلۃ و رکوب غدر تبعثہ ھذا علی الشرط رلیس لہ دخل فی المتمد و التعاون (۵۰)

> ترجمہ: ''یاد رہے کہ جوا حرام اور باطل ہے اس لئے کہ یہ لوگوں سے ان کے اموال چھین لینے کا دوسرا نام ہے، اس کا دار و مدار جہالت، حرص اور باطل خواہشات اور دھوکہ وفریب پر ہے جو انسان کو اس پر آمادہ کرتے ہیں حالانکہ اسے نظام تمدن کی اصلاح اور باہمی تعاون میں کچھ دخل نہیں ہوتا''

پاکستان میں بھی پرائز بانڈز، لاٹری کی مختلف شکلیں، ریس پر کھیلوں پر جان بین کی طرف سے ہار جیت پر انعامات مقرر کرنا جوابازی کی شکلیں ہیں، لہذا یہ پیشے بھی تباہی کے موجب ہیں اور ایسے کاروبار سے کلیتہ احتراز برتا جائے اور حکومت ایسے کاروبار پر پابندی لگائے۔

رشوت:

شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ حکومت کے اہل کاروں کی ضروریات کی تکمیل اور پھر ان کے آمد و خرچ پر کڑی نگرانی بہت ضروری ہے اس لئے کہ اس طرح نہ کرنا رشوت کے رواج کا باعث بنتا ہے اور رشوت کے رواج سے مفاسد کا دروازہ کھل جاتا ہے۔

دھوکہ دہی اور غیر صحت مندانہ مسابقت:

شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ معاشرے کو تنزل سے بچانے کے لئے ضروری ہے کہ افراد کے باہمی معاملات کو عدل اور توازن کی بنیاد پر قائم رکھنے کی کوشش کی جائے اور ایسے امور کو قانوناً ممنوع قرار دیا جائے جو معاشرتی اور معاشی مفاسد کا باعث بنتے ہوں۔

اس سلسلہ میں شاہ صاحبؒ نے درج ذیل امور کا ذکر فرمایا ہے:۔

۱) اس قسم کے تمام معاملات کو ممنوع قرار دیا جائے جن میں جوئے اور قمار کی روح کسی نہ کسی شکل میں موجود ہو، شاہ صاحبؒ نے اس ضمن میں جاہلیت کی بعض ''بیوع'' جنھیں اسلام نے ناجائز قرار دیا ہے،

مثلاً ''بیع مزابنہ، محاقلہ، بیع الصبرہ، بیع الحصاۃ

اور بیع العربان'' (۱۵۱)

کا ذکر فرمایا:

۲) ایسے معاملات جو (تنازعات) کا موجب ہوں مثلاً مال، پیمانہ، اور قیمت کا متعین نہ ہونا ایسی مشروط ''بیع'' جو بعد میں جھگڑے کا باعث بنے،

۳) نظام مدنیت میں خلل انداز ہونے والے عقود و معاملات، مثلاً کسی کی بیع میں دخل دینا، بولی دینا، محض نرخ بڑھانے کی غرض سے بولی دینا، ناواقف افراد کے کے درمیان ایسی دلالی کرنا جو یقینی کے نقصان اور قیمتوں میں اضافے کا باعث بنے۔

۴) ایسی اشیاء کی خرید و فروخت اور ان پر قبضہ جمانا جو اللہ تعالیٰ نے تمام انسانوں کے مشترکہ فائدے کیلئے مباح قرار دی ہیں جیسے شکار، پانی (سمندر، دریا) کھلی چراگاہ کی گھاس وغیرہ۔

خلاصہ:

یہ مذکورہ خرابیاں وہ ہیں جو معاشرے کو بے جان کردیتی ہیں اس لئے ان پر کڑی نظر رکھنا ضروری ہے ان سے بچاؤ حاصل کرنے کی تدابیر ذیل میں ملاحظہ فرمائے۔

معاشی انحطاط سے بچاؤ کی تدابیر:

ایسے جملہ امور جو معاشرے میں شریفانہ زندگی اور معاشی توازن کا سامان بن رہے ہوں شاہ صاحبؒ ان کی روک تھام پر زور دیتے ہیں، وہ فرماتے ہیں:

> ''اعلم ان النبی ﷺ نظر الی عادات العجم و تعمقاتھم فی الاطمئنان بلذات الدنیافحرم روسھا واصولھا وکرہ مادون ذلک''
>
> ترجمہ۔ ''یاد رہے کہ نبی ﷺ نے عجم کی عادات اور دنیاوی لذتوں میں اطمینان کے حصول کے لئے ان کے تعلقات پر نظر کی تو ان کی اصل اور جڑ کو بالکل حرام قرار دیا اور اس کے علاوہ (دوسرے درجہ کے امور) کو ناپسند اور مکروہ قرار دیا''۔ (۱۵۲)

مندرجہ بالا عبارت سے احکام شرعیہ کی علت وحرمت کی حکمت پر روشنی پڑتی ہے اس کی مزید وضاحت آئندہ صفحات میں آئے گی۔

معاشی انحطاط سے بچاؤ کے حوالہ سے درج ذیل نکات قابل لحاظ ہیں :۔

۱) مسلسل احتساب :

اس ضمن میں شاہ صاحبؒ ایک قابل عمل اور موثر اصول پیش کرتے ہیں جو بگڑی ہوئی معیشت کو درست کرنے کیلئے ایک ''مستقل احتسابی'' عامل کی حیثیت سے بروئے کار لایا جاسکتا ہے اور وہ یہ کہ جو اشیاء بذات خود تو حرام نہ ہوں تاہم حرام اور ظالمانہ امور کے وجود میں لانے کا باعث بن رہی ہوں ان کو بھی کنٹرول کرنا لازمی ہے۔

شاہ صاحب فرماتے ہیں :

''ومنها انه اذا امر بشئی حتما اقتضی ذلک ان یرغب فی مقدماته ودواعیه واذا نهی عن شئی حتما اقتضی ذلک ان یسد ذرائعه و یخمل دواعیه ولما کان شرب الخمر اثما وجب ان یقبض علی ایدی العصارین وینهی عن الحضور علی المائدة التی فیها الخمر ولما کان القتال فی الفتنة اثما وجب ان ینهی عن بیع السلاح فی الفتنة'' (۱۵۳)

ترجمہ: ''(استنباط کے اصول میں سے ایک) یہ ہے کہ جب کسی چیز کے کرنے کا حکم فرض موکدہ کے طور پر دیا جائے تو یہ ضروری ہے کہ اس کے دواعی اور مقدمات کی بھی ترغیب وتحریض دلائی جائے اسی طرح جب کسی فعل کو ممنوع قرار دیا جائے تو اس کے اسباب وذرائع کا انسداد بھی ضروری ہے مثال کے طور پر شراب کا پینا گناہ کبیرہ ہے اس لئے ضروری ہوکہ کشید شراب کا پیشہ حرام قرار دیا جائے''

اور یہ کہ جس ضیافت میں شراب پی جا رہی ہو اس میں شرکت ممنوع ہو اس طرح جب کہ فتنہ وفساد کے وقت قتل عام ہو جائے تو اس دوران اسلحہ کا بیچنا حرام ہو۔

اس کا حاصل یہ ہے کہ خلافت ظاہرہ حرام افعال اوران کی دواعی پر کڑی نظر رکھے، اوراحتسابی عمل کو مسلسل جاری رکھے تاکہ معاشرے میں نہ صرف ظالمانہ افعال کی بندش ہو، بلکہ اس کے محرکات ودواعی کا قلع قمع ہو۔

۲) ظلم کا مٹانا:

امام لہذا اس ظالمانہ نظام کو مٹانے اور سنت راشدہ کو قائم کرنے کیلئے بعض اوقات مناسب اقدام و زواجر کے نفاذ پر زور دیتے ہیں اسلئے کہ غلط رسومات کے داعی اوران کے ذریعے مفادات حاصل کرنے والے اشخاص صرف زبانی نصیحت سے راہ راست پر نہیں آتے بلکہ انھیں راہ راست پر لانے کیلئے سخت اقدامات کرنے پڑتے ہیں ایسے میں نیک لوگوں کی خاموشی وصلح پسندی انکے دل ودماغ میں راسخ نہیں ہوگا۔



باب پنجم

فصل ہفتم

شاہ ولی اللہ صاحبؒ کی نظر میں معیار زندگی

زندگی کے معیار کے اصول:

انسان فطری طور پر لالچی ہے زندگی کی ضرورتیں اسے کتنے ہی اچھے طریقے سے مہیا ہو رہی ہوں پھر بھی ھل من مزید (کیا کچھ اور بھی ہے؟) کی خواہش کرتا ہے اس لالچ کی وجہ سے وہ دوسروں کے حقوق چھینتا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کچھ لوگ تو زندگی کی ضرورتیں فراوانی سے حاصل کر لیتے ہیں اور کچھ ان سے محروم رہ جاتے ہیں۔ شاہ صاحبؒ کے خیال میں اس طرح قیصر و کسریٰ کے (سرمایہ دارانہ) نظام کو پھلنے پھولنے میں مدد ملتی ہے اس لئے زندگی کا ایک معیار مقرر ہونا ضروری ہے۔ تاکہ معاشرے میں رہن سہن کا توازن نہ بگڑ جائے آپ کی رائے میں معیار زندگی کے لئے یہ باتیں بہت بنیادی ہیں۔

(۱) معاشرے میں خوشحالی لانے کے لئے یہ ضروری ہے کہ بنیادی ضرورتوں میں توازن ہو، نہ افراط ہو نہ تفریط۔ اس کو شاہ صاحبؒ "اعتدال" کا نام دیتے ہیں۔ (۱۵۴)

(۲) یہ اعتدال تب برقرار رہ سکتا ہے جب معاشرہ میں ہر شخص کو زندگی کی بنیادی ضرورتیں پوری پوری ملیں اور بغیر کسی دقت کے مہیا ہوں یعنی ہر انسان ضرورت کے مطابق پوری اور اچھی خوراک حاصل کرے۔ پہننے کے لئے بہتر طور پر اسے ہر موسم کے لحاظ سے کپڑا میسر ہو، آرام دہ مکان میں رہے اور اپنے پسند کی عورت سے آسانی سے نکاح کر سکے۔ معیار زندگی کی ان آسانیوں کے لئے شاہ صاحبؒ رفاہیت کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں۔

(۳) بنیادی ضرورتوں میں اعتدال (درمیانہ روی) اور رفاہیت (بہتر اور آسانی سے حصول) معیار

زندگی کے پہلے دو بنیادی اصول یک تیسرے اصول کے محتاج ہیں۔ وہ یہ ہے کہ لوگوں میں معیار زندگی کو برقرار رکھنے کے لئے یا خود شعور ہو یا پھر ایسا نظام ہو جس کے ذریعے خود بخود لوگوں کی ضرورتوں کا معیار برقرار رہے تاکہ اعتدال کا انتظام اور "رفاہیت" کا اہتمام ہو سکے۔

اس کیلئے شاہ صاحبؒ نے "سنت عادلہ" کی اصطلاح استعمال کی ہے یعنی انسانی ضرورتیں مہیا کرنے کی لوگوں کو ضمانت دی جائے اور ایسے اصول وضع کئے جائیں جن کی رو سے ہر شخص کی بنیادی ضرورت پوری ہوتی رہے اور عدل عمرانی (معاشرتی انصاف) قائم ہو سکے۔

چنانچہ اعتدال، رفاہیت اور سنت عادلہ معیار زندگی کی بنیاد ہیں ان اصولوں کے مطابق جس شخص کو زندگی کی ضرورتیں مل گئیں گویا زندگی کا لطف اس نے اٹھا لیا۔

شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں:۔

> اے انسانو! جسے خدا نے ایک مکان دے رکھا ہو جس میں وہ آرام سے رہے اتنا ہی پانی جس سے سیراب ہو۔ اتنا کھانا، جو اس کے لئے کافی ہو اتنا کپڑا جس سے وہ تن ڈھانپ سکے ایسی بیوی جو رہن سہن کی جدوجہد میں مدد دے سکتی ہو یاد رکھو دنیا کا لطف اس نے اچھی طرح اٹھالیا۔ (۱۵۵)

خوراک انسان کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اس کے جسم میں جونہی زندگی کے آثار پیدا ہوتے ہیں اسے خوراک کی ضرورت ہوتی ہے اور جب وہ پیدا ہوتا ہے تو اس کی پہلی طلب "خوراک" (یعنی دودھ) ہوتی ہے اس میں ذرا سی تاخیر سے وہ ایڑیاں رگڑنا اور رونا چلانا شروع کر دیتا ہے جوں جوں اس کی عمر بڑھتی ہے اور وہ خود خوراک "حاصل" کرنے کے قابل ہو جاتا تو اس کے لئے وہ جدوجہد کرتا ہے یہاں تک کہ اگر وہ مجبور ہو جائے تو حرام ذرائع کی طرف اس کا میلان ہونا شروع ہو جاتا ہے چنانچہ معاشرے میں سب سے پہلی بات کا خیال یہ رکھا جانا چاہیے کہ لوگوں کو کھانے پینے کی چیزیں ان کی ضرورتوں کے مطابق ملیں

اور آسانی سے مہیا ہوں۔شاہ صاحبؒ کا خیال ہے کہ کھانے پینے کی چیزوں کا انسان کے جسم، اس کے دفاع اور پھر ایمان پر گہرا اثر پڑتا ہے اس لئے یہ ضروری ہے کہ خوراک مہیا کرنے میں خیال رکھا جائے۔لوگوں کو کھانے کے لئے نہ تو اتنا کم ملے جس سے ان کی صحت متاثر ہو اور ضرورت پوری نہ ہو اور نہ اتنا زیادہ ملے اور نہ اس قدر مرغن کہ اس کا معدے پر بھی خراب اثر ہو کیونکہ جب اعصاب پر جو اس قسم کے کھانے کا اثر ہوگا تو اعمال پر بھی اثر ضرور ہوگا۔ (۱۵۶)

چنانچہ ضرورت سے کم خوراک ملنے پر انسان ندیدہ (چندرا) اور لالچی ہو جاتا ہے اس ندیدگی کے کئی واقعات نقل کئے ہیں اور اس قسم کی نادیدگی کو شیطانی عمل کہا ہے (۱) دوسری طرف مرغن غذاؤں اور کھانوں میں طرح طرح کے تکلفات کو آپ نے نے قیصر و کسریٰ کے نظام میں امراء کی نشانیاں میں شمار کیا ہے آپ آنحضرت ﷺ ہی کے عملی کو نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:

> آنحضرت ﷺ عرب میں مبعوث ہوئے یہاں کے لوگوں کی (کھانے پینے کے معاملے میں) عادتیں درمیانی (اعتدال پر) تھیں یہ لوگ عجمیوں کی طرح تکلفات نہیں کرتے تھے (۱۵۷)

چنانچہ خوراک کے معاملے میں شاہ صاحب کی گفتگو کا خلاصہ یہ ہے کہ ہر شخص کو اس کی ضرورت کے مطابق خوراک مہیا کی جائے جو مرغوب اور اچھی ہو اور تکلفات سے بالاتر ہوں۔

لباس اور دوسرے استعمال کی چیزیں:

لباس انسان کی بنیادی ضرورت ہے۔اس ضرورت کے ساتھ وہ چیزیں بھی شامل ہوتی ہیں جو عام استعمال میں آتا ہے شاہ صاحبؒ اس بنیادی ضرورت کی اہمیت کو مختلف انداز سے بیان کرتے ہیں۔وہ چاہتے ہیں کہ نہ تو معاشرہ بدوؤں اور جنگلی لوگوں کا سا نظر آئے اور نہ اس میں اتنی تفریق ہو کہ لوگ لباسوں اور زیبائش میں گم ہو جائیں۔

آپ کے نزدیک لباس کا کم از کم معیار یہ ہے کہ ہر شخص کو ایسا لباس میسر ہو جو گرمی اور سردی سے اسے بچائے۔ (اتنے ہوں) جن کو اپنی ضرورت کے مطابق استعمال کر سکے۔ آپ ایسی صورت کے سخت خلاف ہیں کہ معاشرے میں چند لوگوں کے تو چیتھڑے لگے ہوئے ہوں اور چند لوگ ریشم کے لمبے لمبے اور خوش نما لباس پہنے ہوں جب آپ لباس زینت اور دوسری استعمال کی چیزوں پر بحث کا آغاز فرماتے ہیں تو پہلا جملہ ہی یہ تحریر کرتے ہیں کہ:

آنحضرت ﷺ نے عجم (قیصر و کسریٰ کے علاقے) کے لوگوں کی عادتوں لباس وغیرہ میں ان کے تکلفات اور لذتوں پر نظر ڈالی تو چیز (اس عدم توازن کی) جڑ نظر آئی سے حرام کر دیا اور جس میں نسبتاً کم تکلف تھا اس کو مکروہ قرار دے دیا۔

(۱) چنانچہ بہت زیادہ شان و شوکت دکھانے والا لباس اسی زمرے میں آتا ہے۔

(۲) اگر معاشرے میں کچھ لوگ ایسے ہوں جو بہترین لباس نہ پہن سکیں تو دوسروں کو محض اس وجہ سے اچھا لباس (استطاعت کے باوجود) پہننا چاہیے کہ محروموں کی اس سے دل شکنی ہوگی۔

(۳) وہی لباس کے حصول کی بات تو ایسا لباس جو انسان کیلئے ضروری ہو اور ہر شخص کو مہیا کیا جانا چاہئے۔

عورتوں کے زیورات لباس ہی کا حصہ ہیں عورتوں کے ضروری زیبائش کی حد تک تو اس کی اجازت دی گئی ہے۔لیکن نمائش کے لئے زیور پہننے کی شاہ ولی اللہ سخت مخالفت کرتے ہیں اور آنحضرت ﷺ کا یہ قول نقل فرماتے ہیں کہ:

"خبردار رہو" تم میں سے جو عورت نمائش کے لئے زیور پہنے گی اس
کو اسی کے ساتھ عذاب دیا جائے گا۔ (۱۵۸)

لباس کے علاوہ گھر میں سامان اور فرنیچر شاہ صاحبؒ کے نزدیک صرف ضرورت کے مطابق ہونا چاہیے

اگر ضرورت سے زیادہ سامان گھر میں رکھا گیا تو وہ محض دکھاوے اور نخرے کی لئے ہوگا گھر میں بستروں کی مثال دیتے ہوئے آپ آنحضرت ﷺ کا یہ قول نقل فرماتے ہیں کہ:۔

ایک بستر مرد کے لئے دوسرا اس کی بیوی کے لئے اور تیسرا مہمان کے لئے اور چوتھا شیطان کے لئے۔(۱۵۹)

اس سے مراد ہرگز نہیں ہے کہ گھر میں تین ہی بستر ہوں مقصد یہ ہے جس قدر سامان کی (واقعی) ضرورت ہو وہ رکھا جائے فاضل سامان رکھنے سے دوسروں کے حقوق متاثر ہوتے ہیں۔

مکان:

مکان انسان کی انتہائی اہم ضرورت ہے، رہنے کو تو حیوان بھی غاروں میں مزے سے زندگی گزارتے ہیں اور چرند پرند بھی بڑے اچھے گھر بنا لیتے ہیں اور انسان بھی موسم سے بچنے کیلئے گھاس پھونس کے مکان بنا لیتا ہے اور جس میں زندگی گزار لیتا ہے

لیکن شاہ صاحبؒ کے نزدیک رفاہیت کا تقاضا یہ ہے کہ انسان کے مکان کا کم از کم معیار یہ ہے کہ وہ کشادہ (کھلا) ہو گرمی کی تپش سے پوری طرح محفوظ ہو، بارش اور طوفان کے اثرات کا اس میں خیال گیا ہو سردی سے حفاظت کا سامان اس میں موجود ہو۔ (۱۶۰)

یہ انسان کے مکان کم سے کم ضرورت جو ہر انسان کو مہیا ہونی چاہیے۔ اب یہ مکان کی تعمیر کا اندازہ کیا ہو اس میں شاہ ولی اللہؒ اعتدال کے قائل ہیں مکان نہ تو لوگوں کے پاس ایسے ہوں کہ وہ اس معیار سے گر جائیں اور نہ اتنے بلند و بالا ہوں کہ حویلیاں اور محلات معلوم ہوں اس لئے کہ بلند و بالا مکانات کی بلاضرورت تعمیر شاہ صاحبؒ کے نزدیک قیصر و کسریٰ کے نظام کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے۔

آپ فرماتے ہیں کہ ایک طرف تو عوام کو اس نظام میں جانوروں کی طرح رکھا جاتا ہے اور ان کے آرام کا کوئی خیال نہیں کیا جاتا دوسری طرف امراء بڑے بڑے محلات میں مصروف رہتے ہیں مکان کی تعمیر میں

شان وشوکت دکھانا بے ضرورت اس میں نمائشی چیزیں بنانا قومی دولت کو بے مصرف کام میں خرچ کرنا ہے۔

شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں آنحضرتﷺ کے دور میں (قیصر وکسریٰ کے سرمایہ دارانہ نظام میں) لوگ بڑی بڑی عمارتیں بناتے تھے ان کی بے ضرورت نمائش کرتے تھے اور اس میں کافی پیسہ برباد کرتے تھے اور پھر اس پر فخر بھی کرتے تھے،

چنانچہ آنحضرتؐ نے اس طرح بلا ضرورت قومی دولت ضائع کرنے کی سخت ممانعت فرمائی اور اس بیماری کا علاج یہ فرماتے ہوئے کیا کہ:

"مومن اس دنیا میں ایسا کوئی خرچ نہیں کرتا جس کا اسے فائدہ نہ ہو اور اسے اس کا بدلہ نہ ملے (چنانچہ جب مکان بناتا ہے تو وہ) ضروری تعمیر کے علاوہ بے فائدہ خرچ نہیں کرتا پھر آنحضرتؐ کا یہ قول بھی نقل فرماتے ہیں کہ "ایسی عمارت جس کی ضرورت ہو بناؤ اس کے علاوہ (عالی شان اور بلا ضرورت) تعمیرات اپنے بنانے والے پر وبال بن جاتی ہیں''۔(۱۶۱)

شاہ ولی اللہؒ اس کے علاوہ آنحضرتﷺ کے دوسرے اقوال بھی نقل فرماتے ہیں اور اپنی گفتگو سے یہ ثابت کرتے ہیں کہ مکان انسان کی بنیادی ضرورت ہے۔رفاہیت کے اصولوں پر معاشرے کے ہر شخص کو آرام دہ مکان مہیا کیا جانا چاہیے اور اعتدال کے اصول پر افراط وتفریط سے پرہیز کرنا ضروری ہوگا ورنہ قیصر و کسریٰ کے نظام کی باتیں معاشرے میں پھولیں گی۔

جنس:

شاہ صاحبؒ کی رائے میں جنسی خواہش تمام خواہشات سے بڑی ہوتی ہے انسان کے دل پر اس کا غلبہ جلدی اور زیادہ ہوجاتا ہے جس کی وجہ سے انسانوں میں ہر طرح کی برائیاں پیدا ہوجاتی ہیں اس کی خواہش کی تسکین مرد اور عورت دونوں کے لئے یکساں ضروری ہے کیونکہ اس کی تسکین کا اگر صحیح طرح سے انتظام نہ ہو تو

فرد (مرد اور عورت) کے لئے نفسیاتی اور اور جنسی مسائل کھڑے ہو جاتے ہیں جس کا پہلا اثر خاندان پر پڑتا ہے اور پھر اس کے اثرات پورے معاشرے میں پھیل جاتے ہیں اس لئے انسانی معاشرے میں " صحیح طور پر جنسی تسکین فراہم کرنے کا انتظام کرنا ضروری ہے" شاہ صاحبؒ نے مختلف ابواب میں اس مسئلے پر کافی بحث کی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ (جنس کے) اس فطری تقاضے کا پورا ہونا ضروری ہے لیکن حیوانی ماحول میں اس کے لئے کوئی ضابطہ نہیں ہوتا لیکن انسانی معاشرے میں جنسی تسکین کے ساتھ اس کو بامقصد زندگی کیلئے استعمال کیا جاتا ہے اخلاق اور مذہب ہمیشہ اس معاملے میں سامنے آتے ہیں اور وہی مذہب کامیاب رہا ہے جس نے اس بنیادی ضرورت کی تسکین کا بہتر اور اچھا حل پیش کیا۔

اس سلسلے میں آپؒ اسلام اور آنحضرت ﷺ کی تعلیمات کو شرعی معاہدہ (نکاح) اور اس ضرورت کی تسکین کے لئے اہم کردار ادا کرتا ہے۔ اس میں ایک دوسرے کی پسند بھی شامل ہے ایک دوسرے (بگاڑ کی صورت میں) الگ ہو جانے کے اختیارات بھی۔ ایک دوسرے پر خصوصی ذمہ داریاں بھی۔ اس معاشرتی معاہدے یعنی نکاح کی ایک وجہ مرد اور عورت کے الگ الگ مزاج (نفسیات) اور اس کی خصوصیات بھی ہیں مزاج کی دو مختلف خصوصیتیں جب ایک جگہ (شادی کے معاہدے سے) جمع ہو جاتی ہیں تو بامقصد لوگوں کی ابتدا ہوتی ہے چنانچہ عورت، مرد کے بغیر نامکمل ہے اور مرد عورت کی ضرورت کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اس لئے یہ جنسی تسکین اس طرح پوری ہو کہ جو عورت جس مرد کو (بشرطیکہ دو ایک دوسرے کیلئے حرام نہ ہوں) پسند کرے یا جو مرد جس عورت کو پسند کرے دونوں ایک دوسرے کی عادتوں اور خیالات سے بھی واقف ہوں تو انھیں نکاح (کے معاشرتی معاہدے) میں منسلک کر دیا جائے اگر ایسا نہ کیا گیا تو ملک اور معاشرہ میں فتنہ اور فساد پیدا ہونا شروع ہو جائیں گے۔ (۱۶۲)

معاشی انحطاط اور اس کے بچاؤ کی تدابیر: شاہ صاحبؒ کی نظر میں

شاہ ولی اللہؒ نے جس طرح انسانی معاشرہ کی مختلف منازل کی تشکیل اور ترقی کے اسباب پر گفتگو کی ہے

اسی طرح آپ ان معاشرتی اور معاشی امراض کی نشان دہی بھی کی ہے جو اجتماع انسانی کو اندر ہی اندر دیمک کی طرح چاٹ جاتے ہیں۔

شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ معاشرہ کے حالات یکساں نہیں رہتے۔ بلکہ اس میں ارتقاء تنوع کا سلسلہ جاری رہتا ہے جو قانون فطرت کے عین مطابق ہے معاشرہ میں موجود افراد ارتقاء سے حظ کرتے ہیں اور روز مرہ حاجات کی تسکین میں اچھی سے اچھی اور نفیس ترین اشیاء کا انتخاب کرتے ہیں۔ اشیاء میں نفاست کی دوڑ غیر منتہی ہے لہذا شاہ صاحب انسان کی بنیادی ضروریات لباس مکان، خوراک اور دوسری روزمرہ حاجات کے بارے میں حد اعتدال کی تعین اور مناسب حد بندی کرتے ہیں لباس کے بارے میں شاہ صاحب کی تعلیمات ہیں ایسے جملہ امور جو معاشرہ میں شریفانہ زندگی اور معاشی عدم توازن کا سامان بن رہے ہوں شاہ صاحب ان کی روک تھام پر زور دیتے ہیں وہ فرماتے ہیں۔

اعلم ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم نظر الی عادات العجم و تعمقاتھم فی الاطمئنان بلذاتالدنیا فحرم روسھا و اصولھا و کرہ مادون ذلک۔

ترجمہ: یاد رہے کہ نبی کریم حضور ﷺ نے عجم کی عادات اور دنیاوی لذتوں میں اطمینان کے حصول کے لئے ان کے تعلقات پر نظر کی تو ان کی اصل اور جڑ کو بالکل حرام قرار دیا ہے اور اس کے علاوہ (دوسرے درجہ کے امور) کو ناپسند اور مکروہ قرار دیا ہے۔

۱) لباس:

لباس سے مقصود بدن ڈھانپنا اور زینت حاصل کرنا ہے فخر کے لئے استعمال نہ کریں۔

فمن تلک الرئوس اللباس الفاخرہ فان ذالک اکبر

همهم و اعظم فخرهم .قال عليه السلام لا ينظر الله يوم القيامة الى من جرازاده بطرا و قال عليه السلام فى حق المرء من لبس الجنس المسغرب الناعم من التياو من لبس الحرير فى الدنيا لم يلبسه يوم القيامة و ايضانهى النبى ﷺ عن لبس الحرير و الديبا ج و عن لبس القسى والميا ئر والارجوان ورخص فى الصبعى نائو ثلاث (۱۶۳)

ترجمہ: ان پر تکلیف اشیاء میں سے ایک لباس فاخرہ ہے لباس سے مقصود بدن ڈھانپنا اور زینت حاصل کرنا ہے جب کہ کثر لوگوں کا مقصود یہ نہیں ہوتا بلکہ لوگ سب سے زیادہ فخر اسی پر کرتے ہیں اور اس سے مقصود اپنی مال داری کی نمائش کرنا رہ جاتا ہے۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا قیامت کے روز اللہ تعالیٰ اس شخص کی طرف نظر رحمت نہیں فرمائے گا جو تکبر کے باعث تہمند کو گھسیٹتا چلے لباس میں بے جا تکلف کی ایک علامت یہ بھی ہے کہ کپڑے کی نرم عمدہ اور نادر ریشم کی قسم استعمال میں لائی جائے چنانچہ حضور ﷺ نے فرمایا جس نے دنیا میں ریشم کا لباس پہنا، قیامت کے دن اسے نہیں پہنایا جائے گا یہ بھی آنحضرت ﷺ سے مروی ہے آپ نے حریر و دیباج، قیسی، میاثر اور ارغوان جیسے قیمتی کپڑوں کے استعمال سے منع فرمایا ہے البتہ دو یا تین انگلیوں کے برابر ایسا کپڑا استعمال کرنے میں رخصت ہے۔

واضح ہو کہ نہایت تیز زعفرانی لباس جس میں فخر ونمود کا پہلو غالب ہو ممنوع ہے اس طرح روزمرہ استعمال کے برتن میں بھی اعتدال مناسب ہے۔ سونا چاندی کے برتن استعمال کرنا حرام ہے۔ لباس سادہ ہو،

پھر یہ سادگی صرف لباس تک محدود نہیں ، بلکہ ملبوسات سونا چاندی کے استعمال میں اعتدال کی تعلیم بھی دی گئی ہے۔عورت کے حق میں دونوں اجناس زیورات سونا چاندی اور مرد کے حق میں انگوٹھی کے برابر چاندی کا استعمال جائز ہے لباس میں بے اعتدالی سے کئی مسائل جنم پاتے ہیں۔

۲) گھر کی تعمیرات کی نوعیت:

ایسا گھر ہو جو سردی اور گرمی (موسمی اثرات) سے محفوظ رکھے اور اس کی قضا حسب ضرورت ہو یہ تو بنیادی ضرورت ہے البتہ اس میں زمانہ جاہیت کی طرح بے جا تکلفانہ یا مسرفانہ زیبائش سے شاہ صاحب سختی سے منع کرتے ہیں اور اسے معاشی نقصان خیال کرتے ہیں وہ اس ضمن میں فرماتے ہیں کہ:۔

و منها التطاول في البنيان و تزوين البيوت و زخرفتهافكانوايتكلفون في ذالك غاية التكلف و يبذلون اموالا خطيرة فعالجه النبي ﷺ بالتغليظ الشديد وقال عليه السلام ان الله لم يامرنا ان نكسواالحجارة والطين(۱۶۴)

ترجمہ: ان (اہل عجم) کی ایک بڑی خرابی بلند وبالا عمارات کی تعمیر تھی اور مکانات کو نقش و نگار اور رنگوں سے مزین کرنا تھی وہ اس سلسلہ میں بہت تکلف سے کام لیتے تھے اور گھر کی زینت پر کثیر اموال خرچ کرتے تھے چنانچہ حضور ﷺ نے شدید زجر و توبیخ کے ساتھ اس کی ممانعت کی۔

آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ہر عمارت، عمارت بنانے والوں کے لئے وبال ہے۔ سوائے اس کے جس کا چارہ کار نہ ہو اسی طرح آپ علیہ السلام نے فرمایا اللہ تعالی نے ہمیں مٹی یا پتھر کو (کپڑے یا پردوں) پہنانے کا حکم نہیں دیا۔

اس طرح شاہ صاحبؒ نے دیواروں کی آراستگی وتصویر کشی کے بارے میں تفصیل سے بتایا اور اسے عجمی عادات اور ناپسندیدہ حرکات میں سے شمار کیا جاتا ہے۔

۳) خوراک سے متعلق ہدایات:

خوراک کے معاملے میں صفائی اور صحت کے اصولوں کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے سادہ کھانا سادہ طریقے سے تناول کرنے کے متعلق شاہ صاحب درج ذیل حدیث نقل فرماتے ہیں:۔

''اعلم ان النبی ﷺ بعث فی العرب عاداتھم اوسط العادات ولم یکونوا یتکلفون تکلف العجم والاخذبھا احسن وادنی ان لا یتعمقوا فی الدنیا ولا یعرضوا عن ذکر اللہ''(۱۲۵)

ترجمہ: یاد رکھو! آنحضرت ﷺ کو عرب میں مبعوث کیا گیا جن کی عادات خورد ونوش میں توسط اور میانہ روی تھی وہ لوگ عجمی متمدن اقوام کی عادات کے خوگر ہرگز نہ تھے ان کا طریقہ زندگی سادگی کی وجہ سے بہت عمدہ تھا کیونکہ تکلفات کی وجہ سے انسان عیش پرستی میں مبتلاء ہوکر یاد الٰہی سے غافل ہوجاتا ہے۔

۴) معیار زندگی اور اس میں جادہ عدل:

شاہ صاحب تمدن کی انتہائی حدوں کی نشاندہی کرکے ان دونوں کے درمیان حدمتوسط جو اکثر سماج کے لئے قابل عمل ہو کو اختیار کرنے کی ترغیب دیتے ہیں دراصل لوازمات زندگی سے متعلق شاہ صاحب ایک اصولی بات "البدر البازغہ" میں بیان کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ رفاہیت یعنی معاشی آسودگی کی تین ممکنہ صورتیں اولاً رفاہیت بالغہ، ثانیاً رفاہیت ناقصہ اور ثالثاً رفاہیت متوسطہ ہیں۔ جب افراد انسانی عیش وعشرت

طلبی ورتن آسانی کی زندگی بسر کرنا شروع کر دیتے ہیں اور خوارک، لباس، مکان اور دیگر ضروریات کو پورا کرنے کے لئے زر کثیر خرچ کرتے ہیں اور بے جا تصرفات سے ملک وقوم کی دولت برباد کرتے ہیں پاکستان کی زبان میں وہ VIP کلچر کا شاخسانہ بنتے ہیں تو یہ رفاہیت بالغہ یا ترفہ کا نمونہ ہوتا ہے اور جب لوگ ارتفاعات (لوازمات زندگی) میں اسقدر پست ہوں کہ ان کا معیار زیست اور طریق حیات حیوانوں کی مانند ہو تو وہ لوگ رفاہیت ناقصہ کی حالت میں ہوتے ہیں اور جو لوگ افراط کی طغیانیوں اور تفریط کی تنگیوں سے اپنے دامن کو بچا کر اعتدال وتوازن کی زندگی بسر کرتے ہیں تو وہ رفاعیت متوسطہ ہے۔ شاہ صاحب تمام افراد انسانی کو رفاہیت متوسطہ میں دیکھنے کے آرزومند ہیں اور بقیہ دونوں مدارج کو خلاف انسانیت بتاتے ہیں اور معاشی نحوست بتاتے ہیں۔(۱۶۶)

۵) ضرورت سے زائد اشیاء جمع کرنے کا مرض:

ضرورت سے زائد سامان دنیا اور مال جمع کرنے اور نمائش کا شوق بھی اونچ نیچ اور عدم توازن کا سبب بنتا ہے شاہ صاحب اس مرض کا علاج ساحت تجویز کرتے ہیں زائد از ضرورت اشیاء جمع کرنے کی مذمت کرتے ہیں۔

> و منها اقتناء عدد كثير من الدواب والفرش لا يقصد بذلك كفاية الحاجة بل مراءة الناس والفخر عليهم فقال النبي ﷺ فراش للرجل و فراش لامراته و الثالث للضيف والرابع للشيطان و قال النبي ﷺ يكون اهل للشيطن و بيوت للشيطن(۱۶۷)

> ترجمہ: انہی (امور تعیش میں سے) یہ بھی ہے کہ آدمی کثرت کے ساتھ مویشی اور فرنیچر وغیرہ حاصل کرنے کی کوشش کرے جس کا مقصد

ضروریات کی تکمیل نہیں بلکہ لوگوں کے سامنے نمائش اور ان پر فخر کرنا ہوتا ہے

جناب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ایک بستر اور دوسرا اس کی بیوی کے لئے تیسرا مہمان کے لئے اور چوتھا شیطان کے لئے ہے آپ ﷺ نے فرمایا کچھ اونٹ (سواریں) شیاطین کے لئے کچھ گھر شیاطین کے لئے (یعنی زائد از ضرورت)

اس کا حاصل یہ ہے کہ املاک میں تا حد امکان کمی ایک مستحسن اقدام ہے اس سے طلب املاک کا جذبہ فرو ہوجاتا ہے اور ناداروں کے ساتھ مواسات کے جذبات پروان چڑھتے ہیں۔

۶) عیش اور عشرت اور اس کے معاشی مفاسد:

شاہ صاحب نے معاشرے پر عیاشانہ زندگی کے تباہ کن اثرات کو پرزور الفاظ میں واضح کیا ہے اور بتایا ہے کہ اس کے اثرات ایک متعدی مرض کی طرح معاشرے کے پورے معاشرے کے پورے جسم کو کھوکھلا کر دیتے ہیں شاہ صاحب مسرفانہ اور عیاشانہ طرز زندگی کو قوم کی ہلاکت بتاتے ہیں درج ذیل پر شوکت تحریر میں ایسی زندگی پر کڑی تنقید کرتے ہیں۔

وكذلك منافسة المدن ان ترغيب عظماء هم فه دقائق الحلى واللباس والبنا والمطاعم وغير ذالك زيادة على ما يعطيه الارتفاقات الضرورية التى لا بد للناس منها اجمع عليها عرب الناس وعجمهم فيكسب الناس التصرف فى الامور الطبيعة لتاتى منها شهواتهم فينتصب قوم الى تعليم الجوارى للغناء والرقص والحركات المتناسبة اللذيذة وآخرون الى الالوان المطربة فى الثياب و تصوير صور الحيوانات والاشجار العجيبة و لتخاطط الغريبة فيها وآخرون الى الصناعات البديعة فى الذهب والجواهر

الرافيعةوآخرون الى الابنية الشامخةو تخطيطها و تصريرها (۱٦۸)

ترجمہ: تمدن کی ایک بڑی خرابی یہ ہے کہ کسی ملک کے اہل ثروت ارتفاعات ضرورت سے تجاوز کر کے عیاشی کے لوازم کو فروغ دیں مثلاً قسم قسم کے کھانوں کی تیاری، زرق برق لباس، انواع و اقسام کے زیورات، سامان آرائش اور شاندار عمارات کو ترقی دینے کے لئے اپنی توجہات مرکوز کر دیں چنانچہ لوگ امور صبیعہ میں تصرف کر کے ایسے کاروبار کرنے لگتے ہیں جن سے امراء و عظماء کی خواہشات پوری ہوں لہٰذا کچھ لوگ لڑکیوں کو موسیقی اور رقص اور متناسب و لذیذ جسمانی حرکات کی تعلیم دینے لگ جاتے ہیں کچھ کپڑوں میں بھڑکیلے رنگ اور نقش و نگار اجاگر کرنے میں مشغول ہو جاتے ہیں کچھ لوگ مصوری اور اشجار و حیوانات کی رنگارنگ تصاویر بنانے میں مگن ہو جاتے ہیں اور کچھ سونے چاندی کے زیورات کے نئے ڈیزائن متعارف کرانے میں مصروف ہوتے ہیں۔ جبکہ بہت سے لوگ بلند و بالا عمارات کی تعمیر و تزئین اور نقش و نگار میں اپنا کمال دکھاتے ہیں۔

شاہ صاحب بتاتے ہیں کہ جب قوم کی اکثریت ان جیسے کاموں میں اپنی محنت صرف کرنے لگتی ہے اور کاشتکاری، صنعت وحرفت اور تجارت جو معاش کو ترقی دینے والے شعبے ہیں کی طرف سے توجہ ہٹ جاتی ہے۔ تو پورے معاشرے میں کو اس کے برے نتائج بھگتنے پڑتے ہیں۔ لہذا وہ ان جیسے ذرائع کسب پر قدغن لگاتے ہیں اور یہ پیشے تمدن کے لئے تباہ کن گردانتے ہیں۔

آپ فرماتے ہیں:

فاذا اقبل جم الغفير منهم الى هذه الاكتساب اهملوا

مثلها من الذراعات والتجارات و اذا انفق عظماء المدينة وفيها الاموال اهملوا مثلها من مصالح المدينه و جر ذالک الی التضیق علی القآئمین بالاکساب الضروریۃ و ذالک ضرر بهذه المدینه یتعدی من عضو الی عضو منها حتی یعم الکل و یتجاری فیها کما یتجاری الکلب فی بدن المکلوب (۶۹)

ترجمہ: پس جب لوگ ان (فنون لطیفہ اور عیاشانہ) پیشوں میں مگن ہو جائیں گے اسی مناسبت سے ضروری پیشے مثلاً زراعت و تجارت میں کمی آجائے گی اور اس قدر ملکی مصلحتوں میں کوتاہی ہوگی۔ یہ امور ملک کے لئے ایک موذی مرض ہیں جو اس کے ایک حصے سے منتقل ہو کر دوسرے سرے تک پہنچ جائے گا اور آخر کار پورے ملک میں چھا جائے گا جیسے دیوانے کتے کا زہر انسان کے پورے جسم میں سرایت کر جاتا ہے شاہ صاحب پر تعیش زندگی اور سماج کے لئے مہلک قرار دیتے ہیں وہ ملکی ذرائع پیداوار مثلاً زراعت صنعت و حرفت، تجارت جو ملکی خوشحالی کے لئے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے ہیں کے شعبوں کو عیاشی کی بھینٹ ہرگز نہیں چڑھانا چاہتے۔ اس طرح غیر پیداواری ذرائع کی وہ پرزور انداز میں مذمت کرتے ہیں۔

۷) گراں بار ٹیکس:

شاہ صاحب فرماتے ہیں، کہ عیاشانہ طرز زندگی کے اثرات صرف معاشرے کے ایک حصے تک ہی محدود نہیں رہتے، بلکہ معاشرے کے تمام جو لوگوں کو بری طرح متاثر کرتے ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ جب

اعلیٰ طبقہ کے اخراجات جو رفاہیت بالغہ کے دلدادہ ہوتے ہیں بڑھ جاتے ہیں اوران کے درمیان نمود ونمائش کی دوڑ تیز ہو جاتی ہے، تو وہ اسراف کی انتہا کر جاتے ہیں اور یہ حصول زر میں ظالمانہ طریقوں پر پہنچ تی ہے لہذا وہ کاشتکاروں، صنعت کاروں اور تجارت کرنے والوں پر گراں بار ٹیکس عائد کرتے ہیں اس سے معاشی کا عامل اور مفید عنصر متاثر ہو جاتا ہے۔

آپ فرماتے ہیں:

''و غالب دسب خراب البلدان فی هذه الزمان شيئا ن احدهما تضييقهم علی بيت المال بان الح و ثانی ضرب لاضرآئب الثقيلة علی الزراع والتجار والمحترفة والتشديد عليهم حتی يفضی الیاجحاف المطاوعين واستصالهم''(۱۷۰)

ترجمہ: ہمارے زمانے میں شہروں کی تباہی اور شہری زندگی کی خرابی کے دو بڑے اسباب ہیں ایک بیت المال پر (مفت خوروں کا بوجھ بننا۔ اور دوسرا کاشتکاروں، بیوپاریوں اور پیشہ وروں پر بھاری محصول لگانا، اوران پر اس بارے میں سختی کرنا ہے یہاں تک کہ جو بیچارے حکومت اور اس کو مانتے ہیں وہ تباہ ہورہے ہیں اور جو سرکش اور نادہندہ ہیں ان پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔

شاہ صاحب ایک اور مقام پر عامل پیداوار (کاشتکار) کی محنت اور عمل کو پیش نظر رکھ کر ضروری قرار دیتے ہیں کہ لگان اور مال گزاری میں رفق ونرمی بالخصوص دیگر تخفیف کا خیال رکھا جائے ٹیکسوں کی گرانی ان کے ہاں مسرفانہ تعیش اور مذموم سرمایہ دارانہ ذہنیت کا نتیجہ ہوتا ہے پھر ہوتا یہ ہے کہ حکومت کی جانب سے معیشت

کے بنیادی وسائل پر بھاری ٹیکس لگائے جاتے ہیں اور گراں بار مال گذاری اور لگان عائد کیے جاتے ہیں تاکہ اس طرح طلب زر کا پہلو نکل آئے بقول شاہ صاحب اس طرح تمدن کو برباد کیا جاتا ہے۔

و جر ذلک اکء اکتضییق علی القائمین بالاکساب الضروریة کالزراع والتجار والصناع و تضاعف الضرائب (۱۷۱)

ترجمہ: اور بے جا تعیش ان پیشہ وروں کی مصیبت کا باعث بن جاتا ہے جو ضروری معاشی اعمال میں مصروف ہیں یعنی زراعت پیشہ، تجارت پیشہ، اور صنعت پیشہ اور ان پر بھاری ٹیکس اور گراں بار لگان اور مال گزاری کا سبب باعث بنتا ہے۔

لہذا شاہ صاحبؒ ٹیکس کی زیادتی کو خصوصاً پیداواری ذرائع پر مذموم خیال کرتے ہیں وہ یقیناً ٹیکس کے وجود کے قائل ہیں مگر رعایت حدود کے ساتھ۔ اس لئے کہ اجتماعی اداروں کے قیام اور ترقی کے لئے سرمایہ اس طور پر حاصل کیا جاتا ہے۔

شاہ صاحب کی نظر میں شخصی زندگی کے کردار کے اصول

اخلاقیات کی جو شاخ شخصی زندگی کے کردار کے شعبے سے تعلق رکھتی ہے اس میں وہ کردار بھی شامل ہوتا ہے جو ایک فرد اپنی ذاتی ضروریات کی تسکین کے لئے اختیار کرتا ہے جو اس کی شخصی بقا بہبودی اور ترقی کے لئے ضروری ہوتی ہیں۔

فرد کی ضرورت

ہر فرد کی ابتدائی ضروریات یہ ہیں۔ خوراک کی ضرورت، تحفظ کی ضرورت، زن و شوہر کی رفاقت اور ولادت کی ضرورت لیکن جیسا کہ فرد ارتقاء کے ساتھ فروغ پاتا ہے تو اس کی دوسری ضرریات میں اضافہ ہوتا

ہے مثلاً جمالیاتی، ذہنی اور روحانی ضروریات، جو ایک فرد کی بقاء و بہبود کے لئے لازمی ہوتی ہیں لیکن وہ ان ضروریات کو حاصل کرنے کی راہ میں، دوسرے افراد کے حقوق کو نہ تلف کرتا ہے اور نہ ہی خطرہ میں ڈالتا ہے۔

شاہ ولی اللہؒ نے جن ضروریات کا تذکرہ کیا ہے وہ حسب ذیل ہیں:۔

(الف) ایک شخص کی طبعی بقا کی ضروریات:۔

۱۔خوراک کا کھانا پینا۔ ۲۔تحفظ، کپڑے (لباس) اور مقام رہائش (مکان)

۳۔مشترک ضروریات:۔صفائی، نیند، بیماری میں امداد و علاج۔

(ب) زیب و زینت کی جمالیاتی ضروریات۔

(ج) اپنے ہم جنسوں میں میل جول یا معاشرتی خلط ملط کی شخصی ضروریت۔ دوسرے الفاظ میں یہ حسب ذیل ضروریات ہیں:۔

۱:۔دوسرے رفیق انسانوں کے درمیان چلنا پھرنا، ملنا جلنا اور باہمی سلوک۔

۲:۔رفاقت اور تصورات کا مبادلہ اور باہمی تبادلہ خیال کرنا۔

(د) شادی اور ولادت اور ازدواجی تعلقات۔

اخلاقی کردار:

پس شخصی کردار جب اخلاقی طور پر زیر غور آتا ہے تو ایک فرد کے اس کردار میں ہوتا ہے جو نہایت مستعدی کے ساتھ اپنی اعلیٰ تر ضروریت کی تسکین کی پس پشت ڈالے بغیر، متذکرہ بالا ضروریت کی تسکین کرتا ہے اور یہ اعلیٰ تر ضروریات اس کی ذہنی تمدنی اور روحانی ضروریات ہیں۔ ایک موقع پر شاہ ولی اللہؒ نے اسی تصور کو بیان کیا ہے جسے ذیل الفاظ میں پیش کیا جا سکتا ہے۔

"ایک شخص کا موزوں کردار یا اخلاقی کردار اس کردار میں ہوتا ہے جو

اس کی ابتدائی ضروریات کو اخلاق فاضلہ دیانت اور اسمتہ اصلاح یعنی بجز

کا کردگی ، یکسانیت اور تقدس کی عادات سمیت) کی مطابقت کرتے ہوئے
اعلیٰ کا کردگی کے ساتھ تسکین کرتی ہے اور وہ اس کے ساتھ رائے کلی اور
معاشرہ تاریخ ماضی سے حاصل شدہ تصورات ، مشاہدات اور رجحانات کا بھی
پورا خیال رکھتی ہیں ۔" (۱۷۲)

طبعی ضروریات :

اس موضوع پر شاہ ولی اللہ کے مباحث کے تجزیہ سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ شخصی کردار کی بنیاد نہ صرف طبعی ضروریات (ضروریات علاج و صحت سمیت) کی تسکین میں پائی جاتی ہے بلکہ وہ دوسری ضروریات بھی تسکین میں پائی جاتی ہے جس کیلئے سہولت کے پیش نظر نفسیاتی ضروریات کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے ۔

نفسیاتی ضروریات :

ان میں بنی نوع انسان کی یہ ضروریات شامل ہوتی ہیں مثلاً ذہنی ترقی ، تمدنی و شائستگی اور روحانی کمال کی ضروریات ، جمالیاتی صفت کی ضروریات ، پیدائشی وصف کے محرکات کی ضروریات یا سات اخلاق فاضلہ کی صلاحیتیں ، عام جذبات ، تحریکات ، جوش و ہیجانات کی ضروریات تمدنی اور روحانی رجحانات ۔ شخصی کردار کی اخلاقیات کا معیار یہ ہے کہ ان کی تصدیق ایک ساتھ طبعی و نفسیاتی دونوں اسباب کی بنیاد پر کی جا سکے ۔ اگر کردار کے کسی نمونے کی صرف طبعی اسباب کے تحت تصدیق کی جا سکے گی اور دونوں اسباب کے تحت نہیں ہوگی تو یہ یقیناً کردار کی ایک غیر موزوں شکل ہو گیا اور اس لئے غیر اخلاقی ہو گی ۔

معاشی ضروریات :

ان ضروریات میں معاشی ضروریات بھی شامل کر لینا چاہیں جن کا مقصد اعلیٰ معیار زندگی ہے ۔ انسانی معاشرہ میں اس کے افراد کی ضروریات کی تسکین ان کی طبعی ضروریات کی تسکین سے مراد ہے اور جو بہتر معاشی

حالات پیدا کرنے کے بعد انہیں اس کی تسکین کے قابل بناتی ہے اور ان کی نفسیاتی ضروریت کی تسکین جو ایک اعلیٰ معیار زندگی کو برقرار رکھتے ہوئے ایک بہتر ذہنی اور عمومی حالت پیدا کر کے تسکین کے قابل بنائی جاتی ہیں۔ اسی لئے معاشی ضروریات دونوں اپنے اپنے نقطہ نگاہ سے طبعی اور نفسیاتی ضروریت دونوں میں شامل کی جاسکتی ہیں۔ یہاں یہ واضح کیا جاسکتا ہے کہ ان ضروریات کی تسکین کو ایک کو ایک اعلیٰ معیار زندگی کے سبب اعتدال کے اضافی غور وفکر سے نہ صرف طبعی طور پر، بلکہ جمالیاتی، ذہنی اور روحانی طور پر اعلیٰ بنایا جاسکتا ہے۔

عام اصولوں اور معیارات کے مختصر بیان کے بعد یہ مناسب ہوگا شخصی اخلاقی کردار کے نفاذ کے بارے میں بحث کی جائے۔

خوراک:

شاہ ولی اللہؒ کے بیان کے مطابق جو اخلاقی کردار، ضرورت خوراک سے متعلق ہے وہ سب سے پہلے یہ بتاتا ہے کہ روزی صحیح طور پر حاصل کی جائے اور پھر نہ صرف خورد ونوش کے طریقے بلکہ خورد ونوش کی اشیاء اور ان کی عمدگی کی پسند، طرز خدمت اور برتنوں کی ساخت کا سامان بھی اہمیت رکھتا ہے خوراک کی نوعیت اور برتنوں کی کی پسند مستثنیٰ کرتے ہوئے، باقی کے متذکرہ نکات کے کردار کی اخلاقی یا موزوں شکلوں سے تعلق رکھتے ہیں جو طبعی اور نفسیاتی دونوں اسباب پر منعقد ہوتے ہیں اور خوراک کی قسم اور برتنوں کی پسند کے بارے میں اخلاقی کردار اصول اعتدال اور معاشی بہبودی پر قائم ہوتی ہے۔

نیز اسی نفسیاتی اصول کے مطابق اور ہوتی ہے ہے جس طرح سونے چاندی کے برتنوں کا استعمال اور انتہائی پرتکلف کھانے بھی قابل اعتراض ہو جاتے ہیں کیونکہ ان میں شان وشوکت کا اظہار ہوتا ہے۔ خورد ونوش کی اشیاء کی پسند میں طبعی نقطہ نگاہ بھی شامل ہوتا ہے کو اس حقیقت پر مبنی ہوتا ہے کہ خورد ونوش کی اشیاء اور طریقے اس قسم کے ہوں کہ جو نہ صرف انسانی ضروریات کی تسکین کرسکیں لیکن مجموعی جسم کی نشونما کرتے ہیں اور انسانی جسم کی عام عضویاتی نظام کے مطابق ہوں اس پسند کے نفسیاتی اسباب بھی ہیں جو بنی نوع انسان کے عام

احساسات، جذبات اور جمالیاتی مذاق کی بنیاد پر ملتے ہیں جو انسانوں کو ناپاک خوراک اور ایسے حیوانات جو فضلہ اور سڑی ہوئی چیزیں کھاتے ہیں اور ان کی عادتیں گندی ہوتی ہیں کے گوشت کے استعمال سے باز رکھتے ہیں کیونکہ یہ اشیاء انسانوں کے لئے انتہائی مضر ہوتی ہیں اور اس کے رجحان طبیعت کو شدید نقصان پہنچاتی ہیں۔

خورد و نوش کے طریقے عام صحت کے اسباب رکھتے ہیں جو ہاتھ منہ کی صفائی اور اس جگہ اور ان برتنوں کی صفائی کا تقاضا کرتے ہیں جن میں اشیائے خورد و نوش رکھی جاتی ہیں ان کے بعض طبعی اسباب بھی ہوتے ہیں جیسے پر امن طرز عمل اور نشست مناسب طریقہ۔ نفسیاتی طریقے اچھے آداب وصفات کا تقاضا کرتے ہیں جو کہ حمع و بیہودگی جیسی برائیوں کے اضہار سے روکتے ہیں اور ایسے طرز عمل سے باز رکھتے ہیں جو سادہ خورد نوش کرنے والوں کے دلوں میں بدمزگی ناپسندیدگی یا حسد کے جذبات پیدا کریں۔

منشیات کے استعمال کے خلاف شاہ ولی اللہؒ نے جو دلائل پیش کیے ہیں وہ خوشحالی اور نفسیاتی ضروریات دونوں کی بنیاد پر ہیں نشہ آور اشیاء کا ستعمال نہ صرف صحت کے لئے خطرہ ہوتا ہے بلکہ جو لوگ ان کے عادی ہوجاتے ہیں یہ عادت ان کی آمدنی اور معاشرہ پر ایک فاضل معاشی بار ہوتی ہے اور اس کے ساتھ ہی یہ ان کی پاکیزگی اطوار (سمت) اور ذہن و دماغ کی صفائی پر بھی اثر ڈالتی ہے لہٰذا نشہ آور اشیاء نہ صرف انسانی صحت بلکہ معاشرتی نفسیاتی اور معاشی اسباب کی بناء پر اس کو غیر موزوں کردار میں مبتلا کر دیتی ہیں اور یہ اسی لئے غیر اخلاقی کردار ہے۔

لباس اور مقام رہائش:

شاہ ولی اللہؒ کے یہاں لباس اور مقام رہائش (مکان) کی اخلاقیات، انسان کے طبعی تحفظ اور اس کی جمالیاتی اور نفسیاتی تقاضوں کے مطابق ہے جوان دونوں اداروں کے مطابق انسانی ذہن کا رجحان ترتیب ہیں طبعی ضروریات کے پیش نظر، لباس اور مقام رہائش ایسے ہونے چاہئیں جو طوفان اور موسم کے خلاف تحفظ دے سکیں اور مقام رہائش مین ایک گنجائش ہونی چاہیئے کہ ان میں خلوت اور تنہائی کے علاوہ چوروں اچکوں کی دست برد

سے صاحب مکان کی املاک بھی محفوظ رہیں۔

جہاں تک نفسیاتی ضروریات کا تعلق ہے لباس اور مقام رہائش صرف اس لئے ہوتے ہیں کہ انسان کے وصف حیاء کا تحفظ ہو سکے ان سے خلوت کے ساتھ بیرونی مداخت نہ ہو۔ اس کے علاوہ ان دونوں میں ایک انسان کے اخلاق فاضلہ مثلاً سماحت (فیاضی و عالی ظرفی) ظاہر ہو اور بخیلی و کم ظرفی کا مظاہرہ نہ ہو اور انسان میں عظمت و احترام کے جذبات بھی پیدا ہوتے ہوں لباس کیلئے ایک موزوں کپڑے کی پسند اور لباس پر عظمت طرز، ذہن کے ان رجحانات کے اثرات کا نتیجہ نہیں اپنانا چاہئے جو اعلیٰ ظرفی اور پاکیزگی اخلاق کے خلاف ہوں۔

جمالیاتی و نفسیاتی ضروریات جو انسان کو اچھے اور موزوں لباس پہننے اور خوبصورت و آرام دہ مکانات میں رہنے کی اجازت دیتے ہیں لیکن معاشی اسباب ورمعاشی بہبود کے لوازمات کے پیش نظر وہ لباس و مکان دونوں میں اعتدال پسندی کی تلقین کرتے ہیں۔

جہاں تک لباس میں امتیاز جنس کا تعلق ہے، شاہ ولی اللہ اسے مرد و عورت کے طبائع و سیرت پیدائشی رجحانات اور مخصوص فرائض کی بنیاد پر درست ٹھہراتے ہیں نازک، رنگین اور عورتوں کی پسند کے کپڑے مردوں کے لئے موزوں نہیں ہوتے جوان کے لئے غیر موزوں اور غیر اخلاقی لباس ہوتے ہیں، کیونکہ اگر ایک مرد مستقلاً عورتوں کے فیشن کے نرم اور رنگین کپڑے پہننے کا عادی ہو جائے تو اس سے اس کے مردانہ مزاج کا انداز بگڑ جاتا ہے اسی طرح یہ عورتوں کے لئے غیر موزوں ہے کہ وہ مردوں کی طرح کھردرے کپڑے پہنیں جس میں ان کے حسن اور شائستگی کا معمولی خیال بھی نہ رکھا گیا ہو۔

زیب و زینت:

یہاں اس معاملہ کے جمالیاتی پہلو پر کچھ کہنا مناسب ہوگا جیسا کہ شاہ ولی اللہ نے اسے ایک بڑے عنوان زینت اور تجمل کے تحت بیان کرتے ہیں ایک شخص کے لباس یا مکان یا اس کی زیب و زینت کے تصورات

کوشاہ ولی اللہؒ نے اپنے مخصوص نفسیاتی اسباب کی روشنی میں بیان کیا ہے مثال کے طور اپنے جسم کونشانات سے گودنا کھال کوگرم لوہے سے داغنا یا زیب و زینت کی خاطر جسم کوکسی طرح بگاڑنا یہ سب طریقے طبعی اور طبی دونوں لحاظ سے جسم کے لئے موزوں نہیں ہوتے اور نہ ہی یہ تہذیب وشائستگی کا تقاضا ہے۔

زیب و زینت کی حمایت میں البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ انسانی طبائع کے جمالیاتی پسند عنصر میں پیدائشی طور پر ہوتی ہے اور یہ کہ اوصاف ساحت وعظمت اور شائستہ قطع میں نظر آئے۔

ذاتی زیب و زینت میں ضرورت سے زیادہ مبتلا ہونے کے خلاف نفسیاتی اسباب کی بناء پر کئی اعتراضات وارد ہوتے ہیں مثلاً ضرورت سے زیادہ تزئین و آرائش سے ایک شخص خود سے محبت کے مرض میں مبتلا ہو جائے اور اس کے ساتھ خود پسندی، امارت اور نخوت وغیرہ کی خرابیاں بھی وابستہ ہوتی ہیں۔ جو انسانی عظمت و ساحت اور رائے کلی جیسے اخلاق فاضلہ کی ضد ہوتی ہیں زیب و زینت میں ضرورت سے زائد مبتلا ہونے سے معاشی نقصان بھی ہوتا ہے اس کا کم سے کم یہ نقصان بھی ہوتا ہے کہ یہ دوسروں کے لئے ایک بری مثال بن جاتی ہے جس کی طرف انسان فطرتاً مائل ہو جاتا ہے۔ اور اس طرح سے نام ونمود، خودنمائی ونخوت اورفضول خرچی کی معاشرتی خرابیوں میں مبتلا ہو جاتا ہے اسی لئے شاہ ولی اللہ کردار میں معیار اعتدال کواپنانے کی تلقین کرتے ہیں جس کی تمام اسباب کی روشنی میں تصدیق کی جاتی ہے۔

صفائی:

کردار کے بیان کے ساتھ صفائی کا ذکر بھی شامل کرنا چاہیے صفائی میں جسم کپڑے اور مکانات کو دھونا اور صاف کرنا شامل ہوتا ہے اس عادت کو خصال الفطرت یا ایک عام انسان کی حفظان صحت کی عادات کہتے ہیں شاہ ولی اللہ نے اپنے نظام اخلاقیات میں اس کو حفظان صحت کی تفصیل تو بیان نہیں کرتے البتہ وہ اپنے قارئین کوعلم العلاج کی کتابوں کا حوالہ دیتے ہوئے اس ضمن میں مطمئن ہو جاتے ہیں یہ صفائی کے طریقوں (مثلاً وضو، غسل وغیرہ) کی حمایت اور حفظان صحت کی دس عادات کی حمایت میں کافی نفسیاتی دلائل پیش کرتے

ہیں خصال الفطرت (اچھی عادتیں) انسانی مزاج جمالیاتی صفت میں پائی جاتی ہے جن کی وجہ سے عام انسانی مزاج گندگی اور غلاظت کو پسند نہیں کرتا ہے۔ شاہ ولی اللہ کے نزدیک شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک شخص کے جسم کی گندگی سے ایک قسم کی طبعی ذہنی اور روحانی غفلت و بے ہوشی طاری ہوجاتی ہے اور اس سے اس کے ذہن کی صفائی اور صلاحیت قبولیت کو زبردست نقصان پہنچتا ہے اور اس کا اثر زیادہ تو سستی وغفلت میں ظاہر ہوتا ہے اور گہرے ذکر وفکر کے وقت یہ غفلت زیادہ واضح ہوجاتی ہے۔

رفع حاجت کے بعد ہاتھ دھونا، جسم کے کسی حصہ سے خون یا پیپ وغیرہ کا رسنا، اور ہم خوابی وہم بستری وغیرہ سے ذہن پر بہت برا اثر پڑتا ہے لہذا ان اثرات سے بچنے کیلئے صفائی کا زیادہ عمدہ طریقہ غسل کی ضرورت ہوتی ہے اس کے علاوہ دوسرے قسم کے صاف کرنے اور دھونے کے طریقے اور وضو باقی ماندہ اثرات کی پاکیزگی کے لئے کافی ہوتے ہیں۔ نیند بھی ذہن پر ایسی ہی سستی وغفلت کے اثرات کو دور کرنے کے لئے بھی نہانے کی ضرورت پڑتی ہے۔

نیند:

شاہ ولی اللہ نے نیند کے بارے میں جس میں کردار کی حمایت کی ہے اس کے طبعی ونفسیاتی اسباب کے تحت تصدیق کی جاسکتی ہے ایک بار پھر شاہ صاحب یہاں طبعی اسباب کی تفصیل بیان نہیں کرتے ہیں۔ البتہ ایک مقام پر وہ یہ ہدایت کرتے ہیں کہ ایک شخص کو اپنی بائیں کروٹ پر سونا چاہیے اور اس کی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ اس طرح سونا زیادہ آرام دہ ہے اور جگر وذہن کے فعل کی بیداری کے لئے بہتر ہے۔

جیسا کہ نیند نہ صرف طبعی آرام کے لئے ضروری ہوتی ہے بلکہ ذہنی آرام کے لئے ضروری ہوتی ہے اس لئے شاہ ولی اللہ نے ذہن کو منتشر خیالات سے جو نیند میں خلل انداز ہوتے ہیں۔

بیماری:

بیمار ہونے کی صورت میں مناسب علاج کرانے کے بارے میں شاہ ولی اللہ کی تجویزوں کو طبعی علاج

اورنفسیاتی علاج کی اقسام کے تحت بیان کیا جاسکتا ہے، طبی علاج میں طبی علاج شامل ہوتا ہے اوراس میں شاہ ولی اللہ، مخصوص دعاؤں اورآیات قران کے ذریعہ نفسیاتی علاج بھی شامل کردیتے ہیں جو ذہن کے صبر وسکون کو تکلیف یا بیماری کے دوران بحال ومحفوظ رکھتے ہیں اوران کی بنیادیں فطرتا نفسیاتی ہوتی ہیں۔

ازدواجی تعلق:

ازدواجی تعلقات میں ایک موزوں کردار شاہ ولی اللہ کے نزدیک حیاتیاتی، نفسیاتی اور معاشرتی اسباب کی بناء پر پایا جاتا ہے جنسی تسکین اورتولید کی خواہش کی عادت بنی نوع انسان کی حاتیاتی ضرورت سے متعلق ہے جس کی اگر صحیح طور پر تسکین نہ ہوتو نفسیاتی خرابیاں، انسانی مزاج میں بدمزگی اورگمراہی پیدا ہوجاتی ہیں۔ (۱۷۳)

گھریلو زندگی کے کردار کے اصول

معیار:

گھریلو زندگی کی اخلاقیات کے سلسلے میں شاہ ولی اللہ نے یہ معیار پیش کیا ہے کہ موزوں گھریلو کردار، یک ترقی یافتہ معاشرہ میں ایک خاندان کے افراد کے درمیان، لازمی طور پر ایک رشتہ اوراتحاد کو پیدا کرتا ہے اس کی حفاظت کرتا ہے اوراسے فروغ دیتا ہے اس کا حصول دوستی اورخیر سگالی کے احساسات پیدا کرنے سے ہوتا ہے جو باہمی مقاصد کی تکمیل کیلئے ایک دوسرے کی خدمت کرنے اور باہمی تعاون کے نتیجہ میں ضروریات کی تسکین سے پیدا ہوتے ہیں انسانی نسل کی افزائش اورتحفظ معاشرہ کے علاوہ گھریلو کردار کے دوسرے مقاصد ہوتے ہیں مثلاً بعض نفسیاتی اورمعاشرتی ضروریات کی تسکین، جو ہرفرد کیلئے عام رہتی ہیں یا ایسی ہی دوسری ضروریات کی تسکین جومختلف خاندانوں میں مخصوص ہوتی ہیں۔

اخلاق گھریلو کردار:

پس موزوں گھریلو کردار یہ ہے کہ اسمیں نسل انسانی کی افزائش ،مختلف صلاحیتوں کا تحفظ جنسی خصوصیات ، خاندان کے ہر فرد کی صلاحیتوں کی ترقی وفروغ اور دوستی اور خیر سگالی کے پائیدار و ابدی تعلقات شامل ہوتے ہیں جو بڑے پیمانہ پر، ایک بہترین و منظم معاشرہ کی بنیاد فراہم کرتے ہیں زندگی کے گھریلو کردار کے اصول (حکمت) رائے کلی اور عام واقفیت و مشاہدہ کیمطابق سات اخلاق فاضلہ کی خصوصیات کی روشنی میں تم اپنے خاندان کے افراد اور احباب کے معاملات میں انکوکس طرح کتنی اہمیت دیتے ہو کہ ان کے ساتھ تمہارے کردار اور اشتراک عمل سے شائستگی کی اعلیٰ ترین شکل اور اتحاد و رشتہ کی نہایت باعزت شکل برقرار رہے۔

تہذیب وارتقاع:

ان خصوصیات میں یہ اضافہ کیا جا سکتا ہے کہ گھریلو کردار کا ایک دوسرا نشان یا ازدواجی رشتہ کا کردار، حیوانات کی جنسی اور تولیدی خواہشات کے مقابلہ میں ارفع و اعلیٰ ہوتا ہے اور یہ اعلیٰ تر اور بلند نفسیاتی مقاصد کے حصول اور فروغ کے کام آتا ہے گھریلو کردار کے نمونے یا رسوم اس طرح بنائی جاتی ہیں کہ ان جنسی تحریکوں اور ان کے براہ راست مقصدوں کی ضروری تسکین کرتے ہوئے معاشرتی اور انسانی مقاصد کو کبھی بھی بلند سطح پر نہیں آنے دیا جاتا کہ وہ زیادہ نمایاں حیثیت حاصل کرلیں۔

معاشرتی مقاصد ایسے بھی ہیں کیونکہ گھریلو کردار کے جنس بنیادی اور عنصری نمونوں کے ذریعہ شناخت کئے جاتے ہیں، دوسرے خاندانوں سے دوستانہ اور ہمسائیگی کے تعلقات برقرار رکھتے ہیں اور یہ معاشرتی مقاصد ان کے درمیان ایک دوسرے سے معاہدوں کے مواقع پیدا کرتے ہیں۔ نیز بچے پیدا کرتے ہیں اور ان کی مناسب پرورش ہوتی ہے جس کہ نتیجہ میں معاشرہ کی قوت اور اس کی بقاء کے عنصر میں اضافہ ہوتا ہے یہ معاشرتی مقاصد انسانیت دوستی کے مقاصد میں توسیع پاتے ہیں مثلاً انسانی نسلوں کی وسیع پیمانہ پر بقاء، ارتباط اور بہبودی ان ہی مقاصد کو اس نقطہ نگاہ سے تسلیم کرنا کہ ان سے اعلیٰ مقاصد سے بھی آگے نکل جاتی ہیں اور

ذہن انسانی کے رجحان کو اعلیٰ ترین سطح عطا کرتے ہیں۔

گھریلو کردار کے متعلق شاہ ولی اللہ کی بحث کو چار حصوں پر تقسیم کیا جاتا ہے (الف) زن وشوہر کے تعلقات (ب) بچوں سے تعلقات (ج) نوکروں سے تعلقات اور (د) معاشرتی اداروں سے تعلقات میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

ا) زن وشوہر کے تعلقات:

شاہ ولی اللہ نے ان رسوم وروایات کے لئے کافی لکھا ہے جو میاں بیوی کے درمیان شادی کے وقت اور شادی کے بعد، پائیدار اور ہمیشہ کے تعلقات پیدا کرنے سے تعلقات پیدا کرنے سے تعلق رکھتی ہیں۔ اور یہ رسوم، شادی کا مقصد، خاندان کی تعمیر اور دوسرے افراد سے ان کے مستقبل کے معاشرتی تعلقات بھی استوار کرنے سے تعلق رکھتی ہیں۔

ایسی اشیاء واعمال سے تعلق رکھنے والی ایسی رسوم ہیں جو

(الف) شریک زندگی کے انتخاب

(ب) بعض مخصوص رشتہ داروں (محرمات) سے نکاح کی ممانعت

اور

(ج) منگنی یا سگائی (حنا) کی رسوم، مہر، نکاح اور شادی کی تقریب ولیمہ سے تعلق رکھتی ہیں

ان ہی گھریلو مقاصد کے لئے، یہ شادی کے بعد، گھریلو اداروں کے کردار اپنے زیر اثر رکھتی ہیں جو زن وشو کے ایک دوسرے کے لئے خلوص، وفاداری اور خیر سگالی اور ان کے خاندان کی بہبودی اور دوسرے امور میں باہمی معاونت وتعاون کی بنیاد پر قائم ہوتے ہیں اور ان تعلقات میں زن وشوہر کے فرائض کے درمیان فطری امتیاز بھی پایا ہے۔

عورتوں پر، مردوں کی موجودہ اعلیٰ تر حیثیت ان حقائق پر قائم ہے جو ان کی عظیم تر طبعی قوت، عورتوں کی

تابعداری اور معاشی کفالت میں مرد کی دست نگری (جیسا کہ یہ رسم ہو چکی ہے کہ عورتیں اپنا تمام وقت گھریلو فرائض کی انجام دہی میں صرف کرتی ہیں) گھر سے باہر گھومنے پھرنے کی بدولت، مردوں کے وسیع تر دائرہ سے حاصل شدہ وسیع تر مشاہدہ، ان کے خارجی معاملات اور بیرونی حملوں سے دفاع کے معاشرہ کے لئے ان کی عظیم تر صلاحیت اور موزونیت وغیرہ۔

۲) بچوں سے تعلقات:

اسی طرح بچوں کی نگہداشت کے لئے، شاہ ولی اللہ نے والدین کے درمیان تعاون پر زور دیا ہے اور انہوں نے معاشرتی اسباب کی بناپر، ولادت کی تقریب، عقیقہ کی رسم کی حمایت کی ہے نیز ایسے بچوں کے لئے والدین کی نگرانی و ذمہ داری کو مستحکم کرنے کا نفسیاتی سبب قرار دیا ہے والدین کی توجہ و ذمہ داری، بچے کی طبعی بہبودی تک محدود نہیں ہوتی بلکہ یہ اس کی ذہنی ترقی اور تعلیم کے لئے گنجائش پیدا کرتی ہے تاکہ اس سے بچہ ترقی یافتہ معاشرہ میں اپنا صحیح مقام حاصل کر سکے۔

اسی طرح سے بچوں اور ان کے والدین کے درمیان تعلقات اپنی فطری بنیادیں تلاش کر لیتے ہیں جس کے نتیجہ میں والدین اپنے بچوں سے شفقت و محبت سے پیش آتے ہیں اور بچے اپنے والدین کی عزت، احسان مندی اور فرماں برداری کرتے ہیں۔

۳) نوکروں سے تعلقات:

بعض لوگوں کے دوسروں کے خادم یا نوکر ہو جانے کی خاص وجہ شاہ ولی اللہ کے نزدیک انسانی طبائع کے تنوع میں ملتی ہے جن میں بعض ایسی ہوتی ہیں جو اپنی کامل شخصیت اور خود اعتمادی کی صفات کی حامل ہوتی ہیں اور جو لوگ فطرتاً آقا واقع ہوئے ہیں حالانکہ بعض دوسری طبائع ایسی خصوصیات میں فقدان کی بدولت، ان افراد کی صفات بھی رکھتی ہے جو فطرتاً تحت واقع ہوئے ہیں۔ ان مالکانہ ذہن رکھنے والے افراد کی حاکمانہ صفات کی بدولت دوسرے ان کے غلام و تابع رہتے ہیں معاشی ضروریات ایسے لوگوں کو ایک جگہ جمع کر دیتی

ہیں اور زیادہ تر حالات میں وہ آجر واجیر کے تعلقات قائم کر لیتے ہیں اور اس میں باہمی ضروریات کی تسکین و تکمیل کرتے ہوئے وہ گھریلو امور اور معاشرہ کی بہبودی کے لئے کام کرتے ہیں اس مقصد کے حصول کے لئے آقا اور غلام کے درمیان پائیدار تعلقات لازمی ہوتے ہیں جو ایک دوسرے کے درمیان جذبہ خیر سگالی کے بغیر ممکن نہیں ہوتے البتہ آقا اپنے خادموں کے لئے خصوص، بخشش و مہربانی کے جذبات رکھتا اور خادم اپنے آقا کی فرماں برداری حکم برداری ایمان داری ورخیر سگالی کے جذبات رکھتے ہیں اسی مقصد کی تکمیل کے لئے شاہ ولی اللہ نے ہدایت کی ہے کہ آقا کو چاہیئے کہ وہ اپنے خادموں کی خوراک ولباس میں حصہ لے اور ان کے ساتھ جہاں تک ہو سکے مساوات کی سطح پر تعلق رکھے۔

جبری محنت کسی شخص سے اسکی مرضی کے خلاف زبردستی کام لینا یا ان افراد کی قابلیتوں اور صلاحیتوں کو کچلنا جو اپنی مرضی سے ایک آزاد زندگی بسر کرنے کے خواہش مند ہوں، شاہ ولی اللہ کے نزدیک ان باتوں سے صرف گھریلو بہبودی کا مقصد ہوتا ہے بلکہ بحیثیت مجموعی یہ معاشرہ کی بہبودی کے خطرناک حد تک مضر ثابت ہوتا ہے۔

۴) معاشرتی تعلقات:

اتحاد و یگانگت پیدا کرنے کے لئے مختلف خاندانوں کے افراد کے درمیان معاشرتی رابطے لازمی ہوتے ہیں ایسے رابطوں کی بنیادیں جو بہت سے خاندانوں کے ارکان کو ایک معاشرہ کی وسیع تر برادری میں متحد کر دیتے ہیں شاہ ولی اللہ کے نزدیک ان کی نفسیاتی، معاشرتی اور معاشی ضروریات میں ہوتی ہیں جو ان میں باہمی دوستی اور خیر سگالی پیدا کرتے ہیں۔

ایسے معاشرتی رابطے ان کی زندگی اجتماعی جبلتوں مدنیات الطبع کی تسکین کرتے ہیں اور اس دوران وہ خطرہ اور آفت کے نازک محات میں اپنی وقتی ضروریت کی تسکین کے ذرائع بھی متعین کرتی ہیں نیز وہ باہمی معاونت اور تعاون سے اپنی بعض معاشی ضروریت کی تسکین و تکمیل کر لیتے ہیں۔ یہ بات ان کے رشتہ داروں

سے محدود تر معاشرتی رابطوں اور رشتوں میں خاص طور پر عمل میں آتی ہے اور اسی میں وراثت اور وصیت کے قوانین و رسوم کی بنیادیں ملتی ہیں۔

پس موزوں معاشرتی کردار ہے جو باہمی دوستی کی حفاظت کرتا ہے اور اسے فروغ دیتا ہے اور اسے اچھے معاشرتی تعلقات استوار کرنے کے کام میں لاتا ہے۔ شاہ ولی اللہ کے نزدیک موزوں معاشرتی کردار سے ایک دوسرے کے یہاں ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہوتا ہے تحفوں کا تبادلہ ہوتا ہے دور رہنے کی صورت میں خط و کتابت ہوتی ہے باہمی امداد و معاونت (مالی یا کسی قسم کی) باہمی خیر سگالی اور ہمدردی کا مظاہرہ ہوتا ہے ایک دوسرے کے عیبوں کو نظر انداز اور لغزشوں پر درگزر کی جاتی ہے معمولی نوعیت کے معاملات جو لازمی طور پر ناگواریت اور تنازعہ کی شکل اختیار کر سکتے ہیں پر گہری توجہ دی جاتی ہے ور معاشرہ کو ایک عضویاتی کل میں منظم ہونے کے مقصد کو ناکام بنایا جاتا ہے۔

معاشرتی اور سیاسی کردار کے اصول

معاشی کردار:

ایک اعلیٰ زندگی اور زندگی بسر کرنے سہولتوں کا مجموعہ ایک ترقی پذیر معاشرہ کی ضرورت ہوتے ہیں۔ ان میں یہ اتنے ہی اہم ہوتے ہیں۔ جتنے کہ متذکرہ بالا نفسیاتی، معاشرتی اور دوسرے اہم مقاصد ہوتے ہیں اس ضمن میں موزوں یا اخلاقی کردار کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ ایک اعلیٰ معیار زندگی فراہم کرے جو معاشرہ اور فرد کی ضروریات کی مختلف اقسام کی تسکین سے بھی تعلق رکھتا ہے اسی نقطہ نگاہ سے معاشرہ کی معاشی زندگی کا موزوں یا اخلاقی کردار اخلاقیات کا ایک جزو ہوتا یہاں ایک ایسے معاشی کردار کی بنیاد کے مختصر خطوط بیان کیے جاتے ہیں جو اعلیٰ معیار زندگی اور معاشرہ کی بہبود سے تعلق رکھتے ہیں مزید دیکھے جا سکتے ہیں۔

اعلیٰ معیار زندگی:

ایک اعلیٰ معیار زندگی حاصل کرنا ایک اخلاقی کردار کیلئے ضروری ہے ترقی یافتہ سطحوں کے معاشروں

میں لوگوں کو نہ صرف تمام اشیاء صرف پیدا کرنی پڑتی ہیں بلکہ انہیں سامان تجارت کی پیدائش میں مقدار و نوعیت کے لحاظ سے جمالیاتی مذاق آرام وتسکین کے ذرائع کے مطابق اپنی کارکردگی میں اضافہ کرنا پڑتا ہے۔

صنعت وحرفت:

متذکرہ بالا مقصد مختلف قسم کی صنعتوں کو قائم کرنے سے حاصل ہوتا ہے اور ان میں وہ صنعتیں نمایاں ہو جاتی ہیں جو ضروریات زندگی فراہم کرتی ہیں جیسے زراعت کان کنی تعمیرات مکان پارچہ بافی کوزہ گری موہاری ماہی گیری اور زمین وسمندر کے دوسرے وسائل کو کارآمد بنانا خاص صنعتوں کے علاوہ ترقی یافتہ معاشروں میں لوگ ان صنعتوں میں کام کرتے ہیں جو سامان تعیش اور فنکارانہ اشیاء کی پیداوار کرتی ہیں فوج ورحکومت کی دوسری مدزمتیں وغیرہ روزی کمانے کے دوسرے وسائل وذرائع بھی فراہم کرتی ہیں۔

پیشے اور تجارت:

مختلف صنعتوں میں تقسیم محنت مختلف اقسام کے پیشوں اور تجارت کا فروغ دیتی ہے جس میں اشیاء کا مبادلہ وغیرہ اور اس کے لئے زر کے ایک معیاری نظام کی موجودگی اہم ہے۔

معاشی بہبودی:

معاشرہ کی معاشی بہبودی کے لئے لازمی ہے کہ جہاں تک ممکن ہوسکے کوئی بیکار نہ رہے اور وہ معاشرہ کی فلاح و بہبود کے لئے کوئی کام نہ کرے سرکاری خزانے یا لوگوں کی املاک و جائداد پر ایسے لوگوں کا بار نہ صرف مملکت کی مالیات کے لئے مضر رساں ہے بلکہ معاشرہ کی بہبودی بھی خطرہ میں پڑ جاتی ہے اور یہ نہ صرف غیر معاشی بلکہ غیر اخلاقی کردار بھی ہوتا ہے۔

سی نتیجہ میں املاک و جائداد کے سلسلہ میں جرائم واقع ہوتے ہیں مثلاً دھوکہ دہی، چوری ڈکیتی وغیرہ جوئے اور سودخوری کی اخلاق سوز عادات درسوم وجود میں آتی ہے۔

☆ ☆ ☆

باب پنجم حوالہ جات

۱۔	حجۃ اللہ البالغہ	شاہ ولی اللہ لاہور مکتبہ سلفیہ ۱۹۷۵ء	ص:۶۹، جلد دوم
۲۔	حجۃ اللہ البالغہ	محولا بالہ	ص:۱۱۷، جلد دوم
۳۔	حجۃ اللہ البالغہ	محولا بالہ	ص:۱۰۳، جلد دوم
۴۔	حجۃ اللہ البالغہ	محولا بالہ	ص:۱۱۱، جلد دوم
۵۔	حجۃ اللہ البالغہ	محولا بالہ	ص:۱۰۴، جلد دوم
۶۔	حجۃ اللہ البالغہ	محولا بالہ	ص:۶۹، جلد دوم
۷۔	حجۃ اللہ البالغہ	محولا بالہ	ص:۱۰۴، جلد دوم
۸۔	حجۃ اللہ البالغہ	محولا بالہ	ص:۴۳، جلد دوم
۹۔	القرآن الکریم	۲۰:۹	
۱۰۔	حجۃ اللہ البالغہ	محولا بالہ	ص:۱۱۵، جلد دوم
۱۱۔	حجۃ اللہ البالغہ	محولا بالہ	ص:۱۱۵، جلد دوم
۱۲۔	حجۃ اللہ البالغہ	محولا بالہ	ص:۱۱۶، جلد دوم
۱۳۔	حجۃ اللہ البالغہ	محولا بالہ	ص:۱۱۰، جلد دوم
۱۴۔	حجۃ اللہ البالغہ	محولا بالہ	ص:۱۱۱، جلد دوم
۱۵۔	القرآن الکریم	۲۱:۵	
۱۶۔	القرآن الکریم	۲۱:۴	
۱۷۔	حجۃ اللہ البالغہ	محولا بالہ	ص:۱۱۲، جلد دوم
۱۸۔	حجۃ اللہ البالغہ	محولا بالہ	ص:۱۰۷، جلد دوم

۱۹۔ لبدروالبازغہ شاہ ولی اللہ لاہور لچپت روڈ ۱۹۷۰ء ص ۷۰

۲۰۔ القرآن الکریم ۵ ۲۰

۲۱۔ حجتہ اللہ البالغہ محولا بالہ ص: ۱۰۳، جلد دوم

۲۲۔ حجتہ اللہ البالغہ محولا بالہ ص: ۲۰۲، جلد دوم

۲۳۔ اسلام کا اقتصادی نظام حفیظ الرحمن سیوہاروی لاہور ادارہ اسلامیات ۱۹۸۲ء ص ۳۶۴

۲۴۔ اسلام کا اقتصادی نظام محولا بالہ ص: ۳۶۵

۲۵۔ اسلام کا اقتصادی نظام محولا بالہ ص: ۳۶۸

۲۶۔ حجتہ اللہ البالغہ محولا بالہ ص: ۱۱۷، جلد دوم

۲۷۔ صحیح بخاری محمد بن اسماعیل باب البیوع کراچی قدیمی کتب خانہ ۱۹۷۰ء ص: ۲۵۷

۲۸۔ علماء ہند کا شاندار ماضی سید محمد میاں دہلی مکتبہ برہان اردو بازار، ۱۹۶۳ء ص: ۱۲

۲۹۔ حجتہ اللہ البالغہ محولا بالہ ص ۱۰۳، جلد دوم

۳۰۔ اقتصادی مسائل اور ان کا حل طفیل احمد قریشی کراچی انسائیکلو پیڈیا کارپوریشن فرید چیمہ، ۱۹۷۰ء ص: ۵۷

۳۱۔ القرآن الکریم ۳۰ ۲۲

۳۲۔ القرآن الکریم ۴۳ ۳۲

۳۳۔ حجتہ اللہ البالغہ محولا بالہ ص ۱۸۲

۳۴۔ اسلام کا اقتصادی نظام محولا بالہ ص ۴۴

۳۵۔ القرآن الکریم ۱۱، ۱۲

۳۶۔ القرآن الکریم ۵۱ ۲۹

۳۷۔ القرآن الکریم ۵۳ ۲

۳۸۔ معارف القرآن — مفتی محمد شفیع — کراچی ادارۃ المعارف ۱۹۷۸ء — ص:۱۳۵، جلد اول

۳۹۔ حجۃ اللہ البالغہ — محولا بالہ — ص:۲۰۲، جلد دوم

۴۰۔ القرآن الکریم — ۳۲:۴۳

۴۱۔ القرآن الکریم — ۳:۱۳

۴۲۔ القرآن الکریم — ۲۰:۶

۴۳۔ القرآن الکریم — ۱۰:۱۶

۴۴۔ حجۃ اللہ البالغہ — محولہ بالہ — ص:۲۰۲، جلد دوم

۴۵۔ حجۃ اللہ البالغہ — محولہ بالہ — ص:۸۸، جلد اول

۴۶۔ حجۃ اللہ البالغہ — محولہ بالہ — ص:۸۸، جلد اول

۴۷۔ حجۃ اللہ البالغہ — محولہ بالہ — ص:۶

۴۸۔ حجۃ اللہ البالغہ — محولا بالہ — ص:

۴۹۔ حجۃ اللہ البالغہ — محولہ بالہ — ص:۸۴، جلد اول

۵۰۔ حجۃ اللہ البالغہ — محولہ بالہ — ص:۱۲۲، جلد اول

۵۔ حجۃ اللہ البالغہ — محولہ بالہ — ص:۱۰۳

۵۲۔ القرآن الکریم — ۱۲:۳۲ تا ۸۸

۵۳۔ القرآن الکریم — ۲۳:۵۶ تا ۷۶

۵۴۔ القرآن الکریم — ۲۱:۳

۵۵۔ القرآن الکریم — ۳۳:۲۴

۵۶۔ القرآن الکریم — ۷:۵۷

۵۷۔ حجۃ اللہ البالغہ — محولا بالہ — ص ۸۸ جلد اول

۵۸۔ القرآن الکریم — ۴۱:۲۴

۵۹۔ مسند امام احمد — امام احمد بن حنبل — لبنان، بیروت الموسوعۃ الحدیثیہ ۱۹۹۵ء ص: ۲۱۹

۶۰۔ کنزل الایمان — مفتی حسام الدین — کراچی قدیمی کتب خانہ، ۱۹۸۵ء ص ۵۰

۶۱۔ صحیح بخاری — محولہ بالہ — ص ۴۵، جلد دوم

۶۲۔ حجۃ اللہ البالغہ — محولہ بالہ — ص ۸۸، جلد دوم

۶۳۔ القرآن الکریم — ۲۸۴:۲

۶۴۔ القرآن الکریم — ۲۰۵:۲

۶۵۔ علم معاشیات — پروفیسر اویس احمد — سکھر سندھ بورڈ ۱۹۷۳ء ص ۷۵

۶۶۔ علم معاشیات — محولہ بالہ — ص ۷۹

۶۷۔ علم معاشیات — محولہ بالہ — ص: ۸۴

۶۸۔ حجۃ اللہ البالغہ — محولہ بالہ — ص ۱۰۳، جلد دوم

۶۹۔ حجۃ اللہ البالغہ — محولہ بالہ — ص ۱۰۳، جلد دوم

۷۰۔ حجۃ اللہ البالغہ — محولہ بالہ — ص ۸۸، جلد دوم

۷۱۔ حجۃ اللہ البالغہ — محولہ بالہ — ص ۱۰۵، جلد دوم

۷۲۔ اسلام کا معاشی نظام — ڈاکٹر نور محمد غفاری لاہور مرکز تحقیق دیال سنگھ ٹرسٹ روڈ ۱۹۷۸ء ص: ۱۹۳

۷۳۔ صحیح مسلم — امام المسلم، باب المزارعہ کراچی قدیمی کتب خانہ ۱۹۵۶ء ص ۵۳۹

۷۴۔ حجۃ اللہ البالغہ — محولہ بالہ — ص ۱۰۵ جلد دوم

۷۵۔ شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات — خلیق احمد نظامی — لاہور ادارہ اسلامیات ۱۹۷۸ء ص ۳۲۵

۷۶۔ سنن ابی داؤد　جلال الدین سیوطی　کراچی کتابی لمزارعہ میر محمد کتب خانہ ۱۹۷۵ء　ص: ۳۲۵

۷۷۔ سنن ابی داؤد　محولہ بالہ　کتاب الخراج　ص: ۱۰۵ جلد دوم

۷۸۔ اسلام کا اقتصادی نظام　محولہ بالہ　ص: ۲۱۹

۷۹۔ صحیح بخاری　امام محمد بن اسماعیل　کتاب الجہاد والسیر　ص: ۲۴۷

۸۰۔ سنن ابی داود　محولہ بالہ　کتاب المزارعہ　ص: ۲۴۹

۸۱۔ کتاب الاحوالہ　ابوعبید قاسم　ادارہ تحقیقات اسلامی　ص ۵۶

۸۲۔ کتاب الاحوالہ　محولہ بالہ　ص ۵۶۰

۸۳۔ کتاب الخراج　امام ابو یوسف　دارالاصلاح ۱۹۸۱ء　ص ۱۳۲۰

۸۴۔ سنن ترمذی　محمد بن عیسی　باب احیاء الموات ملتان مکتبہ رحمانیہ ۱۹۶۹ء　ص: ۲۲۳

۸۵۔ کتاب الخراج　محولہ بالہ　ص: ۱۴۱

۸۶۔ کتاب الخراج　محولہ بالہ　ص ۳۷۰

۸۷۔ کتاب الخراج　محولہ بالہ　ص: ۱۳۹

۸۸۔ کتاب الاحوال　محولہ بالہ　ص ۲۶۸

۸۹۔ الفتاوی ہندیہ عالمگیری　شیخ محمد عربی العیمیہ قاہرہ مصر　زمکتب خانہ　۱۳۰۱ھ　ص ۳۴۰

۹۰۔ المبسوط　شمس الدین السرخسی　مصر مکتبہ سعادت ۱۳۳۱ھ　ص: ۱۲۴ جلد ۱۲

۹۱۔ اسلام کا اقتصادی نظام　محولہ بالہ　ص ۱۷۴

۹۲۔ کتاب الخراج　محولہ بالہ　ص ۸۸۰

۹۳۔ کتاب الخراج　محولہ بالہ　ص ۳۲۸

۹۴۔ کتاب الخراج　محولہ بالہ　ص ۸۴

۹۵۔ کتاب الخراج — محولہ بالا — ص: ۱۱۳

۹۶۔ کتاب الخراج — محولہ بالا — ص: ۱۱۰

۹۷۔ کنز الدقائق — ابن النجم زین العابدین — مطبع دار الکتب العربیہ قاہرہ ۱۹۶۷ء — ص: ۱۱۶

۹۸۔ کنز الدقائق — محولہ بالا — ص: ۱۷

۹۹۔ اسلام کا اقتصادی نظام — محولہ بالا — ص: ۱۸۶

۱۰۰۔ حجۃ اللہ البالغہ — محولہ بالا — ص: ۲۲۵

۱۰۱۔ حجۃ اللہ البالغہ — محولہ بالا — ص: ۳۴۲

۱۰۲۔ حجۃ اللہ البالغہ — محولہ بالا — ص: ۳۴۲

۱۰۳۔ حجۃ اللہ البالغہ — محولہ بالا — ص: ۳۱۷

۱۰۴۔ حجۃ اللہ البالغہ — محولہ بالا — ص: ۳۲۸

۱۰۵۔ حجۃ اللہ البالغہ — محولہ بالا — ص: ۲۲۵

۱۰۶۔ حجۃ اللہ البالغہ — محولہ بالا — ص: ۱۱۷

۱۰۷۔ اسلام کا اقتصادی نظام — محولہ بالا — ص: ۱۸۲

۱۰۸۔ حجۃ اللہ البالغہ — محولہ بالا — ص: ۳۱۱

۱۰۹۔ حجۃ اللہ البالغہ — محولہ بالا — ص: ۲۰۲

۱۱۰۔ حجۃ اللہ البالغہ — محولہ بالا — ص: ۲۱۷

۱۱۱۔ کتاب الاموال — ابو عبید قاسم — ص: ۲۱۸

۱۱۲۔ القرآن الکریم — ۳۴: ۹

۱۱۳۔ القرآن الکریم — ۳: ۱۰۴

۱۱۴۔ القرآن الکریم	۳:۵۹			
۱۱۵۔ القرآن الکریم	۲۰۶۳			
۱۱۶۔ القرآن الکریم	۸:۹			
۱۱۷۔ القرآن الکریم	۲۴:۲			
۱۱۸۔ مشکوٰۃ المصابیح	باب البیوع	کراچی قدیمی کتب خانہ	۱۹۸۰ء	ص۲۴۷
۱۱۹۔ کتاب الاحوال	محولہ بالا			ص۲۰۷
۱۲۰۔ اقتصادی مسائل اوران کا حل	محمد شفیق قریشی	انسائیکلوپیڈیا پاکستان	۱۹۷۰ء	ص ۱۳
۱۲۱۔ حجۃ اللہ البالغہ	محولا بالہ			ص ۱۰۶ جلد دوم
۱۲۲۔ حجۃ اللہ البالغہ	محولا بالہ			ص ۱۰۸ جلد دوم
۱۲۳۔ تفسیر ماجدی	مولانا عبدالماجد دریا آبادی	لاہور تاج کمپنی		ص۸۷
۱۲۴۔ حجۃ اللہ البالغہ	محولا بالہ			ص۱۳۰ جلد دوم
۱۲۵۔ القرآن الکریم	۱۳۰۰۷			
۱۲۶۔ القرآن الکریم	۲۳۵۰۶			
۱۲۷۔ حجۃ اللہ البالغہ	محولہ بالہ			ص۲۰۲ جلد دوم
۱۲۸۔ حجۃ اللہ البالغہ	محولہ بالہ			ص:۲۰۲ جلد دوم
۱۲۹۔ شاہ ولی اللہ اوران کا فلسفہ	مولانا عبیداللہ سندھی			ص ۲۰۲ جلد دوم
۱۳۰۔ علم معاشیات	پروفیسر [illegible] احمد			ص ۵،۱۰
۱۳۱۔ حجۃ اللہ البالغہ	محولہ بالہ			ص ۰ جلد اول
۱۳۲۔ حجۃ اللہ البالغہ	محولا بالہ			ص ۸۸ جلد اول

۱۳۳۔ حجۃ اللہ البالغہ — محولا بالہ — ص:۲۱۶

۱۳۴۔ حجۃ اللہ البالغہ — محولا بالہ — ص.۹۱

۱۳۵۔ حجۃ اللہ البالغہ — محولا بالہ — ص ۱۰۵

۱۳۶۔ تاریخ دعوت وعزیمت — سید ابوالحسن ندوی کراچی مجلس نشریات اسلام ۱۹۸۴ء — ص:۳۲۵

۱۳۷۔ تاریخ دعوت وعزیمت — محولا بالہ — ص.۳۲۸

۱۳۸۔ تاریخ دعوت وعزیمت — محولا بالہ — ص:۳۲۳

۱۳۹۔ تاریخ دعوت وعزیمت — محولا بالہ — ص:۳۳۴

۱۴۰۔ تاریخ دعوت وعزیمت — محولا بالہ — ص:۳۳۱

۱۴۱۔ حجۃ اللہ البالغہ — محولا بالہ — ص:۹۲

۱۴۲۔ حجۃ اللہ البالغہ — محولا بالہ — ص:۱۰۴

۱۴۳۔ حجۃ اللہ البالغہ — محولا بالہ — ص:۸۳

۱۴۴۔ حجۃ اللہ البالغہ — محولا بالہ — ص ۳۱۰

۱۴۵۔ حجۃ اللہ البالغہ — محولا بالہ — ص.۵۷

۱۴۶۔ حجۃ اللہ البالغہ — محولا بالہ — ص.۸۲

۱۴۷۔ حجۃ اللہ البالغہ — محولا بالہ — ص:۱۰۶

۱۴۸۔ حجۃ اللہ البالغہ — محولا بالہ — ص ۱۰۶

۱۴۹۔ حجۃ اللہ البالغہ — محولا بالہ — ص.۱۰۶

۱۵۰۔ حجۃ اللہ البالغہ — محولا بالہ — ص.۰۷

۱۵۱۔ حجۃ اللہ البالغہ — محولا بالہ — ص:۱۸۹

۱۵۲۔ حجۃ اللہ البالغہ محولا بالہ ص.۱۸۸

۱۵۳۔ اقتصادی مسائل اوران کاحل محولہ بالہ ص.۹۲

۱۵۴۔ شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات محولہ بالہ ص:۶۵

۱۵۵۔ حجۃ اللہ البالغہ محولا بالہ ص:۵۷

۱۵۶۔ حجۃ اللہ البالغہ محولہ بالہ ص.۱۸۴

۱۵۷۔ حجۃ اللہ البالغہ محولہ بالہ ص.۱۸۶

۱۵۸۔ حجۃ اللہ البالغہ محولہ بالہ ص:۱۸۶

۱۵۹۔ حجۃ اللہ البالغہ محولہ بالہ ص:۱۸۵

۱۶۰۔ حجۃ اللہ البالغہ محولہ بالہ ص:۱۸۶

۱۶۱۔ حجۃ اللہ البالغہ محولہ بالہ ص:۱۸۷

۱۶۲۔ حجۃ اللہ البالغہ محولہ بالہ ص:۱۹۰

۱۶۳۔ حجۃ اللہ البالغہ محولہ بالہ ص:۱۵۲

۱۶۴۔ حجۃ اللہ البالغہ محولہ بالہ ص:۸۶

۱۶۵۔ البدور البازغہ محولہ بالہ ص:۵۵

۱۶۶۔ حجۃ اللہ البالغہ محولہ بالہ ص:۹۳

۱۶۷۔ حجۃ اللہ البالغہ محولہ بالہ ص ۱۰۶

۱۶۸۔ حجۃ اللہ البالغہ محولہ بالہ ص ۶

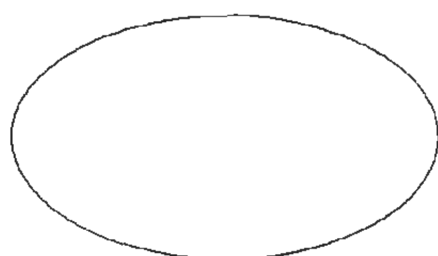
۱۶۹۔ حجۃ اللہ البالغہ محولہ بالہ ص ۴۵

۱۷۰۔ حجۃ اللہ البالغہ محولہ بالہ ص:۱۰۶

۱۷۱۔ اقتصادی مسائل اوران کاحل محولہ بالہ ص:۷۵

۱۷۲۔ اقتصادی مسائل اوران کاحل محولہ بالہ ص:۸۰

☆ ☆ ☆



باب ششم



باب ششم

فصل الف

انسان اور اس کا مقام

انسان کبیر یا دوسرے لفظوں میں انسانیت کا طبعی تقاضہ تو یہ ہے کہ ہر انسان میں اچھے اخلاق پیدا ہوں اور وہ برے اخلاق سے اجتناب کرے، اس حیثیت سے نوع انسانی ہر صحیح الفطرت انسان عدل انصاف، رحمدلی، حیا وغیرہ کو اچھا سمجھے گا اور چوری ظلم اور بے حیائی اور دوسرے برے اخلاق کو برا تصور کرے گا۔ خدا پاک کی عبادت اور اس کی نافرمانی کو بھی اسی پر قیاس کریں لیکن جب انسان عالم شہادت یا عالم عناصر میں آتا ہے تو اس کے ساتھ حیوانیت کا تقاضا بھی لاحق ہو جاتا ہے پھر وہ اپنی استعداد کے لحاظ سے دونوں قسم کے اوصاف کا حامل ہوسکتا ہے۔

انسان کبیر یا انسانیت کے اوصاف پہلے سے موجود تھے۔ اب اس میں حیوانیت کے اوصف پائے جاتے ہیں جیسا کہ کھانا، پینا، اپنی تندرستی کا خیال، اپنی تندرستی کو برقرار رکھنے کا دھیان ہوتا ہے اول کو ملکیت اور دوسرے کو حیوانیت کا نام دیا جاتا ہے ان دونوں اقتضاؤں کو اعتدال پر رکھنا انسانی فطرت ہے اسی لحاظ سے انسانی فطرت اقترابات اور ارتفاقات کو اعتدال پر رکھنے کا نام ٹھہرا۔

قرب حاصل کرنے کا نام اقتراب ہے اور یہ شوق انسان کے روحانی نقطہ نگاہ کا تقاضہ ہے، معاش کا اچھے طریقوں سے حاصل کرنا ارتفاق کہلاتا ہے لیکن اس کیلئے ضروری ہے کہ معاش کی تلاش میں کسی پر اور تعدی سے کام نہ کیا جائے یہ انسانی جسم کا تقاضہ ہے کہ جو حیوانیت اور ملکیت دونوں قوتوں کا متحمل ہے، گر حیوانیت کا تقاضہ دیکھیں تو اس میں سب صفات رذیلہ چھپی آجاتی ہیں کمزوروں پر ظلم وزبردستی اور اعمال کی جزاء وسزا سے غافل و باطنی نجاست سے ملوث ہونا قیامت کو بالکل بھلا دینا، حیوانیت خصلت لوگوں کیساتھ اٹھنا بیٹھنا وغیرہ۔

ملکیت اور حیوانیت دونوں قوتوں میں توازن برقرار رکھنا۔ اور ان کو افراط اور تفریط سے بچانا انسانی نوع کا تقاضہ ہے۔ اگر دونوں اقتضاؤں میں سے ایک کو کم کر دے گا تو انسانیت کی تکمیل نہ ہو سکے گی۔ ایک بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ انسانی طبیعت کا میلان حیوانیت کی طرف زیادہ ہوتا ہے اس لئے ضروری ہے کہ ملکیت کو حیوانیت پر غالب نہ رکھا جائے۔

شاہ صاحب کی رائے میں ہر جاندار کی تقدیر یہ ہے کہ اس میں صورت نوعیہ میں اس کو عطا ہوئی ہے مثلاً اونٹ کی تقدیر یہ ہے کہ اس کو صورت نوعیہ میں دے کر الہام کیا گیا ہے کہ اپنی تندرستی کو قائم رکھنے کے لئے یہ چیزیں کھائے اور یہ چیزیں نہ کھائے، مثلاً اگر گھوڑے کو گوشت کھانے کی عادت پڑے تو وہ بیمار پڑ جائے گا۔ اس طرح انسان کو بھی صورت نوعیہ عطا ہوئی ہے اور اسے یہ الہام ہوا کہ وہ حیوانیت اور ملکیت دونوں قوتوں کا باہمی توازن قائم رکھے اور حیوانیت پر ملکیت اور عقل کو غلبہ دے سوچ سمجھ کر اقتراب (خدا پرستی) اور ارتفاق (انسان دوستی) جیسے کاموں کو حاصل کرے اور اپنی سوسائٹی میں عزت کے ساتھ زندگی بسر کرے دوسرے کے حقوق میں دست درازی نہ کرے۔ اور اپنی تمام ہمت اور عقل اس بات پر غور کرے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے کس کام کے لئے پیدا کیا ہے اور کس لئے مجھے اس انسانی سوسائٹی میں رکھا ہے، یا دوسرے لفظوں میں اللہ تعالیٰ کو راضی رکھنے کے لئے کیا کام کیا جائے اور انسانی سوسائٹی کو کس طرح نفع پہنچایا جائے یہ ہے انسان کی تقدیر، اگر کوئی انسان اپنی تقدیر کے خلاف کام کرے تو وہ سزا کا مستحق ہوگا۔

یہ تو ظاہر ہے کہ انسان اپنے ہم جنس حیوانات کے ساتھ حیوانیت کے کاموں میں شریک رہتا ہے جیسے کہ بھوک، پیاس، شہوت، حرص، دشمن سے لڑنا وغیرہ یہ سب فضائل و عادات ہیں کہ انسان ان خصائل میں باقی حیوانات کے ساتھ شریک ہے انسان کو اسکے علاوہ دو بڑے جوہر بھی عطا ہوئے ہیں جن میں وہ منفرد ہے۔

پہلا جوہر تعالیٰ الٰہی کا اشتیاق اور محبت الٰہی ہے یہ جوہر اس کے روح کے اندر ودیعت رکھا گیا ہے اور دوسرا جوہر عقل ہے جو اس کے دماغ میں ودیعت ہے پھر اس کو جسم کثیف دے کر اس عالم شہادت میں

بھیجا گیا تا کہ یہاں تعلیم پا کر آخرت کے آنے والے جوہر کی پرورش کرے، کیونکہ اس نورانی نقطے کی پرورش اصل مقصود ہے، عالم جسمانی کثیف ہے اس کا اپنی جسمانی زندگی کی طرف میلان زیادہ ہوتا ہے اور پھر شیطان کی یہ شرارت جاری رہتی ہے کہ وہ حیوانیت کے دریچے سے وسوسہ ڈالتا رہے تا کہ انسان اپنی انسانیت سے گر جائے اس سے انسان کو ہر وقت بچنا چاہئے۔

انسان کے اندر تین اعضائے رئیسہ ہیں: دماغ، دل اور جگر۔ جگر انسانی بدن کا خادم ہے وہ جسمانی ضرورتوں کیلئے دماغ کا جزو تیار کرتا ہے پھر اس ضرورت کو پورا کرنے کا راستہ سوچتا ہے اور اس کو دل کے سامنے پیش کر دیتا ہے اگر قلب نے اس راستہ کو پسند کر لیا تو وہ اپنے لشکر یعنی اعضاء کو حکم دیتا ہے کہ اس ضرورت جگر کی طرف سوچے ہوئے راستہ سے پورا کریں۔ گر یہ تینوں اعضائے رئیسہ آدابِ شرعیہ ہیں۔ یا کسی اہل کی صحبت یا ریاضت سے مہذب ہو گئے اور ان کا ملکیت کی طرف میلان ہوا تو، ملائکہ کی طرف سے (جو انسان کی ملکی قوت کے خادم ہیں الہام ہونا شروع ہو جاتا ہے اور انسان کے حیوانیت کے تقاضے یعنی جگر کے تقاضے عقل اور قلب کے ذریعے اور مغلوب ہو جاتے ہیں اور اس سے سوسائٹی کے قوانین کی پابندی کا رجحان بھی پیدا ہوتا ہے۔

فلسفہ، الہیات میں یہ بات مسلم ہے کہ عام عناصر اور وجود میں دو مخفی طاقتیں موجود ہیں۔ ذاتی طور پر ان دونوں میں کوئی شر نہیں ہے، لبتہ نوع انسان کے لحاظ سے جو بھی مخفی طاقت انسان کے لئے ضرر رساں اور نقصان دہ سمجھیں گے۔

جب انسان کے اندر یہ تین اعضائے رئیسہ پیدا ہو تے ہیں تو غذاء کے ہضم در ہضم سے خون صالح پیدا ہوتا ہے اور قلب کے زور سے تمام بدن میں پھیل جاتا ہے اور دورہ کرتا ہے تا کہ ہر ایک عضو کو اس کی حیثیت کے مطابق حصہ ملتا رہے اس خون سے جو بخار پیدا ہوتا ہے اس کو روح حیوانی کہتے ہیں، اطباء اور ڈاکٹر اسی کی صحت اور تندرستی سے بحث کرتے ہیں ان کا مطمحِ نظر یہی روح حیوانی ہوتا ہے۔

لاتمناہی انسانی خواہشات:

ہر شخص اپنے اندر آرزوؤں اور تمناؤں کا ایک سمندر لے کر پیدا ہوتا ہے۔ سچ پوچھئے تو ان ہی آرزوؤں اور تمنؤں نے اس کی زندگی کو نت نئی مشکلوں کی گھتیوں میں الجھا دیا ہے۔ مگر اسی کشا کش سے دنیا میں چہل پہل ہے موجودہ زندگی میں جو مشکلیں پیدا ہوئیں، قرآن نے ان کا بھی جواب دیا ہے جس فطرت کو لے کر انسان اس دنیا میں قدم رکھتا ہے وہ خود مشکلات کی طالب ہے ارشاد ہوتا ہے:۔

ان الا انسان خلق هلوُعاً آدمی بڑا لالچی ہے بے صبرا پیدا کیا گیا ہے۔ (۱)

حدیثوں میں انسانی فطرت کو اس طرح پیش کیا گیا ہے کہ عبداللہ ابن زبیرؓ مکہ معظمہ میں منبر پر کھڑے ہوئے بیان کررہے تھے نبی ﷺ فرماتے تھے ''اگر بنی آدم کو ایک وادی سونے سے بھری ہوئی دی جائے تو دوسری خواہش کرے اور اگر دوسری دی جائے تو تیسری خواہش کرے گا۔ اور انسان کا پیٹ تو (قبر کی مٹی) کے سواء کسی چیز سے نہیں بھرتا اور گویا اسی کی تفسیر ہے جو کسی شاعر نے کہا ہے''

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پر دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

غرض یہ سب انسانی فطرت کی اسی خصوصیات کی تشریح ہے۔ پھر اسی وسیع حب کے سلسلے میں انسانی فطرت میں اور جذبہ توجہ کے قابل ہے جس کو قرآن نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:۔

زين للناس حبُ الشهوات من النساء و البنين و القنا
طير المقنطرة من الذهب و الفضة و الخيل المسومة و الانعام
و الحرث (۲)

لوگوں میں عورتوں بیٹوں، سونے چاندی کے ڈھیر، سدھے ہوئے
گھوڑے مویشی اور کھیتی سے محبت کرنے کی خواہش آراستہ کی گئی ہے۔

جیسا کہ ''زین'' کے فعل مجہول کا اقتضاء کے بظاہر خود انسان کا عیب نہیں۔ بلکہ جس نے اس کی فطرت بنائی ہے اسی نے ان چیزوں کو اس کی فطرت کے سامنے بنا سنوار کے پیش کیا ہے گویا ان اشیاء کی خواہش بھی فطری ہے۔

انسان دولت کا دلدادہ ہے:

فطرت کی حدود سے آگے نکل کر اس عقلی وجود نے اپنے اختیار سے ایک اور نظریئے کا اضافہ کیا ہے جس کا ذکر قرآن نے ان الفاظ میں فرمایا ہے کہ:

یحسب ان مالہ اخلدہ. (۳) وہ یہ سمجھتا ہے کہ مال اس کو خلد (دوام) بخشے گا۔

ظاہر ہے کہ اس کا مطلب یہ تو نہیں ہوسکتا کہ مال اس کو موت کے پنجے سے چھڑاتا ہے کیونکہ آئے دن وہ مالداروں کو مرتا ہوا دیکھتا ہے وہ کیسے یہ خیال کرسکتا ہے کہ مال کے وجود اور حیات کو دوام اور بقا عطا کرتا ہے بلکہ اس کا مطلب وہی ہے جو آدمی سمجھتا ہے کہ معاشی اعتبار سے جس شخص کا معاشرہ میں جو معیار قائم ہوجاتا ہے زندگی کے اس معیار کو خود اس کیلئے اس آئندہ نسلوں کے لئے جو چیز باقی رکھ سکتی ہے وہ مال و دولت ہی ہے۔

الغرض معیار زندگی کے دوام و بقاء کے ہر شخص ''سرمایہ'' کی فکر میں سرگرداں ہے اسلامی معاشیات نے اس سرگردانی کو جائز قرار دیا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ ایسی پابندیاں بھی لگا دیں کہ انسان اعتدال کی حد سے بڑھنے نہ پائے اور ''سرمایہ داری'' کی خرابیوں سے معیشت و معاشرت محفوظ رہے۔

اسلامی معاشیات نے انسان کو معاشی جدوجہد میں کس قدر آزادی دی ہے اور پیدائش دولت کے کس قدر راستے اس پر کھول دیئے ہیں تاکہ وہ خود دولت پیدا کرے اور اس دولت کی پیدائش کو بڑھا کر انسان کے معیار زندگی میں اضافہ کرے۔

انسان کا مقام شاہ ولی اللہ کی نظر میں:

(الف) حضرت شاہ ولی اللہؒ نے اپنی تحریروں میں معاشرتی علوم پر جگہ جگہ بحث کی ہے اور معاشی پہلو کو

خاص اہمیت دیتے ہوئے مختلف مقامات پر بھی بحث کی ہے جو آپ کے معاش افکار کا خلاصہ ہے اس خلاصے کے چند نکات پیش کئے ہیں تاکہ حضرت شاہ صاحبؒ کے معاشی افکار کا حاصل کلام پیش کیا جا سکے۔

انسان:

۱) انسان دوسرے حیوانوں سے تین باتوں میں ممتاز ہے۔

۲) اس میں ذاتی غرض (الرائی الجزئی) کی بجائے مفاد عامہ (الرائی الکلی) کو اپنانے کو خصوصیت موجود ہے۔

ب) وہ ہر قسم کی پاکیزگی اور صفائی اور ذوق جمال کی خصوصیت (ظرافہ) کا حامل ہے۔

ج) وہ اپنے علم کو بڑھاتا ہے اور اپنے ارادوں اور مقاصد کو پورا کرنے کی کوشش میں لگا رہتا ہے اگر انسان میں یہ تینوں خصوصیتیں موجود ہوں تو اس میں اور دوسرے حیوانوں میں کوئی فرق نہیں۔ (۴)

۲۔ فرد (انسان) اور معاشرہ دو الگ چیزیں ہیں۔ دونوں ایک جسم کی مانند ہیں۔ انسان جسم صغیر (چھوٹا جسم) ہے اور انسانیت (معاشرہ) جسم کبیر ہے۔ اس بڑے جسم (یعنی انسانیت) کے کسی بھی حصے (یعنی انسان) کو اگر تکلیف ہوئی ہے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ جسم بیمار ہے۔ اس طرح ایک انسان کی تکلیف پوری انسانیت کی تکلیف ہے۔ (۵)

شاہ ولی اللہ کی نظر میں انسانی اجتماعیت اور اقتصادیت:

شاہ ولی اللہؒ کے فلسفہ کے اس اصول کو پیش نظر رکھتے ہوئے ان کی شہرہ آفاق تصنیف ''حجۃ اللہ البالغہ'' کا مطالعہ کیا جائے یہ امر واضح ہوتا ہے کہ شاہ صاحب کے نزدیک انبیاء کرام کی تعلیمات نے جس طرح انسان کی باطنی استعدادوں کے تزکئے اور ان کی اصلاح کے بعد اسے اس قابل بنایا کہ وہ اللہ تعالی کے رویت کا اہل ہو سکے۔ اس طرح انہوں نے تہذیب جوارح (اصلاح اخلاق انسانی) کا فرض بھی ادا کیا۔ شاہ صاحب کی رائے میں نبوت کا مقصد انسان کی پوری زندگی کی اصلاح اور تہذیب ہے اور نبوت ''حسنۃ فی الدنیا

''اور'' حسنہ فی الاخرۃ'' دونوں پر حاوی اور دونوں کی نگران ہے۔

نبوت کی اگر یہ تعریف سمجھ میں آ جائے تو نبوت کے متعلق ابن خلدون نے جو نظریہ پیش کیا ہے اس کا غیر صحیح ہونا صاف نظر آ جائے گا۔ ابن خلدون کی رائے یہ ہے کہ انسان کو نبوت کی ضرورت فقط اس زندگی کے بعد جو آخرت کی زندگی ہے اس کے امور معلوم کرنے کے لئے پڑتی ہے۔ جہاں تک اس دنیا کی معیشت کا تعلق ہے انسان اپنے ان معاشی نظاموں کے لئے نبوت کا محتاج نہیں۔

نبوت کے متعلق ابن خلدون کے اس نظریئے نے عربوں کی ذہنیت پر بہت برا اثر ڈالا ہے۔ عرب ابن خلدون سے بڑھ کر اپنے ہاں کوئی اور حکیم نہیں پاتے ابن خلدون کا یہ خیال ہے کہ وہ نبوت کو محض آخرت کی گتھیاں سلجھانے کے لئے مانتا ہے اور اس کا خیال ہے کہ دنیاوی ترقی کے لئے انبیاء کی ضرورت ہی نہیں۔ لامحالہ ابن خلدون کا یہ فکر انسان کو دنیا کے معاملات میں انبیاء کی تعلیمات سے مستغنی کر دیتا ہے اور ظاہر ہے کہ اس کا نتیجہ افراد اور قوم کے حق میں کبھی خوش آئند نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ نبوت کو صرف امور اخروی کا مداوا سمجھنے سے یہ ہوا کہ آج کے عرب دنیاوی امور کو حل کرنے کے لئے با آسانی یورپی حکماء کے افکار اور ان کے پروپیگنڈے کے شکار ہو جاتے ہیں۔ لیکن شاہ صاحب کی حکمت پڑھنے والا اس مصیبت سے ہمیشہ محفوظ رہے گا۔

شاہ صاحبؒ نے انسان کے اعضائے رئیسہ کے ابتدائی لطائف کے بعد اس میں لطیفہ جوارح (انسانی اعضاء) بھی مانا ہے اس لطیفہ جوارح کو انسانی زندگی کی بنیاد قرار دینے سے شاہ صاحب نے ایک بڑا اہم مشکل کو بھی حل کر دیا ہے۔ عام طور پر تصوف اور فلسفہ کی ابتداء اخلاق سے کی جاتی ہے۔ گو انسان کی حیوانی زندگی کیلئے اقتصادی ضرورت بے شک مانی جاتی ہے لیکن انسانیت کی اعلیٰ زندگی کا (جو تصوف اور فلسفہ کا موضوع ہے) اقتصادی ضروریات کے ساتھ براہ راست تعلق تسلیم نہیں کیا جاتا انسانی زندگی کو اس طرح سمجھنے کا اثر یہ ہوا کہ ہماری سیاست بالکل کھوکھلی ہو گئی ہے ہمارے ہاں کے عقل مند اور وہ لوگ جو زیادہ با اخلاق مانے جاتے ہیں سیاسی سرگرمیوں سے الگ رہنا انسانیت کا کمال سمجھتے ہیں۔ چنانچہ ان کے نزدیک سیاست جو زندگی کے

روزمرہ کے کاموں کوسمجھانا اپنا مقصد قرار دیتی ہے ایک ادنیٰ اور نا قابل التفلت چیز ہے۔ اس کے برعکس شاہ صاحب نے حجۃ اللہ البالغہ میں متعدد مواقع پر اس امر کی وضاحت کی ہے کہ انسان کی اخلاقی زندگی کا دارومدار بہت حد تک اس کی اقتصادی زندگی کے حسن انتظام پر ہوتا ہے۔

چنانچہ ایک جگہ فرماتے ہیں:

''انسانیت کے اجتماعی اخلاق اس وقت بالکل تباہ و برباد ہو جاتے ہیں، جب کسی جبر سے ان کو اقتصادی تنگی پر مجبور کیا جائے اور وہ گدھے اور بیل کی طرح صرف روٹی کے لئے کام کریں جب کبھی انسانیت پر ایسی مصیبت آتی ہے تو خدا تعالیٰ انسانیت کو اس مصیبت سے نجات دینے کی کوئی نہ کوئی سبیل پیدا کر دیتا ہے اور اس کا اپنے کسی بندے کو الہام بھی کرتا ہے فرعون کی ہلاکت، قیصر کسریٰ کی تباہی اسی اصول پر نبوت کے لوازم میں شمار ہوتی ہے''(۶)

اگر انسانی زندگی کو اس کی اقتصادی ضروریات سے لے کر اس کی اعلیٰ اور ترقی یافتہ شکل تک ایک ہی سلسلے کی کڑیاں سمجھی جائیں تو انسانی زندگی کے لئے جو بھی فلسفہ بنے گا وہ مکمل ہوگا اور وہ تمام زندگی کو بحیثیت مجموعی ایک سمجھ کر اس کیلئے نظام مرتب کرے گا اس لئے انسانوں کی اجتماعی زندگی کے لئے ایک ایسا اقتصادی نظام ہونا چاہئے جو اس کی اقتصادی ضروریات کو پورا کرے۔ چنانچہ جب انسان اپنی حیوانی زندگی کی ضروریات سے مطمئن ہونگے اور ان کے پاس روٹی کپڑے مکان دھندوں سے کچھ فاضل وقت بچے گا تو پھر کہیں وہ اپنی اعلیٰ تر استعدادوں اور دوسرے بلند تر حقائق کی تکمیل کی طرف متوجہ ہوسکیں گے۔ ان حالات کے پیش نظر اگر یہ کہا جائے کہ جو نظام فکر یا فلسفہ اقتصادی زندگی کی ضرورتوں کو نظر انداز کرتا ہے وہ فلسفہ نہ تو مکمل ہے اور نہ صحیح تو یہ کہنا بے جا نہ ہوگا۔

انسانیت جب کبھی اس قسم کی اقتصادی مصیبت میں گرفتار ہو جاتی ہے تو اس کو نجات دینے کے لئے کبھی تو انبیاء کے ذریعے الہام خداوندی صورت پذیر ہوتا ہے تو کبھی یہ اہم کسی صدیق اور حکیم کو اپنے فلسفہ کا واسطہ بناتا ہے۔ چنانچہ ان کوششوں سے جب اجتماع انسانی کا یہ اقتصادی نظام درست ہو جاتا ہے تب کہیں جا کر انسانیت کے سامنے اپنے اخلاق کی تکمیل کے لئے راستہ کھلتا ہے۔ اس دنیا کی زندگی میں اگر انسان کے اخلاق اس طرح پایہ تکمیل کیلئے راستہ کھلتا ہے۔ اس دنیا کی زندگی میں اگر انسان کے اخلاق اس طرح پایہ تکمیل کو پہنچے تو مرنے کے بعد اس کو قبر اور حشر کی مصیبتوں سے نجات مل جاتی ہے۔

واقعہ یہ ہے حیات بعد الموت میں انسان کا جنت کی نعمتوں سے مستفید ہونا دراصل اسی تکمیل اخلاق کا نتیجہ ہے جو انسان کی دنیا کی اس زندگی میں کرتا ہے اب حیات انسانی کا درجہ تو دنیا کی یہ زندگی ہے انسان اس میں اپنے اخلاق کی تکمیل کرنے کے بعد دنیا سے رخصت ہو کر موت کی راہ طے کر کے جنت میں پہنچتا ہے یہ اس کی زندگی کا دوسرا درجہ ہے یہاں پہنچ کر اس کی ترقی کا قدم نہیں رک جاتا وہ اور آگے بڑھتا ہے اور زندگی کے تیسرے درجے میں قدم رکھتا ہے یہاں اسے ''رویت العالمین'' کی سعادت کبریٰ سے سرفراز ہونے کی صلاحیت حاصل ہو جاتی ہے۔

انسانی زندگی کی ابتداء سے لے کر اس کے آخری درجے تک اس حکمت کا سلسلہ کہیں نہیں ٹوٹتا اور شاہ صاحب کا نظام فکر اتنا جامع، عالمگیر اور ہمہ گیر ہے کہ انسان کی ابتدائی ضروریات سے (جنہیں ہم حیوانی زندگی کے لوازم کہتے ہیں) لے کر انسانیت کی ترقی کی آخری اور ارفع ترین منزل تک جتنے ارتقائی مراحل اور مقدمات ہیں ان سب کو اپنے اندر لے لیتا ہے۔ اب اگر اس نظام کی اساس نبوت کو مان لیا جائے اور جہاں نبوت نہ ہو وہاں انبیاء کے پیروؤں میں سے صدیق اور حکیم یہ کام کریں تو اس تشریح کے بعد نبوت انسانیت کیلئے کس قدر فطری چیز بن جاتی ہے۔

اور جیسا کہ عام طور پر غلطی سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ نبوت کا کام صرف اس زندگی کے بعد کے مسئلوں کو ہی

حل کرنا تھا اس کی بھی تردید ہو جاتی ہے پھر نبوت کی تعلیم صحیح معنوں میں: ''حسنة في الدنیا الاخرۃ '' کی حامل بھی بن جاتی ہے۔

یہ ہے شاہ ولی اللہؒ کی حکمت اور ان کے فلسفے کی روح میں بیان کیا گیا ہے۔

مادیت وروحانیت: (شاہ ولی اللہ کی نظر میں)

۱۔ انسانی کو خدا نے ترقی کرنے کا حکم دیا ہے۔ یہ ترقی مادیت اور روحانیت دونوں حالتوں میں کرنا ہوگی۔

۲۔ چنانچہ تمدن اور معاشرت کی ترقی ضروری ہے۔ جس کو ارتفاقات کہا جاتا ہے ذہنی اور روحانی ترقی بھی لازمی ہے۔ جس جو اقترابات کہا جاتا ہے۔ (۷)

معاشیات کا اثر اجتماعی اخلاق پر

(حکماء اور انفرادیت پسندی: یونانی حکماء)

حکماء عموماً اخلاقیات (Ethics) اور اجتماعیت (Sociology) پر بحث کرتے لیکن ان کو الگ الگ موضوع (Subject) بنا کر۔ چنانچہ یونانی حکماء میں سے ارسطو (Aristapole) افلاطون (Plato) سقراط (Socrates) اپی کیورس (Epicurus) وغیرہ نے ان دونوں موضوع لکھا ہے اور خوب لکھا ہے لیکن ان کے باہمی رابطہ پر کسی نے قلم نہیں اٹھایا۔

مسلم حکماء:

حکماء اسلام میں سے ابن مسکویہ، غزالی، سہروردی، راغب، کندی، فارابی، ابن سینا، ابن رشد، ابن خلدون، ابن عربی وغیرہ نے انفرادی اخلاقیات پر طویل بحث کی ہیں۔ ہر ایک نے خلق کی بال کی کھال اتاری ہے لیکن ان میں سے کسی نے بھی اجتماعی اخلاق اور معاشیات کو ملا کر بحث نہیں کی۔

مغربی حکماء:

ایسے ہی کانٹ (Kant) سپنسر (Spencer) شوپن ہار (Schupenhaur) ڈی کارٹ (Dsecart) مل (Mill) سپنوزا (Spinosa) اور ہیگل (Hagal) نے اجتماعیت اور اخلاقیات پر بہت کچھ لکھا ہے۔ لیکن ان کے باہمی ربط پر کسی نے روشنی نہیں ڈالی۔ (۸)

فرد اور جماعت:

پرانے اور نئے سب حکماء اتنی بڑی بات تو مانتے ہیں کہ انفرادی اخلاق کا ظہور اجتماع انسانی کے اندر ہی ہوتا ہے یعنی ایک فرد انسانی جب تک کسی سوسائٹی کے رکن کی حیثیت سے نہ دیکھا جائے اس کی اخلاقی بلندی نظر نہیں آتی ایک شخص جو جنگل میں رہتا ہے اپنے کسی خلق کے اظہار کا موقع نہیں پاتا اس لئے اسے نیک و بد کہنا اپنے اندر کچھ زیادہ معنی نہیں رکھتا لیکن جونہی وہ اجتماع میں داخل ہو جاتا ہے اس کے کاموں کا جائزہ لیتا ہے۔ اگر اس کے کاموں سے اجتماع کے کسی حصے کو نفع پہنچتا ہے تو کہا جائے گا وہ اچھا ہے اور اگر نقصان پہنچتا ہے تو کہا جائے گا کہ وہ برا ہے۔ اس ''نیکی'' اور ''بدی'' کی مقدار بھی اس بات پر موقوف ہے کہ اس کے کام کا اثر اجتماع کے تھوڑے حصے پر پڑتا ہے یا زیادہ حصے پر جتنا زیادہ حصہ اس کے کسی فعل سے اثر ڈالے گا اتنا ہی ''نیکی'' اور ''بدی'' کی مقدار کم یا زیادہ ہوگی۔

اس میں شک نہیں کہ فرد کی اپنی ہستی بھی خاص اہمیت رکھتی ہے لیکن وہ اجتماع کی تکمیل کے لئے ہے نہ کہ اس سے الگ رہ کر زندگی بسر کرنے کیلئے۔ حضرت امام الہند شاہ ولی اللہ دہلویؒ بھی گو ''فرد'' مانتے ہیں اور انسانی فرد کو اس کا حصہ یا جز قرار دیتے ہیں چنانچہ ان کا نظریہ امام نوع انسانی یہی فکر ظاہر کرتا ہے وہ اجتماع کی صحت اسے قرار دیتے ہیں کہ افراد کی افراط و تفریط ایک نقطہ اعتدال پیدا کرلے۔

چنانچہ فرماتے ہیں کہ:۔

وفراد الانسان کالاعضاء المعناية الازلية

الرحمانية المنعقده في صورة نوع الانسان فاذا صلحت الاعضاء كلها بالفرض ، فهو الصحة التامة ولا عتدال الحقيقي وهو كالممتن كما ان صحة زيد مثلاً بحيث في اخلاطه وفي اعضائه افراط و تفريط اصلا كا لممتنعة فكذلك انحصر الكلام في الهيئة القريبة من هذا لصحته وهي انجبار الافراط بالتفريط حتى يعود الكل بالهيئة الاجتماعيته صالحا، (۹)

ترجمہ: ''یعنی عنایت رحمانی انسانی نوع کی صورت میں آکر جمی تو تمام انسان افراد اس کے لئے اعضاء کی مانند بن گئے ۔ فرض کرو تمام اعضاء ور اجزاء صحت مند ہیں تو کہا جائے گا یہ کامل صحت اور حقیقی اعتدال ہے، مگر واقعہ یہ ہے اس قسم کی کامل صحت اور حقیقی اعتدال قطعی ناممکن ہے اس کی مثال یوں سمجھو کہ انسانی فرد کی صحت اس لحاظ سے دیکھی جائے کہ اس کے بدن کے اخلاط (Humours)) اور اعضاء میں کوئی کمی بیشی اور خرابی نہ ہو تو یہ بالکل ناممکن ہے پس صحت کے معنی صرف یہ ہو سکتے ہیں کہ جب اخلاط اور اعضاء کے ملنے سے صحت تامہ کے قریب قریب حالت پیدا ہو جائے ایسے ہی انسانی اجتماع کی صحت کا حال ہے اس کی صحت سے مراد بھی صرف یہی ہو سکتی ہے کہ انسانی افراد کی تفریط مل کر کوئی نقطہ اعتدال پیدا کر لے''۔ (۱۰)

غرض کوئی انسانی فرد محض فرد کی حیثیت سے ترقی کر ہی نہیں سکتا بلکہ اسے سوسائٹی کا فرد بن کر رہنا پڑتا ہے اس میں اس کی کئی حیثیت ہو سکتی ہیں وہ ایک کنبہ کا حصہ ہے، وہ شہر کا باشندہ ہے، وہ قوم کا فرد ہے۔ اور پھر

ایک بین الاقوامی اجتماع کا رکن بھی ہے اس طرح وہ پیچیدہ انسانی سوسائٹی کا پرزہ ہے وہ ان سب پر اثر ڈالتا ہے اور سب سے متاثر ہوتا ہے یہی اثر و تاثر (Action & Reaction) اس کے اجتماعی اخلاق کا نقطہء آغاز ہے۔

اجتماع کا اثر اخلاق پر:

اگر چھوٹے اور بڑے اجتماعات انسانی میں بسنے والے افراد کے اخلاق پر نظر ڈالی جائے تو دیکھنے میں آتا ہے کہ ان میں بین فرق ہے جوں جوں انسان بڑے بڑے اجتماعات کا رکن بنتا جاتا ہے اس کے اخلاق میں صفائی پختگی اور بلندی آتی جاتی ہے۔

حضرت امام کے نزدیک انسان تین باتوں میں حیوانوں سے ممتاز ہے

۱) اجتماع کے فائدے اور رائے کلی کے لئے بھی کام کرتا ہے۔

۲) وہ اپنے افعال اور کردار میں حسن کو سامنے رکھتا ہے۔

۳) وہ اپنے علوم کو تکمیل نفسی کیلئے استعمال کرتا ہے۔ (۱۱)

انسان کے علوم اور اخلاق پر رائے کلی اجتماعیت وغیرہ کا کیا اثر پڑتا ہے چنانچہ فرماتے ہیں کہ جب تمام علوم میں رائے کلی دخل پا لیتی ہے یعنی علوم کو اجتماعی نقطہ نگاہ سے دیکھا جاتا ہے تو حکمت کا مقام حاصل کر لیتے ہیں جب غصب رائے کلی کے ماتحت آ جاتا ہے تو وہ شجاعت کی شکل اختیار کر لیتا ہے جب بلند آواز میں حسن کا نمود داخل ہو جاتا ہے .تو وہ سمجھنے کے قابل کلام بن جاتی ہے۔

اور جب اس میں رائے کلی اور اخلاق کا کمال شامل ہو جاتا ہے تو فصاحت بن جاتی ہے، ایسے ہی تکبر برا ہے، جب تک وہ انفرادی نقطہ نگاہ سے دیکھا جاتا ہے جونہی وہ رائے کلی یا اجتماعی اخلاق کے اثر سے متاثر ہو جاتا ہے تو وہ عفت بن جاتا ہے اور ایک قابل تعریف جذبہ ہو جاتا ہے۔

معاشی حالات کا اثر عوام پر:

حضرت امام صاحب اخلاق کی تعمیر میں معاشی حالات کو بہت حد تک موثر قرار دیتے ہیں۔

چنانچہ فرماتے ہیں کہ:

اعلم ان الخواطر التی یجدھا الانسان فی نفسہٖ و تبعثہ علی العمل بموجبھا لا جرم ان لھا اسبابا کسنۃ اللہ تعالیٰ فی سائر الحوادیث والنظر و التجربۃ یظھر ان منھا مزاجہ الطبیعی المتغیر بسبب التدبیر المحیط بہ من الاکل والشرب ونحو ذالک (۱۲)

ترجمہ: یعنی بعض انسان کے دل میں چھوٹے چھوٹے خیالات پیدا ہوتے ہیں۔ وہ اسے کسی کام پر آمادہ کرتے ہیں ان کو خطرات کہتے ہیں۔ یہ خطرات خود بخود پیدا نہیں ہو جاتے بلکہ جس طرح کارالہی میں اس کا کوئی نہ کوئی سبب و جبلت ہے اور دوسرا انسان کا مزاج طبعی ہے۔ جو انسان کے معاشی ماحول کے اثرات مثلاً کھانے پینے وغیرہ سے بدلتا رہتا ہے۔ یہ مزاج طبعی بھی انسان کے دل میں کام کرنے کی خواہش پیدا کرنے کا ایک بڑا سبب ہوتا ہے''۔

گویا سماج کے معاشی حالات انسان کے اخلاق کے پیدا کرتے ہیں جو اس کے افعال کا نتیجہ ہوتا ہے بہت زبردست اثر رکھتے ہیں۔

ایک اور جگہ فرماتے ہیں کہ:

انما الاخلاق بالاحوال بالعلوم (۱۳)

یعنی انسانی اخلاق معلومات سے پیدا نہیں ہوتے بلکہ ان حالات
سے پیدا ہوتے جن سے انسان گھر کی زندگی بسر کرتا ہے۔

معاشیات کا مقام:

حضرت امام الہندؒ عام حکماء کے خلاف اصلاح نفس کا کام اخلاق کے بجائے ''لطیفہ جوارح'' سے شروع کرتے ہیں۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ انفرادیت پسند حکماء اور صوفیاء اخلاق کو ارتفاقات معاشیہ پر مقدم کرتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان کے ماحول کی اصلاح نہ ہونے کی وجہ سے تہذیب اخلاق کا کام عمومی تحریک نہیں بن سکتا اس کے برخلاف حضرت امام ولی اللہؒ نے تہذیب النفس (Self purification) سے پہلے ایک منزل لطیفہ جوارح مقرر کی ہے جس کو آپ مندرجہ ذیل الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔

در ظاہر شرح کہ مسمی بہ اسلام است، مبحوث عنہ لطیفہ جوارح است
تحقیق ایں لطیفہ آن است کہ قلب وعقل ونفس بہ اعتبار تقویم جوارح وفنا در
جوارح مسمی بہ لطیفہ جوارح مے گردد۔ وبرائے تفہیم ایں لطیفہ بریں۔ فقیر
شترے ظاہر ساختند کہ مشرف بر موت بود۔ غیر از مقے از حیات با او باقی
نماندہ وجمیع اکناف شاشہ بر زمین ضعیف گشتہ اما او وادر قطار سے بستہ بودند
او غیر از رفتن توتے نداست
پس تا آخر از باقی روح راہ مے رفت۔ بعد از آں بمرد از رفتن باز
رفتن باز ماندش ہماں، مردنش ہماں: دریں حال آگاہانید کہ ایں شتر فانی
است در لطیفہ جوارح مواخذہ واعمال برہمیں لطیفہ است۔ (۱۴)

ترجمہ: یعنی ظاہر شروع میں جسے اسلام کہتے ہیں، لطیفہ ء جوارح
سے بحث ہوتی ہے اس کی حقیقت یہ ہے کہ قلب، عقل اور نفس تینوں انسان
کے جوارح کے قیام کا سبب ہیں: انہیں کے ذریعے جوارح کام کرتے ہیں
اور یہ جوارح میں فنا ہوتی ہیں اس کا مصب یہ ہے کہ قلب، وعقل اور نفس
کے دو رخ ہیں ایک انسان کے اعضاء و جوارح کی طرف، اس کی تکمیل کا
نام شریعت ہے۔

دوسرا رخ اپنے منبع کی طرف اس کی تکمیل کا نام احسان، یا تصوف یا
طریقت ہے اس کا ایک اور نام فلسفہ الہی بھی ہے یعنی انسان کی یہ تینوں
قوتیں جب اس کے افعال ظاہری کی تہذیب کی طرف مائل ہوں، تو جن
قواعد کی پابندی کریں گی وہ ظاہری شرع ہے یہی انسان کی ارتقائی زندگی
ہے یہ تینوں قوتیں جب اپنے دوسرے رخ یعنی کے لحاظ سے دیکھی جاتی ہیں
تو جن عملی اصول کی پابندی کر کے ترقی کرتی ہیں وہ تصوف یا فلسفہ ء الہی
کہلاتے ہیں۔

تمام انسان ایک جیسی استعداد لے کر نہیں آتے۔ بعض لوگ چیزیں اپنی زندگی کی ابتداء میں سمجھ لیتے ہیں اور بعض نہیں سمجھ سکتے چنانچہ خاص تیز فہم لوگ ان قوتوں کے دوسرے رخ یعنی خدا تعالیٰ کے ساتھ ان کے تعلق کو براہ راست ابتداء عمر میں سمجھ لیتے ہیں اور اسی کے مطابق زندگی بسر کرتے ہیں لیکن عوام کو یہ حالت نہیں ہوتی وہ ان قوتوں کے اس رخ کی طرف توجہ ہو جائے لیکن جہاں تک ان کے افعال اور جوارح کی تہذیب کا تعلق ہے، حضرت امام صاحب کے نزدیک یہ بھی ان کی انسانیت کی تکمیل کا ایک اہم جز ہے۔

اور چونکہ اس کا تعلق انسانوں کی الشریت کے ساتھ ہے اس لئے اس کی اہمیت سمجھ لینی چاہئے اس

وقت معلوم ہوگا کہ اجتماعی زندگی اور معاشی حالات کا اصلاح کا جس سے انسان کے افعال پر گہرا اثر پڑتا ہے:
انسان کی اندرونی اصلاح سے کتنا قریبی تعلق ہے۔

''عام طور پر تصوف، اخلاق سے شروع کیا جاتا ہے معاشی ضرریات حیوانی زندگی کے لیے تسلیم کی جاتی ہیں۔ لیکن ان کا انسانیت سے تعلق تسلم نہیں کیا جاتا جس کی وجہ سے ہماری سیاست کھوکھلی ہوگئی ہے۔ اور ہمارے عقلمند اور با اخلاق لوگ سیاست سے الگ رہنا ہی اپنا کمال سمجھنے لگ گئے ہیں۔ (۱۵)

لیکن حضرت امام ولی اللہ نے انسانی معاشی ضروریات کو انسانیت جزو قرار دے کر سمجھا یا ہے کہ ان ضروریت کو قابوں میں لا کر عوام میں ایسا صحیح نظام قائم کرنا ضروری ہے جو ان کی ضروریت کو پوری کردے اور ان کے بعد ان کے پاس کچھ وقت بچ جائے تا کہ وہ اپنے اخلاق کی تکمیل پر غور کر سکیں (۱۶)

اخلاقِ اربعہ:

حضرت امام ولی اللہ دہلوی کے نزدیک لطیفہ ءجوارح سے مراد یہ ہے کہ انسان مندرجہ ذیل چار اخلاق اپنے اندر پیدا کرنے کی کوشش کرے۔ (۱۵)

۱) **طہارت** ۲) **اخباتِ**
۳) **سماحت** ۴) **عدالت**

طہارت: سے مراد، بدن، لباس، اور خیالات کی پاکیزگی۔

اِخبات: سے مراد، صحیح علوم سے اتنی وابستگی کہ انسان ان کی تکمیل کو اپنے لئے ضروری سمجھنے لگے اور پھر ان علوم کے منبع خداوند تعالیٰ کی اطاعت کو اپنے لئے لازمی قرار دے لے۔

سماحت: سے مراد یہ ہے کہ انسان دنیا کی چیزیں کھائے پئے، استعمال کرے، ان سے فائدہ اٹھائے، لیکن ان کی محبت اپنے دل میں نہ بٹھائے۔

عدالت: سے مراد نہ صرف یہ کہ انسان دوسرے کا حق نہ مارے بلکہ یہ بھی کہ اپنے اعمال وافعال

میں میانہ روی اختیار کرے۔

غور سے کام لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان چاروں خلقوں کی تکمیل اجتماع انسانی کے اندر رہ کر ہی ہوسکتی ہے اور انسان کا ماحول ان اخلاق کی تکمیل پر بہت گہرا اثر پڑتا ہے اس میں سے آخری خلق تو خصوصیت سے ایک ایسے نظام کا طالب ہے جس میں انسان نہ خود کسی پر ظلم کرے نہ کسی پر ظلم ہوتا برداشت کرے۔

حضرت امام الہندؒ اس ہی اجتماع انسانی کے قیام کا سبب بتاتے ہیں چنانچہ فرماتے ہیں کہ:

خصلت چہارم عدالت است وآں خصلتے است کہ صدور اقامت نظام عادل و سیاست کلی ازو سہل باشد (۷)

ترجمہ: یعنی چوتھی خصلت عدالت ہے انسانی سوسائٹی کے نظام عدل کا انحصار اسی پر ہے اسی سے اجتماع انسانی سیاست عالیہ پر چل سکتی ہے۔

شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں کہ عدالت میں ملکہ یا خصلت ہے جس سے ایسا نظام عدل پیدا ہوتا ہے، جو نہایت آسانی سے تدبیر منزل اور سیاست مدینہ اور بین الاقوامی اجتماعات کے قیام کا سبب بنتا ہے اس خلق کی بنیاد اس انسانیت پر ہے جس جمہوریت پسندانہ افکار پیدا ہوتے ہیں اور پھر آگے چل کر اپنے مناسب حال سیاست پیدا کر لیتے ہیں، جو حکمت الٰہی کے مطابق ہوتی ہے۔ (۸)

اقتصادی خرابی کا اثر اخلاق پر:

حضرت امام کے نزدیک اجتماع انسانی میں عدالت کے نہ ہونے ہی سے خرابی پیدا ہوتی ہے، جس سے انسانی سوسائٹی نہ صرف مادی لحاظ سے برباد ہو جاتی ہے۔ بلکہ وہ اپنے اچھے اخلاق بھی کھو بیٹھتی ہے۔ چنانچہ رومی اور ایرانی سوسائٹیوں میں اقتصادی لوٹ مار اور مرالی چیرہ دستیوں کا عام پر جو اثر پڑا۔

حضرت امامؒ فرماتے ہیں کہ۔

فلما کثرت ھذہ الاشغال تشبع فی نفوس الناس

....

هيأت خسيسة واعرضوا عن الاخلاق الصالحة (۱۹)

ترجمہ: یعنی امراء عیاشیوں میں اور غرباء چاپوسیوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور ان اعمال کی مشق کثرت سے ہونے لگتی ہے، تو نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ لوگوں کے نفوس میں گندی شکلیں جمع ہو جاتی ہیں۔ اور وہ اچھے اخلاق سے عاری ہو جاتے ہیں۔

اس سے ظاہر ہے کہ حضرت امامؒ کے نزدیک اقتصادی بدحالی اور معاشی اونچ نیچ عوام کی اخلاقی پستی اور بربادی کا باعث بنتے ہیں یہ ممکن ہے کہ بعض افراد اتنے بلند نظر، مضبوط کردار اور پختہ اخلاق ہوں کہ وہ معاشی بدحالی سے متاثر نہ ہوں اس کی بیسیوں مثالیں ہر ایک سوسائٹی میں مل سکتی ہیں۔ لیکن جماعت کے اخلاق پر معاشی بدحالی کا اثر ضرور پڑتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت امام الہند اجتماع اور افراد کی صالحیت قائم ہو جاتی رکھنے کیلئے معاشی نظام کی اصلاح ضروری قرار دیتے ہیں اور صاف صاف لکھتے ہیں کہ حکمت الٰہی جب نظام معاشی کی خرابی دیکھتی ہے تو انقلاب لانے والی قوتوں کو بروئے کار لاتی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ انبیاء کرام (Prophets) اجتماع انسانی کی اصلاح کیلئے آتے ہیں تو ان کا اصلی مقصد ان طریقوں (ارتفاقات) کی اصلاح ہوتی ہے، جن سے انسان خدا تعالیٰ کے ساتھ اپنے تعلقات بہتر بنا سکیں چونکہ اجتماعی معاشیات کا اجتماعی اخلاق پر بہت گہرا اثر پڑتا ہے اور سوسائٹی کا معاشی توازن خراب ہو جانے کے باعث عوام بداخلاقی میں مبتلا ہو جاتے ہیں اسلئے انبیاء کرام کو لازماً معاشیات و اقتصادیات کی اصلاح بھی کرنی پڑتی ہے تاکہ غلط خیالات، غلط رسوم عادات کی اصلاح ہو کر صحیح عادات پیدا ہو سکیں۔

چنانچہ حضرت امامؒ فرماتے ہیں کہ:

اگرچہ انبیاء کی تعلیم کی اصلی غرض و غایت یہی ہوتی ہے کہ خدا تعالیٰ کے ساتھ انسان کے تعلقات عبودیت مختلف طریقوں اور شکلوں سے قائم

کریں، لیکن اس کے ساتھ رسوم فاسدہ کی بربادی اور ارتفاقات صالحہ کے قیام کی ترغیب بھی ان کے مشن کا جز ہوتی ہے۔(۲۰)

یہ ملہمین اس لئے نہیں آتے کہ انسان کی اجتماعی زندگی کو توڑ پھوڑ کر محض رہبانیت قائم کریں۔ چنانچہ حضرت امامؒ فرماتے ہیں:

''اللہ ہرگز یہ نہیں چاہتا کہ انسان اپنی تمدنی زندگی کے دوسرے درجے (ارتفاق دوم) کو'' جس میں معاش، اکتساب، تدبیر خانہ، باہمی لین دین اور باہمی تعاون کی زندگی شامل ہے ترک کر دیں یا شہری زندگی سے بے توجہی برتیں اور نہ کسی نبی نے کبھی حکم دیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ انبیاء یہ کبھی حکم نہیں دے سکتے کہ لوگ پہاڑوں کی غاروں اور جنگلوں، بیابانوں میں جابسیں اجتماعی زندگی ترک کر دیں اور انسانی اجتماع کی بھلائی برائی سے الگ تھلگ زندگی بسر کریں۔ کیونکہ اس کا نتیجہ سوائے، وحشیت، بربریت کے اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ بلکہ انہوں نے ہمیشہ ارتفاقی و تمدنی زندگی میں اعتدال پیدا کرنے کی تلقین فرمائی ہے تاکہ نہ تو عوام ارتفاقات میں باریک بینیوں اور تکلفات میں مبتلا ہو کر عیاشی کی زندگی بسر کرنے لگیں اور نہ وحشی و بربری اقوام کی سی زندگی میں مبتلا ہو جائیں۔(۲۱)

نبی کریم صلعم کی بعثت کی غرض: اصلاح ارتفاقات

خود نبی آخرالزماں حضرت محمد رسول اللہؐ کی بعثت کے متعلق لکھتے ہیں کہ:

لما كان الشر السادى فى زمن ابراهيمؑ هو نسيان

التوحيد نزل الحق باز اء بازء باشاعة التوحيد وتوليد العبادات من طهارة و الصلوٰة و زكوٰة وحج و صوم و ذكر و لما كان الشرا السادى فى زمن نبينا محمد ﷺ اختلال الملل و انقلاب الا رتفات خاصة على اصحابها و كان الا مرشد ا قسى نزل الحق بازانه بالجهاد و اشاعة العبادات و توقيتها و القضاء بزوال دولته الروم العجم انتظام امر السوة كهيئته الارتفاق لارابع، ففتح ﷺ بابا من الخير لم يفتح قبلته و انتظمت به امة من الناس هى خير امة اخرجت للناس . (۲۲)

یعنی چونکہ حضرت ابراہیم کی قوم انسانیت توحید کو بھول چکی تھی اسلئے شر سے دنیا کو پاک کرنے کے لئے حق اس شکل میں نازل ہوا کہ توحید کی اشاعت کی جائے اور طہارت، نماز، زکواۃ، حج، روزہ، اور ذکر الٰہی کی عبادت کی جائیں۔

(ب) معاش اور معاشرہ

۱) معاشرہ کی ترقی کیلئے انسانوں کو معاشی طور پر خوشحال (ترفہ) ہونا ضروری ہے۔ (۲۳)

۲) اگر لوگ خوشحال نہیں ہوں گے وہ مذہب اور اخلاق کے ضابطوں کی پابندی نہیں کر سکیں گے اور معاشرہ تباہ ہو جائے گا اسلئے لوگوں کی خوشحالی کا مطلب ہے ایک صالح اور فطری معاشرے کا قیام۔ (۲۴)

۳) خوشحال معاشرے کی پہلی بات یہ ہے کہ لوگوں کی بنیادی ضرورتیں (حاجات اصلیہ) آسانی سے اور صحیح طریقے سے پوری ہوں۔ (۲۵)

اسلام اور قیصر وکسریٰ کے معاش نظام:

۱)انسان فطری طور پر لالچی ہے تھوڑی سہولت کے بعد زیادہ عیش کا خواہش مند ہے اس کو جب کوئی چیز ملتی ہے اس میں وہ اور اضافہ کا خواہاں ہوتا ہے۔(۲۶)

۲)زیادہ سے زیادہ دولت حاصل کرنے کی خواہش سے ایک خاص نظام پیدا ہوجاتا ہے اس میں ایک طبقہ بے انتہاء دولت کا مالک ہوتا ہے عیش وعشرت کا ہر سامان اس کو میسر ہوتا ہے اس نظام میں غریبوں اور مزدوروں کی کوئی عزت نہیں ہوتی وہ دولتمندوں کے رحم وکرم پر ہوتے ہیں ضرورتِ زندگی بھی صحیح طریقے پوری نہیں کرسکتے انھیں صرف اتنا کھانے اور پینے کے لئے ملتا ہے کہ وہ دولتمندوں کے لئے دولت پیدا کرنے کو زندہ رہ سکیں یہ نظام قیصر وکسریٰ کا نظام ہے۔

۳)اسلام اس قیصر وکسریٰ کے نظام کو توڑنے آیا تھا اور آنحضرتﷺ کے نظام دولت ونظام حکومت نے یہ نظام ختم کردیا۔(۲۷)

زمین سے متعلق خصوصی احکام

زمین اور انفرادی ملکیت:

اسلام کا معاشی نظام ''زمین'' اور ''ذرائع پیداوار'' میں انفرادی ملکیت کو تصور کرتا ہے، بے شک یہ صحیح ہے اور اس لئے صحیح ہے کہ اسلام کی نظر میں ''زمین'' یا ''ذرائع پیداوار'' کا انفرادی ملکیت ہونا دراصل معاشی نظام کے فساد کا باعث نہیں ہے بلکہ اس میں اعتدال وتوازن کا فقدان زراو فساد ہوتا ہے۔

نیز اس کے نزدیک انفرادی ملکیت کا انسداد انسان کے جائز انفرادی حقوق وفرائض پر ضرب کاری کے مترادف اور قوائے عملی میں جمود وتعطل پیدا کرنے کا موجب ہے کیونکہ اس قسم کا اقدام گویا فطرت کے ساتھ بغاوت ہے اس لئے وہ کہتا ہے کہ صحیح طریق کار یہ ہے کہ قوانین فطرت (نوامیس الٰہیہ) کی مطابقت کے ساتھ

ساتھ ایک جانب زمین اور وسائل پیداوار میں انفرادی ملکیت کو ایک حد تک جائز قرار دیا جائے اور دوسری جانب اجتماعی مفادات کے پیش نظر اس پر ایسے قیود و شرائط عائد کر دیئے جائیں کہ جو انفرادی ملکیت میں اعتدال و توازن حقیقی کو برقرار رکھیں کیونکہ علم الاخلاق اور علم الاجتماع دونوں کا یہ مسلمہ نظریہ ہے کہ ''انفرادی حقوق و فرائض میں اعتدال ہی اجتماعی حقوق و فرائض کے لئے بہترین کفیل ہے''۔

اسی نظریہ کے ماتحت اسلام نے معاشی نظام میں ''زمین کی انفرادی ملکیت'' کو چند شرائط و قیود کے ساتھ ایک حد تک تسلیم کیا ہے ان سے یہ حقیقت بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام کا معاشی نظام کس طرح سرمایہ دارانہ مفاسد کا انسداد اور سد باب کر کے عام رفاہیت و خوش حالی کے سامان مہیا کرتا ہے۔

زمینداری سے متعلق اسلامی ترغیبات:

اس سلسلہ میں پہلی بات یہ ہے کہ زمین کے متعلق انفرادی ملکیت کے جواز کو مان لینے کے باوجود اسلام کے معاشی نظام میں کیا زمینداری سسٹم (Land.ordism) کی موجودہ ظالمانہ روش کو صحیح تسلیم کیا گیا ہے۔ سوال کا جواب یہ ہے کہ نہیں، اسلام موجودہ زمینداری سسٹم کے ظالمانہ اور غلط طریقہ ہائے کار کو کیسے جائز قرار دے سکتا ہے جبکہ وہ اس مباح زمینداری کو بھی غیر پسندیدہ سمجھتا ہے جو انصار اور مہاجرین کے درمیان اجارہ اور مزارعہ کی صورت میں رائج تھی۔

> عن حنظلة بن قیسؓ سالت رافع بن خدیج عن کراء الارض فقال نهی رسول ﷺ عنه فقلت اباالذهب والورق قال فلا باس له (۲۹)
>
> حنظلہ بن قیسؓ کہتے ہیں کہ میں نے رافع بن خدیجؓ سے زمین کو اجارہ پر لینے کی بابت دریافت کیا انہوں نے فرمایا کہ رسول ﷺ نے ایسا کرنے سے منع فرمایا ہے تب میں نے کہا کہ چاندی اور سونے کے بدلے یعنی نقد لگان پر بھی منع ہے تو انہوں نے فرمایا اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔

عن بن عمرؓ رسول ﷺ خیبر الیھود علی ان جیملو ھا و یز رعو ھا و لھم شطر ما خرج منھا۔ (۳۰)

حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ رسولؐ نے یہود کو خیبر کی زمین اس شرط پر دی کہ وہ اس میں کاشت کریں اور جو پیداوار ہو وہ نصف بٹائی پر ہو۔

عن سعد بن ابی وقاص ان المزارع فی زمن النبی ﷺ کا نو ایکرون مزارعھم الخ۔ (۳۱)

حضرت سعد بن وقاصؓ سے روایت ہے کہ ، کان زمین نبی اکرم ﷺ کے زمانہ میں اپنی زمین کو کرایہ پر دیا کرتے تھے۔

ابو جعفرؒ فرماتے ہیں کہ

مدینہ منورہ میں مہاجرین کا کوئی گھر ایسا نہیں تھا جو تہائی یا چوتھائی حصہ کی بٹائی پر زمین کی کاشت نہ کرتا ہو اور حضرت علی ، سعد بن مالک ، عبداللہ بن مسعود ، عمر بن عبدالعزیز ، قاسم ، عروہ آل ابوبکر ، آل عمر ، آل علی اور ابن میسر بنؒ یہ سب اپنی زمینیں اسی طرح کاشت پر دیا کرتے تھے۔ (۳۲)

امام ابو یوسف فرماتے ہیں کہ:

اس مسئلہ میں جو بات سب سے بہتر ہم نے سنی ہے وہ یہ ہے کہ زمین کو نصف تہائی یا چوتھائی بٹائی کے طریقہ پر دینا جائز ہے یہی صحیح ہے اور میرے نزدیک زمین کا یہ معاملہ مال مضاربت کی طرح کا معاملہ ہے (یعنی جیسا کہ وہ باتفاق جائز ہے اسی طرح یہ بھی جائز ہے اور امام ابوحنیفہ بٹائی کی ان تمام صورتوں کو ناجائز فرماتے ہیں (اور صرف لگان پر دیتے ہیں)۔

یہ تمام روایات حدیثی وفقہی اس بات کو ثابت کرتی ہیں کہ صاحب زمین اگر خود کاشت نہ کرے تو دوسرے کو نقد لگان یا بٹائی پر دے سکتا ہے اوراس سے فائدہ اٹھا سکتا ہے لہٰذا دونوں قسم کی احادیث میں جو تضاد اور تخالف ہے جب تک وہ صاف نہ ہو جواز وعدم جواز کا فیصلہ ممکن ہے

چنانچہ تین جلیل القدر صحابہؓ نے اس تضاد کو دور کرنے کیلئے جو ارشاد فرمایا ہے وہ حسب ذیل ہے:۔

عن رافع بن خديج قال حدثني عماى انهم كانوا يكرون الارض على عهد النبي ﷺ بماينبت على الاربعاء او شي يستثنيه صاحب الارض فنهى النبي ﷺ عن ذلك الخ (۳۳)

رافع بن خدیج فرماتے ہیں کہ ہم سے ہمارے چچا زبیر بن رافع نے فرمایا: وہ نبی اکرم ﷺ کے زمانہ میں زمین کو کرایہ پر دیا کرتے تھے اور یہ شرط لگایا کرتے تھے کہ نہر کے قریب کے حصہ کی زمین کی پیداوار ہماری ہوگی یا اس معین حصہ زمین کی پیداوار ہماری رہے گی جب نبی اکرم کو یہ معلوم ہوا تو ایسا کرنے سے منع فرمادیا۔

عن رافع بن قال نهانا رسول الله ﷺ امر كان لنانا معا اذا كانت لاحد انا رمن ان يعطها بعض خرجها او بدر اهم قال اذا كانت احد كم ارض فليمنعها اخاه او ليزرعها (۳۳)

حضرت رافع بن خدیج نے فرمایا کہ رسول ﷺ نے ہم کو ایک ایسے کام سے منع فرمایا جو بظاہر ہمارے لئے نفع بخش تھا، وہ یہ کہ ہم میں سے کسی شخص کے پاس زمین ہوتو وہ اس کو بٹائی پر دے، یا نقد کان پر اور فرمایا کہ اگر تم میں سے جس کے پاس زمین ہو وہ خود کاشت کرے یا اپنے مسلمان بھائی کو کاشت کے

لئے احسان کے طور پر مفت دے۔

عن عربی ابی هزیرة قال رسول اللہؐ قال بعن کانت له ارض فلیزرعها او لیمنعها فان ابیٰ فلیمسک روضه. (۳۴)

حضرت ابو ہریرہؓ نے فرمایا: رسول اللہ نے ارشاد فرمایا جس شخص کے پاس زمین ہو اس کو چاہئے کہ خود کاشت کرے یا دوسرے کو کاشت کے لئے مفت احسان کے طور پر دیدے اور اگر دونوں میں سے کوئی بات کرنے کو آمادہ نہیں تو اپنی زمین کو یونہی روکے رکھے۔

عن جابر بن عبدالله قال نهی رسول الله ﷺ ان یوخذ الارض اجر او خطه.

حضرت جابر بن عبداللہؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہؐ اس بات سے منع فرمایا ہے کہ زمین کے ذریعہ سے عوض کا یا اجارہ کا فائدہ اٹھایا جائے۔

وکان ابن عمرؓ یکری مزرعه علی عهد النبی ﷺ وابی بکر وعمرو عثمان وحیدر امن اصارة معاویة فلماسمع حدیث رافع ترک فلک خشیته ان یکون النبی ﷺ قد احدث فیه شیا. (۳۵)

حضرت عبداللہ بن عمرؓ اپنی زمین کو عہد نبی کریم ﷺ سے لے کر ابتداء امارت حضرت معاویہؓ تک کاشت کاروں کو لگان پر دیتے رہے مگر جب انہوں نے رافع کی حدیث سنی تو اس عمل کو اس خوف سے ترک کردیا کہ شاید نبی اکرمؐ نے آخری عمر مبارک میں یہ فیصلہ دیا ہو۔

☆ ☆ ☆

باب ششم

فصل دوم حصہ الف

خوش حال معاشرے کے بنیادی اصول

حضرت شاہ ولی اللہؒ کے نزدیک اجتماعیت کو قائم رکھنے کیلئے ایک صحیح معاشرے کی ضرورت ہے اگرچہ ہر معاشرہ اپنی ساخت اور عمل کے اعتبار سے کامل نہیں ہوتا لیکن یہ اس کا نقص اور فساد اس کے زوال کا سبب بنتا ہے اسیئے ریاست کے سرکردہ لوگوں پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ اپنے اجتماعی معاشرے میں ان باتوں کی نشاندہی کریں جو معاشرے میں فساد اور فتنے کا سبب بنتی ہوں اور ایسی اصلاحات و درستگیات کو لائیں جن کے ذریعے معاشرے کی اجتماعی صورت صحت اور تندرستی کی طرف مائل ہو جائے اگرچہ یہ بات کہیں مسلم نہیں ہے کہ معاشرے کی اصلاح کا معیار کیا ہونا چاہئے جو پورے کے پورے اجتماعی مفکرین کو پسند ہوں۔ اجتماعیت کے مفکر بعض رسم و رواج کو غیر مفید سمجھتے ہیں اور بعض لوگ انہیں بہتر یہ مشکل اس لئے پیش آئی ہے کہ معاشرے کے مختلف پہلو ہیں اور ہر ایک پہلوں میں نیکی اور برائی دونوں پائیں جاسکتی ہیں لیکن یہ بات اس وقت آسان ہوسکتی ہے جب پورے معاشرے کو اجتماعی نظر سے دیکھا جائے ان کی بیماری اور علاج بھی اسی نظر سے کیا جائے۔ (۳۶)

اگرچہ بہت ساری بیماریاں اور خرابیاں معاشرے کو خراب کرسکتی ہیں لیکن معاشی بدحالی اخلاقیات پر زیادہ اثر انداز ہوتی ہیں جس سے معاشرہ خراب ہو جاتا ہے معاشی عدم توازن اخلاقی امراض کا بنیاد بن جاتا ہے شاہ صاحب معاشرے کے فساد کا اور سبب یہ بیان کرتے ہیں کہ معاشرے افراد اپنی دوسرے درجہ کی ضروریات کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں اور اس میں اتنے منہمک ہو جاتے ہیں جس کی وجہ سے ابتدائی اور بنیادی ضروریات سے ان کی توجہ ہٹ جاتی ہے اس طرح پہلے ارتقائی منزل یا معاشرتی سطح پر وجود میں آنے

والے رسم و رواج کو بالکل نظر انداز کیا جاتا ہے اسی طرح معاشرے کی تیسری ارتقائی منزل پر لوگ دوسرے درجہ کی رسم ورواج کو چھوڑ دیتے ہیں اسی طرح یہ نقائص مرکزی اجتماعیت کو نقصان پہنچاتے ہیں۔ اور پورے کا پورا انسانی معاشرہ کمال اور ترقی سے محروم رہ جاتا ہے۔

اسی وجہ سے شاہ صاحب نے اس بات پر زیادہ زور دیا ہے کہ معاشرے کے ہر سطح پر جو رسم ورواج وجود میں آتے ہیں ان کو پورا کیا جائے تاکہ لوگوں میں برابری کا احساس رہے اگر معاشرتی نظام کے سرکردہ لوگ جو ریاست کے یا اجتماعیت کے اہم رکن ہیں اگر وہ مذکورہ سطحی نظام کو نظر انداز کردیں تو پورے کی پوری اجتماعیت ناقابل عمل ہوجاتی ہے اسلئے اہل ریاست اور مفکرین پر یہ لازم ہے کہ وہ ملک میں رسومات اور فکری نظام کو عادلانہ طور پر رائج کریں۔ (۳۷)

معاشرے میں رسومات کی حیثیت:

شاہ ولی اللہؒ کے ہاں انسانی کے معاشرتی نظام میں رسومات کی بڑی اہمیت ہے جس طرح انسان کے جسم میں دل کی حیثیت، وہ فرماتے ہیں کہ شریعت کا پہلا مقصود یہی رسوم ہیں جن پر الہامات کے اصول کا عمل ہوتا ہے۔ شارع اور شارع کے اشارات بھی انہیں ہی کی طرف مائل ہوتے ہیں اگرچہ انبیاء علیہم السلام کا یہ طریقہ حسن رہا ہے کہ وہ عبادت کے طریقوں کو مروج کرنے کے ساتھ ساتھ فاسد اور خراب رسوموں کی بیخ کنی کرتے ہیں۔

کیونکہ جب کسی معاشرے میں صحیح رسومات کا رواج ہوجائے اور اگر ان رسومات کو اپنی زندگی کے لوازمات میں سمجھیں تو پھر وہ نظام یا اجتماعیت زیادہ دیر تک چلتی ہے اسلئے یہ کہنے میں حرج نہیں ہوگا کہ انبیاء کا لایا ہوا اور ان کی قائم کردہ رسومات انسانی معاشرے کے مفید ہونے کیلئے ضروری ہوتے ہیں اسلئے ان کی لائی ہوئی شریعت اور مروج کی ہوئی دیرتک باقی رہتی ہیں۔

معاشرے کو درست کرنے کی صورت:

شاہ ولی اللہؒ کے نزدیک اصلاح رسومات میں سے سب سے پہلے یہ بات ضروری ہے کہ اصلاح کا عمل سب سے پہلے بری چیزوں اور خراب رسومات کو سرے سے ختم کیا جائے اور ان رسومات یا عادتوں کے نعم البدل ایسی رسومات کو لایا جائے جو لوگ ان کو جلدی قبول کرلیں اور ان کے برحق ہونے کا ان کو یقین ثبوت ہو جائے۔ (۳۸)

رسومات کی حقیقت کو جاننے والے کا معیار:

حضرت شاہ ولی اللہ رحمتہ اللہ علیہ کے ہاں وہ شخص بڑی اہمیت کا حامل ہے جو راسخ فی العلم کی حیثیت رکھتا ہے اور وہ شریعت کے رموز، رسومات کے فوائد بہتر جان سکتا ہے یعنی نکاح، طلاق، معاملات زیب و زینت، لباس اور عدل وانصاف، تعزیر وحدود اور دیگر مال وغنیمت کے بارے میں زیادہ عالم ہوتا ہے۔ اور ان کے مکلّف یا غیر مکلّف ہونے کی صورتوں سے آگاہ ہوتا ہے لیکن وہ انسان جو فرداً یا اجتماعاً راسخ فی العلم کی حیثیت تک نہیں پہنچتے۔ وہ شریعت اور رسومات کی حدود وقیود سے اتنے واقف نہیں ہوتے جس کی وجہ سے تردد کے شکار ہو جاتے ہیں۔

انبیاءکرام کی لائی ہوئی اصلاح رسومات معاشرے کیلئے زیادہ مفید ہوتی ہیں:

اجتماعیت یا رسومات کی حدود میں انبیاء علیہم السلام کا قائم کردہ معاشرہ نہایت مفید ہوتا ہے اور ان کی لائی ہوئی رسومات کی کوئی مثال نہیں ملتی اور انہوں نے ایسی کوئی نئی چیز معاشرے میں نہیں لی جو لوگوں میں وہ چیز خود یا اس کی نظر نہ ہوں البتہ انبیاء علیہم السلام نے جاہلیت کے دور میں قائم کردہ اور مروج رسومات اور رواج کو ختم کیا ہے اس طرح عبادات اور احکامات کے وقت اور کیفیت مبہم تھی انہیں آسان اور باقاعدہ بنایا اور چیزیں مفید ہونے کے باوجود جاہلیت کے دور میں ختم ہوگئی تھیں ان کی اشاعت کا اہتمام کیا

۔ جس طرح حضورﷺ کے درود سے پہلے ایران اور روم میں سالہا سال تک بادشاہت اور سلطنت رہنے کی وجہ سے جو خرابیاں طویل مدت سے چلی آرہی تھیں، اسلام کے آنے اور اس کی اشاعت سے وہ ختم ہوگئیں اسی طرح عربوں کے قبل اسلام قائم کردہ معاشرے کی اصلاح بھی اسلام کے ذریعے ہوئی۔ (۳۹)

بعض اوقات رسومات محبت اور یک جہتی کا ثبوت بھی دیتی ہیں:

رسومات کا وجود اجتماعیت کیلئے بہت ضروری ہے اور یہ رسومات اتنی مضبوط ہوتی ہیں کہ ان کو مروج کرنے یا ختم کرنے کیلئے ایک کامل جدوجہد کی ضرورت پڑتی ہے۔ اسلئے کہ انسانی معاشرے میں رسومات کے ذریعے محبت والفت کا وجود آتا ہے۔ شاہ صاحب نے رسومات کے دیگر فوائد بھی لکھے ہیں ان میں سے رسومات کا ایک نفسیاتی جائزہ بھی پیش کیا ہے۔ جب معاشرہ میں نفرت اور کدورت عروج پر ہو تو ان کے درمیان ایسی رسومات یا طریقوں کو لایا جائے جن کے ذریعے ان کے اندر محبت پیدا ہو۔

قرآن کے نازل ہونے کا اہم مقصد معاشی ناانصافی اور اصلاح رسومات:

شاہ صاحب نے رسولﷺ کے انتخاب کو نزول قرآن کا مقصد قرار دینے کے بعد معاشی ناانصافی انصافی اور عدم مساوات کی برائیوں کو بھی کھول کر بیان کیا ہے۔

وہ فرماتے ہیں کہ:

> ''جس طرح سوسائٹی میں اقتصادی امن نہ ہو اس میں طرح طرح کے روگ پیدا ہوجاتے ہیں نہ وہاں عدل وانصاف قائم ہوسکتا ہے ورنہ مذہب اپنا اچھا اثر ڈال سکتا ہے۔
>
> شاہ صاحب یہ بھی فرماتے ہیں کہ جس طرح رسولﷺ کے زمانے میں قیصر وکسری نے متمدن دنیا کو مصیبت میں مبتلا کر رکھا تھا اور مشیت الٰہی نے اس فاسد نظام کو ختم کرنا چاہا تھا۔ اسی طرح ان کے زمانے

میں معاشرہ بھی ان اجتماعی بیماریوں سے کھوکھلا ہو چکا تھا اور اس کا مٹنا بھی یقینی نظر آتا تھا۔"(۴۰)

شاہ صاحب کے انقلابی پروگرام کا اہم اصول اصلاح معاشرہ:

شاہ صاحب کے اصلاحی اور انقلابی پروگرام کا اہم اصول اقتصادیات میں توازن اور معاشیات میں مساوات کو واضح کرنا تھا شاہ صاحب کے نزدیک مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کے لئے اقتصادی توازن ایک ضروری امر ہے اور ہر انسانی جماعت کو ایک ایسے اقتصادی نظام کی ضرورت ہے جو اس کی ضرویات زندگی کا کفیل ہو جب لوگوں کو اپنی معاشی ضرورتوں سے فراغت نصیب ہوتی ہے تو پھر وہ اپنے خالی وقت میں جو ان کے پاس کسب معاش کے بعد بچ رہتا ہے زندگی کے ان شعبوں کی ترقی اور تہذیب کی طرف متوجہ ہو سکتے ہیں جو انسانیت کے اصل جوہر ہیں لیکن اگر ان کی اقتصادی ضروریت بھی فراہم نہ ہوں اور ان کی وجہ سے انسان کی جدوجہد اس کی حیوانی نظام کے درست اور متوازن ہونے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ حیات دنیاوی میں انسانیت کے اجتماعی اخلاق تکمیل پذیر ہوتے ہیں۔

چنانچہ حضرت شاہ صاحب حجۃ اللہ البالغہ میں تحریر فرماتے ہیں۔

> "انسانیت کے اجتماعی اخلاق اس وقت برباد ہو جاتے ہیں جب کسی جبر سے ان کو اقتصادی تنگی پر مجبور کر دیا جائے اس وقت گدھوں اور بیلوں کی طرح روٹی کمانے کیلئے کام کرینگے جب انسانیت پر ایسی مصیبت نازل ہوتی ہے تو خدا تعالی انسانیت کو اس سے نجات دلانے کیلئے کوئی راستہ ضرور الہام فرماتا ہے یعنی ضروری ہے کہ قدرت الہیہ انقلاب کے سامان پیدا کرکے قوم کے سر سے ناجائز حکومت کا بوجھ اتار دے۔"(۴۱)

سیاسی اور سماجی قوت کا دار مدار فکری فلسفہ پر ہوتا ہے:

سیاسی قوت اجتماعی قوت سے پیدا ہوتی ہے اور معاشرتی طاقت کا دار و مدار کسی نہ کسی فلسفہ پر ہوتا ہے جس معاشرہ کی بدولت کبھی نہ کبھی درجہ کمال تک پہنچ جائیں گے اور اس کی معاشرتی، اخلاقی اور اقتصادی حالت بھی اچھی ہوگی کیونکہ ذہنی قوتوں کا اثر معاشرت اور اقتصادیت پر پڑتا ہے۔

اگر سماجی حالت (جو کہ ذہنی قوتوں کی پیداوار ہے اچھی ہوگی تو اس سے جو سیاسی قوت پیدا ہوگی وہ بھی اچھی کہلائے گی۔)(۴۲)

مساویانہ تقسیم دولت اور شاہ ولی اللہ:

یہاں یہ بھی سوال پیدا ہوتا ہے کہ عصر حاضر میں ہر معاشی نظام کی بنیاد کسی نہ کسی فلسفہ پر رکھی گئی ہے تو کیا شاہ صاحبؒ اپنی تالیف میں جو عادلانہ تقسیم مال و دولت اور مساویانہ نظام پر زور دیتے ہیں اس نظام کے لئے کوئی فلسفہ بھی پیش کرتے ہیں یا نہیں؟ (۴۳)

اس کا جواب یہ ہے کہ بے شک شاہ صاحبؒ نے ایک جامع فلسفہ بھی پیش کیا ہے لیکن یہ فلسفہ کارل مارکس کے فلسفہ کی طرح اختراعی نہیں ہے۔ شاہ صاحب کے فلسفہ کی بنیاد مذہب اسلام کی حکمت اور اس کی روح پر ہے۔

شاہ صاحب کے نزدیک سب سے پہلے انسان کے لئے معاشی خوش حالی کا ہونا ضروری ہے۔ جب انسان کو ذہنی سکون ملتا ہے تو اس کے بعد وہ مذہب اور اخلاق کا متلاشی ہوتا ہے جس کی حقیقی علت یہ ہے کہ جب تک انسان انسانیت کے اس اولین مرتبہ یا مقام کو نہیں پہنچ سکتا شریعت اور اخلاق کی ذمہ داری انسانوں پر ہوتی ہے، حیوانوں پر نہیں ہوتی۔

شاہ صاحب اور کارل مارکس کا نظریہ بنیادی فرق :

کارل مارکس کا نظریہ مادی فلسفہ سے مشابہت رکھتا ہے کارل مارکس بھی اخلاقی اصولوں اور مذہبی احکام کو معاشی ضروریات کے تابع قرار دیتا اور کہتا ہے کہ اخلاقی اصولوں اور معاشی تقاضوں میں باہمی ٹکراؤ ہوتا ہے تو اخلاق و مذہب کو اپنی شکست مان کر معاشیات کا غلبہ ماننا پڑتا ہے۔

اصل حقیقت یہ ہے کہ معاشیات کے متعلق شاہ صاحب کے بتائے ہوئے اصولوں کی بنیاد قرآن حکیم کی حکیمانہ تعلیم اور اسکی عملی شکل پیغمبر علیہ اسلام کی سنت پر ہے اس لیے فلسفہ ولی اللہی میں معاشی ضروریات اور مذہب واخلاق کے متصادم ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

شاہ صاحب نے اسلام کی تعبیر دو لفظوں 'اقتراب' اور 'ارتفاق' سے فرمائی ہے خدا پرستی اور انسان دوستی کو انسانیت کی بنیاد قرار دیا ہے انسان دوستی کی صحیح تعبیر مال و دولت کی مساویانہ تقسیم ہے تاکہ یہ نہ ہو معاشرہ میں ایک تو شخص عظیم سرمایا دار بن جائے اور دوسرے کو کھانے کیلئے روٹی اور اوڑھنے کے لئے کپڑا بھی میسّر نہ ہو۔ (۴۴)

فاشتی نظام کا خلاصہ:

فاشتی نظام میں سارا زور فرد کی انفرادیت، صلاحیت اور ذاتی ملکیت پر دیا جاتا ہے اس سے اجتماعی اور تمدنی زندگی میں معاشی فلاح اور خوش حالی کا ہونا ناممکن نہیں تو دشوار ضرور ہے یہی وجہ ہے کہ شاہ صاحب رحمہ اللہ علیہ کے فلسفہ میں جملہ کائنات فی الحقیقۃ ایک وحدت ہے جس کا نام ان کے فلسفہ میں "شخص اکبر" ہے۔ (۴۵)

لامحدود انفرادی ملکیت معاشرہ کے لئے مفید نہیں:

شاہ صاحب رحمتہ اللہ علیہ زمین اور قدرتی وسائل پیداوار مثلاً معدنیات، کانوں اور چشموں وغیرہ

پر نامحدود غیر مشروط انفرادی ملکیت کے قائل نہیں ہیں بلکہ وہ ان سب کو بنیادی طور پر اللہ تعالیٰ کی ملکیت تصور کرتے ہیں اور ان تمام وسائل پر بنی نوع انسان کا یکساں طور پر حق تسلیم کرتے ہیں جن سے ہر شخص انتفاع کر سکتا ہے صرف ضروری ہے کہ وہ شخص کسی کو کوئی ضرر پہنچائے اس زمین پر قبضہ کر لے۔

شاہ صاحب رحمتہ اللہ علیہ کے نزدیک زمین کی حیثیت درحقیقت مسجد، رباط سرائے اور مسافر خانہ کی ہے جو نمازیوں، مسافروں اور راہ گیروں کے لئے وقف ہوتے ہیں جو شخص پہلے آئے گا پہلے حق دار ہوگا۔

زمین کا اصل مالک وہ ہے جو اس کو آباد کرے:

مذکورہ اصول مردہ اور بنجر زمین میں بھی ہے یعنی:

من احیا أرضا میتۃ فھی لہ،

(جو مردہ و بنجر زمین کو آباد کرے گا وہ اسی کی ہے۔)

دولت کا اصل سبب محنت ہے:

شاہ ولی اللہ کے نزدیک دولت کی اصل بنیاد محنت ہے کاشت کار مزدور قوت کا سبب ہیں، باہمی تعاون مدنیت (شہریت) کی روح رواں ہے جب تک کوئی شخص ملک و قوم کیلئے کام نہ کرے ملک کی دولت میں اس کا حصہ نہیں۔ (۴۶)

غلط رسومات معاشی ہمواری کا سبب ہوتی ہے:

جواء، سٹہ اور عیاشی کے اڈے ختم کئے جائیں جن کی موجودگی میں تقسیم دولت کا صحیح نظام قائم نہیں ہو سکتا اور بغیر اس کے کہ وہ قوم اور قوم کی دولت میں اضافہ ہو دولت بہت سی جیبوں سے نکل کر ایک طرف سمٹ آتی ہے۔ (۴۷)

محنت کشوں کی خوشحالی میں محنت ضروری ہے:

مزدور کاشتکار اور جو لوگ ملک و قوم کیلئے دماغی کام کریں، وہ دولت کے اصل مستحق ہیں انکی وجہ سے ہی ترقی اور خوشحالی ہے جو نظام ان کو دبائے وہ ملک کیلئے خطرہ ہے اس کو ختم ہو جانا چاہیے ضرورت مند مزدور کی رضا قابل اعتبار نہیں جب تک اس کی محنت کی وہ قیمت ادا نہ کی جائے جو امداد باہمی کے اصول پر لازم ہوتی ہے۔ (۴۸)

جس نظام میں محنت کشوں کو انصاف میسر نہ ہو ختم کیا جائے:

جو معاشرہ محنت کی صحیح قیمت ادا نہ کرے، مزدوروں اور کاشتکاروں پر بھاری ٹیکس لگائے، قوم کا دشمن ہے اس کو ختم ہونا چاہیے۔ (۴۹)

خوشحال معاشرے کے بنیادی معاشی اصول: شاہ صاحب کی نظر میں

۱) دولت کی پیداوار کیلئے جب افراد مختلف معاشی اداروں (زراعت، تجارت، صنعت) سے وابستہ ہوتے ہیں تو ان میں نہ کوئی ''مالک'' ہوگا نہ ''مزدور'' اور نہ کوئی ''کسان'' یہ لوگ ایک دوسرے کے ساتھ ''معاہدہ معاشی'' میں بندھے ہوتے ہیں ایک فریق اگر دوسرے کے حقوق کا خیال نہ کرے یا کسی بھی ذریعے سے ظلم کرے تو دوسرے کو حق ہوگا کہ وہ اس معاہدے سے الگ ہو جائیں اور ایسا نظام بنائیں یا دوسرے کے معاشی اداروں کو اس طرح ترتیب دیں جس سے آئندہ ظلم نہ ہو سکے۔ (۵۰)

۲) اس معاشی معاہدے کی بنیاد ''اصول معاونت ہے''۔ امداد باہمی کے اس اصول کے مطابق معاشی اداروں میں کام کرنے والے اور کرانے والے ایک دوسرے کے معاون ہے۔

زراعت میں مزارعت، مخابرت اور مساقات وغیرہ اس معاونت کی مختلف شکلیں ہیں تجارت میں اس معاونت کیلئے مخابرت، مفاوضت اور شرکت الوجوہ وغیرہ بہترین صورتیں ہیں صنعت میں ان صورتوں

میں سے کسی کو اپنایا جا سکتا ہے لیکن شرکت الصنائع کا طریقہ معاونت کے اصول کی ایک اچھی شکل ہے (۵۱)

۳) معاشرے میں معاونت (امدادی باہمی) کے اصول کو اس طرح رائج کیا جائے کہ کوئی شخص کسی دوسرے شخص کے لئے معاشی تنگی کا باعث نہ بننے پائے اور ہر شخص خوشحال زندگی بسر کر سکے۔

۴) ایسے معاشی اداروں کو جڑ سے ختم کرنے کی ضرورت ہے جن میں ''دولت کی پیدائش'' بغیر محنت کے ہو یا جن کے ذریعے دولت کو چند ہاتھوں میں جانے کا موقع ملے یا جن کے ذریعے دولت کو ذخیرہ کر لیا جا سکے۔ (۵۲)

(۵) معاشی استحکام اور صحیح معاشی نظام کیلئے ضروری ہے کہ ہر شخص اپنے لئے خود کمائے اور کوئی نہ کوئی کام کرے دوسروں پر بوجھ نہ بنے۔ (۵۳)



باب ششم حوالہ جات

۱۔ القرآن الکریم۔ ۷:۷۰

۲۔ القرآن الکریم۔ ۳:۷

۳۔ القرآن الکریم۔ ۳:۱۰۴

۴۔ حجۃ اللہ البالغہ — شاہ ولی اللہ — لاہور — مکتبہ السلفیہ ۱۹۷۵ء — ص ۱۹، جلد اول

۵۔ حجۃ اللہ البالغہ — محولا بالا — ص:۲۱۹ جلد دوم

۶۔ تاریخ دعوت عزیمت — سید ابوالحسن ندوی — کراچی — مجلس نشریات اسلام ۱۹۸۳ء — ص ۱۵۳ جلد پنجم

۷۔ شاہ ولی اللہ کا فلسفہ — عبید اللہ سندھی — لاہور — سندھ ساگر اکیڈمی ۱۹۴۶ء — ص:۱۶۵

۸۔ شاہ ولی اللہ کا فلسفہ — محولا بالا — ص:۱۶۴

۹۔ البدور البازغہ — شاہ ولی اللہ — لاہور — سندھ ساگر اکیڈمی ۱۹۷۰ء — ص:۴۹

۱۰۔ البدور البازغہ — محولا بالا — ص:۴۸

۱۱۔ البدور البازغہ — محولا بالا — ص:۲۸

۱۲۔ حجۃ اللہ البالغہ — محولا بالا — ص:۲۷

۱۳۔ البدور البازغہ — محولا بالا — ص:۴۱

۱۴۔ اطاف المقدس — شاہ ولی اللہ — ص:۲۹۰

۱۵۔ الفرقان ولی اللہ نمبر — عبید اللہ سندھی — ص:۳۲۰

۱۶۔ الفرقان — مولانا عبید اللہ سندھی — لاہور — سندھ ساگر اکیڈمی ۱۹۸۳ء — ص:۳۲۰

۱۷۔ ہمعات — شاہ ولی اللہ — ... — مجلس بیت الحکمت ۱۹۶۰ء — ص:۴۹

۱۸۔ حجۃ اللہ البالغہ — محولا بالا — ص:۲۸ جلد دوم

۱۹۔	حجتہ اللہ البالغہ	محولا بالہ		ص: ۱۰۶ جلد اول
۲۰۔	حجتہ اللہ البالغہ	محولا بالہ		ص ۴۰ جلد اول
۲۱۔	حجتہ اللہ البالغہ	محولا بالہ		ص: ۱۰۴ جلد اول
۲۲۔	تفہیمات	شاہ ولی اللہ		ص: ۶۰، ۶۱
۲۳۔	حجتہ اللہ البالغہ	محولا بالہ		ص ۹۷
۲۴۔	حجتہ اللہ البالغہ	محولا بالہ		ص: ۲۲۲ جلد اول
۲۵۔	حجتہ اللہ البالغہ	محولا بالہ		ص ۹۰۸ جلد سوم
۲۶۔	حجتہ اللہ البالغہ	محولا بالہ		ص: ۸۸ جلد اول
۲۷۔	حجتہ اللہ البالغہ	محولا بالہ		ص ۲۷ جلد دوم
۲۸۔	ترمذی شریف	عیسی محمد بن عیسی	لاہور مکتبہ رحمانیہ	ص: ۴۴۸
۲۹۔	صحیح مسلم	محمد بن مسلم	باب المزارعہ، ۱۹۸۳ء	ص: ۲۲۴
۳۰۔	صحیح مسلم	محولا بالہ		ص: ۴۵۲
۳۱۔	صحیح بخاری	محمد بن اسماعیل بخاری	باب مزارعہ، قدیمی کتب خانہ ۱۹۷۰ء	ص ۲۲۴
۳۲۔	صحیح بخاری	محولا بالہ		ص: ۳۱۱
۳۳۔	سنن ابی داؤد	ابوداؤد سجستانی	قدیمی کتب خانہ ۱۹۸۲ء	ص: ۴۸۵
۳۴۔	صحیح بخاری	محولا بالہ		ص: ۲۷۳
۳۵۔	صحیح بخاری	محولا بالہ		ص: ۲۷۵
۳۶۔	حجتہ اللہ البالغہ	محولا بالہ		ص: ۳۱۱
۳۷۔	حجتہ اللہ البالغہ	محولا بالہ		ص: ۴۰ جلد اول

۳۸۔ حجۃ اللہ البالغہ	محولا بالہ	ص:۴۰ جلداول
۳۹۔ حجۃ اللہ البالغہ	محولا بالہ	ص:۴۹ جلداول
۴۰۔ حجۃ اللہ البالغہ	محولا بالہ	ص ۵۰ جلداول
۴۱۔ تنخیص سماجی انصاف اور اجتماعی غلام مصطفیٰ قاسمی حیدر آباد شاہ ولی اللہ اکیڈمی ۱۹۸۶ء (شاہ ولی اللہ کی نظر میں)		ص ۴۰
۴۲۔ حجۃ اللہ البالغہ	محولا بالہ	ص:۱۰۴ جلداول
۴۳۔ تنخیص سماجی انصاف اور اجتماعی	محولا بالہ	ص ۵۵
۴۴۔ تنخیص سماجی انصاف اور اجتماعی	محولا بالہ	ص:۶۰
۴۵۔ تنخیص سماجی انصاف اور اجتماعی	محولا بالہ	ص:۶۵
۴۶۔ تنخیص سماجی انصاف اور اجتماعی	محولا بالہ	ص:۶۶
۴۷۔ حجۃ اللہ البالغہ	محولا بالہ	ص:۶۲ جلددوم
۴۸۔ شاہ ولی اللہ اور ان کا خاندان	حکیم محمد احمد برکاتی لاہور مجلس اشاعت ۱۹۷۶ء	ص:۲۰۵
۴۹۔ شاہ ولی اللہ اور ان کا خاندان	محولا بالہ	ص:۲۰۶
۵۰۔ شاہ ولی اللہ اور ان کا خاندان	محولا بالہ	ص ۲۰۶
۵۱۔ حجۃ اللہ البالغہ	محولا بالہ	ص ۱۰۴ جلددوم
۵۲۔ حجۃ اللہ البالغہ	محولا بالہ	ص:۱۰۸ جلددوم
۵۳۔ حجۃ اللہ البالغہ	محولا بالہ	ص:۱۰۶ جلددوم
۵۴۔ تفہیمات الہیہ	شاہ ولی اللہ	ص:۳۱۸ جلددوم
۵۵۔ حجۃ اللہ البالغہ	محولا بالہ	ص ۱۰۴ جلداول

۵۶۔ حجۃ اللہ البالغہ — محولہ بالا — ص:۱۰۴ جلد اول

۵۷۔ شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات — محولہ بالا — ص:۵۱

۵۸۔ شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات — محولہ بالا — ص:۵۱

۵۹۔ حجۃ اللہ البالغہ — محولہ بالا — ص:۱۰۴ جلد اول

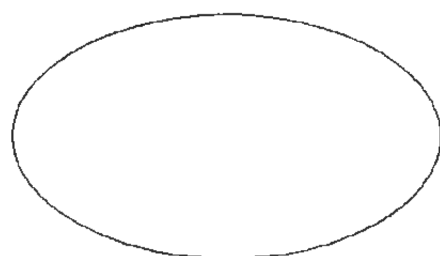
۶۰۔ حجۃ اللہ البالغہ — محولہ بالا — ص:۱۰۳ جلد دوم

۶۱۔ حجۃ اللہ البالغہ — محولہ بالا — ص:۱۰۵ جلد دوم

۶۲۔ شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات — محولہ بالا — ص:۵۶

۶۳۔ تفہیمات الٰہیہ — محولہ بالا — ص:۱۲۰ جلد دوم

☆ ☆ ☆



باب هفتم



باب ہفتم

فصل الف

ہماری معیشت اس کا طریقہ کار اور احتیاجات

(Our Economy How it Work)

ہماری معیشت کے نمایاں پہلو:

موجودہ دور میں ہماری روزانہ زندگی ہماری معیشت کی آئینہ دار ہے کیونکہ اس میں ہمیں ان تمام مسائل سے دوچار ہونا پڑتا ہے جو معاش انسان کی ذات اس کے اعمال اور اس کی جدوجہد کے علاوہ ملک اور قوم کے معاشی مسائل سے متعلق ہیں زندگی بسر کرنے کیلئے کوشش ضروری ہے، تاکہ اس کے ذریعے ہم دولت پیدا کرسکیں ان کوششوں کو ہم معاشی جدوجہد کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ قومیں بھی آجکل معاشی جدوجہد میں مصروف ہیں۔ اور وہ پیدائش دولت میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے میں کوشاں ہیں۔ اس معاشی جدوجہد میں خواہ وہ کسی پیمانے پر کیوں نہ ہوں تین نمایاں پہلو پائے جاتے ہیں۔

۱) معاشی جدوجہد احتیاجات کی وجہ سے کی جاتی ہے۔

۲) معاشی جدوجہد۔ پیدائش دولت کی صورت میں ظاہر ہوتی ہیں۔

۳) معاشی جدوجہد کے نتیجے میں جو اشیاء پیدا ہوتی ہیں وہ احتیاجات کی تسکین کے لئے پیدا ہوتی ہیں۔

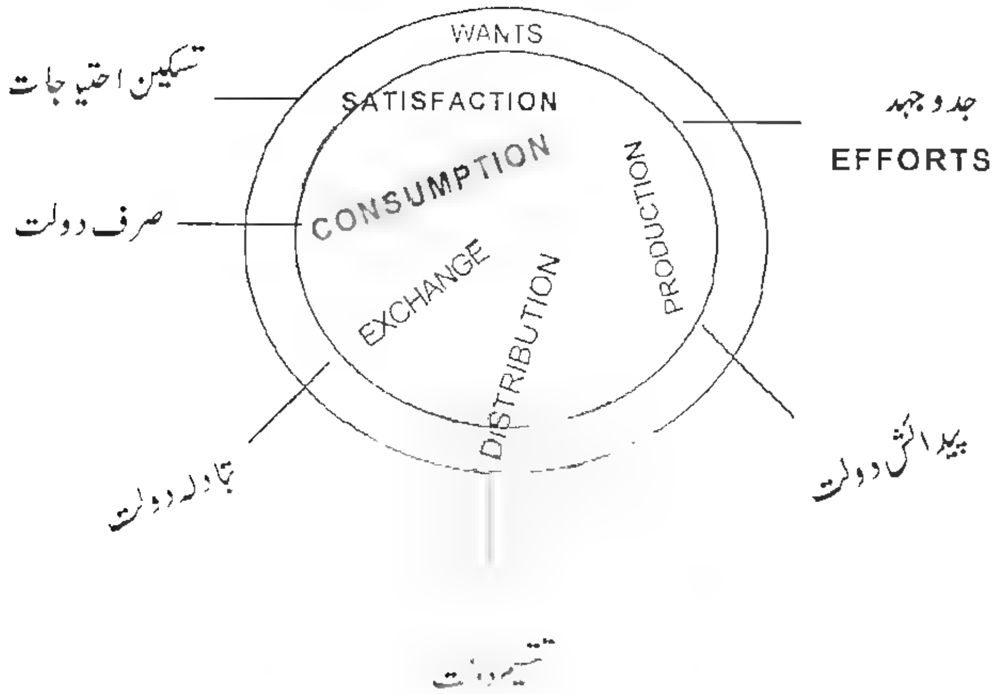
انسانی احتیاجات ہی معاشی جدوجہد کا سبب ہوتی ہیں اگر احتیاجات نہ ہوتی تو معاشی جدوجہد بھی نہ ہوتی اس طرح ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ دنیا میں ہر ملک کی معیشت صرف احتیاجات پر ہی منحصر ہوتی ہے۔ اگر احتیاجات فوری طور پر ختم ہوجائیں۔ تو یقیناً ہر قسم کی جدوجہد بھی ختم ہوجائے۔ گویا احتیاجات ہی معاشی

جدو جہد کی ابتداء کا باعث ہوتی ہیں اور احتیاجات کے خاتمہ کے ساتھ جدو جہد بھی ختم ہو جاتی ہے۔

اس کا طریقہ کار:(How it Work)

دنیا میں جو کاروباری چہل پہل نظر آتی ہے وہ صرف احتیاجات ہی کی بدولت ہے اس علم کے مطالعے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انسان کس طرح دولت پیدا کرتا ہے۔اور پھر اس کے صرف سے اپنی احتیاجات کو تسکین پہنچاتا ہے۔احتیاجات کی تسکین کے ئے صارف (Consumer) کو ایک دائرہ عمل سے گزرنا پڑتا ہے ذیل کی شکل سے ہماری معیشت اور اس کے طریقہ کار کا پتا با آسانی چل سکتا ہے۔

☆ احتیاجات ☆



انسان طویل طریقہ کار اختیار کرتا ہے، تب کہیں جا کر وہ اپنی احتیاجات کو تسکین پہنچاتا ہے۔ پیدائش دولت مختلف عاملین پیدائش شریک ہوتے ہیں ان کی جدوجہد سے جو دولت پیدا ہوتی ہے وہ ان عاملین پیدائش میں تقسیم کر دی جاتی ہے۔ بعد ازاں اس سے وہ اشیاء خریدتے ہیں جن کے استعمال سے ان کی حاجت کی تسکین ہوتی ہے یہ ایک سلسلہ ہے جو کبھی ختم نہیں ہو پاتا یعنی یہ کہ معاشی جدوجہد کا چکر برابر چلتا رہتا ہے۔ احتیاجات اور ان کی تسکین کے علاوہ معاشیات میں ان اصولوں کو بھی مدنظر رکھا جاتا ہے جن کے ذریعے ہر ممکن جدوجہد کرتا ہے۔

احتیاجات: (Wants)

خواہشات کو ہم احتیاجات نہیں کہہ سکتے کیونکہ خواہش تخیلاتی اور ناقابل تکمیل بھی ہو سکتی ہے احتیاج صرف اس خواہش کو کہتے ہیں، جو قابل تسکین ہو احتیاجات دو طرح کی ہو سکتی ہیں:۔

۱) معاشی احتیاجات

۲) غیر معاشی احتیاجات

غیر معاشی احتیاجات وہ ہوتی ہیں جن کی تسکین غیر معاشی ذرائع سے ہوتی ہو، مثلاً اگر کوئی شخص دھیان یا کشف و معرفت کی منازل طے کرنا چاہے، تو یہ احتیاج غیر معاشی قسم کی ہوگی معاشی احتیاجات وہ ہوتی ہیں، جو انسان کو معاشی جدوجہد کیلئے مجبور کرتی ہیں یہ جدوجہد پیدائش دولت کیلئے ہوتی ہے اگر معاشی سوسائٹی میں دولت موجود نہ ہو تو انسان احتیاجات کی تسکین دشوار ہو جائے۔ کوئی احتیاج اسی وقت معاشی کہلائے گی، جب اس میں درج ذیل خصوصیات موجود ہوں

۱) اسے پورا کیا جاتا ہے۔

۲) اسے پورا کرنے کیلئے جسمانی اور مالی ذرائع موجود ہوں۔

۳) صاحب احتیاج ان ذرائع کو بروئے کار لانے پر رضا مند ہوں۔

....

احتیاجات کی قسمیں:

احتیاجات اپنی نوعیت کے لحاظ سے ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہیں۔ان احتیاجات کے چند مدارج ہوتے ہیں جن کی بنا پر احتیاجات کو ہم تین حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

۱)ضروریات(Necessities)

۲)آسائشات(Comforts)

۳)تعشیات(Luxries)

ضرورت:(Necessities)

بنیادی طور پر انسان کو اپنی زندگی کی بقا کیلئے، چند چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے۔مثلاً کھانا پینا کپڑا اور مکان۔کھانا خواہ کسی قسم کا کیوں نہ ہو۔زندہ رہنے کیلئے اشد ضروری ہے۔موسمی تبدیلیوں سے اپنے آپ کو محفوظ رکھنے کیلئے کپڑا ناگزیر ہے اسی طرح اپنے آپ کو دشمنوں اور موسمی تبدیلیوں سے بچانے کے لئے مکان ضروری ہو جاتا ہے ان تین بنیادی ضرورتوں کے علاوہ اور بھی ضروریات ہوتی ہیں۔''شدت احساس'' کی بناء پر ضرورت زندگی کو ماہرین معاشیات نے مزید تین حصوں میں تقسیم کر دیا ہے۔

۱) ضروریات زندگی(Necessities for Existence)

۲) ضروریات کارکردگی (Necessities for Efficiency)

۳) ضرویات رسمی (Conventional necessites)

ضروریات زندگی بقائے زندگی کیلئے ناگزیر ہوتی ہیں،مثلاً روٹی کپڑا اور مکان مگر ان کے علاوہ کچھ ایسی ضروریات بھی ہوتی ہیں جن کے استعمال سے انسان کی کارکردگی (Efficinecy)میں اضافہ ہو جاتا ہے مثلاً گھی دودھ، مکھن اور شہد وغیرہ انسان کو زیادہ تندرست رکھتے ہیں اور اسے قوی بناتے ہیں ضروریات رسمی وہ ہوتی ہیں جو نہ زندگی کے برقرار رکھنے کیلئے ضروری ہوتی ہیں اور نہ کارکردگی کیلئے بلکہ وہ

ایسی ضرورتیں ہوتی جو اسے سوسائٹی کی وجہ سے پورا کرنا پڑتی ہیں یہ ضرورتیں عادات رسم و رواج اور فیشن کی خاطر پوری کی جاتی ہیں ان احتیاجات کی تکمیل سے انسان کی کارکردگی میں اضافہ نہیں ہوتا مگر پھر بھی عام طور پر لوگ ضروریت کارکردگی کی اتنی پروہ نہیں کرتے جتنی کہ رسمی ضروریت کی یہ خصوصیات کسی ایک ملک یا قوم میں نہیں پائی جاتیں بلکہ دنیا بھر کی قوموں میں رسمی ضروریات کی تسکین کو اہمیت دی جاتی ہے اس کو یوں سمجھئے کہ ایک مزدور دن بھر محنت کرتا ہے اسے پھل، دودھ، اور گھی کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ اس کی صحت برقرار رہے۔

آسائشات:(Comforts)

آسائشات وہ احتیاجات ہیں جن تسکین انسانی زندگی کو زیادہ خوشگوار اور آرام دہ بناتی ہیں اشیائے آسائش سے انسانی کارکردگی پر بھی برا اثر پڑتا ہے۔ گو بسا اوقات ان سے صارف کی کارکردگی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ اشیائے آسائش میں اچھی خوراک اچھا لباس، کشادہ اور صحت افزا مکان، تعلیم اور تفریح کی سہولتیں وغیرہ شامل ہیں۔

تعیّشات(Luxries)

پروفیسر جیڈ (Gide) نے بلا وجہ احتیاجات کی تسکین کو تعیشات کہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ احتیاجات ہوتی ہیں جو نہ تو انسان کی زندگی کی بقا کے لئے ضروری ہوتی ہیں اور نہ اس کی قوت کارگردگی میں اضافہ کرتی ہیں بلکہ وہ انسان کے عیش و عشرت کیلئے ہوتی ہیں، وہ اس قسم کی احتیاجات کی تسکین کے لئے بازار سے جو سامان خریدتا ہے وہ صرف تفریح طبع کی خاطر ہوتا ہے۔

جیڈ کے علاوہ پروفیسر ایلے (Ely) نے بیجا ذاتی اخراجات کو تعیشات کا نام دیا ہے تعیشات میں بعض اشیاء تباہ کن اور مضر بھی ہوتی ہیں۔ (۱)

اشیاءاور خدمات کی ضرورت:

(The Need for Goods and service)

انسانی احتیاجات اور اشیاء کا براہ راست تعلق ہے۔ انسانی احتیاجات کی تسکین بعض اوقات اشیا کی پیدائش سے ہوتی ہے اور بعض اوقات خدمات کا شمار ضروریات حیات میں ہوگا۔ یا آسائشات اور تعیشات میں مندرجہ ذیل باتوں کا خیال رکھنا ہوگا۔

۱) صارف (Consumer) کی آمدنی:

۲) خدمت یا شے کا استعمال کا مقصد:

۳) صارف کی قوت کارکردگی:

۴) شے کی قیمت:

صارف کی آمدنی دراصل اشیاء کے استعمال کی حدود میں متعین کرتی ہے اگر اس کی آمدنی کم ہوگی تو 'زر' کی قدر میں اس کے نزدیک زیادہ ہوگی اور اس کم 'زر' سے وہ زیادہ افادہ کرنے کی کوشش کرے گا اسے اشیائے صرف کم تعداد میں ملیں گی اگر اس کی آمدنی زیادہ ہوگی تو اس کے صرف میں زیادہ اشیاء آسکیں گی۔

شے کا استعمال کا مقصد بھی صارف کی نیت پر منحصر ہوگا۔ یعنی یہ کہ وہ اس شے کو صرف بقائے حیات کے لئے استعمال کرنا چاہتا ہے یا اسے اپنی قوت کارکردگی کے لئے استعمال میں لاتا ہے۔ عموماً شے کی مقدار اور اس کی قیمت بھی صرف پر اثر انداز ہوتی ہیں احتیاجات کی درجہ بندی ضروریات، آسائشات میں سے میں ایک اضافی شے ہے اگر اسے عیش و عشرت کی خاطر استعمال کیا جاتا ہے تو وہ تعیشات میں شامل ہو جاتی ہے۔ اس طرح ایک انسان کیلئے یہ ضروری ہے کہ وہ ان اشیاء کو استعمال کرے جن کا تعلق ضروریات حیات اور آسائشات سے ہو اگر وہ اشیاء جن کا تعلق "تعیشات" میں ہوتا ہے، اسے صرف کے لئے نہیں ملتیں، تو ان

کے نہ ملنے سے اس کی کارکردگی پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ یہی وجہ ہے کہ اشیاء کی پیدائش طلب کے تحت ہوتی ہے ضروریات زندگی زیادہ سے زیادہ مقدار یا تعداد میں پیدا کی جاتی ہیں آسائشات کی پیدائش محدود ہوتی ہے اور تعیشات کی پیدائش بہت کم ہوتی ہے۔

احتیاجات میں فرق:

ہر انسان کو احتیاجات دوسروں سے مختلف ہوتی ہیں اس اختلاف کا انحصار طبیعتوں، پیشوں، تعلیم و تربیت، آمدنی وغیرہ کے فرق پر ہوتا ہے آب و ہوا اور رسم و رواج بھی احتیاجات میں فرق کا باعث ہوتے ہیں۔ اگر دنیا کے تمام باشندوں کی طبیعتیں اور رجحانات وغیرہ یکساں ہو جائیں تو ان کی احتیاجات بھی یکساں ہو جائیں گی۔ اس طرح دنیا کے مختلف کاروبار بالکل ختم ہی ہو جائیں گے تاہم انسانی احتیاجات کی کچھ خصوصیت ایسی ہیں جو ہر ملک اور ہر قوم کے باشندوں میں یکساں پائی جاتی ہیں۔

احتیاجات کی عام خصوصیات:

(Common Characterstic of Human Wants)

احتیاجات کے اختلاف کے باوجود ان میں چند خصوصیات ایسی ہیں جو ہر ملک کے باشندوں کی احتیاجات میں پائی جاتی ہیں جو مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ احتیاجات لامحدود ہوتی ہیں:

(Wants are Unlimited in Number)

ہر انسان کی احتیاجات لامحدود ہوتی ہیں اس لئے وہ ان سب کو تسکین بہم نہیں پہنچا سکتا۔ انسان جب ترقی کی منزلیں طے کرتا ہے تو اس کی احتیاجات میں بھی اسی لحاظ سے اضافہ ہو جاتا ہے۔ اس کو یوں سمجھئے کہ ایک بچہ پیدا ہوتا ہے تو اس کی احتیاجات چند کپڑے اور دودھ تک محدود رہتی ہے۔ مگر جب وہ اسکول جانے

کے قابل ہو جاتا ہے تو اس کی احتیاجات میں بھی اضافہ ہو جاتا ہے۔ کالج کی حدود میں داخل ہو کر اس کی احتیاجات اور زیادہ بڑھ جاتی ہیں جب شادی بیاہ کر کے وہ اپنا گھر بساتا ہے تو اس کی احتیاجات کی تعداد اور بڑھ جاتی ہے جس زمانے میں انسان وحشی تھا، اس کی احتیاجات بہت کم تھیں۔ مگر جیسے جیسے وہ تہذیب یافتہ ہوتا گیا اس کی احتیاجات بڑھتی گئیں اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ سوسائٹی میں ترقی کرنے سے انسان کی احتیاجات میں بھی زیادتی ہوتی جاتی ہے انسان اپنی زندگی قانون ارتقاء ترقی کے ساتھ ساتھ اس کی احتیاجات بھی بڑھتی جاتی ہے۔

۲۔احتیاجات کی تسکین ممکن ہے:(Wants are Competitive)

انسان کی تمام تر احتیاجات تسکین پذیر ہوتی ہیں۔ مگر انسان اپنے محدود ذرائع کی وجہ سے تمام احتیاجات کی تسکین بیک وقت نہیں کرسکتا بلکہ وہ ان ضروریات کو ایک ایک کر کے تسکین پہنچاتا ہے۔ وہ ان احتیاجات کی تسکین پر پہلے توجہ دیتا ہے جو زیادہ ضروری ہوتیں ہیں۔

۳۔ احتیاجات بار بار عود کرتی ہیں:

(Wants Tend to Recur)

بعض احتیاجات ایسی ہوتی ہیں جو بار بار عود کرتی رہتی ہیں۔ اور انسان وقفوں کے بعد ان کی تسکین کرتا رہتا ہے اس کو یوں سمجھئے کہ: انسان کو پانی کی احتیاج ہوتی ہے تو وہ ایک گلاس پانی پی کر اس کی تسکین کر لیتا ہے ،مگر چند گھنٹوں کے بعد اسے پھر پیاس لگتی ہے اور وہ اس احتیاج کی تسکین کے لئے پانی کا دوسرا گلاس پیتا ہے اسی طرح بھوک کی احتیاج کا حال ہے وہ صبح کھانا کھا کر اپنے اس احتیاج کی تسکین کر لیتا ہے مگر اسے شام کو پھر بھوک لگتی ہے اور وہ کھانا کھانے پر مجبور ہو جاتا ہے ان دونوں احتیاجات میں صرف '' وقفہ '' کا فرق ہے۔ کپڑا بھی انسانی احتیاجات میں شامل ہے اگر ایک انسان چند جوڑے کپڑے بنا لیتا ہے تو ایک سال کے بعد

انہیں پھر بننا پڑتا ہے یہی حال دوسری احتیاج کا بھی ہے جو وقتی طور پر تسکین پذیر ہوتی ہیں، مگر وہ پھر انسان پر اپنا دباؤ ڈالتی ہیں کہ وہ اشیاء ''صرف'' کے ذریعے انہیں تسکین پہنچائے۔

۴۔احتیاجات میں باہم مقابلہ ہوتا ہے:

(Wants are Comeritive)

انسان کی احتیاجات لامحدود ہیں مگر وہ یکساں نوعیت کی نہیں ہوتیں بعض احتیاجات زیادہ شدید ہوتی ہیں اور بعض کم انسان کو اپنی محدود آمدنی سے انہیں تسکین پہنچانا ہوتیں ہیں چنانچہ تمام احتیاجات میں باہم مقابلہ ہوتا ہے اور وہ سب سے پہلے ان احتیاجات کو تسکین بہم پہنچاتا ہے جنہیں وہ زیادہ ضروری سمجھتا ہے۔

اس کے بعد غیر ضروری اور آخر میں وہ جن سے اسے کم سے کم افادہ کی توقع ہوتی ہے اس کو ماہرین معاشیات (Economists) نے یوں کہا ہے کہ انسانی احتیاجات میں مقابلہ ہوتا ہے ہر احتیاج اپنا افادہ انسان کے سامنے پیش کرتی ہے وہ اس کو ترجیح دیتا ہے جو اسے زیادہ افادہ پہنچاتی ہے یہ انسانی فیصلے ہوتے ہیں اور ان ہی کی بنا پر احتیاجات کے باہمی مقابلے کا تصفیہ ہوتا ہے مگر ہر انسان کی احتیاجات مختلف ہوتیں ہیں اور مختلف اوقات میں اس کا اثر بھی مختلف ہوتا ہے اسکی وجہ سے ایک احتیاج کی تسکین ایک انسان کیلئے بہت ضروری ہے، تو دوسرے انسان کے لئے وہ بالکل غیر ضروری ہوسکتی ہیں اس طرح احتیاجات اپنے باہمی مقابلے میں علیحدہ علیحدہ اہمیت اور دباؤ کی حامل ہوتی ہیں یہ سب کچھ انسان کے معاشی ضرورت پر منحصر ہوتا ہے۔

۵۔احتیاجات ایک دوسرے کیلئے لازم وملزوم ہیں:

(Wants are Complementary)

انسان کی بہت سی احتیاج ایسی ہیں جو ایک شے سے تسکین پذیر نہیں ہو پاتیں ان کی تسکین کیلئے یہ لازی

ہوتا ہے کہ دوسری شے یا اشیاء بھی استعمال میں لائی جائیں۔ کیونکہ تمام متعلقہ چیزوں کے بغیر مکمل افادہ نہیں مل سکتا اس کو یوں سمجھئے کہ ایک طالب علم کو قلم کی ضرورت ہے تو وہ فوری طور پر قلم خرید لیتا ہے مگر اس کے پاس روشنائی نہیں ہوتی، اس کی وجہ سے وہ قلم سے پورے طور پر استفادہ نہیں کر پاتا گویا قلم کی احتیاج کی تسکین ہو جاتی ہے مگر اس کے لئے یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ روشنائی بھی خریدی جائے تاکہ وہ قلم کام میں لایا جاسکے۔ اس طرح قلم اور روشنائی دونوں ایک دوسرے کے افادے کی تکمیل کرتے ہیں کیونکہ یہ دونوں چیزیں لازم و ملزوم ہیں اسی طرح کار کیلئے پیٹرول ضروری ہے، چائے کے لئے دودھ اور شکر لازم اور ضروری ہیں۔

۶۔ احتیاجات متبادل ہوتیں ہیں:

(Wants are Aleternative)

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کئی اشیاء ایک ہی احتیاج کی تسکین کیلئے استعمال کی جاتی ہیں ان سے افادہ میں کوئی زیادہ فرق نہیں پڑتا۔ موجودہ زمانے میں بعض اشیاء بازار سے غائب ہو جاتی ہیں ان کیلئے متبادل اشیاء کی ضرورت پڑتی ہے، کیونکہ بعض احتیاجات کی تسکین اشد ضروری ہوتیں ہیں اگر کسی انسان کو بازار میں چائے نہیں ملتی تو وہ اس کی جگہ کافی اور کوکا کولا بھی استعمال کر سکتا ہے اس طرح ایک شے دوسری شے کی جگہ انسانی احتیاج کی تسکین کیلئے استعمال کی جاتی ہے۔

۷۔ بعض احتیاجات انسان کی عادت ثانیہ بن جاتیں ہیں:

(Wants Becom The Second Nature of Men)

قدرت نے انسان میں چند عادتیں پیدا کی ہیں جو فطری ہوتیں ہیں۔ انسان ان کی تسکین کے لئے مجبور ہے سوسائٹی میں رہنے کی وجہ سے وہ مجبوراً چند عادتوں کو اختیار کر لیتا ہے، مثلاً سگریٹ پینا، چائے نوشی کرنا، شراب پینا اور پان کھانا وہ عادتیں ہیں جو انسان اختیار کر لیتا ہے اور جب ان کا عادی ہو جاتا ہے تو وہ ان کی

ضروریات زندگی کا روپ دھار لیتے ہیں ان کا دباؤ انسان پر اس قدر زیادہ ہوتا ہے کہ وہ انسان اشیاء کی صرف پر مجبور ہو جاتا ہے اگر وہ ان اشیاء کو استعمال نہیں کرتا تو کام کرنے کے قابل نہیں رہتا وہ مردہ اور بے جان سا ہو جاتا ہے۔

دوسرے الفاظ میں یہ کہا جاتا ہے کہ انسان اپنی ان اقتصادی عادتوں کا غلام ہو جاتا ہے اگر وہ ان اشیاء کی صرف کے بغیر کام کرتا ہے تو اس کا یہ کام اعلیٰ درجے کا نہیں ہوتا۔



باب ہفتم

فصل ''ب''

ہندوستان میں معاشی مسئلہ کا حل:

جن جذبات کے ماتحت ممالک اسلامی سے اپیل کی گئی اور ان کے سامنے اسلام کا اہم مطالبہ رکھا گیا اسلام ہم سے بھی اسی مطالبہ کا حقدار ہے۔

آزاد اسلامی ممالک اور ہمارے درمیان نمایاں فرق ہے کہ ان کے سامنے صرف طرز حکومت کے رخ بدل دینے کا سوال ہے اور ہم بھی محکومیت کا شکار اور حکومت، محکومیت کے زیر اثر ہیں اور محکومیت کی وجہ سے پورے ملک میں مسلم اور غیر مسلم اس لئے اس سے قطع نظر کہ ہندوستان کے آئندہ نظام حکومت کا خاکہ کیا ہونا چاہئے اور اس سلسلہ کے نظریاتی مباحث سے دامن کشاں ہوکر کتاب کے موضوع ''اقتصادی نظام'' کے پیش نظر ہمارے لئے ادائے فرض کی بہترین شکل یہ ہے کہ ہندوستان کے باشندوں پر قول تحریر وتقریر سے یہ ثابت کر دکھائیں کہ عملی وعلمی دونوں پہلوؤں سے کائنات انسانی کے لئے امن واطمینان اور فوز وفلاح صرف اسی صورت میں نصیب ہوسکتی ہے کہ اسلام کے معاشی نظام کے اصول وقوانین اسی کو اپنا رہنما بنا لیا جائے۔

اگر ہندوستان جنت نشان پر کمیونزم، سوشلزم، نیشنزم، فیسزم اپنے اپنے نظام ہائے معاشی کو تبلیغ و دعوت میں سرگرم عمل نظر آتے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ اسلام کے نظام معاشی کی دعوت وتبلیغ کیلئے میدان کو تنگ سمجھ کر ہم دست وپا بریدہ بن جائیں اور حرمان ویاس کو رفیق حیات بنالیں۔

کیونکہ اگر دینوی نظام ہائے اقتصادی کی مقبولیت کے لئے اس ملک کا دامن وسیع ہے تو روحانیت کی راہ سے آئے ہوئے معاشی نظام کے لئے اس کا دامن کیسے کوتاہ ہوسکتا ہے۔ البتہ شرط ہے کہ اس نظام کی دعوت وتبلیغ کے لئے نفرت کی جگہ مودت، خشونت کے بجائے رفق ونرمی، تنگ نظر اور عداوت، بداخلاقی کی جگہ

مواسات وحسن اخلاق جیسے برتر اصولوں کو اسوہ بنالیا جائے اور قرآن کے اس مقدس اصول دعوت کو معیار یقین کیا جائے۔

ادع الی سبیل ربک بالحکمۃ و الموعظۃ الحسنہ و جادلھم بالتی ھی احسن (۲)

''اے محمدؐ تم اپنے پروردگار کی جانب دعوت دو، دانائی اور اچھی نصیحت کے ساتھ اور ان سے مجادلہ (تبادلہ خیالات) کرو اس طریقہ پر جو بہت ہی خوب اور بہتر سے بہتر ہو۔

پس! اگر ہم نے حسن اخلاق کے ساتھ روشن دلائل و براہین کے ہتھیاروں سے سج کر مسلم و غیر مسلم پر اسلام کے اقتصادی نظام کو برتری کو روشن کر دیا تو وہ وقت دور نہیں کہ مادیت کے انتہائی عروج اور روحانیت کے سخت انحطاط کے اس دور میں امن عالم اور کائنات انسانی کی اخوت عام ودوام کے لئے حقیقی معنوں میں بے چین ومضطرب ہیں ان کے ہاتھوں توپ و تفنگ اور مادی اسلحہ کی گرم بازاریوں کے بغیر ہی ایسا نظام قائم ہو جائے کہ سرزمین ہند کا ہر ایک طبقہ اور ہر ایک ملت وقوم اس مقدس نظام کی برتری کے سامنے سر تسلیم خم کر دے اور اس طرح خدائے برتر کا پیغ م حق اپنی پوری رعنائیوں اور دل نوازیوں کے ساتھ برضا ورغبت اس سرزمین میں عملی صورت اختیار کر لے اور آج کا یہ محکوم ملک تمام کائنات کیلئے نمونہ راہ اور راہنما ثابت ہوسکتا ہے۔

ہندوستان میں صحیح معاشی نظام اور اس کی مشکلات:

ہندوستان میں اگر صحیح معاشی نظام کو بروئے کار لایا جائے تو اس سلسلہ میں دو مسائل خاص اہمیت رکھتے ہیں ایک ''سود'' کا مسئلہ اور دوسرا بڑی بڑی زمینداریوں اور تعلقہ داروں کا مسئلہ اسلئے ان دونوں ہی مسئلوں کے ساتھ باشندگان ہند کا بہت گہرا تعلق موجود ہے خصوصاً مسئلہ سود تو اس درجہ خطرناک ہے کہ ہندوستان کی اکثر وبیشتر مسلم وغیر مسلم آبادی کی معاشی بدحالی وفاقہ مستی کا یہی واحد ادارہ ہے اور اس کے بعد ان بڑی بڑی

زمینداروں اور تعلقہ داریوں کا درجہ ہے جن میں کاشت کار کو اسلام، اخلاق اور انصاف کے خلاف غلام سمجھا جاتا اور غلاموں کی طرح ان کے ساتھ سلوک کیا جاتا ہے اور جو عوام کی معاشی تباہی کیلئے جونک کا کام کر رہی ہے اور نہ صرف یہ بلکہ شریعت اسلامی کے اہم قانون وراثت کے خلاف مجرمانہ جرات کے ساتھ یہ زمیندار اور تعلقہ دار سرکاری عدالتوں میں یہ بیان دیتے چلے گئیں ہیں کہ ہم اپنی اسٹیٹ اور تعلقہ کی وراثت کے مسئلہ میں اسلامی قانون پر رسم ورواج کے قانون کو واجب العمل یقین کرتے ہیں اسلئے یہ اعلان کرنا ضروری ہے کہ اسلام کے اور ذاتی اسٹیٹ اور تعلقہ کے موجودہ سسٹم کے لئے کوئی گنجائش ہے۔

ہر دو مسائل میں سے ''سود'' ایسا مسئلہ ہے جس کی قباحت و شناعت واضح اور عام طور پر مسلم ہے اور معاشی نظام میں اس کی تباہ کاریاں روشن و ظاہر ہیں۔ البتہ بڑی بڑی زمینداریوں کے موجودہ سسٹم میں قباحت و شناعت میں شخصی ملکیت کا مسئلہ حائل ہو جاتا ہے اور اسی لئے اس کے خلاف اقتصادی نظام کا اقدام نہ صرف غیر مسلم کی نگاہوں میں کھٹکتا ہے بلکہ خود مسلمانوں میں بھی ایسے افراد موجود ہیں جو احکام اسلامی سے ناواقفیت کی بنا پر اس اقدام کو غیر اسلامی سمجھتے ہیں۔ اور کمیونزم یا سوشلزم کی کورانہ تقلید جانتے ہیں۔ اس لئے از بس ضروری ہے کہ اس مقام پر علماء اسلام کا وہ چند فتاویٰ یا اسلامی فیصلے پیش کر دیئے جائیں جو یہ ثابت کرتے ہیں کہ اگر عامہ مسلمین کی فلاح و بہبود کا تقاضا ہو تو امام اور امیر کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ مفتوحہ ملکی کی اراضی کو شخصی ملک بنانے کے بجائے بیت المال اور حکومت (خلافت) کی ملک قرار دے۔

علمائے اسلام کے یہ فتاوے مغل بادشاہوں کے دور میں اور برٹش حکومت کے ابتدائی دور میں اس سلسلہ میں زیر تحریر آئے ہیں کہ:

''اراضی ہند'' اشخاص وافراد کی ملکیت نہیں ہے بلکہ وقف للمسلمین کی حیثیت میں حکومت (بیت المال) کی ملکیت ہیں اور ایسی زمین کو اسلام کے معاشی نظام کی اصطلاح میں ''ارض الحوز'' کہا جاتا ہے جیسا کہ حضرت عمرؓ نے ''ارض عراق'' کے متعلق یہی فیصلہ فرمایا اور جمہور صحابہ (رضی اللہ عنہم) نے اس پر مہر ثبت

کر کے آئندہ کیلئے اسوۂ حسنہ قرار دیا نہیں بلکہ ''ارض مملکت'' اور وقف للمسلمین ہو کر بیت المال کی ملکیت ہیں، فرماتے ہیں۔

الحجة لعلماء نافی التقریر امیر المومنین عمر لسواد عراق بموافقتهمن الصحابته رضوان الله علهیم اجمعین فی الهدانته فی باب الضنائم و اذافتح الامام بلدة عنوة ای قهر انهو بالخیار ان شاء قسمه مابین المسلمین کما فعل رسول الله صلی الله علیه وسلم بخیبر وان شاء اقرا هله علیه ووضع علیهم الجزیته وعلیٰ اراضیهم الخراج کذالک فعل عمر لسواد العراق بموافقه افقه من الصحابته رضوان الله علیهم اجمیعن ولم یحمدمن مانعه وفی کل من ذالک قدوة فتحیتر (۳)

''اور تقریر (خلیفہ کا ملک) کی زمین کو مسلمانوں کی انفرادی ملکیت بنانے کی بجائے مفتوح غیر مسلموں کے قبضہ میں باقی رکھنا اور اس کی ملکیت کو حکومت کی قرار دینا ''تقریر'' کہلاتا ہے کے متعلق ہمارے علماء (احناف) کی دلیل حضرت عمرؓ کی وہ تقریر ہے جو صحابہ رضی اللہ عنھم کی موافقت سے سواد عراق کے متعلق ان کے عمل میں آئی ہدایہ باب الغنائم میں ہے کہ اگر امام کسی شہر کو قہر و غلبہ کے ساتھ فتح کرے تو اس کو اختیار ہے کہ چاہے تو اس کی اراضی کو مسلمانوں میں تقسیم کر دے جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے خیبر کی زمینوں کے متعلق کیا اور چاہے تو مفتوح آبادی کے قبضہ میں ہی اس کو رہنے دے اور

اس پر جذیہ مقرر کر کے ان کی زمینوں پر خراج مقرر کر دے جیسا کہ حضرت رضی عنہ نے صحابہ کہ موافقت کے ساتھ کیا اور جس کسی نے مخالفت کی تو اس کو ناپسند کیا گیا بہر حال امام ان دونوں باتوں میں مختار ہے اور دونوں اس کی صوابدید کیلئے اسوۂ حسنہ ہیں ۔''

تحریر فرماتے ہیں:

وفی نفی الملک عن الکفار فی صورة التقریر وجعلهم کالا کرة العاممتم للمسلمین فوائد نیترة و منافع کثیرة لا هة الا سلام المستحقین اذ لا لا رض و الخرج بالمنع و العطاء المستحقین. (۴)

ترجمہ: ''اور تقریر ہند کے بارے میں ''تقریر شکل میں'' یہ کہنا کہ یہاں کے غیر مسلم باشندوں کی ملکیت نہیں ہے اور ان کو کاشت کاروں اور اجارہ داروں کی طرح قرار دینا جو مسلمانوں کے (بیت المال) کے لئے عامل کی حیثیت میں ہیں ۔ مسلمانوں کے لئے روشن فوائد اور کثیر منافع کا باعث ہے اس لئے کہ زمین اور خراج کے دینے اور نہ دینے کا معاملہ دراصل مستحقین کے پیش نظر ہے ۔''

امام ابو حنیفہؒ کے قوم پر ہندوستان کی اکثر بیشتر اراضی ان لوگوں کی ملکیت نہیں ہے جو اس پر قابض ہیں سوچو اور سمجھوں پھر معلوم رہے جب کہ ہندوستان کی اراضی ان انواع مختلفہ پر قائم ہے اراضی ہند کے متعلق کسی شخص کی ملکیت وعدم ملکیت پر حکم لگانا اس وقت تک درست نہیں ہے جب تک یقین کے ساتھ حکم لگانے والے کو یہ معلوم نہ جائے کہ یہ ذکر کردہ انواع میں سے کس نوع میں شامل ہے ۔ پس جس زمین کے بارے میں جس

نوع سے متعلق ہونے کا یقین ہو جائے اس کے مطابق حکم دینا چاہئے لیکن اگر علم یقین حاصل نہ ہو تو فتویٰ دینا ممنوع قرار دیا ہے۔ (۵)

شیخ جلالؒ اور محمد اعلیٰ کے چند صدی بعد جب برٹش حکومت کا تسلط ہوا تو علمائے اسلام کے سامنے پھر یہ مسئلہ آیا کہ اراضی ہند شخصی ملکیت ہیں یا نہیں اور ان پر عشر یا اخراج واجب ہے یا نہیں تو محقق عصر حضرت شاہ عبدالعزیز نور اللہ مرقدہ نے اپنے مشہور فتاویٰ میں اس وقت یہی فیصلہ دیا کہ اراضی ہند بیت المال کی ملکیت ہیں شخصی مملوکہ نہیں ہیں اور یہاں زمیندار و تعلقہ دار مالک کی حیثیت میں نہیں اس لئے اراضی ہند نہ عشری ہیں اور نہ خراجی۔

فرماتے ہیں۔

مگر بنا بر آنچہ حضرت جلال تھانیسری قدس اللہ سرہ در رسالہ خود اختیار فرمودہ اند کہ زمین ہندوستان در ابتدائے فتح مانند سواد عراق کہ در عہد حضرت فاروقؓ مفتوح شدہ بود موقوف بر ملک بیت المال ست و زمینداداراں رابیش از توست ودار دغلی تردد فرہم اور دن مزارعین و اعانت و زراعت وحفظ و غلے نیست۔ چنانچہ لفظ زمیندار نیز اشعار باں میکند وتغیر و تبدل زمینداری وعزل ونصب زمینداری اخراج بعضے از انہا و قرار بعضے و عطائے ارضی بافغاناں وہمچوں و سادات وفدوانیاں بصیغہ زمینداری دلالت صریحہ بریں می کند الخ۔ (۶)

شاید اس مسلک کی بنیاد پر کہ حضرت شیخ جلال تھانیسریؒ نے اپنے رسالہ میں اختیار فرمایا ہے کہ:

ہندوستان کی زمین ابتداء میں عراق کی طرح (جو کہ حضرت فاروقؓ کے زمانے میں فتح ہوا تھا) بیت المال کی ملک پر ہی قائم ہے اور زمینداروں کے سوا کہ وہ اس کے متولی و داروغہ ہیں اور کاشت کاروں کو تلاش

کر کے زمین دینے اور زراعت میں اعانت بہم پہنچانے اوا سی زمہ داری کے غور فکر میں رہنے کے کوئی حق حاصل نہیں ہے اور نہ سن کی ملکیت کا کوئی دخل ہے چنانچہ لفظ زمیندار بھی اسی کی خبر دیتا ہے۔ اور زمینداری میں تغیر درعزل نصیب اور بعض کا اخراج اور بعض کیلئے اثبات اور بعض کو داد و دہش مثلاً افغانان، بلوچ، سادات مشائخ وغیرہ کو زمینداری کے اصول پر زمینیں دینا اس دعوی کی صریح تائید کرتے ہیں۔

علماء اسلام کے ان فتاوی کے علاوہ مغل بادشاہوں نے اراضی ہند پر جو تصرفات قائم رکھے نیز شاہ عالم نے سرحامس روکو دیوانی احکام سپرد کرتے ہوئے زمینداروں کے متعلق جو معائدہ کیا اور سراج الدولہ نے ایسٹ انڈیا کمپنی کو بنگال میں دیوانی اختیارات حوالہ کرتے ہوئے۔ بنگال کی زمینوں سے متعلق جو معائدہ کیا وہ بھی اسی کی تائید کرتے ہیں کہ یہ بادشاہ اور ابتدائی دور میں خود انگریزی حکومت اراضی ہند اور زمیندار اور تعلقہ کے ذاتی وشخصی ملکیت نہیں سمجھتے اور حکومت کی ملک شمار کرتے ہوئے ان کو نگراں اور ''قیم'' کی حیثیت دیتے تھے۔

پس! علمائے اسلام کے فتاوی سے یہ ثابت ہوگیا کہ ہندوستان کی زمین حکومت کی ملکیت اور بیت المال کی ملکیت سمجھی جاتی رہی ہے اور انہوں نے اس فیصلہ میں عامۃ المسلمین کی فلاح و بہبود کے پیش نظر مخصوص طبقہ زمینداران و تعلقہ داران کے نقصان کو قابل نظر انداز سمجھا اور اس کیلئے ہندوستان کے معاشی نظام میں اس قسم کے اقدام کو غیر اسلامی کہنا کس طرح درست ہو سکتا ہے۔ البتہ یہ دیکھنا ازبس ضروری ہوگا کہ یہ اقدام عامۃ المسلمین کی معاشی فلاح کیلئے مفید ثابت ہو۔



باب ھفتم

فصل ''ج''

پاکستان کا معاشی جائزہ

(Economic Review Of Pakistan)

پاکستان کی قومی آمدنی:

کسی ملک کی مادی اور معاشی ترقی کا تخمینہ لگانے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ اس کو قومی آمدنی میں اضافہ کی رفتار کا جائزہ لیا جائے کیونکہ معیشت کے مختلف شعبوں مثلاً زراعت ،صنعت ، بیرونی تجارت ، مواصلات ،قوت (Bnerg)، بینکوں کی کارکردگی ، اور پیداوار کا اظہار قومی آمدنی میں اضافہ کی صورت میں ہوتا ہے ، اگر مختلف شعبوں کی پیداوار میں اضافہ ہوا تو قومی آمدنی بڑھ جاتی ہے اور اگر ان کی کارگردگی سست ہو تو آمدنی میں تسلی بخش اضافہ نہیں ہوتا۔

پاکستان ایک غریب اور پسماندہ ملک ہے اسلئے اسکی قومی آمدنی کم ہے آمدنی کا اہم ذریعہ پیدائش زراعت ہے جہاں سے خام قومی پیداوار کا چونتیس فی صد حصہ حاصل ہوتا ہے اور دوسرا اہم ذریعہ صنعت ہے جس سے پندرہ فیصد حصہ آتا ہے پھر تھوک وپرچون کی تجارت ہے جو خام قومی پیداوار کے تیرہ فی صد کا ذمہ دار ہے انکے علاوہ باقی شعبے غیر ترقی یافتہ ہیں جن میں کان کنی تعمیرات ، بجلی وگیس ، بنکاری وبیمہ کاری مواصلات اور خدمات شامل ہیں خود زراعت پر قومی پیداوار کا دارومدار ہے ، لہذا جب تک ایک طویل امید منصوبے کے تحت پوری معیشت کی ترقی کیلئے باقاعدہ پروگرام بنا کر اسے عملی جامہ نہیں پہنایا جاتا پاکستان کی قومی آمدنی میں معقول اضافہ نہیں ہوسکتا۔

....

کسی ملک کی خام ملکی پیداوار:
(Gross Domestic Product)

کسی ملک کی قومی آمدنی ناپنے کے لئے عموماً تین طریقے اختیار کئے جاتے ہیں۔ اول، پیدا ہونے والی اشیاء خدمات کی بازاری قیمتوں کے لحاظ سے مالیت۔ دوم، تمام عاملین پیدائش کی آمدنیوں کا مجموعہ۔ سوم، مختلف اشیاء و خدمات پر ہونے والی سرکاری ونجی خرچ کا مجموعہ۔ لیکن چونکہ پاکستان میں تمام شعبوں سے متعلق صحیح معلومات اور اعداد وشمار نہیں ملتے اسلئے یہاں قومی آمدنی کی پیمائش کے لئے کوئی ایک طریقہ استعمال نہیں کیا جاتا بلکہ حالات کی مناسبت سے تینوں طریقوں کی ہی اختیار کیا جاتا ہے چنانچہ قومی آمدنی ناپنے کے لئے:

۱۔ مندرجہ ذیل شعبوں میں پیداوار کا طریقہ اختیار کیا جاتا ہے۔

زراعت، صنعت تعمیرات اور کان کنی وغیرہ۔

۲۔ مندرجہ ذیل شعبوں میں آمدنی کا طریقہ استعمال کیا جاتا ہے: یعنی عاملین پیدائش کو اجرتوں منافعوں کرایوں اور سود کی شکل میں ملنے والے معاوضہ کو جمع کر لیا جاتا ہے: بنکاری، بیمہ کاری، مکانات کی ملکیت اور دفاع، خدمات اور سرکاری نظم ونسق۔

۳۔ مندرجہ ذیل شعبوں میں خرچ کا طریقہ اختیار کیا جاتا ہے۔

بجلی، پانی اور گیس وغیرہ کیونکہ ان چیزوں کے مصرف اور خرچ کا حساب کتاب میسر آجاتا ہے۔

۱۔ قدرتی ذرائع کی قلت:

کسی ملک کی قومی آمدنی اور معاشی ترقی کا دارومدار وہاں کے قدرتی ذرائع پر ہوتا ہے پاکستان میں اس قسم کے ذرائع تھوڑے ہیں۔ مشرقی بنگلہ دیش قائم ہونے سے قبل مشرقی اور مغربی پاکستان کا مجموعہ کاشتہ رقبہ 69719 ہزار ایکڑ تھا جو زراعتی آبادی کے مقابلہ میں بہت کم ہے اور فی کس اوسط کاشتہ رقبہ

ایک ایکڑ سے بھی کم ہے لیکن سیم وتھور کے باعث بہت سی زمین ناقابل کاشت ہوتی جارہی ہے۔ جنگلات کے تحت رقبہ کل رقبہ کا پانچ فیصد ہے حالانکہ ایک مانے ہوئے اصول کے مطابق زیر جنگلات رقبہ ملک کے کل رقبہ کا پچیس فیصد ہونا چاہئے پاکستان میں معدنیات بھی کم ہیں۔ بالخصوص کوئلے اور لوہے کی شدید قلت ہے حیوانات بھی ضرورت سے کم ہیں غرض پاکستان کی پس ماندگی اور کم قومی آمدنی کی سب سے بڑی وجہ قدرتی ذرائع کی کمی ہے۔

۲۔ لوگوں کی پست استعداد عمل:

پاکستان میں فی کس آمدنی کے پست ہونے کی دوسری بڑی وجہ یہ ہے کہ یہاں کے لوگوں کی اکثریت ناخواندہ ہے، بے ہنر، غیر تربیت یافتہ، قدامت پسند اور ٹیکنالوجی کے جدید تمدن سے ناآشنا ہے، نیز ہمارے کل آبادی میں سے کام کرنے والوں (Working Population) کا تناسب صرف 33 فیصد ہے حالانکہ مغربی ممالک میں کل آبادی کے پچاس فیصد لوگ کام کرتے ہیں کیونکہ وہاں عورتیں بھی مردوں کے دوش بدوش معاشی جدوجہد میں بڑی سرگرمی سے حصہ لیتی ہیں۔ نیز کام کرنے کے ایک افراد کا بیس فیصد بے روزگار رہے حالانکہ امریکہ میں صرف پانچ فیصد لوگ بیروزگار رہیں۔ ہمارے ہاں محتاجوں اور بھکاریوں کی تعداد بھی بڑھتی جارہی ہے اسلئے ہمارے ملک میں قومی پیداوار کم ہوتی ہے اور فی کس آمدنی بھی کم ہے۔

۳۔ سرمائے کی قلت:

پاکستان میں سرمائے کی قلت ہے اسلئے زراعت اور صنعت کو ترقی دینے کیلئے مشینیں، اوزار اور آلات حاصل نہیں کئے جاسکتے 1960 تا 1970 کے دوران میں زائد کمائے ہوئے روپے کا ساتواں حصہ بچا کر سرمایہ کاری میں لگایا جارہا ہے جب کہ ترقی یافتہ ملکوں میں قومی آمدنی کا پانچواں حصہ بچا کر سرمایہ کاری میں لگایا جاتا ہے۔

۴۔ افراطِ آبادی:

بعض ماہرین معاشیات کی رائے یہ ہے کہ پاکستان میں فی کس آمدنی کم ہونے کی ایک وجہ یہ ہے کہ یہاں آبادی وسائل سے زیادہ ہے، ہر سال آبادی میں تین فیصد شرح سے اضافہ ہو رہا ہے۔ لیکن ذرائع پیدائش، وسائل، قومی آمدنی اور روزگار کے مواقع میں تیزی سے اضافہ نہیں ہو رہا ہے اس لئے فی کس آمدنی پست سطح پر ٹھہر گئی ہے۔ گزشتہ پون صدی میں (مغربی) پاکستان کی آبادی میں ساڑھے چار گنا اضافہ ہو چکا ہے کیونکہ 1901ء میں پاکستانی علاقہ کی آبادی ایک کروڑ ساٹھ لاکھ تھی جو بڑھ کر 1977ء میں سات کروڑ چھیالیس لاکھ ہو چکی ہے۔ شرح افزائش کے زیادہ ہونے اور شرح اموات کے کم ہونے کی بناء پر پاکستان میں چھوٹی عمر کے افراد کی تعداد بہت زیادہ ہے مثلاً پینتالیس فیصد آبادی کی عمر پندرہ سال سے کم ہے جس کی بناء پر مستقبل میں ترقیاتی منصوبہ بندی پر دور رس اثرات پڑتے ہیں اڑتالیس فیصد آبادی اسکول اور کالج میں جانے کی عمر میں ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ دوسروں پر انحصار کرنے والی آبادی کا تناسب بہت بلند ہے نیز جمعیتِ محنت میں اضافہ کرنے والی نوجوان آبادی کا تناسب بھی بڑھتا جا رہا ہے۔ جس سے ملکی وسائل پر شدید دباؤ پڑ رہا ہے۔

۵۔ ناقص منصوبہ بندی:

پاکستان میں معاشی منصوبہ بندی میں بعض خامیاں موجود ہیں جن کے باعث ملک خوش حالی کی راہ پر گامزن نہیں ہو سکا مثلاً ان منصوبوں میں زرعی اصلاحات کی طرف کم توجہ دی گئی ہے چند ہاتھوں میں زمین کے ارتکاز کو نہیں روکا گیا، غیر ملکی امداد پر زیادہ دارومدار رکھا گیا صنعتوں کو زیادہ تحفظ دینے سے دولت کی تقسیم غیر مساویانہ ہو گئی ہے اور متوسط طبقہ بالکل محدود ہو کر رہ گیا بعض غیر ضروری اشیاء کی درآمد پر زائد از ضرورت زرمبادلہ ضائع کیا جاتا رہا سرکاری انتظامیہ میں بعض افراد عیش و عشرت پرست، راشی اور خود غرض تھے انہوں نے اپنے اختیارات سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے فرائض کی انجام دہی میں

مجرمانہ غفلت کی ماضی میں معاشی ترقی کے لئے منصوبہ بندی کے وقت یہ حکمت عملی اختیار کی گئی کہ معاشرتی عدل (Social Justis) کے تقاضوں کو نظر انداز کر کے قومی آمدنی کی تقسیم ایسی بنیادوں پر ہو کہ صنعت کاروں اور تاجروں کے پاس زیادہ دولت جمع ہو سکے تاکہ وہ اپنے بند میں ن بچت کے باعث بیش از بیش رقم وصول کر کے سرمایہ کاری میں لگا سکیں۔

۶۔ زراعت پر دار و مدار:

ہماری تقریباً اسی فیصد آبادی کھیتی باڑی سے روزی کماتی ہے لیکن زراعت کا دار و مدار اچھے موسم اور آب و ہوا پر منحصر ہوتا ہے اسلئے جب کبھی موسمی حالات خراب ہو جائیں، زرعی پیداوار کم ہو جاتی ہے۔ 1973، 1975، اور 1976 میں پنجاب اور سندھ کے دریاؤں میں اتنے زبردست سیلاب آئے کہ ان سے پہلے ایسی مثال نہیں ملتی ان کے علاوہ دونوں صوبے تباہ کن نقصان سے دوچار ہونے 1974-75ء کے دوران زرعی شعبے کی ترقی 2 فیصد تھی۔ گویا سال بہ سال پہلے کے مقابلہ میں زرعی پیداوار کم ہوگئی۔

۷۔ سیم اور تھور:

سیم و تھور کے باعث ہماری زمین ناکارہ ہوتی جا رہی ہے اور فصلوں کی پیداوار کم ہونے کا خطرہ بڑھ رہا ہے نیز پہاڑی علاقوں بارش کی وجہ سے ریگزاروں میں آندھیوں کی وجہ سے زمین کٹاؤ کا شکار ہوتی جا رہی ہے ایک تخمینہ کے مطابق پنجاب میں سیم زدہ علاقہ بیاسی لاکھ ایکڑ ہے، سندھ میں چوہتر لاکھ ایکڑ اور صوبہ سرحد میں ایک لاکھ ایکڑ۔ چاروں صوبوں میں تھور زدہ علاقہ کا رقبہ ایک کروڑ نوے لاکھ ایکڑ ہے اس حکومت نے سیم و تھور پر قابو پانے کیلئے ایک طویل المیاد منصوبہ بنایا ہے جس کے تحت ہر سال میں اٹھارہ سو نئے ٹیوب ویل لگائیں جائیں گے اور اس منصوبہ پر ہر سال ڈیڑھ ارب روپے خرچ ہوں گے ہمارے ملک میں کاشت کاری کے طریقے بہت پرانے ہیں زرعی مشینوں، فرٹیلائزروں اور کیمیائی کھادوں کا استعمال کم کیا

جاتا ہے اس لئے پیداوار کم ہوتی ہے اور کاشت کار طبقہ غریب اور مفلس ہے پہلے سے اب کسان مشینوں کو استعمال کرنے لگے ہیں مگر حکومت زیادہ توجہ نہیں کر رہی ہے۔

۸۔ غیر مساوی تقسیم دولت:

غربت کا ایک سبب دولت کی غیر منصفانہ تقسیم ہے ماضی میں صنعتی دولت کا بیشتر حصہ ملک کے بائیس خاندانوں کے قبضے میں جمع ہوگیا۔ جس کے باعث متوسط اور غریب طبقہ معاشی ترقی کرنے سے محروم رہ گیا۔ پیپلز پارٹی حکومت نے بنیادی صنعتوں، بنکوں اور بیمہ زندگی کے کاروبار کو قومی تحویل میں لے کر متعدد کارخانوں کا انتظام سرکاری افسروں کے حوالے کر دیا اس اقدام کا مقصد یہ تھا کہ منافع حکومت کے خزانے میں جمع ہوں ارتکاز دولت کا رجحان رک جائے، ٹیکس چھپانے کی عادت ختم ہو اور مزدوروں کے حقوق کا تحفظ ہو، لیکن یہ مقاصد صحیح معنوں میں پورے نہ ہو سکے۔

۹۔ غیر مکمل منڈیاں:

ہمارے ہاں منڈیوں کا نظام غیر مکمل (Imperfect) اور غیر مقابلیاتی (Non-Cmpetitive) ہے عاملین پیدائش میں نقل پذیری (Mobility) نہیں پائی جاتی یعنی وہ بہتر معاوضے کی تلاش میں حرکت نہیں کرتے۔ لوگ منڈیوں کے متعلق ضروری معلومات سے بے خبر ہیں تخصیص کار (Speialization) کا رواج کم ہے، معیشت کے بعض شعبوں میں اجارہ دارانہ کیفیت پیدا ہو چکی ہیں، صنعتوں کو بہت زیادہ تحفظ (Protect.on) دیا گیا ہے۔ انہیں مقابلے کا خوف نہیں رہا اس لئے وہ اپنی استعداد (Efficency) بہتر نہیں بنا سکیں۔

۱۰۔ ناموافق حالات:

آزادی کے بعد کافی عرصے تک ملک کو سیاسی استحکام نصیب نہیں ہو سکا اعلیٰ سطح پر آئے دن ردوبدل

ہوتا رہا معاشی منصوبہ بندی کی جانب کافی عرصے بعد توجہ دی گئی نیز بھارت کا رویہ شروع سے ہی خراب رہا ہے جس کے باعث دفاع (Militry) پر بہت زیادہ رقم خرچ کی جاتی رہی، غیر ملکی امداد، اور قرضے بآسانی نہیں ملتے رہے بلکہ ان پر سیاسی مفادات کا رنگ غالب رہا۔

۱۱۔ بددیانتی اور بدعنوانی:

ہماری قومی زندگی میں تقریباً تمام شعبوں میں بددیانتی (Dishoresty) اور بدعنوانی (Coroption) سرایت کر چکی ہے۔ نظم و نسق میں کاروبار و تجارت مین، سیاست و معیشت میں مزدور، مالک تعلقات میں، فرائض کی کوتاہی کی انجام دہی، دفتری کارروائیوں میں غرض بے ایمانی کو بہت فروغ ملا ہے جس کے باعث معاشی ترقی کی راہ میں بے شمار مشکلات پیدا ہو گئی اور رشوت عام ہو گئی ہے۔

۱۲۔ انگریز کا عہد حکومت:

قیام پاکستان سے قبل برصغیر ہندو پاک پر انگریز حکمران تھے۔ انہوں نے پاکستانی علاقہ میں صنعتیں قائم نہ ہونے دیں تاکہ ان کی اپنی صنعت پر برا اثر نہ پڑے۔ وہ یہاں سے مختلف قسم کے خام مواد سستے داموں انگلستان بھیج دیتے اور وہاں سے وہی خام مواد مصنوعات میں ڈھال کر نہایت بلند قیمت پر یہاں فروخت کرتے انہوں نے اس وجہ سے بھی صنعتیں قائم نہ کیں کہ لوگوں کو کارخانوں میں ملازمت کے مواقع نہ مل سکیں، اور وہ فوج میں بھرتی ہوتے رہیں۔

غرض پاکستان میں قومی آمدنی اور فی کس آمدنی نہ صرف کم ہے بلکہ اس میں گزشتہ چند سالوں سے شدید اتار چڑھاؤ بھی ہوتا رہا ہے اس اتار چڑھاؤ کی اہم وجوہات یہ رہی ہیں کہ:

سیاسی، بدامنی، سقوط مشرقی پاکستان، مالک، مزدور، تعلقات میں کشیدگی، بین الاقوامی طور پر مندی کا رجحان، ملک کے اندر سیلابوں کے باعث یا دریاؤں میں پانی کی سطح کم ہونے کے باعث پیداوار میں کمی، بجلی کی کمی، بارشوں کی قلت، فصلوں کی کیڑے مکوڑوں اور امراض کے باعث تباہ کاری صنعتوں

کیلئے زرعی خام مال کی قلت اور سرمایہ کاری میں کمی کا رجحان وغیرہ۔ (۷)

فی کس آمدنی بڑھانے کے طریقے:

پاکستان میں فی کس آمدنی بلند کرنے، بالفاظ دیگر قومی آمدنی بڑھانے اور لوگوں کے معیارِ زندگی کو بہتر بنانے کے لئے مندرجہ ذیل اختیار معلوم کرنے چاہئیں،

ا۔ عزم و جرآت:

پاکستان کی معاشی ترقی کے لئے سب سے پہلی شرط یہ ہے کہ لوگوں کے اندر ترقی کرنے کی خواہش پیدا ہو اور ان میں آگے بڑھنے کا نیا ولولہ اور جوش و جذبہ جنم لے اس کے ساتھ ان میں عزم بھی ہونا چاہئے کہ وہ اس مقصد کیلئے اپنی تمام توتیں اور صلاحیتیں استعمال کریں گے ترقی کی عمارت خود ملکی ذرائع کی بنیاد پر تعمیر کریں گے اور اپنے اس مقصد کو حاصل کرنے کیلئے مسلسل کوشش کرتے رہیں گے۔

۲۔ تعلیم اور فنی تربیت:

کسی ملک میں خواہ کتنے ذرائع موجود ہوں ان سے اس وقت تک فائدہ نہیں اٹھایا جاسکتا جب تک وہاں کے لوگ ان ذرائع کو استعمال کرنے میں ماہر نہ ہوں، معاشی ترقی کا حقیقی دارومدار انسانی کی اپنی صلاحیت، طاقت استعداد پر ہے۔

لہذا جس حد تک ممکن ہو عوام کو زیادہ سے زیادہ تعلیم و تربیت اور فنی و تکنیکی ٹریننگ مہیا کرنے سہولتیں دینی چاہئیں زراعی، صنعتی، تجارتی، بنکاری اور انتظامی امور میں ماہرانہ اور خصوصی تربیت دینے والے ادارے قائم کرنے چاہئیں تاکہ لوگوں میں کام کرنے کی صلاحیت بڑھے، نئے نئے فنون پیدائش اختیار کرنے کی ترغیب ملے، پیشہ ورانہ نقل پذیری میں اضافہ ہو انسانی ذرائع (Humain Resources) کی ترقی کو بہت اہمیت دی جانی چاہئے۔

۳۔ سرمایہ اندوزی:(Capital Acumulation)

معاشی ترقی کے لئے سرمایہ اندوزی یا تشکیل سرمایہ (Capital Formaiton) بہت ضروری ہے اس سے مراد ہے ایسی اشیاء وخدمات میں اضافہ کرنا جو عام ضرورت کی چیزیں تیار کرنے میں مدد دیں مثلاً صنعتی کارخانے، مشینیں، ٹریکٹر، بلڈوزر، ٹیوب ویل، بجلی گھر، آب پاشی کے منصوبے اور ذرائع مواصلات وغیرہ۔

چنانچہ پاکستان میں سرمایہ اندوزی کیلئے مندرجہ ذیل اقدامات کرنے چاہئیں:۔

☆ پس اندازی کی مہم تیز کی جائے۔

☆ بچا ہوا روپیہ کاروبار میں لگانے والے اداروں میں اضافہ کیا جائے مثلاً، بنک اور سرمایہ کاری کی کارپوریشنیں وغیرہ۔

☆ سرمایہ کاری کی حوصلہ افزائی کے لئے ٹیکسوں کی مراعات دی جائیں۔

☆ زرعی آمدنیوں پر ٹیکس بڑھا کر حکومت سرمائے کی مقدار میں اضافہ کرسکتی ہے۔

☆ غیر ضروری اشیائے صارفین کی درآمد بند کی جائے، تاکہ لوگ تعیشات پر روپیہ خرچ نہ کرسکیں۔

☆ دیہات میں جو لوگ برسر روزگار نہیں ہوتے ہیں انہیں دیہاتی معیشت کے ترقیاتی کاموں مثلاً سڑکوں، اسکولوں، ہسپتالوں، اور بندوں وغیرہ کی تعمیر پر لگا کر اشیائے سرمایہ میں اضافہ کیا جاسکتا ہے۔

☆ غیر ملکوں سے قرضے اور امداد سے بھی اشیائے سرمایہ میں اضافہ کیا جاسکتا ہے۔

۴۔ زرعی ترقی:

ہماری خام قومی پیداوار کا 34 فیصد حصہ زراعت سے حاصل ہوتا ہے اور اسی فیصد لوگ زراعت سے روزی کماتے ہیں گویا، ہمارا سب سے بڑا ذریعہ معاش زراعت ہے لیکن بدقسمتی سے یہ پرانے طریقوں پر چلائی جارہی ہے۔ جدید طرز کی مشینوں کو استعمال نہیں کیا جاتا سیم وتھور کی کٹاؤ کی وجہ سے زمین کی

پیداوار گھٹتی جارہی ہے۔اور ہمارے ملک میں ایک ایکڑ کی اوسط پیداوار بہت کم ہے لہذا ملکی دولت میں اضافہ کرنے کیلئے ضروری ہے کہ کھیتی باڑی کا نظام بہتر بنایا جائے۔فصلیں بونے،کاٹنے اور فروخت کرنے اور مصنوعات میں ڈھالنے کے تمام مرحلوں میں اصلاح کی جائے اعلیٰ کھاد اور بیج استعمال کئے جانے چاہئیں۔زرعی شعبہ کی بارآوری (Productivity) بڑھانی چاہئے۔

یہ بھی ضروری ہے کہ زرعی پیداوار میں تنوع (Diversification) پیدا کی جائے تاکہ خوردنی تیل،چینی،سبزیوں،پولٹری،مچھلی،گوشت،اور ڈیری کی پیداواریں بڑھ سکیں۔زرعی مشینوں کا استعمال مقبول بنایا جائے اور چھوٹے کاشت کاروں تک جدید زرعی ٹیکنالوجی پہنچائی جائے۔

۵۔ صنعتی ترقی:

پاکستان کی معاشی ترقی کے لئے ضروری ہے کہ صنعتوں کو ترقی دی جائے،بھاری صنعتیں قائم کی جائیں تاکہ آئندہ معاشی ترقی کی رفتار تیز کرنے کیلئے ضروری سامان ملک کے اندر ہی مل سکے۔اس وقت ہم اپنی ضرورت کی ''اشیاء سرمایہ کاری (Investment Goods)'' کا پچھتر فیصد غیرممالک سے درآمد کرتے ہیں کل قومی آمدنی کا صرف چودہ فیصد صنعتوں سے حاصل ہوتا ہے پھر ایک حالیہ اندازے کے مطابق ہماری بڑی بڑی صنعتوں کی استعداد پہلے سے گرگئی ہے، اور بعض کی بہتر نہیں ہوسکی حالانکہ صنعتی شعبہ (Sector) کو ضرورت سے زیادہ سہولتیں دی گئی ہیں۔

یہ بھی ضروری ہے کہ بنیادی صنعت کو بہت زیادہ اہمیت دی جائے اور صنعتی ہیئت کی بنیاد وسیع ترکی جائے تاکہ ان کی رفتار ترقی تیز تر ہوسکے۔کارخانہ داروں اور سرمایہ کاروں کیلئے یقینی اور حوصلہ بخش فضا پیدا کی جائے،عدم یقینی اور تعطل کے حالات کو ختم کیا جائے غیرممالک سے مشینوں کی درآمد اور قرضہ کی بہم رسانی کے امور سہل بنائے جائیں ٹیکسوں کا نیا ضابطہ بنایا جائے،مالک اور مزدور کے تعلقات میں کشیدگی ختم کرکے حالات کو خوشگوار بنایا جائے۔

۶۔ خاندانی منصوبہ بندی:

جدید ماہرین معاشیات کا خیال ہے کہ ہمارے ہاں فی کس آمدنی کے پست ہونے کی ایک وجہ یہ ہے کہ آبادی تیزی سے بڑھ رہی ہے، اور ملک کے اقتصادی ذرائع پر آبادی کا بوجھ بڑھتا جارہا ہے۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ ہمارے ملک میں آبادی بڑھنے کی رفتار تین فی صدی سال ہے اور معاشی ترقی کے لئے جس قدر بھی منصوبے بنائے جاتے ہیں ان کا نتیجہ آبادی کے بڑھ جانے سے زائل ہوجاتا ہے۔ لہٰذا جب تک آبادی کا کنٹرول نہیں کیا جائے گا معاشی ترقی کے منصوبے بے فائدہ ثابت ہوں گے اور معیارِ زندگی کو بلند کرنے کی ہر ممکن کوشش ناکام رہے گی۔

اس لئے ضروری ہے کہ آبادی کے بڑھنے کی رفتار کم کی جائے، پاکستان میں خاندانی منصوبہ بندی کی مہم کا باقاعدہ طور پر آغاز 1960ء میں کیا گیا تھا لیکن اس کے باوجود آبادی کی شرح افزائش کم ہونے کے بجائے بڑھتی گئی۔

۷۔ ترقیاتی منصوبہ بندی:

قومی آمدنی بڑھانے کیلئے ضروری ہے کہ پوری معیشت کو ایک ضابطہ کا پابند کیا جائے۔ معاشی منصوبہ بندی کے ذریعے۔ زراعت، صنعت، تجارت، قوت، مواصلات، زر، بنکاری اور دیگر شعبوں کے لئے ترقیاتی پروگرام بنائے جائیں۔

۸۔ منصفانی تقسیم دولت:

قومی آمدنی بڑھانے کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ جس حد تک ممکن ہو سکے دولت منصفانہ اور مساویانہ طریقے سے تقسیم کی جائے کیونکہ اس طرح ایک طرف تو ارتکاز دولت کا مسئلہ ختم ہوجائے گا اور متمول طبقہ کے پاس اندھا دھند دولت جمع نہیں ہوگی کہ وہ اسے عیش و عشرت میں اڑا دیں اور دوسری طرف متوسط اور

غریب طبقہ کے پاس بھی اتنی دولت آجائے گی کہ وہ اپنی پیداواری صلاحیتوں سے بہتر فائدہ اٹھانے کے قابل ہو جائیں گے اور یوں قومی آمدنی میں اضافہ ہوگا۔ ملکی دولت کی منصفانہ تقسیم کے لیے ٹیکسوں اور سرکاری اخراجات کا نظام بہتر بنانا چاہیئے۔

۹۔ دیانت وامانت:

قومی آمدنی میں اضافہ اور فی کس آمدنی کا معیار بلند کرنے کیلئے سب سے بڑھ کر جو قدم ضروری ہے وہ یہ کہ قومی زندگی کے سارے شعبوں اور تمام امور ع معاملات میں دیانتداری اختیار کی جائے۔ فرائض کی انجام دہی میں غفلت یا کوتاہی ہرگز نہ کی جائے تجارت اور کاروبار میں بد دیانتی ترک کر دی جائے ہر کام میں ذاتی مفاد پر قومی مفاد کو ترجیح دی جائے اور ذمہ داری اور حب وطن کا پورا پورا ثبوت دیا جائے۔ (۸)

غیر مساوی تقسیم دولت وآمدنی:

پاکستان میں مختلف طبقوں اور دولت کی آمدنی میں وسیع فرق پایا جاتا ہے، ایک طرف انتہائی دولت مند طبقہ ہے جو بڑے بڑے زمینداروں، جاگیرداروں، صنعت کاروں، تاجروں اور درآمد کنندگان پر مشتمل ہے اور دوسری طرف انتہائی غریب طبقہ ہے جو ان افراد پر مشتمل ہے: چھوٹے چھوٹے کاشت کارو، مزارع، مزدور، دست کار، ملازم ان میں بہت سے پورے طور پر برسر روزگار نہیں ہیں ان کی آمدنی اتنی ہے کہ جس سے بمشکل جسم و جان کا رشتہ برقرار رکھ سکیں ان دونوں کے درمیان ایک متوسط طبقہ بھی ہے جو معمولی درجہ کے زمینداروں کارخانہ داوں، افسروں اور تاجروں پر مشتمل ہے۔

آمدنیوں میں عدم مساوات کی وجوہ دو طرح کی ہوتی ہے:۔ ایک عمومی وجوہ جن کو دور نہیں کیا جا سکتا (مثلاً ذہنی لیاقت میں فرق) اور دوسرے خصوصی وجوہ جن کو ہٹایا جا سکتا ہے۔

عمومی وجوہات:

جہاں تک عمومی وجوہات کا تعلق ہے ان میں یہ شامل ہیں:

قدرتی صلاحیتوں میں فرق:

مختلف افراد کی قدرتی صلاحیتیں مختلف ہوتی ہیں بعض بہت ذہین، لائق اور مستعد ہوتے ہیں اور بعض، کند ذہن اور کاہل ہوتے ہیں ان کی اپنی اپنی صلاحیت میں اختلاف کے باعث ان کی قوت کار، استعداد اور آمدنی میں بھی فرق پیدا ہوجاتا ہے اگرچہ انسانی صلاحیتوں کو مناسب ماحول اور بہتر تعلیم و تربیت میں بہتر بنایا جاسکتا ہے۔ لیکن پھر بھی پیدائشی صلاحیتوں میں فرق کو بالکل نہیں مٹایا جاسکتا اور کوئی بھی شخص اپنی خداداد لیاقت سے زیادہ حاصل کرنے کی توقع نہیں کرسکتا۔

ماحول میں فرق:

انسان کا ماحول بھی اس کی کارکردگی، استعداد اور آمدنی حاصل کرنے کی قوت پر اثر انداز ہوتا ہے۔ ایک بچہ جس ماحول میں پرورش پاتا ہے اور اس کے کنبہ کے بڑے افراد جس ذریعہ معاش سے وابستہ ہوں عموماً وہ بچہ بھی اسی کو منتخب کرتا ہے اسیئے پیشہ کے اعتبار سے لوگوں کے مختلف گروہ بن گئے ہیں۔ یہ بات بھی قابل غور ہے کہ غربا اپنے بچوں کو اعلیٰ تعلیم، فنی تربیت، عمدہ ماحول مہیا نہیں کرسکتے لہٰذا ان کے بچے زیادہ آمدنی کمانے کے لائق نہیں ہوسکتے ان کے برعکس امراء کے بچوں کو تعلیم و تربیت کی اعلیٰ سے اعلیٰ سہولتیں میسر آتی ہیں اور وہ نہایت سازگار ماحول میں پروان چڑھتے ہیں اس لئے وہ زیادہ آمدنی کمانے کے لائق ہوجاتے ہیں:

اتفاقات زمانہ:

بعض اوقات مختلف قسم کے اتفاقات بھی انسان کو زیادہ یا کم آمدنی کے لائق بنا دیتے ہیں۔ اگر دفعتہً

جنگ لگ جائے اور کسی خاص شے کی مانگ بڑھ جانے سے اس کی قیمت بڑھ جائے تو وہ شے بنانے والے ناظموں کے منافع یکدم چھلانگ لگائیں گے اور وہ دیکھتے ہی دیکھتے بہت سی دولت سمیٹ لیں گے۔ اس کے برعکس اگر ناگہاں صورکسی شے کی مانگ کم ہو جائے، سرد بازاری واقع ہو جائے یا طوفان، سیلاب، آگ یا کوئی اور حادثہ رونما ہو جائے تو کاروبار کو سخت دھچکا لگتا ہے۔ (۹)

خصوصی وجوہات:

خصوصی وجوہات میں یہ شامل ہیں:

ا۔ غیر مکسوبہ آمدنی:(Unearned income)

جن لوگوں کی ملکیت میں زمین، مکانات یا اس قسم کی غیر منقولہ جائداد ہے انہیں ان کا کرایہ اور لگان حاصل ہوتا ہے پھر آبادی کے بڑھ جانے اور ذرائع کے بہتر ہو جانے سے زمینوں کا لگان بڑھتا جا رہا ہے لہٰذا ایسا طبقہ جاگیرداروں زمین داروں اور جائداد کے مالکوں پر مشتمل ہے، اس کی آمدنی مسلسل بڑھتی جا رہی ہے اس کے برعکس جو لوگ ان اثاثوں سے محروم ہیں۔ ان کی آمدنی قلیل ہے۔

۲۔ سود:

بعض افراد کو ان کے سرمائے سے سود حاصل ہوتا ہے خواہ یہ سرمایہ انہوں نے خود کمایا ہو یا انہیں ورثہ میں ملا ہو، سرمایہ داروی نظام میں یہ طریقہ چلا آتا ہے کہ ایک شخص کی جائداد اور دولت اس کے وارثون کو منتقل ہو جاتی ہے۔ لہٰذا اگر ایک مرتبہ کوئی شخص دولت کما لے تو وہ نہ صرف اس کے بلکہ اس کے وارثوں کیلئے بھی آمدنی کا ایک مستقل ذریعہ بن جاتی ہے اور یوں دولت ایک ہی فرد یا ایک ہی گھرانہ میں جمع ہو جاتی ہے روا شت کا یہ رواج اگرچہ دولت میں عدم مساوات کا سبب نہیں ہے البتہ اس عدم مساوات کو قائم ضرور رکھتا ہے۔

بعض مفکرین یہ رائے پیش کرتے ہیں کہ دولت مند افراد کے ورثاء کو اس رواج سے ایک ایسا فائدہ پہنچ جاتا ہے جو انہوں نے خود اپنے زورِ بازو سے نہیں کمایا ہوتا۔

بعض دیگر مفکرین کی رائے یہ ہے کہ وراثت کا رواج ایک ایسا حق ہے جو معاشرہ کو سونپ رکھا ہے اس لئے یہ حق برقرار رہنا چاہئے۔

۳۔ منافع جات:

عموماً یہ دیکھا جاتا ہے کہ اگر یکساں لیاقت کے افراد دو مختلف پیشے اختیار کریں تو ان کی آمدنی میں اختلاف پیدا ہو جائے گا۔ مثلاً ایک شخص ملازمت کرے اور دوسرا (اگر اس کے پاس سرمایہ ہو) کاروبار کرے۔ تو عموماً کاروبار تجارت میں خدشے زیادہ ہوتے ہیں۔ بہت کم لوگ انہیں مول لیتے ہیں۔ اس لئے منافع جات تنخواہوں کے مقابلہ میں بڑھ جاتے ہیں۔

اب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ پاکستان میں غیر مساوی تقسیم دولت کی وجوہ کیا ہیں:۔

پاکستان میں غیر مساوی تقسیم دولت کی وجوہ:

پاکستان میں لوگوں کی دولت اور آمدنی میں وسیع فرق کئی وجوہ کی بناء پر پیدا ہوا ہے جن میں مندرجہ ذیل قابل ذکر ہیں:

ا۔ ذرائع کی غیر مساوی تقسیم:

پاکستان میں سب سے بڑا اور سب سے اہم ذریعہ آمدنی زرعی زمین ہے۔ لہٰذا جن لوگوں کے پاس اس کی بہتات ہے وہ بہت دولت مند ہیں۔ انہیں نہایت باقاعدگی کے ساتھ معقول آمدنی حاصل ہوتی ہے اور چونکہ وہ اپنی ساری آمدنی خرچ نہیں کر دیتے۔ لہٰذا اس میں پس انداز کر کے آمدنی کے مزید ذرائع حاصل کر لیتے ہیں اور امیر سے امیر تر ہوتے جاتے ہیں۔ اس طبقہ کی دولت آگے ان کی اولاد کو منتقل ہو جاتی

ہے جو بہتر علم اور بہتر تربیت حاصل کر کے اس قابل ہو جاتے ہیں کہ اپنے ذرائع آمدنی کو اور زیادہ مضبوط و مستحکم بنائیں لہٰذا ہمارے ملک میں دولت اور آمدنی کے بیشتر ذرائع اسی طبقہ کی ملکیت میں مرتکز ہوتے چلے آئے ہیں، اور دوسرے طبقوں کو زیادہ دولت حاصل کرنے کا موقع نہیں مل سکا۔

بڑے بڑے زمین داروں اور جاگیرداروں جن کے پاس زمین کی مقدار بہت تھوڑی ہے لیکن وہ کھیتی باڑی کے ساتھ منسلک ہیں یا دیہات میں آباد ہونے کہ وجہ سے زراعت سے وابستہ ہیں۔ ان کی آمدنی نہایت قلیل ہے۔ ان میں یہ لوگ شامل ہیں: چھوٹے کسان، مزارع (یعنی ایسے لوگ جو دوسروں کی زمینوں کو بٹائی پر کاشت کرتے ہیں) زرعی مزدور (جو فصل کی کٹائی کے وقت عارضی طور پر اجرتیں ے کر کھیتوں میں کام کرتے ہیں)

غرض ہمارے ملک میں ناقص زمینداری نظام کے باعث ایک طرف زمین کی بہت بڑی مقدار چند لوگوں کے ہاتھ میں مرتکز ہوگئی، اور دوسری طرف دیہات میں رہنے والی کثیر آبادی زمین سے محروم ہوگئی چنانچہ زمین کی اس غلط تقسیم کے باعث لوگوں کی آمدنیوں میں عدم مساوات پیدا ہوگئی پاکستان میں زرعی اصلاحات صحیح معنوں میں نافذ نہیں ہوسکیں، اس لئے زمین کی تقسیم میں عدم مساوات موجود ہے۔

۲۔ سرمائے کی مقدار:

قیام پاکستان کے وقت غیر مسلموں کے ترک وطن کے باعث ہمارے ہاں صنعت اور تجارت کے میدان میں ایک وسیع خلاء پیدا ہوگیا جس کو پر کرنے کیلئے ایسے لوگ آگے آئے جن کے پاس پہلے سے کچھ سرمایہ تھا یا ان میں ناظمانہ صلاحیتیں موجود تھیں۔ اس وقت ترقی کرنے کے مواقع بہت تھے کیونکہ عام اشیاء کی ضرورت بڑھ رہی تھی۔ قیمتوں کا رجحان اوپر کو تھا اور منافع کی شرح بلند تھی لہٰذا ان لوگوں نے اپنے سرمائے کی مدد سے یا بنکوں سے قرض لے کر بڑے بڑے تجارتی اور صنعتی ادارے قائم کیے جو اب مضبوط بنیادوں پر قائم ہیں تجارت وصنعت کی ترقی کیلئے حکومت نے بھی کافی اقدامات کئے اور ان لوگوں کی حوصلہ

افزائی کی لہٰذا اس طبقہ کی آمدنی کافی زیادہ ہے ان میں بڑے بڑے صنعت کار، تاجر اور درآمد کرنے والے شامل ہیں۔

۳۔ ناخواندگی اور پس ماندگی:

ہمارے ملک میں سولہ فی صد افراد خواندہ ہیں، باقی ان پڑھ ہیں، وہ کوئی ہنر یا کسب نہیں جانتے معمولی قسم کی ٹریننگ سے محروم ہیں۔لہٰذا ان کی استعداد عمل اور صلاحیت بہت پست ہے، کام کرنے کی قوت بہت کم ہے موجودہ دور سائنس اور ٹیکنالوجی کا دور ہے اشیاء پیدا کرنے کے نئے نئے طریقے دریافت ہو چکے ہیں جدید آلات بنائے گئے ہیں، نقل و حمل کی بہتر سہولتیں مہیا ہو چکی ہیں، لیکن جو لوگ بالکل ناخواندہ ہیں وہ ان تمام دریافتوں اور سہولتوں سے فائدہ نہیں اٹھ سکتے ان کی قوتِ کار کم ہی رہتی ہے، اس لئے ان کی آمدنی بھی قلیل ہے۔

۴۔ قیمتوں میں اضافہ:

قیام پاکستان کے بعد قیمتوں کی سطح بلند سے بلند تر ہوتی آئی ہے جس کی کئی وجوہ ہیں:۔

☆ آبادی میں اضافہ

☆ اناج اور اشیائے خورک کی قلت۔

☆ بعض اشیاء کی درآمد پر پابندی۔

☆ برآمدات میں کمی۔

☆ ترقیاتی پروجیکٹ پر روپے کا مصرف۔

☆ بنکوں کے جاری کردہ قرض میں اضافہ۔

☆ روپے کی بیرونی قدر میں دو مرتبہ تخفیف۔

☆ حکومت کی تمویل خاسر کی پالیسی۔

☆ بیرونی ادائیگیوں کا خسارتوازن۔

☆ شرح تجارت (نسبت در آمد بر آمد) کی خرابی۔

ان وجوہ کی بناء پر ہمارے ہاں قیمتوں کی عام سطح بلند سے بلند ہوتی چلی گئی ہے اور اس سے کاروباری طبقہ کو بہت فائدہ پہنچ ہے جبکہ ملازمت پیشہ لوگوں کی حقیقی آمدنی کم ہوتی گئی ہے کیونکہ ان کی تنخواہوں یا اجرتوں میں اسی نسبت سے اضافہ نہیں کیا جاتا رہا جس نسبت سے اشیاء کی قیمتیں بڑھتی گئی ہیں لہذا ایک طرف تو تاجر اور کارخانہ داروں کی آمدنی اور دولت بڑھتی گئی، اور دوسری جانب ملازمت پیشہ لوگوں کی آمدنی کم ہوتی گئی۔

۵۔ سرکاری تجارتی وصنعتی پالیسی:

حکومت پاکستان صنعتی وتجارتی ترقی کے لئے بہت سے اقدامات کرتی ہے۔

☆ درآمدی لائسنس جاری کئے جاتے ہیں۔

☆ بعض صنعتوں کو تامین دی جاتی ہے۔

☆ قرضوں کی سہولتیں مہیا کی جاتی ہیں۔

☆ ٹیکسوں کی چھوٹ دی جاتی ہے۔

ان تمام سہولتوں سے عموماً وہی لوگ فائدہ اٹھاتے ہیں جو پہلے ہی خوشحال اور دولت مند ہوتے ہیں کیونکہ درآمدی تجارت میں نو واردوں کو شامل ہونے کا زیادہ موقع نہیں مل سکا۔ قرضہ یا اس طرح کی دیگر سہولتیں حاصل کرنے میں بھی زیادہ تر وہی لوگ کامیاب ہوتے رہے ہیں جو پہلے سے ہی مضبوط ذریعہ معاش پر قابض ہیں، اوسط درجے یا چھوٹے درجے کے لوگوں کو ان سہولتوں سے فائدہ اٹھانے کا موقع نہیں مل سکتا اس لئے ایک خاص طبقہ کی آمدنی بڑھتی گئی ہے۔ جبکہ دوسرے طبقوں کی آمدنی میں اضافہ نہیں ہو سکا۔ (۱۰)

غیر مساوی آمدنیوں کے اثرات ونتائج:

۱۔ دولت کی غیر مساوی تقسیم اور لوگوں کی آمدنی میں بہت فرق سے نہ صرف کئی ناخوشگوار معاشرتی اور سماجی نتائج پیدا ہوتے ہیں بلکہ معاشی ترقی کی راہ میں بھی رکاوٹ پڑتی ہے، مثلاً زمین کی غیر مساوی تقسیم کے باعث لوگوں کی آمدنی میں جو عدم مساوات پیدا ہوئی ہے اس سے ہمارے معاشی ترقی پر بہت برا اثر پڑا ہے، کیونکہ جو لوگ مزارعین یا زرعی مزدوروں کی حیثیت سے کام کرتے ہیں انہیں اپنی محنت کا پورا ثمرہ نہیں ملتا اسلیئے ان کے اندر زیادہ محنت اور کوشش کرنے کا جذبہ سرد پڑ جاتا ہے۔

۲۔ دولت کی غیر مساوی تقسیم دولت و آمدنی کے باعث ملک میں دو طبقے وجود میں آگئے ہیں، طبقہ امراء (جن کی تعداد بہت تھوڑی ہے) اور طبقہ غرباء (جن کی تعداد بہت زیادہ ہے) اس طرح پاکستانی قوم دو ''قوموں'' میں بٹ گئی ہے، سیاسی اور معاشی اقتدار طبقہ اوّل کے ہاتھ میں منتقل ہوگیا ہے، ایسی صورت میں اگرچہ قانون کی نظر میں سب برابر ہیں لیکن کوئی قانونی حق حاصل کرنے یا مقدمہ لڑنے اور انصاف چاہنے پر جو اخراجات آتے ہیں وہ غرباء کی پہنچ سے باہر ہیں اسلیئے سیاسی آزادی اور مساوات، بے معنی سی ہوکر رہ جاتی ہے تاریخ گواہ ہے کہ بعض انقلابات کی ایک بڑی وجہ یہی ہے ''غیر مساوی تقسیم دولت'' بنی رہی ہے۔

۳۔ غیر مساوی تقسیم دولت کا ایک اور نقصان یہ ہے کہ اس سے ملک کے بعض پیداواری ذرائع ضائع ہوتے رہتے ہیں، طبقہ امراء میں سے بعض افراد اپنی دولت نمائش، عیش وعشرت، ٹھاٹھ باٹھ اور دیگر فضول مشاغل میں ضائع کرتے رہتے ہیں۔ اپنا وقت سیر وتفریح، بے کار گپ بازی اور آرام پسندی میں گزارتے ہیں گویا وہ اپنا وقت اور اپنی محنت پیداواری کاموں میں خرچ نہیں کرتے، دولت پیدا نہیں کرتے البتہ خرچ ضرور کرتے ہیں، اکثر بے راہ روی، بدعنوانی اور اخلاق سوز حرکتوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔

ان کے برعکس طبقہ غرباء کو حسب ضرورت دولت میسر نہیں آتی اس لئے انہیں خوراک، رہائش، تعلیم

....

تربیت، تفریح اور صحت کے لئے مطلوبہ سہولتیں نہیں ملتی، ان کو قوت کار بڑھ نہیں سکتی، استعداد عمل پست رہتی ہے اور یوں پوری قوم ان لوگوں کی محنت اور کارکردگی کے ثمرہ سے محروم رہتی ہے۔

۴۔ چونکہ غرباء کے مقابلہ میں امراء کا میلان صَرف کم ہوتا ہے اس لئے ملک کی معاشی جدوجہد پر برا اثر پڑتا ہے اور موثر طلب کم ہونے سے قومی آمدنی کی سطح بلند نہیں ہوسکتی۔

۵۔ غیر مساوی تقسیم دولت سے نہ صرف زمانہ حال میں برے اثرات پیدا ہوتے ہیں بلکہ یہ آئندہ نسلوں لے لئے بھی ویسے ہی حالات پیدا کرنے کا باعث بنتی ہے۔ کیونکہ اگرچہ تمام بچوں کو قدرت کی جانب سے کم وبیش یکساں صلاحیتیں عطا ہوتی ہے لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ قومی آمدنی کے تقریباً ہر شعبہ میں صرف امیر گھرانوں کے چشم و چراغ ہی سبقت لے جاتے ہیں کیونکہ انہیں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے پورے مواقع مل جاتے ہیں جبکہ غریب گھرانوں کے بچے ناداری اور ناسازگاری کے باعث تعلیم سے محروم رہتے ہیں۔

اصلاحی اقدامات: (Remedial measures)

کسی ملک میں کسی نظام کے تحت تمام لوگوں کی دوست اور آمدنی نہ مساوی ہوسکتی ہے نہ ہونی چاہئے کیونکہ جہاں تک لوگوں کی صلاحیت اور قوت کارفرما کا تعلق ہے یہ سب کی مختلف ہوتی ہے اس لئے ان کی آمدنی میں بھی اسی لحاظ سے فرق پایا جاتا ہے۔ اس قسم کا ختلاف نہ صرف قابل برداشت ہے بلکہ عین ضروری ہے تاکہ:

☆ لوگوں کو اپنی محنت کا پورا پورا صلہ ملنے کا یقین ہو،

اور ان کے اندر ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر محنت کرنے کا جذبہ پیدا ہو۔

☆ وہ اپنی صلاحیت اور قوت کار کو بہتر بنانے کی طرف مائل ہوں

البتہ بعض حالات میں لوگوں کی دوست اور آمدنی میں فرق ایسی وجوہ کی بناء پر پیدا ہوتا ہے جو ناپسندیدہ ہیں اور فوراً دور کرنا چاہئے پاکستان میں ابتدائی سالوں کے دوران جب صنعت کی حوصلہ افزائی

کیلئے مختلف اقدامات کئے گئے اور بعض ضوابط بنائے گئے تو لوگوں کی دولت اور آمدنی میں فرق اور زیادہ ہوگیا کیونکہ ان اقدامات سے زیادہ تر انہی لوگوں کو فائدہ پہنچا جنکے پاس پہلے سے کافی دولت موجود تھی۔

لوگوں کی آمدنی میں عدم مساوات کو دور کرنے کے لئے ضروری ہے کہ وہ وجوہ ختم کی جائیں جنہوں نے اس مسئلے کو جنم دیا مثلاً:

۱۔ زرعی اصلاحات کو مکمل اور موثر طریقہ سے نافذ کر کے سب سے اہم ذریعہ آمدنی یعنی زمین کی تقسیم مساویانہ کرنی چاہئے، تاکہ جو لوگ زمین اور زراعت سے وابستہ ہیں ان سب کو اپنی اپنی محنت کے مطابق صلہ مل سکے اور ان کی آمدنیوں میں وسیع فرق کم ہو جائے۔

۲۔ چھوٹے اور متوسط طبقہ کے لوگوں کیلئے تجارت، صنعت، بنکاری، مواصلات اور دیگر معاشی شعبوں میں آگے بڑھنے کے مواقع بڑھائے جائیں اس سلسلے میں ان کی رہنمائی اور حوصلہ افزائی کرنی چاہئے انہیں قرضہ کی سہولتیں بہم پہنچانی چاہئیں، اور غیر ممالک سے خام مال منگوانے کیلئے لائسنس دینے چاہئیں۔

۳۔ تعلیم و تربیت ہمارے ملک میں اکثر لوگوں کی آمدنی اس لئے کم ہے کہ وہ ناخواندہ ہیں۔ ان کی استعداد کار کم ہیں۔ اور وہ کوئی ایسا کام نہیں کر سکتے جس کیلئے زیادہ سمجھ بوجھ یا ہنر وکسب کی ضرورت ہوتی ہے۔ لہٰذا ملک میں فنی تعلیم کی سہولتیں بڑھانی چاہئیں تاکہ لوگ زیادہ کام کرنے کے قابل ہوسکیں اور زیادہ روپیہ کما سکیں، تعلیم اور فنی تربیت حاصل کرنے کے بعد جس قدر لوگ ٹیکنیشن، انجینئر، اکاؤنٹینٹ، سیلز مین، منتظم وغیرہ بن سکیں گے اتنے لوگ کم آمدنی والے زمرہ میں شامل ہوسکیں گے۔

۴۔ افراط زر سے تاجروں اور صنعت کاروں کو بہت فائدہ پہنچا ہے۔ ان کی آمدنیاں اور منافع جات بہت بڑھ گئے ہیں، جبکہ معینہ آمدنی والے افراد اور غرباء کی پریشانیاں بڑھ گئیں ہیں غرض افراط زر سے ''غیر مساوی تقسیم دولت و آمدنی'' کا مسئلہ اور بھی نازک ہوگیا ہے، اس لئے:

☆ ٹیکس اکٹھے کرنے کا نظام بہتر بنانا چاہئے اور غرباء کو زندگی کی بنیادی ضرورتیں

مثلاً تعلیم علاج اور رہائش وغیرہ مفت یا کم قیمت پر مہیا کرنی چاہیئے:

☆ اجارہ داروں کی حوصلہ شکنی کرنی چاہیے:

☆ ملازمت پیشہ افراد کی تنخواہوں اور اجرتوں میں اضافہ کرنا چاہیئے:

۵۔ امداد باہمی کے ادارے: لوگوں کی دولت اور آمدنی میں وسیع فرق کو کم کرنے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ امداد باہمی کی تنظیم کا مطلب ہی یہ ہے کہ تھوڑے سے وسائل والے لوگوں کو تعاون باہم کے ذریعہ منظم کر کے اس قابل بنایا جائے اور انہیں مضبوط بنا کر مواقع کی یکسانیت بہم پہنچانی چاہیئے:

۶۔ سرکاری مالیاتی پالیسی اس طرح مرتب کی جائے کہ امیر پر محصول عائد کئے جائیں اور غرباء پر سے بوجھ کم کر کے انہیں ریلیف مہیا کیا جائے گویا آئندہ براہ راست ٹیکسوں پر زیادہ سے زیادہ دارومدار کیا جانا چاہیئے۔

۷۔ چوتھے منصوبے میں ایک منصوبہ صرف اشیائے (Consumption Plan) بنایا گیا تھا جس میں یہ طے کیا گیا کہ ملک کو ضروری اشیائے کی ہر سال کتنی مقدار درکار ہے اور اسی مقدار کو پورا کرنے کیلئے اشیاء کی پیداوار اور درآمد بڑھائی جائے گی۔ نیز ایک قابل عمل قیمت پالیسی مرتب کی جائے گی تاکہ قیمتوں کا معیار ایک خاص حد سے بڑھنے نہ پائے۔

پاکستان پلاننگ کمیشن لکھتا ہے کہ ملک میں صنعتی آمدنیوں کے ارتکاز پر سخت نکتہ چینی کی جاتی ہے اس قسم کی بحث ناگزیر ہو جاتی ہے جب ایک ملک صنعتی ترقی کے دوسرے مرحلے سے گزر رہا ہوتا ہے۔ ہم بھی اس دور سے گزر رہے ہیں، اس وقت صنعت کاروں کو پہلی پود نے اپنی جڑیں مضبوط کر لی ہیں، اب سرمایہ آگے آنے سے نہیں ہچکچاتا اور صنعتی میدان میں نو واردان وہی مراعات طلب کرتے ہیں جو پہلے صنعت کاروں کو دی گئیں، اب چند گھرانوں میں صنعتی اقتدار کا مرتکز ہو جانا کھلے مقابلہ کے راستے میں رکاوٹ بنا ہوا ہے اور خود تخلیقی کاروباری کوشش کا منبع ہی ختم کرنے کیلئے خطرہ بن گیا ہے۔

اب معاشی ترقی کا ایسا مرحلہ آن پہنچا ہے جب کچھ بنیادی اصلاحات نافذ کر دینی چاہئیں تاکہ صنعتی آمدنی اور دولت کا ارتکاز ایک حد سے بڑھنے نہ پائے اس کا ثبوت ان باتوں سے ملتا ہے:

۱۔ صنعت کاروں کی پہلی پود (جس نے جزوی طور پر اپنی ناظمانہ قابلیت کی بناء پر کمائی کی) اب صنعتی دولت دوسری پود کے حوالے کردی ہے جس کیلئے ایک غیر مکسوبہ غیر مترقبہ (Uncarned wind fall) دولت ہے۔

۲۔ صنعت افروزی (Industialization) کا پہلا دور ختم ہو چکا ہے اور دوسرا دور شروع ہو رہا ہے،، اس میں اعلیٰ قسم کی پیچیدہ صنعتوں کے قیام پر زور دیا جائے گا اور اس کیلئے نئی نئی معلومات اور مستعد انتظامیہ کی ضرورت ہوگی، ان حالات میں انفرادی کوششوں اور ملکیتوں کے بجائے اداراتی اور پیشہ وارانہ انتظامیہ کی ضرورت ہوگی۔

۳۔ اگر صنعتی اقتدار چند ہاتھوں میں مرتکز رہے تو سرکاری منظوریاں اور بنکوں کے قرضے بھی صرف چند گھرانوں کو ہی ملتے ہیں اور نو وارد ان سہولتوں سے بالکل محروم رہتے ہیں اس طرح نہ صرف معاشرتی انصاف مجروح ہوتا ہے بلکہ خود معاشی ترقی کی رفتار بھی سست پڑ جاتی ہے۔

۴۔ اس وقت ضرورت اس امر کی ہے کہ ملک کے پس ماندہ علاقوں کی صنعت افروزی کی جانب زیادہ سے زیادہ توجہ دی جائے لیکن یہ کام اس وقت تک ممکن نہیں جب تک ارتکاز دولت کی لعنت کو دور نہ کیا جائے

۵۔ ارتکاز دولت کا مسئلہ اس مرحلہ پر قابل علاج ہے کیونکہ ابھی صنعتی شعبہ ہماری خام پیداوار کا صرف چودہ فیصد ہے لیکن آئندہ دس سالوں میں بڑھ کر یہ پچیس فیصد ہو جائے گا اسئے ابھی وقت ہے کہ اس مسئلہ کو موثر طریقہ سے حل کر لیا جائے کیونکہ ہمارے موجودہ نظام میں بڑے بڑے صنعتی خاندانوں کا زیادہ تر دارومدار سرکاری سرپرستی پر ہے وہ حکومت سے جاری کردہ لائسنسوں، منظوریوں اور قرضوں کے بل بوتے پر ڈھیروں منافع کما رہے ہیں۔

حکومت پاکستان نے تہیہ کر رکھا ہے کہ صنعتوں کی ملکیت کو وسیع سے وسیع تر کر دیا جائے چنانچہ اس سلسلے میں کئی اقدامات کئے گئے ہیں مثلاً:

مختلف تجارتی و صنعتی اداروں میں عام لوگوں کے حصص شامل کرنے کے لئے ہدایت جاری کی گئیں۔ صنعتی اداروں کی ملکیت وسیع بنیادوں پر قائم کی جائے گی۔

منصوبہ بندی کمیشن کی رائے یہ ہے کہ اس سلسلہ میں ایک ایک بنیادی اصلاح کی جانی باقی ہے اور وہ یہ ہے کہ پہلے سے قائم شدہ صنعت کاروں سے کہا جائے کہ وہ نئی پیچیدہ اور دشوار قسم کی صنعتیں قائم کرنے، نئی ٹیکنالوجی متعارف کرنے اور نئی تحقیق کی ذمہ داری اٹھانے کے میدان میں اپنا اہم کردار ادا کرتے رہیں۔ صنعتی میدان میں نو واردوں کے داخلہ کیلئے دروازے کھلے رہنے دیں اور آزادانہ مقابلہ کے ذریعے منافع کمائیں گویا اب منافع رعایت و عنایت کے بجائے تخلیقی کاروباری کوششوں کی بناء پر ملنا چاہئے:

تاہم صنعتی آمدنیوں اور دولت کے ارتکاز کے مسئلہ کو حل کرنے کے لئے منصوبہ بندی کمیشن نے چوتھے منصوبے میں مندرجہ ذیل اقدامات تجویز کئے:

۱۔ قرضہ دینے والے اداروں بالخصوص تجارتی بنکوں کے لئے قرضہ دینے کے بارے میں ایسی پالیسی وضع کرنی چاہئے کہ چھوٹے اور متوسط درجہ کے قرضہ مانگنے والوں کو بھی قرضہ مل سکے، اس وقت بڑے بڑے صنعتی خاندانوں کو بنکوں تک لامحدود رسائی حاصل ہے اسے کم کرنا چاہئے اگر ان کوششوں کے باوجود چھوٹے قرضداروں کو معقول حد تک قرضہ جاری نہ کیا جائے تو پھر ایسی حد لگا دینی چاہئے جس سے زیادہ کسی بڑے صنعت کار کو قرضہ نہ دیا جائے۔

۲۔ سرکاری مالیاتی پالیسی کو بڑے موثر طریقہ سے استعمال کر کے صنعتی آمدنی اور دولت کو چند ہاتھوں میں جمع ہونے سے روکنا چاہئے اس وقت صنعتوں میں روپیہ لگانے، پیداوار بڑھانے اور اشیائے برآمد

کرنے کے کام کی حوصلہ افزائی کرنے کے لئے حکومت نے بہت سی مراعات دے رکھی ہیں جن کی بناء پر وہ بہت زیادہ محاصل کی قربانی دے رہی ہے۔

لیکن دوسری جانب حکومت کو خام قومی پیداوار کا صرف 2 فیصد براہ راست ٹیکسوں سے حاصل ہوتا ہے حالاں کہ دیگر ترقی پذیر ممالک میں حکومت قومی پیداوار کا اوسطاً چھ فیصد حصہ براہ راست ٹیکسوں کی معرفت حاصل کرتی ہے اور ترقی یافتہ ملکوں میں سترہ فیصد، اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ پاکستان میں زیادہ آمدنی والا طبقہ حکومت سے مراعات بہت لیتا ہے لیکن اس پر ٹیکسوں کا بوجھ انتہائی کم ہے، یہ صورتحال بدل دینی چاہئے۔

۳۔ صنعتی میدان میں نو واردوں کی حوصلہ افزائی کرنی چاہئے تاکہ وہ نئے نئے کاروبار شروع کریں انہیں ٹیکسوں کی مراعات اور دیگر سہولتیں بہم پہنچانی چاہئیں، عام اور سادہ قسم کی شیئے صارفین بنانے کی صنعتیں صرف نو واردوں کے لئے مخصوص کر دینی چاہئیں۔ اور صنعتی ترقیاتی بنک پر لازم ہے کہ نو واردوں کی حوصلہ افزائی کریں اور انہیں زیادہ قرضہ دیں۔ (۱)



باب ھفتم

فصل "د"

اصلاح معاشیات و اقتصادیات کے حقیقی و معنوی طریقے:

(شاہ ولی اللہؒ کی نظر میں)

اللہ تعالٰی نے جب زمین پر اپنی مخلوق پیدا کی تو ان کی معاش وروزی بھی زمین پر مقرر فرمائی اور زمین کی اشیاء سے انتفاع ان کیلئے مباح اور جائز کر دیا، اور چونکہ حرص وراز کی وجہ سے ان کے نزاعات و جھگڑے ہونے لگے تو حکم الٰہی ہوا قرار پایا کہ کوئی انسان کوئی انسان دوسرے انسان کی مخصوص چیز میں کسی قسم کی مداخلت نہ کرے۔

اور یہ اسکی مخصوص ومختص چیز اس طرح ہوگی کہ اس چیز پر قبضہ ہو یا اس کے کسی مورث کا قبضہ تھا یا کسی ایسے طریقے سے اس چیز پر اس کا قبضہ ہے جو ان لوگوں میں عمومی طور پر قبضہ اور ملکیت کے لئے معتبر مانا جاتا ہے اس قسم کے قبضہ اور ملکیت میں سوائے تبادلہ کے اور سوچ سمجھ کر یا کسی فریب، دھوکہ، اور قابل اعتماد باہمی رضامندی کے کسی قسم کی مزاحمت کرنا حرام اور ناجائز ہے۔

چونکہ انسان مدنی الطبع واقع ہوا ہے اور باہمی تعاون انسان کے انسان کی معاشی ومعاشرتی تعمیر کی استقامت ناممکن ہے اس لئے قضاء الٰہی نے انسانوں کیلئے باہمی تعاون واجب اور لازم کر دیا، چونکہ نوع انسان کا کوئی فرد بلا کسی سخت مجبوری کے تمدنی وعمرانی اور تمدنیات وعمرانیت کے دخل واثر سے علیحدہ بے تعلق اور بے اثر نہیں رہ سکتا اور اس کا اصل اور حقیقی سبب اور وجہ یہی ہے کہ ہر انسان کیلئے اپنے مباح مال کا تحفظ ناگزیر ہے نیز اس مال مباح کا جو ہر انسان کیلئے مختص ہو چکا ہے جس کے ذریعہ پر انسان اپنی امداد و استعانت کیا کرتا ہے۔ نمو اور اضافہ بھی ضروری ہے مثلاً چوپائے ہوں تو ان کی نسل بڑھائی جائے زمین ہو تو

اس کی اصلاح و درستگی کی جائے اور اسے قابل زراعت بنایا جائے زمین کے اندر پانی سینچا جائے اور پانی کے ذریعہ کھیتی کی پیداوار میں اضافہ کیا جائے وغیرہ وغیرہ۔

پس!! اس قسم کے امور میں شرط لازم کردی گئی کہ لوگ باہم ایک دوسرے کو عنیق وتنگی میں نہ ڈالیں کہ جس کی وجہ سے اصل تمدن میں فساد اور خرابیاں پیدا ہوں جائیں۔

اور پھر یہ لوگوں کے مال میں نمو اور اضافہ بلا باہمی تعاون معاشی کے متعذر اور محال ہے اور اس تعاون کے کچھ ایسے طریقے ہیں جن کے بغیر شہری زندگی کی استقامت متغیر اور دشوار ہو جاتی ہے مثلاً کچھ لوگ ایک شہر سے دوسرے شہر میں جا کر تجارت کرتے ہیں اور اپنی نفع اندوزی کو ایک مخصوص میعاد تک کے لئے محفوظ کر لیتے ہیں یا کچھ لوگ دلالی میں سعی وکوشش کو کام میں لاتے ہیں یا کچھ لوگ اپنی ایجادات و صنعت گری کے ذریعے لوگوں کے مال ومتاع کے اندر ایک خاص پسندیدہ شان پیدا کر دیتے ہیں یا اس قسم کی اور صورتیں اختیار کر لیتے ہیں۔

پس! مال کے نمو اور اضافہ کے وہ طریقے ہیں کہ باہمی تعاون میں اثر نہ ہو جیسے قمار بازی جوا یا اسی باہمی رضامندی ہو مثلاً سود یا کہ مفلس اور کنگال آدمی اس سے مجبوراً ایسی رقم اپنے ذمہ لازم کر لیتا ہے جس کا ایفاء اس کی قدرت و طاقت سے باہر ہوتا ہے اور حقیقت اس کی رضامندی حقیقی رضامندی نہیں ہوتی اور اسی وجہ سے سود کا عقد ولین دین پسندیدہ عقد ولین دین نہیں ہوتا اور تحصیل مال کا یہ صحیح وصالح سبب اور طریقہ نہیں ہے جبکہ شرعی حکمت اور مصلحت کے اندر یہ ایک باطل اور قطعاً حرام عقد ہے۔

آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''من احیا ارضا میتة فھی له''

ترجمہ: جس نے مردہ بنجر زمین آباد کی تو زمین اس کی ہے۔ (۱۲)

'اقول' میں کہتا ہوں کہ اس کی اصل حقیقت وہی ہے جس کی طرف ہم اشارہ کر چکے ہیں کہ

یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کا مال اور ملکیت ہے لیکن چونکہ اللہ تعالیٰ نے زمین اور زمین کی اشیاء سے استخاع مباح جائز گردانا ہے تو لازمی امر ہے کہ حرص اور نفع اندوزی کی خواہشات کی وجہ سے باہمی کشمکش ہوا کرے گی پس! اس وقت شرعی حکم یہ ہوگا کہ جس نے بلاکسی ضرر رسانی کے سب سے پہلے جس زمین پر قبضہ کیا وہ اس کی ہوئی اس کو اس سے بے دخل نہیں کیا جا سکتا وہ مردہ اور بنجر زمین ہو شہر کے اندر نہیں اور شہر کے اردگرد ہے جب اس کو کوئی شخص بلاکسی ضرر رسانی کے آباد کرے گا تو اس زمین پر اسی کا قبضہ کہا جائے گا۔ کیونکہ اس زمین پر سب سے پہلے اسی نے قبضہ کیا اور اسی صورت میں حکم یہی ہوگا اس زمین سے اس کو جبراً بے دخل نہیں کیا جائے گا۔ زمین کی حیثیت اور حقیقت مسجد، رباط، صحرائے اور مسافر خانہ کی سی ہے کہ وہ نمازیوں، مسافروں، راہگیروں کے لئے وقف ہوا کرتے ہیں، اور تمام انسان ان کے اندر شریک اور حصہ دار ہوتے ہیں جو شخص پہلے آئے گا وہ پہلے حقدار ہوگا اور کسی انسان کی ملکیت کے معنی یہ ہیں کہ اس چیز سے انتفاع کا حق سب سے زیادہ اس کو ہے دوسرے کو نہیں۔

آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''عادی الارض اللہ و رسولہ ثمہ ھی لکم منی'' (١٣)

ترجمہ: عادی لاوارث زمین اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی ہے پھر وہ میری جانب سے تمہارے لئے ہے۔

عادی زمین وہ ہے جس کے مالک ہلاک ہو جائیں اور اس زمین کا کوئی وارث اور دعویدار نہ رہا ہو جو اپنا حق پیش کر سکے اور مخاصمت کیلئے کھڑا ہو اور محبت و دلیل میں اپنے کسی مورث کا قبضہ اور ملکیت پیش کرے۔ اس قسم کی زمین سے انسانوں کی ملکیت منقطع ہو جاتی ہے۔ اور وہ صرف اللہ تعالیٰ کی ملکیت ہو جاتی ہے اس زمین کا حکم وہی ہوگا جو کبھی زندہ اور آباد نہیں ہوئی تھی اسی معنی کی رو سے وہ غیر آباد کہی جائے گی جو ہم نے ملک اور ملکیت کے معنی میں بیان کئے ہیں۔

آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا۔

''لاحمی الا اللہ ورسولہ''

ترجمہ: چراگاہ کا احاطہ اللہ اور اس کے رسول کے سوا کسی کا نہیں۔ (۱۴)

شاہ صاحب کہتے ہیں کہ چراہ گاہ کا احاطہ کرنا لوگوں کے حق میں ایک قسم کی تنگی اور تکلیف ہے ان پر ایک قسم کا ظلم ہے اس سے ان کو ضرر اور نقصان پہنچتا ہے۔ پس آنحضرت ﷺ نے اس کی سخت ممانعت کردی اور حدیث کے اندر آنحضرت ﷺ کی ذات کو اس لئے مستثنیٰ ہے جن امور کی بناء پر تہذیب نفس وغیرہ پر ہے ان میں آنحضرت ﷺ کی ذات اور دوسرے لوگ مساوی ہیں انحضرت ﷺ نے مہر روز کے سیلاب کے متعلق یہ فیصلہ فرمایا تھا۔

''ان یمسک حتیٰ یبلغ الکعبین ثم یرسل الا علیٰ علی الا سفل'' (۱۵)

ترجمہ: پانی کو اس وقت روکے کہ پاؤں کے گٹوں تک پہنچ جائے پھر اوپر والا نیچے والے کے لئے پانی چھوڑ دے۔

اور حضرت زبیرؓ کی مخاصمت کے قبضہ میں آپ نے یوں فیصلہ دیا تھا:۔

''اسق یا زبیر ثم احبس حتی یرجع الی جدر ثمہ ارسل الماء الی جارک'' (۱۶)

ترجمہ: ''زبیر! تم پانی کو اس وقت تک روکو کہ پانی کھیت کی دیواروں تک پہنچ جائے اس کے بعد پانی کو اپنے پڑوسی کے لئے چھوڑ دو''

اس بارے میں حضرت شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ جس مباح چیز میں بہت سے لوگوں کے حقوق علی الترتیب لازم ہوں تو اسی صورت میں واجب یہی ہے کہ ترتیب کی اسی قدر رعایت کی جائے کہ جس سے

سب کو فائدہ پہنچے اور یہ فائدہ ایسا ہو جو کم سے کم سمجھا جائے اور اس صورت میں اگر قریب ترین آدمی کو مقدم نہ رکھا جائے تو ایک اور سختی سمجھی جائے گی اور لوگوں کو ضرر نقصان ہوگا اور الاول ثم لاول کو بالترتیب فائدہ نہ پہنچے گا تو حقدار کو حق نہیں مے گا۔

چنانچہ آنحضرت ﷺ نے اسی اصل اور قاعدہ کے مطابق فیصلہ فرمایا کہ ''پانی کو اس وقت روک لیا جائے کہ گٹوں تک ہو جائے اور گٹوں تک پانی کی مقدار قریب قریب وہی مقدار ہے جو آپ نے دیواروں اور مینڈھوں تک پانی پہنچنے کی مقدار بیان فرمائی ہے۔ کیونکہ گٹوں تک پانی پہنچنے کی مقدار اتنی ہی ہے کہ اس سے کھیت کی دیواروں تک پانی پہنچ جاتا ہے جب تک پانی کی اتنی مقدار نہ ہوگی تو دیواروں تک پہنچنے سے پہلے ہی زمین اس کو جذب کر لے گی آنحضرت ﷺ نے ابیض بن جمال المار بی کو نمک کا ایک چشمہ دار قطعہ عطا کر دیا تھا کسی نے عرض کیا یا رسول اللہؐ آپ نے اس کو نہ ٹوٹنے والا (ختم نہ ہونے والا مادہ دے دیا) راوی کہتا ہے کہ یہ سن کر آپ ﷺ نے وہ قطعہ ان سے واپس کر لیا۔

(شاہ صاحب فرماتے ہیں) میں کہتا ہوں کہ اس امر میں کسی شک کی گنجائش ہی نہیں ہے کہ جن معادن اور کانوں میں زیادہ محنت اور مشقت کی ضرورت ہو ایسی معادن اور کانیں کسی ایک مسلمان کو دے دینا عام مسلمانوں کے حق میں مضر رساں ہے اور ان کے حق میں ایک قسم کی ضیق اور تنگی ہے آپؐ نے اس قطعہ نمک کو ابیض بن جمال مار بی سے واپس کر لیا۔ آنحضرت ﷺ سے لقطہ یعنی کسی کی پڑی ہوئی چیز سے متعلق سوال کیا گیا تو آپؐ نے جواب دیا:

''اعرف عفاصها، ووکائها ثمه عرفها سنة، فان جاء صاحبها والا شانک بها'' (۷)

ترجمہ: اس کا منہ اور بندھن اچھی طرح پہچان لو، اور سمجھ لو، پھر سال بھر تک اس کا تعارف کراؤ، اگر اس آشنا میں اس کا مالک آجائے تو

فیہا ورنہ پھر تمہیں اس کے متعلق اختیار ہے، سائل نے کہا 'فضالة الغنم' ''کسی کی گمشدہ بکری مل جائے تو کیا کرنا چاہئے'' آپؐ نے جواب دیا 'ھی لک اولاخیک اوللذئب' ''وہ یا تو تیرے لئے ہے یا تیرے بھائی کے لئے، یا بھیڑیئے کے لئے'' سائل نے کہا ''مالک ولھا معھا سفائھا وحذائھا ترد الماء وتاکل الشجرة حتیٰ تلقاھا ربھا''(۱۸)

ترجمہ: بائع مشتری (لین دین کرنے والوں) کو ایک دوسرے کے مقابلہ میں اس وقت تک اختیار نہیں ہے کہ دونوں جدا نہیں ہوئے اس کے بعد اختیار نہیں مگر ہاں بیع خیار میں اس کے بعد بھی اختیار ہے(۱۹)

شاہ صاحب فرماتے ہیں:

یہ سمجھ لو کہ یہاں کسی ایسی چیز کی ضرورت ہے جو بائع ومشتری کے حق کا قطعی فیصلہ کر دیا جس سے دونوں حق بالکل ممتاز اور علیحدہ ہو جائیں اور بیع وشراء کو مسترد کرنے کا اختیار دونوں سے مرتفع ہو جائے، اگر اس قسم کا قاملع فیصلہ کن امر نہ ہوتو بائع ومشتری ایک دوسرے کو نقصان پہنچا سکتے ہیں ان میں سے ہر ایک کے قبضہ میں جو عوض ہو چکا ہے اس کے اندر تصرف کرنے سے بوجہ اس خوف کے کہ مستقبل میں سامنے والا مزاحمت کرے گا احتراز نہ کرے گا۔

یہاں یہ بات بھی سمجھ لینی چاہئے کہ عام طور پر بیع وشراء کے وقت کچھ ایسے الفاظ بولے جاتے ہیں جن سے متعاقدین یعنی بائع مشتری کی رضامندی اور عزم وارادہ ظاہر ہوتا ہے۔ لیکن اس قسم کے الفاظ قطعی

فیصلہ کن الفاظ نہیں گردانا جا سکتا کیونکہ اس قسم کے الفاظ بیع وشراء لین دین اور مال کی قیمت کی طرف متوجہ اور مائل کرنے کے لئے بولے جاتے ہیں لین دین کی رضامندی، اور بات چیت اس قسم کے پختہ اور زوردار الفاظ کے بغیر ناممکن ہوتی ہے نیز معاملات میں عام لوگوں کی زبان سے اس قسم کے الفاظ نکلنا ان کی قلبی اور دلی رغبت وخواہش کے اظہار کی ایک صورت ہوا کرتی ہے لہٰذا الفاظ میں فرق کرنا ضروری ہے اس میں فرق نہ کرنا عظیم تین حرج ونقصان کا موجب ہے اسی طرح جو چیزیں تبادلہ میں پیش کی جاتی ہیں۔ ضروری ہے کہ وہ سامنے والے سے مانگے اور جو چیز خریدنا چاہتا ہے اسے دیکھ لو اور دیکھ بھال کر اس پر غور تو بل کرلو، اور ظاہر ہے کہ اس قسم کے لینے میں اور قبضہ کیئے لینے میں بڑا فرق ہے۔

نیز یہاں یہ چیز بھی جائز نہیں ہے کہ عقد بیع وشراء کی قطعی فیصلہ کن چیز کوئی امر ایسا ہو جو واضح اور ظاہر نہ ہو اور نہ ہی یہ قطعی فیصلہ کن امر ہے کہ کوئی ایسی مدت اور میعاد ہونی چاہئے جو ایک دن یا ایک دن سے زیادہ ہو کیونکہ اکثر و بیشتر متاع وسامان اس لئے خریدا جاتا ہے کہ اسی دن اس سے فائدہ اٹھایا جائے۔ (۲۰)

تمدن اور پیشے:

اندازہ ہونا چاہئے کہ شہر کے اندر مثلاً دس ہزار (10,000) آدمی اجتماعی زندگی بسر کر رہے ہیں اس وقت اس شہر کی مدنی شہری سیاست اور شہر کے باشندوں کے کسب اور پیشوں سے بچت ناگزیر ہوگی اگر ان لوگوں میں اکثر و بیشتر ایسے لوگ بستے ہیں جو صنعت وحرفت کا پیشہ اختیار کرتے ہیں اور شہری سیاست ونظام سے سروکار رکھتے ہیں اور بہت کم لوگ بستے ہیں ایسے میں جو پانی مویشی پروری اور زراعت کا پیشہ کرتے ہیں تو سمجھ لین چاہئے کہ ان لوگوں کی دنیوی زندگی بالکل فاسد اور خراب ہو کر رہ جائے گی اور اگر یہ لوگ شراب کشی، اور خمر سازی، اصنام تراشی کے پیشے اختیار کریں تو ظاہر ہے کہ لوگوں کے حق میں یہ ایک اس قسم کی اس امر کی ترغیب واشاعت ہوگی کہ لوگ ان چیزوں کو اسی طریقہ پر استعمال کریں گے جس طریقہ

پر ان چیزوں کا استعمال ان لوگوں کے یہاں عام طور پر شائع اور رائج ہے اور ظاہر ہے کہ ایسا کرنا ان کے دین و مذہب کی بربادی کا موجب اور سبب ہوگا پس اگر عطیہ حکمت الہیہ کے مطابق معروف و مستحسن طریقوں پر معروف و مستحسن کسب اور پیشے ان کے لئے لازم تر دیئے جائیں اور ذیل پیشوں سے ان کو روک دیا جائے تو شہری باشندوں کی حالت یقیناً درست ہو جائے گی بالآخر یہی چیز ان لوگوں کو جو معاشرت کے ضروری شہری مشاغل میں لگے ہوئے ہیں، جیسے انسان کہ کسان، تاجر، ارنان ضائع و جرف وغیرہ ضیق و تنگی میں مبتلا کریں گے اور ان پر دو چند سہ چند مزائب محاصل اور ٹیکس عائد کر دیں گے اور ظاہر ہے کہ شہر و ملک کے لئے ایسا متعدی ضرر رساں مرض اور روگ ہے کہ شہر و ملک کے تمام گوشوں میں پھیل جائے گا، اس طرح عام ہو جائے گا کہ تمام باشندوں کو اپنی زد میں لے لیگا۔

اور یہ مرض اور اس کا زہر شہر و ملک میں اس طرح جاری و ساری اور پیوست ہو جائے گا جس طرح کسی کو کتا کاٹ لیتا ہے، اور اس کے سارے جسم میں اس کا زہر سرایت کر جاتا ہے اور یہی وہ مہلک و خطرناک مرض تھا جو عجمی ممالک میں بلائے بے درماں کی طرح تمام پر مسلط ہو چکا تھا چنانچہ خدائے قدوس نے اپنے پیغمبر ﷺ کو القاء فرمایا کہ اس مرض مہلک کا علاج کریں اور مرض کے اصل مادہ کا قلع قمع کر دی پس آنحضرتؐ نے ان مہلک امور کے غالب مظنات و مواقع پر غور و تامل فرمایا مثلاً لونڈیوں کو رقص و سرور گانے بجانے کی تعلیم دینے حریر و ریشم اور ریشمی لباس پہننے مختلف قسم کے سونے کا تفاضل اور زیادتی کے ساتھ تبادلہ اور لین دین کرنے کی آپ نے سخت ممانعت فرما دی:

ممنوع بیع وشراء

(حکمت شرعیہ اس بیع وشراء کو ممنوع قرار دیتی ہے جس کے اندر جہالت اور منازعات کا احتمال ہو)

معلوم کرنا چاہئے کہ ''میسرہ'' یعنی ایک حرام و باطل معاملہ ہے کیونکہ جوا لوگوں کے مال چھیننے کا نام ہے جس کا اعتماد اور دارومدار جہالت، حرص، باطل آرزو اور فریب و دھوکا پر ہے جس سے جوئے

باز مذکورہ شرائط کو ماننے پر آمادہ ہو جاتا ہے جوئے کو تمدن اور تعاون باہمی میں کسی قسم کا دخل نہیں اگر دھوکا کھانے والا خاموشی اختیار کرتا ہے تو غصہ پی کر اپنے خسران اور ٹوٹے پر خاموشی اختیار کرتا ہے اگر مخاصمت اور جھگڑا کرتا تو ایسی بات کے متعلق جھگڑا کرتا ہے جو خود اس نے اپنے لئے لازم کر لی ہیں اور لازمی اور اپنے قصد و ارادہ سے اس میں پھنسا ہے اور وہ شخص جو غبن کرتا ہے دھوکا فریب دے کر جوئے میں بازی جیت لیتا ہے جب اس کو کچھ نفع ہوتا ہے تو یہ نفع اس پر بڑی جیت کو دعوت دیتا ہے اور حرص آگ کی طرح ٹھنڈی ہونے نہیں پاتی اور یہ قلیل چیز بھی اس کے حق میں وہاں بن کر رہ جاتی ہے اور ظاہر ہے جوئے کی عادت مال و دولت کی تباہی و بربادی ہے اور طول وطول مناقشات اور جھگڑوں کا موجب بن جاتی ہے اور معاشرت و معاش کہ وہ طریقے جو عین مقصود ہیں وہ متروک ہو جاتے ہیں اور جس تعاون باہمی پر تمدن و عمران کی عمارت قائم ہے اس سے روگردانی لازم ہو جاتی ہے اور شب و روز کا معائنہ تمہیں آگاہی دیتا ہے کہ کسی ایک قمار باز کو تم ایسا نہ پاؤ گے جو مذکورہ خرابیوں میں مبتلا نہ ہوا ہو ربا یعنی ''سود'' دو قسم کا ہوتا ہے ایک حقیقی، دوسرا غیر حقیقی، جو حقیقی پر محمول کیا جاتا ہے حقیقی سودیوں اور قرضوں میں ہوا کرتا ہے اور ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ سود کا لین دین اصل موضوع معاملات کے خلاف ہے۔

اور یہ بھی بیان کر چکے ہیں کہ جاہیت میں لوگ نہایت خطرناک طریقے پر سود کے کاروبار میں مشغول ورمنہمک رہتے تھے جس کی وجہ سے ان کے اندر بڑے بڑے مناقشات اور لڑائیاں ہوتی رہتی تھیں اور یہ بھی بیان کر چکے ہیں کہ اس کا چھوٹے سے چھوٹا کاروبار بڑے سے بڑے کاروبار کی طرف کھینچ لے جاتا ہے اس لئے واجب ہو گیا ہے کہ سرے سے اس کا سد باب کر دیا جائے اور یہی وجہ تھی جو قرآن حکیم کی آیتیں نہایت مناسب طریقہ سے نازل ہوئیں۔

دوسری قسم کا سود ''ربا الفضل'' ہے یعنی کسی قسم کی زیادتی و اضافہ کے ساتھ لین دین کرنا اور اس قسم کے سود کے متعلق اصل اصول یہ مشہور و مستفیض حدیث ہے۔

'الذهب بالهذب الفضة والبر بالبر والشعير بالشعير والتمر، والملح بالملح مثلاً سواء بسواء يدابيد، فاذا اختلف نبيعوا كيف شئتم اذ كان يدابيد' (۲۱)

ترجمہ: ''سونے کے بدلے، چاندی، گیہوں کے بدلے گیہوں، جو کے بدلے جو، کھجور کے بدلے کھجور اور نمک کے بدلے نمک کے مثل بالمثل برابر دست بدست ہو تو جس طرح چاہو فروخت کرو'

اسی ''ربا الفضل'' یعنی زیادتی اور اضافہ کے لین دین کو تضیطاً بوجہ سود حقیقی کی مشابہت کے سود کہا گیا ہے اسی طریقہ پر اس کو سود کہا گیا ہے جس طریقہ پر آنحضرت ﷺ کو منجم کاہن کہا ہے کہ ''المنجم کاهن'' (نجومی کاہن ہے) اس کے بعد 'ربا' سود کا استعمال اس معنی میں شریعت کے اندر عام ہو گیا اور یہ معنی بھی ایک حقیقت بن گئی۔

آنحضرت ﷺ نے حضرت بلالؓ حکم دیا تھا کہ 'بع التمر ببیع اخر ثم اشتریه' کھجور کو ایک دوسری بیع کر کے فروخت کر دو پھر تم خرید لو۔ (۲۲)

معلوم کرنا چاہئے کہ بعض بیع وشراء ایسی بھی ہیں جن میں جوئے کے معنی پائے جاتے ہیں اور جاہلیت کے زمانہ میں لوگ عموماً اس قسم کے معاملات کیا کرتے تھے چنانچہ پیغمبر ﷺ نے اس قسم کے لین دین کی ممانعت فرمادی، اس قسم کے معاملات میں سے ایک مزابنہ یہ بھی ہے اور 'مزابنہ' کے معنی یہ ہیں کہ مثلاً ایک شخص درخت پر لگے ہوئے کھجور ایک سو فرق یعنی ایک سو کمبل کے عوض فروخت کرے، اسی قسم کے معاملات میں ایک 'محاقلہ' بھی ہے اور محاقلہ کی حقیقت یہ ہے کہ کھڑی ہوئی کھیتی کو مثلاً سو فرق گیہوں کے مقابلہ میں فروخت کی جائے اور شارع نے 'عرایا' کے خرمن وانداز سے کھجور کے لین دین کی اجازت دی ہے، بشرطیکہ وہ پانچ وسق سے کم ہو اور رخصت کی وجہ یہ ہے کہ شارع کو معلوم ہو کہ اس قدر کم مقدار میں

لوگ جوئے کا قصد نہیں کیا کرتے۔ مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ خشک کھجور یا چھوارے سے لے کر تر کھجور کر لیں اور کھالیں نیز پانچ کی مقدار 'زر' کا تکے نصب کی بھی مقدار ہے وراتنی مقدار ہے کہ گھرانہ سال بھر کھا سکتا ہے

اسی قسم کے معاملات میں سے ایک 'بیع ا صبرہ' بھی ہے اور 'بیع صبرہ' یہ ہے کہ کھجور کا انبار ہو جس کا اندازہ اور مقدار رائج الوقت کل وناپ سے نہ کیا جائے دوسرے کھجور کے عوض فروخت کی جائے۔

اسی قسم کے معاملات میں سے 'بیع ملامسہ' بھی ہے اور ملامسہ اسے کہتے ہیں کہ مشتری بائع کا کپڑا ادے تاکہ بیع ثابت ہو جائے۔

اسی قسم کے معاملات میں سے 'بیع منابذہ' بھی ہے اس کی صورت یہ کہ مشتری کنکر ڈال دے تاکہ بیع لازم ہو جائے۔

اسی قسم کے معاملات میں سے ایک 'بیع المسادوہ' بھی ہے اس کی صورت یہ ہے کہ مشتری کنکر ڈال دے تاکہ بیع لازم ہو جائے۔

مذکورہ بالا تمام معاملات میں جوئے کے معنی پائے جاتے ہیں اور ظاہر ہے کہ یہ موضوع معاملات کے سراسر خلاف ہے کیونکہ بیع وشراء کا اصل موضوع یہ ہے کہ دیکھ بھال کر استقلال واستقامت کے ساتھ لین دین کیا جائے اور یہ بات مذکورہ معاملات میں قطعاً نہیں پائی جاتی۔

آپ ﷺ نے 'بیع العربان' سے بھی ممانعت فرمائی ہے اور اس کی صورت یہ ہے کہ مشتری بائع کو کچھ قیمت پیشگی دیدے، کہ اگر یہ چیز اس نے خریدی تو رقم قیمت میں مجرا کر لی جائے گی اور اگر نہ خریدی تو بلا معاوضہ یہ رقم بائع ہوگی ظاہر ہے کہ اس میں بھی جوئے کے معنی موجود ہیں۔

آنحضرتؐ سے کسی نے تمر یعنی خشک کھجور دے کر رطب یعنی تر کھجور خریدنے کا سوال کیا آپؐ نے فرمایا 'اینقص اذا یبلس' (۲۳) کیا سوکھنے کے بعد یہ کم ہو جائیں گے۔ اس نے کہا ہو جائیں گے تو آپ ﷺ نے اس معاملہ کی ممانعت فرما دی۔

(اقوال) میں کہتا ہوں کہ یہ ایک جوئے کی صورت ہے نیز اس کے اندر 'ربا الفضل' یعنی زیادتی سود کا بھی احتمال ہے۔

آنحضرت ﷺ نے ایسے 'ہارہ' کے متعلق فرمایا جس کے اندر سونا اور خرمہر جڑے ہوں۔

'اتباع حتی تفصل' جب تک الگ نہ کردیئے جائیں ہار نہ جوئے۔ (۲۴)

حضرت شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ نے اس کی ممانعت اس لئے فرمائی کہ اس کے اندر 'جوئے' کی ایک صورت موجود ہے اور بائع ومشتری میں سے کسی ایک کو دھوکہ اور نقصان کا اندیشہ ہے اور پھر جس کو بھی نقصان ہوگا اگر نقصان کے بعد وہ خاموشی اختیار کرے گا تو اس کے اندر غیظ وغضب کے انگارے بھرے ہوئے ہوں گے۔ اور اگر وہ مخ صمت وجھگڑا کرے گا تو ناحق اور بلا استحقاق جھگڑا کریگا۔

معوم کرنا چاہئے کہ آنحضرتؐ کی بعثت عرب میں ہوئی تھی اور اہل عرب کے یہاں بیع وشراء کے بہت سے معاملات پہلے سے رائج تھے اللہ تعالیٰ نے ''وحی'' نازل فرما کر بعض معاملات کو مکروہ وممنوع کردیا اور بعض کو جائز اور مباح رکھا۔

آنحضرت ﷺ نے فرمایا۔

> ''مہر البغ خبیث'' زانیہ کی اجرت خبیث وپلید ہے اور آپ ﷺ نے کاہن اجرت کی بھی ممانعت فرمائی ہے نیز گانے والے کی اجرت کو بھی حرام قرار فرمایا۔ (۲۵)

شاہ صاحب فرماتے ہیں:

> وہ مال جو معصیت وگناہ کی مخالطت سے حاصل کیا جوئے اس سے متنفع ہونا دو معنی کے اعتبار سے حرام ہے ایک یہ کہ مال حرم ہے اور اس قسم کے مال سے نفع اٹھانے کی ممانعت کردینا اس معصبیت وگناہ حق میں

ایک زبردست تنبیہ ہے اور اس قسم کے معاملات کو رائج کرنا فساد اور لوگوں کو معصیت پر ابھارنے کا موجب ہے۔

آنحضرت ﷺ نے ''نر'' کو مادہ پر ڈالنے کی اجرت سے ممانعت کردی اور ایک روایت میں اونٹ کو اونٹنی پر ڈالنے کی اجرت کے الفاظ ہیں لیکن کراماتاً یعنی بغیر کسی اجرت کے اگر نر والے کو کچھ دے دیا جائے تو آپؐ نے اس کی بھی اجازت دے دی ہے۔

ازاں جملہ یہ ہے کہ آپ ﷺ نے اس قسم کی بیع وشراء کی بھی ممانعت فرمادی جس کے اندر بائع و مشتری نے اپنے اپنے عوض وتبادلہ کو مبہم چھوڑ دیا ہو، جس کی وجہ سے منازعت ومخاصمت پیدا ہونا ممکن ہو ایسا عقد لین دین ہو کہ ایک عقد کے اندر دوسرا عقد داخل کردیا جائے یا وہ بیع وشراء اس قسم کی ہو کہ مبیع کو دیکھے بغیر مشتری کی رضامندی متفق نہیں ہوسکتی اور اس نے سرے سے دیکھا تک نہیں یا بیع کے اندر کوئی ایسی شرط لگادی جائے کہ بعد میں جاکر اس شرط کی وجہ سے حجت اور مخاصمت کا موقع مل سکتا ہے۔

آنحضرت ﷺ نے ''بیع مضامین'' اور ''بیع ملاقیح'' کی بھی ممانعت کردی ہے مضامین کے یہ معنی ہیں کہ وہ بچہ فروخت کیا جائے جو ابھی تک نر کی پشت میں ہے اور ''ملاقیح'' اس بچے کو بیچنے کی ممانت کردی نیز قرض وادھار کے بدلہ میں بیع وفروخت کی بھی ممانعت کردی نیز ایک بیع کے اندر دوسرے بیع کرنے کی ممانعت کردی اور اس کی یہ شکل ہے ایک چیز اس طرح فروخت کی جائے کہ اگر نقد ہو تو ایک ہزار اور ادھار ہو تو دو ہزار قیمت ہوگی اس قسم کی بیع کی ممانعت اس وجہ سے کی گئی کہ اس میں عقد کے وقت کوئی ایک چیز طے نہیں ہوتی بعض علماء نے اس قسم کی بیع کے معنی یہ بیان کئے ہیں کہ بائع ایک چیز اس طور پر فروخت کرے کہ یہ چیز میں تمہیں ایک ہزار میں دیتا ہوں فروخت کرو اس قسم کی بیع وشراء کی ممانعت کی وجہ یہی ہے کہ شرط کرنے والا بعد میں جاکر اس شرط کی ڈھال سے کر حجت ومخاصمت کا علم بلند کرسکے نیز ایک بیع کے اندر دوسری بیع داخل کرنے کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ بائع اس شرط پر مشتری کے ہاتھ ایک چیز فروخت کرے

کہ جب مستری اس چیز کو فروخت کرنا چاہے تو اس چیز کا سب سے زیادہ حقدار یہی بائع ،وراسی قسم کی بیع کے متعلق حضرت عمرؓ نے فرمایا۔

'' لا تحل لک فیھا شرط لاحد ''

ایسی بیع وشراء تیرے لئے حلال نہیں جس میں بائع ومستری کوئی شرط لگادے۔۔(۲۶)

اور آنحضرت ﷺ نے مبیع کے اندر کسی چیز کے مستثنٰی کرنے کی ممانعت کردی ہے جب تک فردہ چیز صاف طور پر واضح ہو جائے مثلاً بائع یہ کہے کہ میں اس فرق بیچتا ہوں لیکن اس میں سے ایک نہیں فروخت کرتا اس قسم کا اسثنٰی اس ںئے ممنوع ہوا کہ اس کہ اندر جہالت پائی جاتی ہے جو آگے چل کر منزعت کا سبب بن سکتی ہے اگر چہ پر جہالت بیع کو فاسد کرنے کا موجب نہیں ہوسکتی کیونکہ ہر بیع میں کچھ ایسے امور ہوتے ہیں جنہیں مہمل اور مبہم چھوڑ دیا جارہا ہے اور تمام امور کا استقصاء واحصر رنقصان وضرر کا موجب بھی ہے بیع کو فاسد کرنے والی جہالت وہ ہے جو منازعت ومخاصمت کی موجب ہو(۲۷)

ازاں جملہ ایک یہ بھی ہے کہ ایک بیع سے کوئی دوسرا معاملہ مقصود ہو اور معاملہ یا بیع کے ضمن میں مطلوب ہوتا ہے یا بیع کے ساتھ مطلوب ہوتہ کہ بائع سے اس کا مطالبہ کرسکے نیز چونکہ اصل مطلوب فوت ہورہا ہے اس لئے وہ خاموش بھی نہیں رہ سکتا اور پھر یہی باتیں آگے جا کر خصومت ونزاع کا سبب بن جاتی ہے اور بلا استحقاق جھگڑے کا موجب ہو جاتی ہیں اس قسم کی خصومتوں میں قاضی بھی کوئی صاف اور خاص فیصلہ نہیں دے سکتا۔

آنحضرت ﷺ نے فرمایا۔

''لایحل بیع و سلف ولا شرطان فی بیع'' (۲۸)

ترجمہ: یہ درست نہیں ہے کہ بیع بھی ہو اور قرض بھی نہ یہ درست ہے کہ ایک بیع کے اندر دونوں شرطیں ہوں۔

اس کی مثال یہ ہے کہ بائع کہے کہ یہ چیز میں تمہارے ہاتھ اس شرط پر فروخت کرتا ہوں کہ تم مجھے اتنا قرض دو، اور بیع کے اندر دو شرطیں لگانے کہ معنی ہیں کہ بیع و فروخت کے حقوق بھی اپنے لئے مشروط گردان لے اور بیع و فروخت سے باہر کی بھی شرط لگا دے مثلاً یہ شرط لگائے کہ پھر یہ چیز مجھے ہبہ کر دی جائے یا مثلاً یہ کہ فلاں آدمی میرے لئے فلاں چیز کی سفارش کر دی جائے یا یہ کہ جب مشتری اس چیز کو فروخت کرے تو اس کے سواء کسی دوسرے کے ہاتھ فروخت نہ کرے اس قسم کی شرطیں لگانا ایک عقد اور ایک بیع کے اندر شرطیں قائم کرنا کہا جائے گا۔

آنحضرتؐ نے فرمایا 'لاتبع مالیس عندک' (۲۹)

ترجمہ: جو چیز تمہارے پاس موجود نہیں اس کی بیع مت کرو،

اور بیع غرور سے بھی آپؐ نے ممانعت فرمادی اور بیع غرور کے معنی یہ ہیں کہ بیع کے وقت بیع کے موجود ہونے یا اس کے ملنے نہ ملنے کا یقین نہ ہو۔

آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

'من ابتاع طعاما فلا یبعه حتی یستوفیه'

ترجمہ: جو شخص اناج خریدے تو جب تک اس پر قبضہ نہ ہو جائے اسے فروخت نہ کرے۔

اس حدیث کے متعلق بعض کہتے کہ کہ یہ حکم غلّہ اور اناج کے متعلق ہے کیونکہ ہمہ قسم کے مال میں غلّہ اور اناج ہی ایک اسی چیز ہے جس کا استعمال عام طور پر بکثرت متداول ہے اور سب سے زیادہ اسی کی ضرورت ہوا کرتی ہے اور اس سے اس وقت تک کوئی منتفع نہیں ہوسکتا جب تک اس کو کھ کر فنا اور ختم نہ کردے جب غلّہ پر قبضہ نہیں کیا جاتا تو بسا اوقات یہ ہوتا ہے کہ بائع اسے اپنے تصرف میں لے آتا ہے اور ظاہر ہے کہ اس صورت میں ایک قضیہ سے دوسرا قضیہ اور ایک جھگڑے سے دوسرا جھگڑا اُٹھ کھڑا ہوگا۔ اور بعض یہ کہتے ہیں کہ یہ حکم عام ہے ہر منقول چیز پر جاری ہوگا کیونکہ ہر منقول چیز تغیر و تبدل اور عیب و خرابی

پیدا ہو جانے کا اندیشہ ہے اور ظاہر ہے کہ اس سے خصومت اور جھگڑا پیدا ہو جائے گا۔

حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں۔

'علااحسب کل شئ الا مثله' (۳۰)

ترجمہ: میں ہر چیز غلہ ہی کے مانند سمجھتا ہوں

اور ہم نے جو علت بیان کی ہے اس لحاظ سے بھی حضرت ابن عباسؓ کا قول ہی قرین قیاس ہے۔ از انجملہ ممنوع ومکروہ معاملات میں سے وہ معاملات بھی ہیں جو شہر وملک کے نظام کے اندر خلل انداز ہوں اور لوگوں کے ضرر کا موجب ہوں اس قسم کے معاملات کا بھی قلع قمع اور سد باب ضروری ہے۔

چنانچہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا:۔

'لا تلقو الرکبان و لا بیع بعضکم علی بعض و لا یسم الرجل علی سوم اخیه و لا تنا جشوا و لا بیع حاضر لباد' (۳۱)

ترجمہ: باہر آنے والے قافلہ اور کھیپ سے شہر سے باہر جا کر کھیپ خریدنے کے لئے نہ ملو اور نہ ہی تم میں سے کوئی شخص کسی کی بیع پر بیع کرے اور نہ اپنے بھائی کے نرخ و قیمت پر نرخ قیمت بڑھائے نہ بیع و رفوخت کے وقت بائع کی چیز کی تعریف کرے اور نہ کوئی شہری کسی دیہاتی کی کوئی چیز فروخت کرے۔

حضرت شاہ صاحب فرماتے ہیں:

قافلہ اور کھیپ سے ملنے کے یہ معنی ہیں کہ جو سواریاں اور قافلے کھیپ لے کر باہر سے تجارت کے لئے آئیں اسے کوئی آدمی شہر کے اندر داخل ہونے اور شہر کے نرخ معلوم کرنے سے پہلے شہر کے نرخ کم

نرخ پر خرید لے اس قسم کی بیع وشراء میں بائع کو نقصان ہونے کا اندیشہ ہے، اس سے بائع کو بھی نقصان ہے اور عام لوگوں کو بھی بائع کا نقصان یہ ہے کہ اگر وہ شہر میں جا کر فروخت کرتا تو قیمت کچھ زیادہ آتی اور اسی وجہ سے اس قسم کی بیع میں بائع کو اختیار دیا گیا ہے کہ اگر اس کو اپنے ضرر و نقصان کی آگاہی ہو جائے تو اس بیع کو مسترد کر دے گا اور عام لوگوں کو اس قسم کی بیع و فروخت میں یہ نقصان ہے کہ اس تجارت میں تمام شہریوں کا حق ہے اور شہری مصلحت کا تقاضا یہی ہے کہ جو زیادہ ضرورت مند ہو اس کو مقدم رکھا جائے اور تمام ضرورت مندوں کو درجہ بدرجہ فائدہ پہنچایا جائے اور اگر تمام کی حالت مساوی ہے تو تمام کو مساوی رکھا جائے یا پھر قرعہ ڈالا جائے کسی ایک شخص کا بلا بالا ترجیح لے لینا اس قسم کا ظلم ہے لیکن پھر بھی شہر والوں کو اس بیع وشراء کے فسخ کرنے کا حق اور اختیار نہیں ہے کیونکہ اس نے اس کا کوئی مالی نقصان نہیں کیا ہے بلکہ صرف یہ کیا ہے کہ لوگ اس سے جو امید رکھتے تھے اس نے پوری نہیں۔

دوسری صورت یہ ہے کہ نفع سے اس مال کو فروخت کر دیں، اور فوراً ہی اس سرمایہ سے دوسری تجارت شروع کر دیں اور پھر اس کو بھی فوراً فروخت کر دیا، ادھر مال آیا اُدھر فروخت کر دیا اس طرح تجارت کا سلسلہ جاری رکھیں۔ دوسری قسم کی تجارت اور نفع اندوزی شہری ملکی مصلحت کے حق میں زیادہ مناسب اور زیادہ بابرکت ہے۔

آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا۔

"من احتكر فهو خاطئ" (۳۲)

ترجمہ: جو شخص تجارت کے مال کا ذخیرہ جمع کرے گا یہ گنہگار ہے۔

اور ارشاد فرمایا:

"الجالب مرزوق . والمحتكر ملعون" (۳۳)

ترجمہ: مال لانے والے کی روزی دی جاتی ہے اور جو مال روکتا ہے وہ ملعون ہے۔

شاہ صاحب فرماتے ہیں۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ شہری ضرورت کے باوجود صرف زیادہ قیمت اور گراں فروشی کے خیال سے مال ومتاع کو روک لینا۔ اس کے معنی یہی ہیں کہ تھوڑے بہت نفع کی خاطر شہریوں کو ضرر اور تکلیف پہنچانا ہے یہ سراسر شہری نظام کی تخریب ہے۔

ازاں جملہ ایک مکروہ معاملہ یہ بھی ہے کہ خریدار کو فریب اور دھوکہ دیا جائے چنانچہ آپ ﷺ کا ارشاد ہے

''لا تصروا الابل والغنم فمن ابتاعها بعد ذالک فهو بخير النظرين بعد ان يحلبها ان رضيها امسکها وان سخطها ردها وصاعا من تمر''(۳۴)

ترجمہ: اونٹ اور بکری کے تھن میں دودھ جمع نہ کرو جو شخص تھن میں دودھ جمع کئے ہوئے جانوروں کو خریدے تو دوہنے کے بعد اختیار ہے جو بہتر معلوم ہو کرے اگر جانور پسند آجائے تو رکھ لینا اگر ناپسند ہو تو واپس کردے ساتھ ہی ساتھ ایک صاع کھجور بھی دیدے۔

ایک اور روایت کے اندر ہے۔

'صاعاً من طعام لاسمراء'

ترجمہ: ایک صاع اناج دیدے لیکن گیہوں نہ ہوں۔

''کل حيث لا يرديه الا غير فقيه اذا انسد باب الرای فيه يترک العمابه''

ترجمہ: ہر حدیث جس کو غیر فقیہہ راوی نے روایت کی ہو اور وہاں قیاس
رائے کا دروازہ بھی بند ہو تو اس حدیث پر عمل نہیں کیا جا سکتا۔ (۳۵)

اس قاعدہ کلیہ پر جو کچھ اعتراضات وارد ہیں وہ یہ ہیں، علاوہ ازیں یہ قاعدہ ہماری پیش کردہ صورت پر منطبق ہی نہیں ہو سکتا کیونکہ بخاری نے یہ حدیث حضرت ابن مسعود کی اسناد سے روایت کی ہے اور ظاہر ہے کہ حضرت ابن مسعودؓ افقہ الناس تھے اور یہاں تمہارے سامنے صرف ان کا نام پیش کر دینا ہی کافی ہے نیز حدیث کے اندر جو مقدار بیان کی گئی ہے وہ بمنزلہ دیگر مقدار یعیہ کے ہے جس کی خوبی کو عقل انسانی سمجھ سکتی ہے لیکن کسی ایک مقدار کی حکمت معلوم کرنا ہر عقل کا کام نہیں ہے البتہ راسخین فی العلم اس مقدار کی خصوصی حکمت سے بھی واقف ہو سکتے ہیں۔ آنحضرت ﷺ نے غلہ کا انبار دیکھا جس کے اندر کے حصہ میں کچھ تری اور نمی انبار کے مالک سے آپؐ نے فرمایا:

"افلا جعلته فوق الطعام حتى يرا الناس، من غش
فليس منى" (۳۶)

ترجمہ: اس طرح اناج کو تم نے اپنے اوپر کیوں نہ کر دیا تاکہ
لوگ اسے دیکھ لیتے۔ جو شخص دھوکہ کرے وہ ہم میں سے نہیں ہے۔

ازاں جملہ ایک مکروہ وممنوع معاملہ یہ بھی ہے کہ کسی مباح الاصل یعنی ایسی چیز کہ وہ ہر ایک کے لئے مباح ہے فروخت کرنا مثلاً وہ کثیر دریا پانی جو یا تو جاری ہے یا اس قدر کثیر ہے کہ اس کے ختم ہونے کا امکان ہی نہیں ہے اسی چیز پر کوئی ظالم شخص قبضہ جمالے اور اس کی بیع وشراء کرنے لگے تو ظاہر ہے کہ یہ قبضہ بیع وفروخت اللہ تعالیٰ کے مال میں بیجا اور ناحق تصرف ہے اور وہ لوگوں کو خواہ مخواہ ضرر ونقصان پہنچا رہا ہے اور اسی وجہ سے آنحضرت ﷺ نے فاضل پانی کو فروخت کرنے سے لوگوں کو منع فرما دیا۔ اور فرمایا کہ اس سے لوگ گھانس فروخت کرنے کا بھی موقع نکال لیں گے۔

شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ:

اس کی صورت یہ ہے کہ کوئی آدمی کسی چشمہ یا جھیل پر قبضہ جما بیٹھے اور بلا اجرت کسی جانوروں کو پانی نہ پینے دے، جب ایسا ہوگا تو یہ بات بھی پیدا ہو جائے گی کہ لوگ گھانس بھی فروخت کرنے لگیں گے اور مویشیوں کو چرانے کی قیمت لی جائے گی اور ظاہر ہے کہ یہ چیز بالکل باطل ہے کیونکہ پانی اور گھاس مباح چیزیں ہیں۔آپ ﷺ نے اس بارے میں یہ حدیث قدسی بیان فرمائی ہے۔

''فیقول اللہ . الیوم امنعک نفلی کما منعت فضل مالم تعمل یداک''(۳۷)

ترجمہ: اللہ تعالیٰ قیامت کے دن فرمائے گا آج تجھ سے اپنا فضل روک لیتا ہوں جس طرح کہ تو نے دنیا میں اس چیز کا فضل روک لیتا تھا، جس میں تیرے ہاتھوں کے عمل کو کوئی دخل نہ تھا۔

بعض علماء نے اس ارشاد کا یہ مطلب بیان کیا ہے فاضل پانی جو اپنی ضرورت سے زیادہ ہے ایسے شخص کے ہاتھ جو خود پینا چاہتا ہے یا اپنے چوپایوں کو پلانا چاہتا ہے فروخت کرنا حرام ہے۔

آپ ﷺ کا ارشاد مبارک ہے:

''المسلمون شرکاء فی ثلاث . فی الماء و الکلاء و لنار''

ترجمہ: مسلمان تین چیزوں میں باہم ایک دوسرے کے شریک ہیں پانی میں، گھانس میں، آگ میں،

حضرت شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ یہ تاکید اور ہمدردی اس وقت ہے کہ جبکہ یہ چیزیں کسی کی ملکیت میں ہوں جب یہ چیزیں کسی کی ملکیت ہی میں نہ ہوں تو ان کا حکم بالکل واضح اور ظاہر ہے۔

☆ ☆ ☆

باب ھفتم

فصل ''۵''

تعاون باہمی معاشیات کی بنیادی قدر

شاہ صاحب انسان معاشرہ میں تعاون اور اشتراک کی کارفرمائی دیکھنا چاہتے تے، آپ غیر فطری مساوات کے بھی قائل نہیں تھے، بلکہ پورے انسانی معاشرہ کو ایک انسان کے فرد کے جسم کے مختلف اعضاء کی طرح دیکھنا چاہتے ہیں، وہ تحریر فرماتے ہیں:

> وذالک ان اللہ ارادفی العالم انتظام امرھم وان یعاون بعضھم بعضا وان لا یظلم بعضھم وان یتالف بعضھم ببعض ویڈیروا، واحس اذا تالم عضو منه تداعی له سائر الاعضاء بالحمی والسھر (۳۹)
>
> ترجمہ: اللہ تعالی کو دنیا کا انتظام اس طرح قائم رکھنا منظور ہے، کہ افراد معاشرہ ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کریں اور ایک دوسرے پر ظلم نہ کریں، اور آپس محبت والفت قائم رکھیں، اور ایسے ہوجائیں کہ بدن کے اعضاء ہوتے ہیں، کہ جب کسی عضو کو تکلیف ہو تو سارا بدن اس سے بخار اور بے چینی محسوس کرے۔

اسی طرح آپ تحریر فرماتے ہیں:۔

> اعلم انه اوجبت الحکمة ان تکون السنه بینھم ان یتعاون اھل الحیی فیما بینھم، یتنا صروا ریتوا سوا وان یجعل کل واحد ضرر الاخر ونفعه بمنزلته ضرر نفسه (۴۰)
>
> ترجمہ: یاد رہے کہ حکمت خداوندی نے لوگوں کے درمیان اس طریقہ کو لازم

کیا، کہ اہل محلہ آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون و ہمدردی کریں، حتیٰ کہ ہر ایک ان میں سے ایک دوسرے کے نفع ونقصان کو اپنا فائدہ ضرور خیال کرے

آپ نے اس ضمن میں باہمی تعاون واشتراک کے مختلف میدانوں اور تقاضوں کا ذکر فرمایا ہے اور ان پر مختلف عنوانات کے ساتھ بحث فرمائی ہے جن میں سے چند ایک مندرجہ ذیل ہیں۔

ا: حقوق ملکیت :

اللہ تعالیٰ نے انسان کو زمین پر پیدا کر کے اس کی روزی کا سامان بھی یہیں فراہم کر دیا ہے۔ اور سب انسانوں کو مساوی طور پر اس سے حق دیا ہے۔ مگر انسان کی خودغرضانہ مسابقت اور باہمی تنازع کو روکنے کے لئے یہ قاعدہ مقرر کر دیا کہ جو شخص کسی قطعہ زمین سے سب پہلے نفع حاصل کرنا شروع کر دے، وہ اسی کی ملکیت ہوگی۔ اب کسی دوسرے کو حق نہیں کہ اس سے انتزع کر سکے، تاوقت کہ یہ مالک اول برضائے خود دوسرے کو اسے نہ دے یا مبادلہ کیلئے آمادہ نہ ہو جائے''اسی کا نام'' حق ملکیت ہے۔ شاہ صاحب ملکیت زمین کے بارے میں فرماتے ہیں۔

ان الکل مال اللہ لیس فیہ حق لا حد فی الحقیقتہ لکن اللہ لماباح لهم الانتفاع بالا رض وما فيها وقعت المشاحته فکان الحکم حینذ ان لا یھیج احد مما سبق الیہ من غیر مضارة فالارض المتیہ التی لیست فی البلاد ولا فی فناء ھا اذاعمر ھار جل فقد سبقت یده الیھا من غیر مضار تہ فمنحکمہ الا یھیج عنھا والارض کلھا فی احقیقتہ بمنزلتہ مسجداو رباط جعلوقفا علی ابناء اسبیل وھم شرکاء فیقدم الا سبق فالا سبق ومعنی الملک فی حق الا دمی کو نہ احق بالا نتفامن غیره.(۱۳)

....

سب مال کا مالک اللہ تعالیٰ ہے اس میں کسی کا حق نہیں ہے، لیکن، چونکہ اللہ تعالیٰ نے زمین اور اس کی پیداوار سے فائدہ اٹھانے کی اجازت دے دی تو لوگوں نے حرص اور لالچ کا اظہار شروع کر دیا اسئے قاعدہ یہ بنایا گیا کہ جو شخص کسی زمین پر پہلے قبضہ کر لے، بشرطیکہ اس سے کسی کو نقصان اور ضرر نہ پہنچتا ہو تو اسے فائدہ اٹھانے سے نہ ہٹایا جائے لہٰذا غیر کاشت شدہ ایسی زمین کو جو شہر پہلے کاشت کرے، بشرط کہ اس سے کسی کو نقصان نہ پہنچتا ہو، تو اس کا حکم یہ ہے کہ اسے نہ ہٹایا جائے ورساری زمین حقیقت میں مسجد یا سرائے کی حیثیت رکھتی ہے، یہ آنے جانے والوں کے لئے وقف ہے اور سب لوگ اس میں برابر کے شریک ہیں مگر جو پہلے آ کر قبضہ کرے وہ اس کا مالک بن جاتا ہے اور زمین پر کسی کے قبضہ کے صرف یہ معنی ہیں کہ شخص کی نسبت اس قطعہ زمین سے فائدہ اٹھانے کا حق رکھتا ہے۔

ملکیت کے اس پس منظر کے بعد اس کے مبادلہ کی مختلف شکلیں سامنے آتی ہیں۔ آپ بتاتے ہیں کہ اس تقسیم اور مبادلہ کے لئے قانونی و آئینی ریاست رکھنا ضروری ہے تاکہ یہ تصرفات لوگوں کے لئے ابتری کا باعث نہ بننے پائیں یوں اسلام کے نظام معیشت میں ایک فرد کا سرمایہ دوسرے فرد کے لئے رحمت ثابت ہو نہ کہ زحمت۔

۲۔ مباح اشیاء پر عدم ممانعت:

آپ کے نزدیک تمدن کا ایک طبعی قانون یہ بھی ہے کہ جو چیز اللہ تعالیٰ نے عام فائدے کیلئے پیدا کی ہیں انہیں حتی الامکان اسی شکل میں رہنا چاہئے کہ ہر شخص اس سے استفادہ کر سکے۔

وہ تحریر فرماتے ہیں کہ:

ومنها ان يكون الشئى مباح الا صل كا لماء العد فيتغلب ظالم عليه فيبيعه

و بذالک تصرف فی مال الله من غیر حق و اضرار بالناس و بذالک نهی النبی ﷺ عن بیع فضل الماء لیباع به الکلاء قول هو ان یتغلب رجل علی عین اوواد فلایدع احد لیقی منه ماشیه الا باجر فانه یفضی الی بیع الکلاء المباع یعنی یصیر الرعی من ذالک بازاء مال و هذاباطل لان الماء الکلاء مباحان وهو قوله ﷺ یقول الله تعالی الیوم امنعک فضل کمامنعت فضل مالم تعلم یداک (۴۲)

ترجمہ: محرمہ کے ایک یہ ہے کہ کوئی چیز دراصل مباح ہو، مثلاً چشموں کا پانی لیکن کوئی ظالم اس پر زبردستی قبضہ کر کے اس کو بیچنا شروع کردے یہ اس لئے منع ہے کہ اللہ کے مال میں ناحق تصرف کرنے ہے اس سے عام لوگوں کو ضرر پہنچتا ہے اسی وجہ سے حضور ﷺ نے فالتو پانی کی فراخت سے منع فرمایا ہے تاکہ اس کی وجہ سے جنگل کی گھاس کی فروخت شروع نہ ہوجائے میں (ولی اللہ) کہتا ہوں، اس سے مراد یہ ہے کہ ایک آدمی کسی وادی یا چشمے پر قبضہ کرلے اور کسی چوپائے کو اجرت ومعاوضہ کے بغیر پانی پینے نہ دے، تو نوبت یہاں تک پہنچ جائے گی کہ مباح گھاس بھی بکنے لگے گی اور یہ باطل ہے کیونکہ پانی اور گھاس دونوں مباح ہیں اور حضورؐ نے یہ فرمایا کی قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ایسے شخص سے فرمائے گا کہ: ''میں آج اپنا فضل تجھ سے روکتا ہوں، جیسے کہ تو نے اس فضل (مباح اشیاء) کو روک رکھا تھا'' (۴۳)

اس عبارت کا حاصل یہ ہے کہ مباح الاصل اشیاء پر کسی کا قبضہ نہیں۔

شاہ صاحب نے مباح الاصل اشیاء کے بارے میں درج ذیل حدیث نقل کی ہے:۔

''المسلمون شرکاء فی ثلاث فی الماء و الکلاء و النار''

ترجمہ: لوگ تین چیزوں میں ایک دوسرے کے ساجھی اور شریک ہیں، یعنی پانی، آگ، گھاس میں (۴۴)

اس حدیث کی بناء پر پانی گھاس اور آگ میں 'الناس' یعنی عام پبلک شریک سمجھی جاتی ہے لیکن صرف ان ہی تین چیزوں تک اشتراک کے فلسفہ کو محدود سمجھنا صحیح نہیں ہے بلکہ اس ذیل میں اور بھی ایسی چیزیں ہیں جن کو اگر انفرادی ملک قرار دی جائے تو معاشی تنگی کا قومی اندیشہ ہو۔

۳۔ پیشوں کی آزادی:

مختلف پیشوں اور مکاسب کے اختیار میں آپ کے نزدیک حکیمانہ طرز عمل یہ ہے کہ ہر فرد کو اس کی ذہنی وجسمانی استعداد اور ضروریات کے مطابق پیشوں کے اختیار کرنے کی آزادی ہونی چاہئے اسی طرح ایسے مواقع پیدا کرنا بھی ضروری ہے کہ معاشرہ کا کوئی فرد بے کار نہ بیٹھے بلکہ تمدن کی اصلاح وترقی کیلئے ضروری کاموں میں حصہ لے۔

> لما كان الناس مدنيين بالطبع لا تستقيم معايشتهم الا بتعاون بينهم نزل القضاء بايجاب التعاون بينهم و لا يخلو احد منهم مماله دخل في التمدن الا عند حاجته لا يجد منها بدا. (۴۴)
>
> ترجمہ: چونکہ تمام انسان مدنی الطبع ہیں اس لئے ان کی معیشت ان کے باہمی تعاون کے بغیر درست نہیں ہوسکتی۔ اس سے حکم ہو کہ تمام لوگ باہمی تعاون سے کام لیں اور یہ بھی حکم ہوا کہ جس چیز کو تمدن میں دخل ہے، کوئی آدمی کسی شدید حاجت کے بغیر اس سے خالی نہ رہے۔

اس کا حاصل یہ ہے کہ معاشی میدان میں مناسب پیشے کا حصول ہر کسی کا حق ہے۔ پیشہ کے اختیار کرنے میں طبائع اور حالات وضرورت کی رعایت رکھنا ضروری ہے تاکہ انسان کی ذہنی اور جسمانی قوں کا مناسب استعمال ہو اور زیادہ سے زیدہ حصول پیداوار ہو۔ انسانوں کے اس طور پر مل کر پیداوار میں

....

شریک ہونے کے عمل میں ایک روح کارفرما ہوتی ہے جسے شاہ صاحب 'باہمی تعاون' سے یاد کرتے ہیں۔

۴۔ عدل مساوات کی روح:

شاہ صاحب معاشرے میں عدل و مساوات کی روح دیکھنے کے خواہاں ہیں۔ وہ اسے انسانی معاشرے کی اصلاح و ترقی کا سنگ بنیاد قرار دیتے ہیں وہ صفت عدالت کی مختلف شعبہ ہائے زندگی میں جلوہ افروزی کو یوں بیان کرتے ہیں۔

والعدالة اذا اعتبرت باوضاع الانسان فی قیامه و یقظته و میسته و کلامه و زیه و لباسه و شعره سمیت 'ادبا' و اذا اعتبرت بالاموال جمعها و صرفها سمت 'کفایة' و اذا اعتبرت بتدبیر المنزل سمیت حریته و اذا وعتبرت بتدبیر. (۴۵)

ترجمہ: صفت عدالت کا ظہور جب انسانی اوضاع مثلاً نشست و برخاست خوراک، نیند، چلنے پھرنے بول چال، اور لباس کی وضع قطع کے ساتھ ہو تو اسے 'ادب' کہا جاتا ہے اور جب مال کمانے اور اس کے خرچ کے معاملے میں عدالت کا ظہور ہو تو اس کو 'کفایت یا اقتصاد' کہا جاتا ہے۔ اگر تدبیر منزل میں عدالت کو ملحوظ رکھا جائے تو اس کو 'حریت' کا نام دیا جاتا ہے اور جب نظام تمدن کو عدل کے ساتھ بروئے کار لانے کی کوشش کی جائے تو اسے سیاست کہتے ہیں۔

اس سے واضح ہے کہ شاہ صاحب کے ہاں عدل ایک ہمہ گیر و جامع قدر ہے جو جملہ شعبہ ہائے زندگی میں مختلف انواع انداز سے اس کا ظہور ہوتا ہے۔

۵۔ احسان وتبرع:

شاہ صاحب معاشرے کے محروم افراد اور طبقات کی اعانت کو انسانی سوسائٹی کی اہم ضرورت قرار دیتے ہیں اور اسے انسانی معاشرے کا ایک ایسا ہمہ گیر اصول قرار دیتے ہیں جو ہر صالح انسانی معاشرے میں ہمیشہ سے ایک مسلمہ کلیہ کی حیثیت سے تسلیم کیا جاتا رہا ہے۔ چنانچہ اس کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:۔

"ولما كان انتظام المدينه لايتم الا بانشاء الفت و محبته بينهم وكان الا لفته كثيراً مانفضى الى بذل المحتاج اليه بلا بدل او تتوقف عليه انشعبت الهبته و العاريته ولا تتم ايضا الا بمواساة الفقراء انبعت الصدقة" (۴۶)

ترجمہ: مملکت کا نظام اس صورت میں ممکن ہوسکتا ہے لوگوں کے درمیان محبت اور الفت پیدا کیں جائیں اور عام طور پر الفت پیدا کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ضرورت کی چیز بلا معاوضہ دوسرے کو دی جائے۔

چنانچہ اس وجہ سے 'ہبہ' قرض لین دین کی صورتیں پیدا ہوئیں۔ اور اس طرح فقراء کی ہمدردی کے لئے صدقہ، خیرات کی ضرورت پیش آئی۔

پاکستان میں اسلامی معاشی نظام کا نفاذ واطلاق رکاوٹ:

مشکل ترین مسئلہ جو آج پاکستان جیسے مسلم ممالک کو ہر جگہ درپیش ہے اور اپنے حل کا شدید تقاضہ کررہا ہے وہ یہ ہے کہ ان کے ہاں فی الوقت معاشی ظلم واستحصال پر مبنی جو سرمایہ دارانہ اور جاگیردارانہ معاشی نظام قائم اور رائج ہے اس کو کس طرح ختم کیا جائے اور اس کی جگہ اسلام کا عادلانہ معاشی نظام کس طریقہ

سے عمل میں لایا جائے یہ مسئلہ ایسے مسلمانوں زعماء و مصلحین کیلئے سخت بے چینی اور شدید پریشانی کا باعث بنا ہوا ہے جو نام نہاد اسلامی معاشروں کو حقیقی اور صحیح معنوں میں اسلامی معاشرہ بنانے کی اپنے اندر سچی تمنا اور تڑپ رکھتے اور بالیقین یہ سمجھتے ہیں کہ جب تک مسئلہ مذکور حل نہیں ہو جاتا کوئی معاشرہ حقیقی طور اسلامی معاشرہ نہیں بن سکتا۔

لٰہذا وہ پوری توجہ کے ساتھ اس مسئلے کا اطمینان بخش حل تجویز اور تلاش کرنے میں سرگرداں اور مصروف ہیں۔

معاشی مسئلہ کی اہمیت و ضرورت:

پاکستان میں مسئلہ مذکور کو نہایت اہم ہے ان میں سے ایک خاص اور نمایاں وجہ یہ ہے کہ بدنصیبی سے آج ہمارے نام نہاد مسلم معاشروں میں بڑی کثرت کے ساتھ جو انفرادی و اجتماعی برائیاں اور طرح طرح کی جو سماجی معاشرتی، سیاسی اور ثقافتی خرابیاں اور بدعنوانیاں ہیں غور سے دیکھا جائے تو ان کے اسباب میں بڑا سبب وہ سرمایہ دارانہ اور جاگیردارانہ معاشی نظام ہے جو ان معاشروں میں موجود اور بروئے کار کیونکہ اس نظام کی یہ فطرت اور ذاتی خاصیت ہے کہ وہ افراد معاشرہ کو معاشی طور پر اعلیٰ اور ادنیٰ دو بالکل مختلف طبقوں میں منقسم کرتا اور بھیانک قسم کے غیر فطری معاشی توازن کا باعث بنتا ہے۔

ظالمانہ واستحصالی معیشت کے نتائج:

پاکستان میں بہت تھوڑی تعداد میں گویا پانچ فیصد سے بھی کم ایسے افراد ہوتے ہیں جن کے قبضہ میں قومی دولت اور وسائل دولت کا بہت بڑا حصہ ہوتا ہے، بڑے بڑے قطعات اراضی، عالی شان عمارات، کارخانوں، فیکٹریوں، تجارتی مراکز کاروباری اداروں کے مالک کہلاتے اور نہایت شان و شوکت، عیش و عشرت اور امیرانہ ٹھاٹھ باٹھ سے اعلیٰ معیار کی زندگی گزارتے ہیں اور اپنی مالداری اور دولت مندی کا فاخرانہ انداز سے اظہار کر کے دوسروں پر اپنی برتری جتلاتے اور رعب جماتے ہیں اور دوسری طرف

پچانوے فیصد (95%) سے بھی زائد افراد کی معاشی حالت ایسی ہوتی ہے کہ ان کو یا تو سادہ شکل اور معمولی سے معمولی معیار میں بھی باقاعدگی کے ساتھ بنیادی معاشی ضروریات تک میسر نہیں ہوتی نہ پیٹ بھر کر دو وقت معمولی کھانا ملتا اور نہ تن ڈھانپنے کیلئے مناسب لباس، نہ رہنے کیلئے سادہ سا گھر میسر ہوتا اور نہ علاج تعلیم کی کوئی سہولت موجود ہوتی ہے۔

لہٰذا یہ معاشی لحاظ سے ہمیشہ بدحال اور پریشان رہتے ہیں اور یا پھر اگر ان میں سے کچھ افراد کو بنیادی معاشی ضروریات کسی نہ کسی شکل میں ہمیشہ میسر ہوتی ہے یعنی آمدنی اتنی ہوتی ہے جس سے روزمرہ کی ضروریات تو کسی طرح پوری ہو جاتی ہے لیکن کل کیلئے کچھ نہیں بچتا۔

گویا ضرورت سے زیادہ رزق کمانے کے راستے ان پر مسدود ہوتے ہیں۔ وہ خواہ کتنی ہی کوشش کریں اور جدوجہد کریں۔ضروریات سے زیادہ کچھ حاصل نہیں کر سکتے ہٰذا ہنگامی اور نہ گہانی ضروریات کے وقت ان کو معاشی پریشانی کا ضرور سامنا کرنا پڑتا ہے۔ دراصل یہی وہ لوگ ہیں جو کھیتوں، کارخانوں، منڈیوں، بازاروں دکانوں اور دفتروں میں محنت کرتے ہیں اور قومی معیشت کی گاڑی چلاتے ہیں۔لیکن ان کو ان کی سعی و محنت کا پھل بہت کم ملتا ہے۔

بہرحال یہ حقیقت واقعہ اور عام مشاہدہ ہے کہ سرمایہ دارانہ معاشی نظام کے اندر قومی دولت و ثروت چند ہاتھوں میں سمٹی اور افراد کے درمیان غیر فطری قسم کی معاشی نشیب و فراز ظہور میں آتے ہیں ایک طرف انتہائی امیر و خوشحال اور دوسری طرف غریب و خستہ حال لوگ وجود میں آتے ہیں اور اس غیر فطری معاشی عدم توازن سے معاشرے کے مختلف قسم کی انفرادی اور اجتماعی برائیوں کا ظہور میں آنا ایک قدرتی امر ہے جن سے اسلام اپنے مجوزہ صالح معاشرے کو پاک وصاف رکھنا چاہتا ہے کیونکہ ان کے ذریعے عام بدامنی و بے چینی پیدا ہوتی اور اجتماعی فلاح و بہبود پر منفی اثر پڑتا ہے۔ اس کی جگہ اسلام کا عادلانہ معاشی نظام قائم و رائج ہو لہٰذا اس سے اس اہمیت کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے جو مذکورہ مسئلہ کا حاصل ہے۔

معاشی مسئلہ کی اہمیت: (پاکستان میں)

پاکستان میں معاشیت کی بہت بڑی ضرورت ہے، مطلب یہ ہے کہ پاکستان میں زندگی کے معاشی مسئلے کی اہمیت اس حد تک بڑھ گئی ہے کہ گویا یہ مرکزی اور بنیادی مسئلہ ہے۔ باقی سب مسائل اس کے مقابلہ میں حیثیت رکھتے ہیں آج کا انسان سب سے پہلے اپنے معاشی مسئلے کا اطمینان بخش حل چاہتا ہے۔ جتنی دلچسپی اس کو معاشی مسئلے سے ہے اتنی کسی دوسرے مسئلہ سے نہیں۔ معاشی مسئلے کی اہمیت اس کے نزدیک اس قدر بڑھ چکی ہے کہ کسی نظام حیات کے اچھے برے اور قابل قبول اور قابل رد ہونے کا معیار یہ بن کر رہ گیا ہے کہ معاشی مسئلے کا حل وہ کیا پیش کرتا ہے اگر اس کا پیش کردہ حل بہتر اور اطمینان بخش ہے تو وہ نظام حیات قابل قبول ہے خواہ دوسرے پہلوؤں سے اس کے اندر کتنی ہی خامیاں اور برائیاں کیوں نہ پائی جاتیں ہوں اس کے برعکس جس نظام حیات کا پیش کردہ حل بہتر اور اطمینان بخش نہیں ہوتا وہ اچھا اور قابل قبول نہیں بلکہ قابل رد ہے اگرچہ دوسرے پہلوؤں سے اس کے اندر کتنی خوبیاں اور اچھائیاں کیوں نہ موجود ہوں اور یہ کہ معاشی مسئلے کا سب سے بہتر اور مثالی حل وہ ہوسکتا ہے جس سے معاشرے کے سو فیصد افراد کو معاشی خوشحالی بھی حاصل ہوتی ہے اور معاشی ترقی کا موقع بھی ملتا ہو۔

اور چونکہ اسلام کے معاشی نظام کے اندر یہ خوبی اور صلاحیت پوری طرح موجود ہے کہ جو معاشرہ اس پر عمل کرے اس کے ہر فرد معاشی خوشحالی بھی نصیب ہوسکتی ہے اور معاشی ترقی کا بھی مناسب موقع مل سکتا ہے۔ لہٰذا پاکستان میں اس کو کسی مسلم معاشرے کے اندر عملی طور پر پیش کرنا اور بروئے کار لانا دنیا سلامی نظام حیات کی مقبولیت اور حقانیت کا بہترین ذریعہ اور موثر وسیلہ ثابت ہوسکتا ہے ہو اور چونکہ مسئلہ مذکور کا اس سے گہرا تعلق ہے لہٰذا اس سے بھی اس اہمیت پر روشنی پڑتی اور اس کا اہم ثابت اور واضح ہوتا ہے۔ مسئلہ مذکور کے اہم ہونے کی کچھ اور وجوہ بھی ہیں لیکن میں بغرض اختصار صرف مذکورہ دو وجوہ کے بیان پر اکتفا کرتا ہوں جن سے اس کی غیر معمولی اہمیت کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

....

اسلامی نظام معیشت اور اس کے اطلاق سے پاکستان میں مشکل:

پاکستان کے معاشرے میں موجود جس معاشی نظام کو داخلی اور اندرونی طور پر معاشرے کے بااثر اور طاقتور افراد کی پرزور حمایت اور تائید حاصل ہو وہ اس کو ہر طریقہ سے بحال و برقرار رکھنا چاہتے ہوں۔ اس معاشی نظام کو بدلنا کتنا مشکل اور دشوار مسئلہ ہوسکتا ہے اور پھر جبکہ اس نظام کو بیرونی اور خارجی طور پر زبردست حمایت اور تائید حاصل ہو یعنی جن غیر مسلم ملکوں اور معاشروں سے اس مسلم معاشرے کے سیاسی اور معاشی روابط تعلقات ہوں اور وہ سیاسی طور پر ان کے تابع وزیر اثر اور معاشی طور پر ان کا محتاج ہو اور دست نگر بلکہ مقروض ہو وہ بھی یہی چاہتے ہیں جس طرح اس مسلم ملک و معاشرے میں بھی سرمایہ دارانہ معاشی نظام قائم و برقرار رہے اور اس میں کوئی ایسی تبدیلی نہ ہونے پائے جس سے ان کے مفادات کو نقصان پہنچتا ہو تو ایسی صورت میں اس معاشی نظام کو تبدیل کرنا بہت ہی مشکل اور انتہائی دشوار ہو جاتا ہے اور چونکہ ہمارے پاکستانی معاشرے کی حالت تقریباً ایسی ہی ہے اس میں رائج اور موجود سرمایہ دارانہ و جاگیردارانہ معاشی نظام کو بحال و برقرار رکھنے کیلئے اندرونی و بیرونی قوتیں متفق ہیں پاکستان کے جن مغربی ممالک سے معاشی اور اسلامی تعلقات ہیں ان کی پوری خواہش اور کوشش ہے کہ پاکستان میں معاشی نظام فی الوقت موجود اور برقرار ہے لہٰذا اس کو بدلنے اور ختم کرنے کا مسئلہ اگرچہ محال و ناممکن نہیں لیکن بے حد مشکل ضرور ہے، کوئی حقیقت پسند اس کا انکار نہیں کرسکتا۔

معاشی عدل اور پاکستانی نظامہائے معیشت سے اس کا تقابل:

اسلام کے معاشی نظام کی سرمایہ دارانہ اور اشتراکی معاشی نظاموں پر عقلی و نظری لحاظ سے بہتری و برتری ثابت کی جاسکتی ہے تو وہ بھی اس کی ان معاشی تعلیمات کی بنیاد پر جو عدل پر مبنی مستقل اور حقیقی قوانین کی حیثیت رکھتی ہیں جہاں تک احسان و ایثار پر مبنی اخلاقی نوعیت کی معاشی تعلیمات کا تعلق ہے ان کی تعلیم و ترغیب صرف دین اسلام میں ہی نہیں بلکہ دنیا کے ہر ساوی دین و مذہب میں موجود ہے بلکہ لادین قسم کے

انسانی معاشروں میں بھی ایسے لوگوں کو اچھا سمجھا اور عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے جو از راہ ہمدردی اور خیر خواہی دوسروں کیلئے مالی ایثار کرتے اور رفاہ عام کے مصارف میں دل کھول کر حصہ لیتے ہیں حالانکہ وہ قانوناً اس کے پابند نہیں ہوتے گویا احسان والی اخلاقی تعلیمات پر عمل کی ترغیب تمام دنیا اور تمام معاشروں میں پائی جاتی ہے۔

یہ دوسری بات ہے کہ اس قسم کی اخلاقی تعلیمات پر عمل کرنے کے جو معنوی اور روحانی محرکات اسلامی ہدایات ہیں وہ بہت قوی اور زیادہ پائیدار ہیں۔ بہر حال اسلام میں جو اخلاقی نوعیت کی معاشی تعلیمات ہیں ان کی بناء پر اسلام کے معاشی نظام کی بہتری و برتری دوسرے معاشی نظاموں پر ثابت نہیں کی جاسکتی اسی طرح اسلام کی ان معاشی نظام کی بہتری و برتری ثابت نہیں کی جاسکتی جو ناموافق عبوری حالات سے متعلق عبوری اور وقتی احکامات کی حیثیت رکھتی ہیں کیونکہ ان کے اندر کچھ نہ کچھ ظلم و حق تلفی کی برائی ضرور موجود ہوتی ہے۔ لہٰذا خلاف عدل ہونے کیوجہ سے منشائے اسلام کے مطابق نہیں ہوتیں اور ان کا اختیار کرنا ''مالا یدریک کلہ لایترک کلہ'' کے طور پر ہوتا ہے یعنی جب مطلوبہ شے پوری نہ مل سکتی ہوں بلکہ ادھوری مل سکتی ہوں تو وقتی طور پر اسی کو اختیار کرلیا جائے اور پوری کوشش جاری رہے یا یوں کہہ لیجئے کہ ان کا اختیار کرنا 'اھون البلیتین' اور اخف الشرین کے طور پر ہوتا ہے یعنی جب دو برائیوں میں سے یک کا اختیار کرنا ضروری اور ناگزیر ہو تو وقتی طور کم درجہ کی برائی کو اختیار کرلیا جائے، یعنی نفرت کے ساتھ اور بالآخر چھوڑ دینے کے ارادہ سے بہر حال یہ عبوری حالات سے تعلق رکھنے معاشی تعلیمات ہرگز ایسی نہیں جن کی بناء پر اسلامی معاشی نظام کے بہتر ہونے کا دعویٰ نہیں کیا جاسکتا۔

☆ ☆ ☆

باب ہفتم حوالاجات

۱۔ علم معاشیات — پروفیسر اویس احمد — سکھر — سندھ ٹیکسٹ بورڈ ۱۹۷۳ء — ص.۳۸

۲۔ اسلام کا اقتصادی نظام — مولانا محمد حفیظ الرحمن سیوہاروی — لاہور — ادارہ اسلامیات ۱۹۸۴ء — ص:۴۰۹

۳۔ اسلام کا اقتصادی نظام — محولا بالہ — ص:۴۱۲

۴۔ اسلام کا اقتصادی نظام — محولا بالہ — ص:۴۱۳

۵۔ سلام کا اقتصادی نظام — محولا بالہ — ص.۴۱۳

۶۔ سلام کا اقتصادی نظام — محولا بالہ — ص:۴۱۵

۷۔ معاشیت پاکستان — پروفیسر محمد منظور علی شیخ — لاہور — اعجاز پرنٹر ۱۹۹۱ء — ص:۴۸۰

۸۔ معاشیت پاکستان — محولا بالہ — ص:۴۸۳

۹۔ معاشیت پاکستان — محولا بالہ — ص:۴۸۵

۱۰۔ معاشیت پاکستان — محولا بالہ — ص:۴۸۹

۱۱۔ معاشیات پاکستان — محولا بالہ — ص:۴۹۷

۱۲۔ ابوداؤد — ابی دداؤد سلیمان — داراحیاء السنتہ النبلویہ مکتہ المکرمتہ ۱۲۷۵ھ رقم الحدیث ۱۰۷۳ — ص:۱۷۸ جلد سوم

۱۳۔ البھیقی الکبری — امام بیہقی علی ابی بکر بن سلمان، بیروت دارالخیر رقم الحدیث ۱۱۵۶۵ — ص:۱۴۳ جلد ششم

۱۴۔ صحیح بخاری — امام بخاری محمد اسماعیل بخاری — کراچی قدیم کتب خانہ ۱۹۴۰ء — ص:۸۳۵ جلد دوم

۱۵۔ ابوداؤد — محولا بالہ — رقم الحدیث ۳۶۳۹ — ص:۳۱۶ جلد سوم

۱۶۔ صحیح بخاری — محولا بالہ — رقم احدیث ۲۲۳۱ — ص:۲۲۳۱ جلد دوم

۱۷۔ صحیح بخاری — محولا بالہ — رقم الحدیث ۲۲۴۳ — ص:۴۶ جلد اول

۱۸۔ صحیح بخاری — محولا بالہ — ص.۴۶ جلد سوم

۱۹۔ صحیح بخاری — الامام ابی الحسن المسلم ابی الحجاج — مکتبہ دارالخیر بیروت ۱۹۸۵ء، رقم الحدیث ۲۰۲۵ — ص:۴۳۷ جلد دوم

۲۰۔ حجتہ اللہ البالغہ — شاہ ولی اللہ — المکتبہ سلفیہ لاہور — ص:۱۰۵ جلد دوم

۲۱۔ صحیح مسلم — محولا بالہ — رقم الحدیث ۱۵۸۷ — ص:۴۳۷ جلد دوم

۲۲۔ صحیح بخاری — محولا بالہ — رقم الحدیث ۲۱۸۸ — ص:۸۱۳ جلد سوم

۲۳۔ البیہقی الکبری — محولا بالہ — رقم الحدیث ۱۰۳۳۹ — ص:۲۹۳ جلد پنجم

۲۴۔ صحیح مسلم — محولا بالہ — رقم الحدیث ۱۵۹۱ — ص:۱۲۱۳ جلد سوم

۲۵۔	صحیح مسلم	محولا بالہ	رقم الحدیث ۱۵۶۸	ص:۱۱۹۹ جلد سوم
۲۶۔	البیہقی الکبری	محولا بالہ	رقم الحدیث ۱۰۶۱۱	ص:۳۳۶۰ جد پنجم
۲۷۔	حجۃ اللہ البالغہ	محولا بالہ		ص:۱۱ جلد دوم
۲۸۔	سنن الترمذی	ابو عیسیٰ محمد بن عیسیٰ کراچی دار الاشاعت ۲۰۰۱ء، رقم الحدیث ۱۲۲۴		ص:۵۳۵ جلد سوم
۲۹۔	سنن الترمذی	محول بالہ	رقم الحدیث ۱۲۲۲	ص:۵۳۴ جلد سوم
۳۰۔	فتح اسباری			ص:۳۴۹ جد چہارم
۳۱۔	صحیح بخاری	محولا بالہ		ص:۷۵۵ جد دوم
۳۲۔	صحیح مسلم	الامام ابی الحسن المسلم ابی الحاج بیروت مکتبہ دار الخیر ۱۹۸۵ء، رقم الحدیث ۶۰۵		ص:۱۲۲۷ جلد دوم
۳۳۔	سنن الترمذی	محولا بالہ	رقم الحدیث ۲۵۴۴	ص:۳۲۴ جلد دوم
۳۴۔	صحیح بخاری	محولا بالہ	رقم الحدیث ۲۰۴۱	ص:۷۵۵ جلد دوم
۳۵۔	حجۃ اللہ البالغہ	محولا بالہ		ص:۱۱۱ جد دوم
۳۶۔	صحیح مسلم	محولا بالہ	رقم الحدیث ۱۰۲	ص:۹۹ جد اول
۳۷۔	صحیح بخاری	محولا بالہ	رقم الحدیث ۲۲۴۰	ص:۸۳۴ جد دوم
۳۸۔	سنن البیہقی الکبری	محولا بالہ	رقم الحدیث ۱۱۲۱۶	ص:۱۵۰ جلد دوم
۳۹۔	حجۃ اللہ البالغہ	محولا بالہ		ص:۱۱ جلد دوم
۴۰۔	حجۃ اللہ البالغہ	محولا بالہ		ص:۴۰ جد دوم
۴۱۔	حجۃ اللہ البالغہ	محولا بالہ		ص:۴۰ جلد دوم
۴۲۔	حجۃ اللہ البالغہ	محولا بالہ		ص:۳۳ جلد دوم
۴۳۔	حجۃ اللہ البالغہ	محولا بالہ		ص:۴۰
۴۴۔	حجۃ اللہ البالغہ	محولا بالہ		ص:۴۹
۴۵۔	حجۃ اللہ البالغہ	محولا بالہ		ص:۳۴ جد دوم
۴۶۔	حجۃ اللہ البالغہ	محولا بالہ		ص:۳۴ جد دوم
۴۷۔	حجۃ اللہ البالغہ	محولا بالہ		ص:۶ جد دوم

☆☆☆

کتابیات

نمبر	کتاب	مصنف	ناشر	سال
۱۔	قرآن کریم			
۲۔	ابوداؤد	سلیمان ابن اشعث	قدیمی کتب خانہ کراچی	۱۹۷۰ء
۳۔	اسلام کا معاشی نظام	ڈاکٹر نور محمد غفاری	مرکز تحقیق سنگھ دیال لائبریری	۱۹۹۲ء
۴۔	اسلامی معیشت	پروفیسر میر محمد نواز خان	ایور نیو بکس، اردو بازار لاہور	
۵۔	اسلام اور جدید معیشت و تجارت	مولانا محمد تقی عثمانی	ادارۃ المعارف کراچی	
۶۔	المبسوط	شمس الدین السرخسی	مکتبہ السعادات مصر	۱۳۳۱ھ
۷۔	اصول فقہ اور شاہ ولی اللہ	ڈاکٹر مظہر بقا	بقا پبلیشر گلشن اقبال کراچی	۱۹۸۶ء
۸۔	المصفی شرح موطا	شاہ ولی اللہ	کتب خانہ رحیمی معیز مسجد دہلی	۱۳۴۶ھ
۹۔	اسلامی معاشیات	پروفیسر میر محمد نواز خان	یور نیو بکس اردو بازار لاہور	۱۹۹۴ء
۱۰۔	ابن ماجہ	ابوعبید محمد زید ماجہ	سعید اینڈ کمپنی کراچی	۱۹۸۶ء
۱۱۔	اسلام کا اقتصادی نظام	مولانا حفیظ الرحمن سیوہاروی	ادارہ اسلامیات لاہور	۱۹۸۴ء
۱۲۔	البدور البازغۃ	شاہ ولی اللہ	لاہور محبت روڈ	۱۹۷۰ء
۱۳۔	اقتصادی مسائل اور ان کا حل	خلیل احمد قریشی	انسائیکلوپیڈیا کارپوریشن کراچی	۱۹۷۰ء
۱۴۔	الفتاویٰ ہندیہ عالمگیری	شیخ محمد عباسی	العلمیۃ قاہرہ الازہر کتب خانہ	۱۳۱۰ھ
۱۵۔	اخلاق اور فلسفہ اخلاق	مولانا حفیظ الرحمن سیوہاروی	مکتبہ تنویر القرآن لاہور	۱۹۷۶ء
۱۶۔	اخلاقیات	سی۔ اے قادر	مجلس ترقی ادب لاہور	۱۹۶۱ء
۱۷۔	اسلام کا معاشی نظام	ڈاکٹر اسرار احمد	مکتبہ جدید پریس لاہور	۱۹۸۶ء
۱۸۔	اسلامی معیشت کے بنیادی اصول	مفتی عبدالسلام چاٹگامی	بنوریہ پریس کراچی	۱۹۹۶ء
۱۹۔	اسلام کے معاشی نظریے	محمد یوسف الدین	ایجوکیشنل بک کمپنی کراچی	۱۹۸۴ء
۲۰۔	اسلامی معاشیات	سید مناظر احسن گیلانی	دارالاشاعت کراچی	۱۹۸۶ء
۲۱۔	البیہقی الکبریٰ	امام بیہقی علی بن ابی سمان	دارالخیر بیروت	۱۴۳۵ھ
۲۲۔	اسلام کا نظریہ مملکت	ڈاکٹر نجابت اللہ صدیقی	اسلامک پبلیشرز لاہور	۱۹۸۶ء
۲۳۔	اسلام اور معاشی تحفظ	یوسف القرضاوی (عبدالحمید)	البدر پبلیشرز لاہور	۱۹۸۰ء
۲۴۔	التفہیمات الٰہیۃ	شاہ ولی اللہ	بجنور ہند	۱۳۵۵ھ

۲۵۔	الہام الرحمٰن	عبید اللہ سندھی	شاہ ولی اللہ اکیڈمی حیدر آباد	۱۹۸۹ء
۲۶۔	اسلام اور ملکیت زمین	محمد طاسین	مجلس علمی کراچی	۱۹۹۰ء
۲۷۔	اسلام کی عادلانہ اقتصادی تعلیمات	محمد طاسین	مجلس علمی کراچی	۱۹۹۵ء
۲۸۔	البدایہ والنہایہ	حافظ ابن کثیر	بیروت دار الفکر	۱۴۱۸ھ
۲۹۔	ابحاث فی الاقتصاد المعاصر	عبد اللطیف	مطبعۃ الصلاح دمشق	۱۹۹۱ء
۳۰۔	التکافل الاجتماعی فی الاسلام	عبد اللہ ناصح	دار السلام بیروت	۱۸۹۳ء
۳۱۔	الاسلام والاوضاع الاقتصادیۃ	محمد غزالی	دار الکتاب العربی مصر	۱۹۵۲ء
۳۲۔	معاشی ناہمواریوں کا اسلامی حل	نعیم صدیقی	مکتبہ چراغ راہ کراچی	۱۹۸۵ء
۳۳۔	الاقتصاد الاسلام	محمد حسین بہشتی	منظمۃ العلوم الاسلامی صہران	۱۹۸۶ء
۳۴۔	الاقتصاد الاسلامی	الدکتور ابراہیم الطحاوی	المطابع الامیریۃ قاہرہ	۱۹۷۴ء
۳۵۔	اسلام کا نظام دولت	مفتی محمد شفیع	مکتبہ دار العلوم کراچی	۱۹۶۸ء
۳۶۔	اسلامی نظام کے تحت معاشی اصلاحات	مفتی محمد شفیع	دی مسلم ورلڈ لاہور	۱۹۷۷ء
۳۷۔	اسلام کا معاشی نظریہ	محمد مظہر الدین صدیقی	ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور	۱۹۵۵ء
۳۸۔	اسلام اور معاشی تحفظ	یوسف القرضاوی (عبد الحمید)	بدر پبلیکیشنز لاہور	۱۹۷۸ء
۳۹۔	اسلام کا شورائی نظام	ڈاکٹر محمد آدم	بلال ایسوسی ایٹس کراچی	۱۹۹۹ء
۴۰۔	آسان اسلامی آئین	ظہیر احمد تاج	تاج منزل پی ای سی ایچ کراچی	۱۹۷۳ء
۴۱۔	الاستخراج الاحکام الخراج	ابو الفرج عبد الرحمٰن	دار الکتب العلمیہ لبنان	۱۴۰۵ھ
۴۲۔	الخراج والنظم المالیہ لدولۃ الاسلامیۃ	الدکتور محمد ضیاء الدین	دار الانصار قاہرہ	۱۹۷۷ء
۴۳۔	الکتاب الخراج والعشر	نعیم اشرف نور احمد	ادارۃ القرآن والعلوم الاسلامیۃ کراچی	۱۴۱۷ھ
۴۴۔	النظام الاقتصادی فی الاسلام	تقی الدین النبہانی	دار الامۃ بیروت لبنان	۱۴۱۸ھ
۴۵۔	اسلامی اصول وتجارت مع شرکت ومضاربت	مظفر حسین	غضنفر اکیڈمی کراچی	۱۹۸۵ء
۴۶۔	اسلامی بینکاری کی بنیادی	مفتی محمد تقی عثمانی	مکتبہ عارفی فیصل آباد	۱۹۹۲ء
۴۷۔	اسلام کا معاشی نظام اور معاشی نظریات	سید محمد امین الحق	محکمہ اوقاف لاہور	۹۷۰ء
۴۸۔	اسلام اور قرنیہ کی پیوند کاری	افتخار حسین	پاکستان آئی بینک سوسائٹی کراچی	۱۹۸۴ء
۴۹۔	اسلامی نظام معیشت کے چند اصول	نور محمد اعظمی	ادارۃ المعارف فرید آباد ڈھاکہ	۱۹۷۰ء
۵۰۔	اسلامی معاشی اصول عہد جدید کے تناظر میں	فاروق عزیز	مکتبہ آئین نو لاہور	۱۹۹۷ء

نمبر	کتاب	مصنف	ناشر	سال
۵۱۔	اسلام کا نظام عشر و خراج	مولانا مجاہد الاسلام قاسمی	ادارۃ القرآن اسلامیہ کراچی	۱۹۹۴ء
۵۲۔	النظام الاقتصادی فی الاسلام	الدکتور احمد محمد العسال	مکتبہ وھبہ عابدین قاہرہ	۱۹۸۰ء
۵۳۔	النظام الاقتصادی فی الاسلام	الدکتور مصطفیٰ الہمیری	دار العلوم للطباعۃ الریاض	۱۹۸۵ء
۵۴۔	الاقتصاد فی القرآن والسنۃ	الدکتور عیسیٰ عبدہ	ادارۃ المعارف قاہرہ	۱۹۸۱ء
۵۵۔	الفرقان	محمد منظور نعمانی	مکتبہ الفرقان بریلی	۱۳۶۰ھ
۵۶۔	اسلام کا معاشی نظام	منشی عبدالرحمن خان	ادارہ اشاعت علوم اسلامیہ ملتان	۱۹۸۳ء
۵۷۔	الاسلام معضلات الاقتصاد	سید ابوالاعلیٰ مودودی	موسسۃ الرسالۃ بیروت	۱۹۸۳ء
۵۸۔	انسان کا معاشی مسئلہ اور اس کا اسلامی حل	سید ابوالاعلیٰ مودودی	اسلامک پبلیکشنز لاہور	۱۹۶۲ء
۵۹۔	ایمان اور زندگی	ڈاکٹر یوسف القرضاوی	ادارہ معارف اسلامی لاہور	۱۹۷۳ء
۶۰۔	اسلام اور مغرب کی تہذیبی مسائل	محمد قطب (ترجمہ ساجد الرحمن)	ادارہ معارف اسلامی لاہور	۱۹۷۲ء
۶۱۔	اسلام کا روشن مستقبل	سید قطب شہید (ترجمہ عبدالحمید صدیقی)	//	۱۹۷۵ء
۶۲۔	اسلامی ریاست	سید ابوالاعلیٰ مودودی	ادارہ معارف اسلامی لاہور	۱۹۶۵ء
۶۳۔	ادبیات مودودی	خورشید احمد	ادارہ معارف اسلامی لاہور	۱۹۷۲ء
۶۴۔	اسلامی نظام میں معاشی اصلاحات کیا ہوں گی؟	مفتی محمد شفیع	مرکزی جمعیت علماء اسلام کراچی	۱۹۸۹ء
۶۵۔	اسلام اور دولت	مفتی محمد شفیع	عالمی ادارہ اشاعت علوم اسلامیہ ملتان	۱۹۶۲ء
۶۶۔	الاسلام الاقتصادی	الدکتور محمد البہی	مکتبہ وھبہ عابدین قاہرہ	۱۹۸۱ء
۶۷۔	الاسلام فی حل مشاکل المجتمعات الاسلامیہ المعاصرۃ	الدکتور محمد البہی	مکتبہ وھبہ عابدین قاہرہ	۱۹۸۲ء
۶۸۔	التضامن الاسلامی فی المجال الاقتصادی	دکتور غریب الجمال	دار الشروق جدہ	۱۹۷۶ء
۶۹۔	اسلام کا اقتصادی نظام	مولانا حفظ الرحمن	ندوۃ المصنفین دہلی پریس	۱۹۵۹ء
۷۰۔	اسلام کا قانون اراضی	نصرت علی اثیر	مرکز تحقیق دیال سنگھ ٹرسٹ لاہور	۱۹۶۰ء
۷۱۔	اسلام کا قانون تجارت	ڈاکٹر نور محمد غفاری	مرکز تحقیق دیال سنگھ ٹرسٹ لاہور	۱۹۵۶ء
۷۲۔	اسلام کا قانون محاصل	ڈاکٹر نور محمد غفاری	مرکز تحقیق دیال سنگھ ٹرسٹ لاہور	۱۹۷۰ء
۷۳۔	اسلام کا قانون محنت و اجرت	مولانا محب اللہ ندوی	مرکز تحقیق دیال سنگھ ٹرسٹ لاہور	۱۹۶۲ء
۷۴۔	اجتہاد اور تبدیلی احکام	مولانا محب اللہ ندوی	مرکز تحقیق دیال سنگھ ٹرسٹ لاہور	۱۹۵۶ء

۷۵۔	اسلام کے بین الاقوامی اصول وتصورات	مولانا محب اللہ ندوی	مرکز تحقیق دیال سنگھ ٹرسٹ لاہور	۱۹۷۲ء
۷۶۔	اسلام کا قانون وقت	ڈاکٹر محمود الحسن عارف	مرکز تحقیق دیال سنگھ ٹرسٹ لاہور	۱۹۷۵ء
۷۷۔	اسلام کا قانون شہادت	مولانا سید محمد متین ہاشمی	مرکز تحقیق دیال سنگھ ٹرسٹ لاہور	۱۹۷۸ء
۷۸۔	اسلامی معاشیات	مولانا مناظر احسن گیلانی	شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور	۱۹۶۲ء
۷۹۔	ایضاح الادلۃ	شیخ الہند محمود حسن	ادارہ اسلامیات لاہور	۱۹۸۲ء
۸۰۔	ارشاد مجدد	احمد بن سعید	مطبوعہ سلطان آرٹ گلبرگ کراچی	۱۹۷۳ء
۸۱۔	اجتہاد	مولانا تقی امینی	قدیمی کتب خانہ کراچی	۱۹۸۷ء
۸۲۔	الاجتھاد فیما لا نص فیہ	الدکتور الطیب خضری	مکتبہ الحرمین مکہ مکرمہ	۱۹۸۳ء
۸۳۔	الاجتہاد فی الشریعۃ الاسلامیہ	امام محمد بن سعود	دارہ الثقافۃ السر بالجیہ ریاض	۱۹۸۳ء
۸۴۔	اجتہاد	خالد انصاری بھوپال	سوئی برقی پریس بھوپال	۱۹۶۷ء
۸۵۔	اسلام میں فاضلہ دولت کا مقام	عبدالرحمن گیلانی	مکتبہ اسلام لاہور	۱۹۸۸ء
۸۶۔	اسلام میں مکمل دین مستقل تہذیب	محمد عبداللہ اسعد	مکتبہ رحمانیہ (یوپی) ہند	۱۹۸۲ء
۸۷۔	اسلام کا نظام سیاست عدالت	یعقوب الرحمن عثمانی	نفیس اکیڈمی حیدر آباد دکن	۱۹۴۶ء
۸۸۔	اسلامی ملکوں کی سیاست	خیور السن م	قومی دار الاشاعت لاہور	۱۹۶۰ء
۸۹۔	اسلام کا نظام حکومت	مولانا حامد انصاری	رفیق ندوۃ المصنفین دہلی	۱۹۵۶ء
۹۰۔	اسلام کا سیاسی نظام	جاوید احمد غامدی	قومی پریس لاہور	۱۹۸۶ء
۹۱۔	آب کوثر	شیخ محمد اکرام	فیروز سنز لمیٹڈ لاہور	۱۹۶۶ء
۹۲۔	احکام قرآن	چوہدری نذر محمد	سروس انڈسٹریز لمیٹڈ لاہور	۱۹۸۶ء
۹۳۔	احکام قرآنی	منشی عبدالرحمن	شمع اکیڈمی لاہور	۱۹۷۴ء
۹۴۔	اصحاب کہف	مولانا ابوالکلام آزاد	شعاع ادب لاہور	۱۹۶۴ء
۹۵۔	اجزائے ایمان	مولانا محمد ادریس	مکتبہ دار الشکر اسلامیہ کراچی	۱۹۹۷ء
۹۶۔	امام اعظم اور علم الحدیث	مولانا محمد علی صدیقی	انجمن دار العلوم الشہابیۃ سیالکوٹ	۱۹۸۱ء
۹۷۔	العلم والعلماء	علامہ ابن عبدالبر اندلسی	ادارہ اسلامیات لاہور	۱۴۰۴ھ
۹۸۔	العدالۃ الاجتماعیۃ فی الاسلام	سید قطب	اسلامک پبلیشنز لاہور	۱۹۶۹ء
۹۹۔	اسلام اور جدید اقتصادی مسائل	مولانا محمد تقی عثمانی	میمن اسلامک پبلیشرز کراچی	۱۹۹۳ء
۱۰۰۔	برصغیر پاک وہند میں علم فقہ	مولانا اسحاق بھٹی	ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور	۱۹۷۳ء

نمبر	کتاب	مصنف	ناشر	سن
۱۰۱ـ	تاریخ دعوت وعزیمت	مولانا ابوالحسن ندوی	مجلس نشریات اسلام کراچی	۱۹۵۲ء
۱۰۲ـ	تاریخ اقوام عالم	مرتضیٰ احمد خان	مجلس نشریات اسلام لاہور	۱۹۵۸ء
۱۰۳ـ	تذکرہ شاہ ولی اللہ	سید مناظر حسن گیلانی	نفیس اکیڈمی کراچی	۱۹۶۸ء
۱۰۴ـ	تاریخ اخلاقیات	مولانا احسان اللہ	جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن	۹۳۵ ء
۱۰۵ـ	تاریخ اقوام عالم	مرتضیٰ احمد خان	مجلس نشریات اسلام لاہور	۱۹۵۸ء
۱۰۶ـ	تعارف اخلاقیات	ولیم للی (سید احمد سعید)	شعبہ تصنیف وتالیف جامعہ کراچی	۱۹۸۴ء
۱۰۷ـ	تفسیر ماجدی	عبدالماجد دریا آبادی	مجلس نشریات اسلام لاہور	۹۷۰ ء
۱۰۸ـ	ترمذی	ابوعیسیٰ ترمذی	قدیمی کتب خانہ کراچی	۱۹۸۶ء
۱۰۹ـ	ترجمان القرآن	مولانا ابوالکلام آزاد	سندھ ساگر اکیڈمی لاہور	۱۹۸۵ء
۱۱۰ـ	تلخیص سماجی انصاف اور اجتماعی	غلام مصطفیٰ قاسمی	شاہ ولی اللہ اکیڈمی حیدرآباد	۱۹۷۵ء
۱۱ـ	تذکرۂ صوفیاء سندھ	اعجاز الحق قدوسی	گلزار محمدیہ اسٹیم پریس لاہور	۱۹۵۹ء
۱۱۲ـ	تذکرہ العلماء والمشائخ	محمد الدین فوق	گلزار محمدیہ اسٹیم پریس لاہور	۱۳۳۸ھ
۱۱۳ـ	تجدید معاشیات	مولانا عبدالباری ندوی	نفیس اکیڈمی کراچی	۱۹۶۲ء
۱۱۴ـ	تفسیر المنار	محمد عبدہ	دار المنار مصر	۱۳۶۶ھ
۱۱۵ـ	تاریخ الفقہ الاسلامی	ڈاکٹر محمد یوسف موسیٰ	دار المعرفة قاہرہ	۱۹۶۴ء
۱۱۶ـ	تنزلات اقتصادیة	الدکتور نشأت الشعار	الطباعة والنشر فی حلب سوریة	۲۰۰۲ء
۱۱۷ـ	تاریخ افکار وعلوم	[illegible]	ادارہ معارف اسلامی لاہور	۱۹۷۰ء
۱۱۸ ـ	توزیع الثروة فی الاسلام	مفتی محمد شفیع	مکتبہ دار العلوم کراچی	۱۳۹۸ھ
۱۱۹ـ	تعلیمات حکیم الامت	محمد موسیٰ بھٹو	سندھ نیشنل اکیڈمی سندھ حیدرآباد	۲۰۰۱ء
۱۲۰ـ	تاریخ الفقہ الاسلامی	الدکتور عمر سلیمان	مکتبة الفلاح الکویت	۱۹۸۲ء
۱۲۱ـ	تاریخ الفقہ الاسلامی	عبدالسلام ندوی	مطبع معارف دار المصنفین	۱۹۷۰ء
۱۲۲ـ	تعمیر انسانیت	سید ابوالحسن علی ندوی	مجلس نشریات اسلام کراچی	۱۹۹۵ء
۲۳ ـ	تہذیب وتمدن اسلامی	رشید اختر ندوی	ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور	۱۹۵۱ء
۱۲۴ـ	تمدن عرب	ڈاکٹر سید علی	کراچی بک لمیٹڈ	۱۹۶۰ء
۱۲۵ـ	تمدن ہند	مولانا سید علی	کراچی بک لمیٹڈ	۱۹۶۲ء
۱۲۶ـ	تاریخ الفقہ	قاضی ظہور الحسن	مکتبہ معین الادب لاہور	۱۹۷۸ء

نمبر	کتاب	مصنف	ناشر	سن
۱۲۷۔	تمدن اسلام کا پیام بیسویں صدی کی دنیا کے نام	عبدالماجد دریا آبادی	علی گڑھ مسلم یونیورسٹی پریس	۱۹۳۸ء
۱۲۸۔	تنقید و تحقیق	غلام مصطفی جان	مجلس نشریات اسلام کراچی	۲۰۰۱ء
۱۲۹۔	تجارت رحمت العالمین کی نظر میں	عبدالمومن بخش	مکتبہ عمر کراچی	۱۹۹۹ء
۱۳۰۔	تذکرہ المحدثین	مولانا غلام رسول سعدی	فرید بک اسٹال لاہور	۱۹۷۷ء
۱۳۱۔	تذکرۃ الحبیب	مولانا اشرف علی تھانوی	زمزم پبلیشرز کراچی	۲۰۰۳ء
۱۳۲۔	تذکرہ علمائے ہند	رحمٰن علی	ہسٹوریکل سوسائٹی کراچی	۱۹۶۱ء
۱۳۳۔	تاریخ مسلمان پاک و ہند	فرید آبادی ہاشمی	انجمن ترقی اردو پاکستان	۱۹۵۳ء
۱۳۴۔	تصوف کی حقیقت اور ان کا فلسفہ تاریخ	شاہ ولی اللہ	سندھ ساگر اکیڈمی لاہور	۱۹۴۶ء
۱۳۵۔	ثقافت ماہانہ	شیخ محمد اکرام	ماہانہ ثقافت لاہور	۱۹۶۷ء
۱۳۶۔	پیغام بنام موتمر کل ہند جمعیت اسلام کلکتہ	ناظم کل ہند جمعیت علمائے اسلام	جمعیت پریس کلکتہ	۱۹۴۵ء
۱۳۷۔	پاکستان اقتصادی جائزہ	ارشد زمان (اقتصادی مشیر)	وزارت خزانہ پاکستان	۱۹۸۲ء
۱۳۸۔	جواہر الفقہ	مفتی محمد شفیعؒ	مکتبہ دار العلوم کراچی	۱۳۹۵ھ
۱۳۹۔	جدید جاہلیت	محمد قطب (ترجمہ ساجد الرحمٰن)	ادارہ معارف اسلامی لاہور	۱۹۸۰ء
۱۴۰۔	جواہر الحدیث	محمد ادریس انصاری	ادارہ تبلیغ اسلام صادق آباد	۱۹۸۶ء
۱۴۱۔	چند معاشی مسائل اور اسلام	یعقوب شاہ	ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور	۱۹۶۷ھ
۱۴۲۔	حجۃ اللہ البالغۃ	شاہ ولی اللہ	مکتبہ سلفیہ لاہور	۱۲۸۶ھ
۱۴۳۔	حیات العلماء	سید عبدالباقی سہوانی	مطبع کشور لکھنؤ	۱۹۲۲ء
۱۴۴۔	حیات ولی اللہ	رحیم بخش دہلوی	مکتبہ حبیبہ بارس گنج لاہور	۱۹۶۰ء
۱۴۵۔	حیات العلماء	سید عبدالباقی سہوانی	مطبع نول کشور لکھنؤ	۱۹۲۲ء
۱۴۶۔	حدیقۃ الاولیاء	مفتی غلام سرور لاہوری	مطبع نول کشور لکھنؤ	۱۸۷۷ء
۱۴۷۔	حضور اکرمؐ بحیثیت دہندہ نظام معیشت	پروفیسر محمد عبدالجبار	خدمت کونسل سیالکوٹ چھاؤنی	۱۹۸۳ء
۱۴۸۔	حیات ولی اللہ	رحیم بخش دہلوی	مکتبہ حبیبہ بارس گنج لاہور	۱۹۶۰ء
۱۴۹۔	حیات رسول امیؐ	خالد مسعود	غزنی اسٹریٹ لاہور	۲۰۰۳ء
۱۵۰۔	حیات رسالت مآبؐ	راجہ محمد شریف	زاہد اکیڈمی جوہر آباد سرگودھا	۲۰۰۳ء

۱۵۱۔ حجیت حدیث — مولانا محمد تقی عثمانی — ادارہ اسلامیات لاہور — ۱۹۹۱ء

۱۵۲۔ حفاظت و حجیت حدیث — مولانا فہیم عثمانی — دار الکتب لاہور — ۱۹۷۹ء

۱۵۳۔ حیات طیبہؒ — مرزا حیرت دہلوی — اسلامی پبلشنگ کمپنی لاہور — ۱۹۶۳ء

۱۵۴۔ حیات مسلمین — حضرت اشرف علی تھانوی — ادارہ المعارف کراچی — ۱۹۹۸ء

۱۵۵۔ حقوق العباد — حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ — ادارہ اسلامیات لاہور — ۲۰۰۰ء

۱۵۶۔ خطبات عثمانی — پروفیسر محمد انوار الحسن شیرکوٹی — نذر سنز لاہور — ۱۹۷۲ء

۱۵۷۔ خطبہ صدارت — مولانا شبیر احمد عثمانیؒ — دفتر مرکزی جمعیت علمائے اسلام کراچی — ۱۹۴۹ء

۱۵۸۔ درس اخلاق — مولانا محمد اسلم شیخوپوری — مکتبہ حلیمیہ سائٹ کراچی — ۲۰۰۲ء

۱۵۹۔ دین و شریعت — مولانا منظور نعمانی — مجلس نشریات اسلام کراچی — ۱۹۸۴ء

۱۶۰۔ دستور حیات — مولانا ابوالحسن علی ندوی — مجلس تحقیقات و نشریات اسلام لکھنؤ — ۱۹۸۳ء

۱۶۱۔ دین رحمت — شاہ معین الدین احمد ندوی — مطبع معارف اعظم گڑھ — ۱۹۶۷ء

۱۶۲۔ دین کا متوازن تصور — ڈاکٹر مولانا محسن عثمانی ندوی — مجلس نشریات اسلام کراچی — ۱۹۹۹ء

۱۶۳۔ دور التقسیم والاخلاق فی الاقتصادی الاسلامی — ڈاکٹر یوسف القرضاوی — مکتبہ وھبہ قاہرہ — ۱۹۹۵ء

۱۶۴۔ دولت مغلیہ کی ہیئت مرکزی — ابن حسن — لاہور — ۱۹۵۸ء

۱۶۵۔ ریاض الصالحین — امام محی الدین ابو زکریا یحییٰ — دار الاشاعت کراچی — ۱۹۸۵ء

۱۶۶۔ ریاض السالکین فی انوار العارفین — حکیم میاں عبد الغفور — ادارہ سہروردیہ فی مخزن اسلامی کراچی — ۱۹۸۴ء

۱۶۷۔ رسول اکرمؐ کی حکمت انقلاب — سید اسعد گیلانی — ادارہ ترجمان القرآن لاہور — ۱۹۸۱ء

۱۶۸۔ رسول اکرمؐ کی سیاسی زندگی — ڈاکٹر محمد حمید اللہ — دار الاشاعت کراچی — ۱۳۸۰ھ

۱۶۹۔ رود کوثر — محمد اکرام شیخ — ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور — ۱۹۸۶ء

۱۷۰۔ زر و بینکاری — شیخ مبارک علی — رہبر پبلشر کراچی — ۱۹۹۹ء

۱۷۱۔ زر و بینک داری — شیخ عطاء اللہ ایم اے — تاجر کتب کشمیری بازار لاہور — ۱۹۵۴ء

۱۷۲۔ سرمایہ دارانہ نظام انشورنس اور اسلام کا نظام کفالت عامہ — پروفیسر ڈاکٹر نور محمد غفاری — مرکز تحقیق دیال سنگھ ٹرسٹ لاہور — ۱۹۹۲ء

۱۷۳۔ سرمایہ دارانہ اور اشتراکی نظام کا اسلامی معاشی نظام سے موازنہ — شیخ التفسیر علامہ شمس الحق افغانی — مکتبہ انوار القرآن پشاور — ۱۹۹۹ء

۱۷۴۔ سیرت فریدیہ — سر سید احمد خان — مطبوعہ اعظم گڑھ — ۱۹۸۲ء

نمبر	کتاب	مصنف	ناشر	سن
۱۷۵۔	سیرت احمد مجتبیٰ	شاہ مصباح الدین	پاکستان اسٹیٹ آئل کمپنی کراچی	۱۹۸۶ء
۱۷۶۔	سیرت سرور کونینؐ	مفتی محمد عاشق الٰہی	ادارۃ المعارف کراچی	۲۰۰۳ء
۱۷۷۔	سیرت رسول اکرمؐ	مفتی محمد شفیعؒ	ادارہ اسلامیات لاہور	۱۴۰۴ھ
۱۷۸۔	سماجی انصاف و اجتماعیت	غلام مصطفیٰ قاسمی	شاہ ولی اللہ اکیڈمی حیدرآباد	۱۹۷۳ء
۱۷۹۔	سیرۃ الرسول	شاہ ولی اللہ	دارالاشاعت کراچی	۱۳۵۸ھ
۱۸۰۔	سرور المحزون	شاہ ولی اللہ	دارالاشاعت دیوبند ضلع سہارن پور	۱۳۵۸ھ
۱۸۱۔	شاہ ولی اللہ اور ان کا فلسفہ	مولانا عبیداللہ سندھی	سندھ ساگر اکیڈمی لاہور	۱۹۴۶ء
۱۸۲۔	شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات	خلیق احمد نظامی	ادارہ اسلامیات لاہور	۱۹۵۰ء
۱۸۳۔	شاہ ولی اللہ اور ان کی تعلیم	مولانا غلام حسین جلبانی	شاہ ولی اللہ اکیڈمی حیدرآباد	۱۳۸۲ھ
۱۸۴۔	شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک	مولانا عبیداللہ سندھی	سندھ ساگر اکیڈمی لاہور	۱۹۶۵ء
۱۸۵۔	شاہ ولی اللہ اور ان کا خاندان	حکیم محمد احمد برکاتی	مجلس اشاعت لاہور	۱۹۷۵ء
۱۸۶۔	شرکات الاشخاص بین الشرقیہ والقانون	محمد بن ابراہیم موسیٰ	جامعۃ الامام محمد بن سعود اسلامیہ ریاض	۱۴۰۱ھ
۱۸۷۔	شرکۃ العنان فی الفقہ الاسلامی	ابراہیم فاضل ندیو	مکتبۃ الاقصیٰ عمان	۱۹۸۲ء
۱۸۸۔	شاہ ولی اللہ کے افکار	مولانا عبیداللہ سندھی	المحمود اکیڈمی لاہور	۱۹۹۲ء
۱۸۹۔	شاہ ولی اللہ کی خدمات	پروفیسر محمد یسین	شاہ ولی اللہ اکیڈمی پھلت مظفر نگر	۲۰۰۴ء
۱۹۰۔	شاہ ولی اللہ اور ان کے اقتصادی نظریات	بشیر احمد بی اے	مکی دارالکتب لاہور	۹۹۴ء
۱۹۱۔	شامی ابن عابد محمد امین	انور مختار	ایچ ایم سعید کراچی	۱۹۸۰ء
۱۹۲۔	شعور و آگہی	مولانا عبیداللہ سندھی	صیب پبلیشرز لاہور	۲۰۰۱ء
۱۹۳۔	صحیح بخاری	محمد بن اسماعیل بخاری	ایچ ایم سعید کراچی	۱۹۷۵ء
۱۹۴۔	صحیح مسلم	ابوالحسن مسلم بن حجاج	قدیمی کتب خانہ کراچی	۱۹۸۵ء
۱۹۵۔	علمائے ہند کا شاندار ماضی	محمد میاں	مکتبہ محمودیہ لاہور	۱۹۷۷ء
۱۹۶۔	علم معاشیات	اویس احمد	سکھر [illegible]	۱۹۷۳ء
۱۹۷۔	عشر مینوئیل سندھ	عرفان احمد امتیازی	مرکزی زکوٰۃ انتظامیہ اسلام آباد	۱۹۸۳ء
۱۹۸۔	غیر مسلم ممالک میں عشر و خراج و اراضی ہند	محمد عبیداللہ الاسعدی	مجلس تحقیق برطانیہ	۱۹۹۶ء
۱۹۹۔	علوم الحدیث	[illegible]	مطبعۃ جامعہ دمشق	۱۹۶۳ء
۲۰۰۔	علم الاخلاق	مولوی احسان احمد	جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن	۱۹۳۵ء

نمبر	کتاب	مصنف	ناشر	سن
۲۰۱ـ	عظمٰی کے معاشی نظریات	جارج سول، ترجمہ ماسٹر ایم اختر انگلینڈ دارالکتب		۱۹۲۳ء
۲۰۲ـ	فیض الباری	مولانا محمد انور شاہ کشمیری	خضر راہ بک ڈپو دیوبند	۱۹٦۰ء
۲۰۳ـ	فقہ اسلامی کا تاریخی پس منظر	مولانا تقی امینی	سنچری اسلامک اسٹڈی سرکل لاہور	۱۹٦۹ء
۲۰۴ـ	فطری حکومت	قاری محمد طیب	ادارہ عثمانیہ لاہور	۱۹٦۳ء
۲۰۵ـ	فتاوٰی عزیزی	شاہ عبدالعزیز	مجتبائی پریس لاہور	۱۹٦۳ء
۲۰٦ـ	فقہائے دیوبند	محمد اسحٰق بھٹی	ادارہ ثقافت اسلامیہ دہلی	۱۹۸۱ء
۲۰۷ـ	فلسفہ واخلاقیات	ڈاکٹر سید عطاء الرحیم	کفایت آکیڈمی کراچی	۱۹۹۲ء
۲۰۸ـ	فیوض الحرمین	شاہ ولی اللہ	مکتبہ سلیقہ لاہور	۱۹٦۸ء
۲۰۹ـ	قرآن کی معاشی تعلیمات	سید ابوالاعلیٰ مودودی	مسلم سوسائٹی ملتان	۱۹٦۰ء
۲۱۰ـ	قانون شریعت	عبدالسلام خان	مدنی دارالاشاعت دار اسلام ٹھٹھہ	۱۹٦۵ء
۲۱۱ـ	قصص الاولیاء	مولانا محمد فاضل عثمانی	ادارہ اسلامیات لاہور	۱۹۹۵ء
۲۱۲ـ	قصص قرآن	سید صدر الدین بلخی	مکتبہ معین آدب لاہور	۱۹٦۷ء
۲۱۳ـ	قصص الانبیاء	عبدالوہاب نجار	مکتبہ التجاریہ الکبری مصر	۱۹۵٦ء
۲۱۴ـ	قرآن مجید کا ربوبیت	پرویز	ادارہ طلوع اسلام گلبرگ لاہور	۱۹۷۸ء
۲۱۵ـ	قومی ترقی لائحہ عمل	ابراہیم محمد یوانی	مسلم آباد مشہور فیست لیتھو پریس کراچی	۱۹۷۰ء
۲۱٦ـ	قوائد جامعہ	محمد عبدالرحیم چشتی	نور محمد کارخانہ تجارت کتب کراچی	۱۹٦۴ء
۲۱۷ـ	کتاب الاجتھاد	الدکتور عبدالحمید	دارالعلوم والثقافۃ بیروت	۱۹۸۷ء
۲۱۸ـ	کتاب الاموال	ابوعبید قاسم	ادارہ تحقیقات اسلامی	۱۹۸۵ء
۲۱۹ـ	کتاب الخراج	ابو یوسف	بولاق	۱۳۰۲ھ
۲۲۰ـ	کنز الدقائق	ابن نجیم زین العابدین	مصبع دار الکتب العربیۃ قاہرہ	۱۹٦۷ء
۲۲۱ـ	کنز الاعمال	مفتی حسام الدین		۱۹٦۰ء
۲۲۲ـ	کسب حلال اور راہ اعتدال	مولانا ولی اللہ مظہری صدیقی	درخواستی کتب خانہ کراچی	۱۴۱۷ھ
۲۲۳ـ	کتاب الخراج وصنعۃ الکتابۃ	ابوالفرج قدامہ بن جعفر	جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن	۱۹۳۰ء
۲۲۴ـ	کتاب الفقہ علی مذاہب الاربعہ	عبدالرحمن جزیری	دارالعلوم والثقافۃ بیروت	۱۹۷۲ء
۲۲۵ـ	گلزار اولیاء	[illegible] حسین	مطبع سبحانی حیدرآباد دکن	۱۸۹۰ء
۲۲٦ـ	گلزار ابرار	فاضل احمد جیوری	اسلامک بک فاؤنڈیشن لاہور	۱۹۷۸ء

نمبر	کتاب	مصنف	ناشر	سن
۲۲۷ـ	لمحات	شاہ ولی اللہ	حیدرآباد دکن	۱۹۷۸ء
۲۲۸ـ	مقدمہ اخلاقیات	مولوی احسان اللہ	جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن	۱۹۴۷ء
۲۲۹ـ	معارف القرآن	مفتی محمد شفیع صاحب	ادارہ المعارف کراچی	۱۹۷۰ء
۲۳۰ـ	مسلمانوں کے سیاسی افکار	پروفیسر رشید احمد	مطبع اسعادہ مصر	۱۳۲۴ء
۲۳۱ـ	معاشیات اسلام	ابوالاعلیٰ مودودی	اسلامک پبلشرز لاہور	۱۹۹۰ء
۲۳۲ـ	مسند امام احمد	امام احمد	بستان بیروت	۱۹۸۰ء
۲۳۳ـ	مجمع الزوائد	حفیظ نورالدین	مکتبہ القدوس قاہرہ	۱۳۵۲ھ
۲۳۴ـ	مصفی ومسوی شرح موطا	شاہ ولی اللہ	حیدر ترقی پریس دہلی	۱۳۴۶ھ
۲۳۵ـ	مشکوٰۃ شریف	ابوعبداللہ ولی الدین	قدیمی کتب خانہ کراچی	۱۹۸۰ء
۲۳۶ـ	مشکوٰۃ المصابیح	ابومحمد لقب محمد السنۃ	قدیمی کتب خانہ کراچی	۱۹۸۵ء
۲۳۷ـ	معاشیات مصادر ومنہاج	ڈاکٹر ذاکر حسین		۱۹۸۰ء
۲۳۸ـ	معاشیات اسلام	منظور علی شیخ	علمی کتاب خانہ اردو بازار لاہور	۱۹۷۷ء
۲۳۹ـ	موافقات اصول شرح شاطبی	شاہ ولی اللہ	المکتبہ التجاریہ الکبریٰ مصر	۱۳۲۵ھ
۲۴۰ـ	مجمع الزاوعد	حفیظ نورالدین	مکتبہ القدوس قاہرہ	۱۳۴۵ھ
۲۴۱ـ	مشرق وسطیٰ کا معاشرتی جائزہ	محمد عبدالکریم	مکتبہ خدام ملت، کراچی	۱۹۹۴ء
۲۴۲ـ	معاشی ترقی	پروفیسر ایم اے چودہری	اکنامکس پبلشر لاہور	۱۹۷۴ء
۲۴۳ـ	معاشیات اسلام	[illegible]	غضنفر اکیڈمی کراچی	۱۹۸۴ء
۲۴۴ـ	معاشیات ہند	[illegible]	دارالطبع جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن	۱۹۲۴ء
۲۴۵ـ	معاشیات اور پاکستان	عبدالقدوس ہاشمی	نفیس اکیڈمی حیدرآباد دکن	۱۹۴۶ء
۲۴۶ـ	مقدمہ معاشیات	ڈبلیو ایچ نورسینڈ	دارالطباع جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن	۱۹۳۲ء
۲۴۷ـ	مولانا مودودی کے معاشی تصورات	محمد اکرم خان	اسلامک پبلشرز لاہور	۱۹۸۳ء
۲۴۸ـ	معاشیت اور اس کے تقاضے	پروفیسر اکرم ظاہر	دارالشعور لاہور	۱۹۹۴ء
۲۴۹ـ	مرکز ابحاث الاقتصاد الاسلامی فی عشرۃ سنوات		مکتبہ عبدالعزیز جدہ	۱۹۸۸ء
۲۵۰ـ	مقامات الاقتصادی الاسلامی	عبدالسمیع المصری	مکتبہ وھبہ قاہرہ	۱۹۸۳ء
۲۵۱ـ	محنت کی عظمت، اسلامی نقطہ نظر سے	ابوالحسن قدوسی	ہیمرو پبلیکیشنز ڈائریکٹریٹ کراچی	۱۹۸۶ء
۲۵۲ـ	معاہدہ عمرانی، روسو	ترجمہ ڈاکٹر محمود حسین	کراچی	۱۹۶۴ء

۲۵۳۔ مسلم الثبوت	محب اللہ بہاری	المطبعۃ المنیر یہ بولاق مصر	۱۳۲۵ھ
۲۵۴۔ مشکلۃ الفقراء	الدکتور یوسف القرضاوی	مکتبہ وھبہ القاہرہ	۱۹۸۰ء
۲۵۵۔ معرکۃ الاسلام اوالراسمالیہ	سید قطب	دارالشروق القاہرہ	۱۹۸۱ء
۲۵۶۔ معاشرتی واقتصادی مقاصد واصلاحات اراضی		حکومت پاکستان پلاننگ بورڈ	۱۹۵۶ء
۲۵۷۔ مسلمانوں کا عروج وزوال	سعید احمد اکبرآبادی	جدید برقی پریس دہلی	۱۹۴۲ء
۲۵۸۔ مسلمانوں کے سیاسی افکار	پروفیسر رشید احمد	ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور	۱۹۶۱ء
۲۵۹۔ مقدمہ ابن خلدون	عبدالرحمن بن خلدون	المطبعۃ الخیریۃ بیروت	۱۳۹۹ھ
۲۶۰۔ معاشیات کا اسلامی فلسفہ	مولانا عبدالباری ندوی	ادارہ تالیف اشرفیہ ملتان	۱۴۲۶ھ
۲۶۱۔ مجلس حکیم الامت	مولانا مفتی محمد شفیعؒ	ادارہ المعارف کراچی	۱۹۷۴ء
۲۶۲۔ ملفوظات کشمیری	مولانا سید احمد رضا	بیت الحکمت دیوبند یوپی	۱۹۷۰ء
۲۶۳۔ معارف الاکابر	مولانا اشرف علی تھانوی	ادارہ اسلامیات لاہور	۱۹۹۵ء
۲۶۴۔ مجالس مفتی اعظم	مفتی عبدالروف سکھروی	ادارۃ المعارف کراچی	۱۹۹۷ء
۲۶۵۔ ملفوظات جامعۃ العلوم	قاضی سجاد حسین	انڈین کونسل آف ہسٹاریکل ریسرچ دہلی	۱۹۸۷ء
۲۶۶۔ مواہب ربانیہ	حضرت حکیم اختر	کتب خانہ مظہری کراچی	۱۹۹۸ء
۲۶۷۔ ملفوظات شاہ عبدالعزیز	ڈاکٹر سید معین الحق	پاکستان ایجوکیشنل اکیڈمی کراچی	۱۹۶۰ء
۲۶۸۔ ملفوظات رائے پوری	مولانا محمد صاحب انوری	ادارہ المعارف کراچی	۱۹۸۰ء
۲۶۹۔ ملفوظات عارفی	مولانا منظور احمد حسینی	کتب خانہ یوسفیہ کراچی	۱۹۹۹ء
۲۷۰۔ معارف حکیم الامت	ڈاکٹر عبدالحیٔ	سعید اینڈ کمپنی کراچی	۱۹۸۵ء
۲۷۱۔ مبادیات فقہ	مولانا مفتی محمد امین جیلی	ادارہ اسلامیات لاہور	۱۹۸۰ء
۲۷۲۔ مقدمہ تدوین فقہ	مولانا سید مناظر احسن گیلانی	مکتبہ رشیدیہ لمیٹڈ	۱۹۷۶ء
۲۷۳۔ مراسلات سیاسیہ	مولانا شبیر احمد عثمانی	شعبہ نشر و اشاعت آل انڈیا مسلم لیگ دہلی	۱۹۶۴ء
۲۷۴۔ مشکلات القرآن	مولانا محمد انور	ادارہ تالیف اشرفیہ ملتان	۱۹۸۴ء
۲۷۵۔ مومن کے شب وروز	ڈاکٹر محمود	ولایت سنز کراچی	۱۹۸۴ء
۲۷۶۔ معاشرۃ النبیؐ	متین طارق باغپتی	مکتبہ تعمیر انسانیت لاہور	۱۹۷۷ء
۲۷۷۔ منہاج اسلامی معیشت	حافظ غلام حسین	مرکز تحقیق دیال سنگھ ٹرسٹ لاہور	۱۹۹۲ء
۲۷۸۔ نبوی نظام اقتصاد معاشیات	محمد اشرف خان	عالمی ادارہ اشاعت علوم اسلامیہ ملتان	۱۹۷۲ء

۲۷۹۔ نبی کی معاشی زندگی | ڈاکٹر نور محمد غفاری | مرکز تحقیق دیال سنگھ ٹرسٹ لاہور | ۱۹۸۸ء

۲۸۰۔ نظریہ مبادلات خارجہ | ترجمہ، وائٹ کوں | در مطبع جامعہ عثمانیہ | ۱۹۳۷ء

۲۸۱۔ نظام اسلام کی اہمیت | عبدالرحمن | چٹان پرنٹنگ پریس لاہور | ۱۹۷۲ء

۲۸۲۔ نظریہ اجتھاد فی الشریعۃ الاسلامیۃ | محمد ابراہیم عباس | دار الشروق جدۃ | ۱۹۸۳ء

۲۸۳۔ نظام اسلام | تقی الدین انبہانی | الخلاف پبلیکیشنز لاہور | ۲۰۰۰ء

۲۸۴۔ ہند کی معاشی حالت | ڈبلیو، ایچ مور ہینڈ | جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن | ۱۹۲۹ء

۲۸۵۔ ہندوستان میں وہابی تحریک | ڈاکٹر قیام الدین احمد | نفیس اکیڈمی کراچی | ۹۷۲ء

۲۸۶۔ ہمارا اسلام | عبدالقیوم ندوی | دار المصنفین علی گڑھ (یوپی) | ۱۹۷۱ء

۲۸۷۔ ہمارا دینی نظام تعلیم | ڈاکٹر محمد امین | دارالاخلاص مرکز تحقیق اسلامی لاہور | ۲۰۰۴ء

۲۸۸۔ واقعہ دارالحکومت دہلی | بشیر الدین دہلوی | شمسی مشین پریس آگرہ، دہلی | ۱۹۱۹ء

۲۸۹۔ The Economic System of Islam. M.Umar Chapara. Karachi University.1971.

۲۹۰۔ Distribution of Wealth in Islam.Mufti M.Shafi.Begum Aysha Bawany Wakf Karachi.1968.

۲۹۱۔ Islamic Banking.Shahid Hassan Siddiqui. Rayel Book Company Karachi.1994

۲۹۲۔ Islamic Finance.M.Taqi Usmani. Idaratul Ma'arif Karachi.2001

۲۹۳۔ Financial Assets and Islamic Fatwa Evaluatio. S.M.Hasan Uz Zman.Islamic Reserrch Institute Islamabad.1992.

۲۹۴۔ Economic Guidelines in the Qur'an. S.M.Hasan Uz Zman.Islamic Reserrch Institute Islamabad.1993.

۲۹۵۔ Islam and the Economic Challenge. M.Umar Chapara. The Islamic Foundation Institute Thought.1992.

٢٩٦- Islamic Banking and Finance.Muhammad Ayub. State Bank Of Pakistan.2002.

٢٩٧- Development AnIslamic Perspective. Adiit Ghazali Pelamduk Publication.Malaysia.1990.

٢٩٨- Islamic Economics .A Bibliography. Tariquttul Khaal.Jeddah.1994.

٢٩٩- Economics An Islamic Approach. Dr,M.Nejatullah. Book Traders Block 19.Islamabad.1983.

٣٠٠- Islam And Economic Development M.Umar Chapra.Islamic Research Institute.1981.

٣٠١- Development And Distribution In Islam Ata ul Haq.Pelamduk Publications Malaysia.1993

٣٠٢- Economic System Under Umar The Great. Arfan Mehmud Ra'ana. Sh.Muhammad Ashraf.Lahore 1987.

٣٠٣- Development And Problems Of Islamic Banks. Ausaf Ahmad. Jeddah.1987.

٣٠٤- The Role Of Government In An Islamic Economy Abul Khair Mohd Jalauddin. International Islamic Universty Malaysia.1991.

٣٠٥- Essays On Islam.Dr,M.Hamedullah. Hamderd Foundation Pakistan.1992.

٣٠٦- International Islamic Conference.Dr,M.A.Khan. Islamic Research Institute Islamabad.1968.

۳۰۷۔ Islamic Thoughts.Shamsul Alam.
Islamic Foundation Bangladesh.1986.

۳۰۸۔ Essays In Islamic And Comparative Studies.
Ismail Raji Faruqi.
Internatnal Institute Of Islamic Thought,Washington.1882.

مجلات

۳۰۹۔ الفرقان ولی اللہ	مولانا عبیداللہ سندھی	ساگر اکیڈمی لاہور	۱۹۸۳ء
۳۱۰۔ الولی		شاہ ولی اللہ اکیڈمی حیدر آباد	۱۹۸۳ء
۳۱۱۔ الرحیم		شاہ ولی اللہ اکیڈمی حیدر آباد	۶۴تا۱۹۷۱ء
۳۱۲۔ فکر ونظر (سہ ماہی)		ادارہ تحقیقات اسلامی اسلام آباد	۷۲تا۸۰

☆☆☆

﴿ اختتامیہ ﴾

اس مقالہ کی بحث سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہ اپنے دور کے امام تھے، آپ نے تعلیمات اسلامی کے تمام شعبوں کی حکمتوں کو بطریق احسن بیان فرمایا، میرا موضوع تحقیق معاشی نظریات ہے، آپ نے اس میدان میں بھی حکمت کے اصول قائم کرنے میں اپنا فرض پوری طرح ادا کر دیا ہے آپ کی حکمت کا تقاضا ہے کہ قرآن حکیم کی تعلیمات اب عملی زندگی میں عوام میں پھیلیں اس کا انجام یہ ہوگا کہ ان کے ذریعے ایسا انقلاب برپا ہوگا جو عوام کی معاشی اور عقلی ضرورتیں پوری کرے گا۔

تاریخ اسلام میں امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے سلطانیت کا جو دور شروع ہوا وہ سلطان عالمگیرؒ پر ختم ہوگیا اس دور کی خصوصیت بادشاہی تھی جو قرآن حکیم کے تحت کام کرتی رہی، گو کبھی کبھی ایسے تجارع پسند بادشاہ بھی آئے، جو اپنا ذاتی قانون چلاتے تھے، لیکن ہر ایک ارتجاع کے بعد ایسا انقلاب آتا رہا جس کے بعد قرآن حکیم کے قانون کو چلانے والا بادشاہ تخت پر متمکن ہو جاتا تھا اور یہ سلسلہ سلطان عالمگیرؒ (۱۱۰۷ھ) تک جاری رہا جب شاہی نظام کے ختم ہونے کے بعد اس دور کا آغاز ہوتا ہے جس کی خصوصیت حکمت کی اشاعت عامہ ہے۔

اگر تمام دنیا کی اقوام کی متوازی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اسی زمانے کے قریب یورپ میں دورہ حکمت (Scientifc Age) شروع ہوتا ہے مشین ایجاد ہوتی ہے جس سے صنعتی انقلاب آتا ہے اور سیاسی لحاظ سے ہر ملک میں بادشاہی کے خاتمے پر قومی حکومت قائم ہوتی نظر آتی ہے۔

اسی زمانے میں حضرت امام ولی اللہ کی تحریک تجدید و انقلاب ایک معین پروگرام کے ساتھ شروع ہوتی ہے وہ آنے والے دور کے پیش نظر انسانی ارتقاء کا وہ فلسفہ پیش کرتے جس میں خدا پرستی کے ساتھ

دنیاوی ترقی کے اصول بھی وابستہ ہیں یہی وہ زمانہ ہے جب وہ اعلان کرتے ہیں کہ جب کوئی قوم بین الاقوامی مقام سے گر جائے ۔ ۔ ۔ ۔ جیسے مسلمان اس وقت ہندوستان میں حکومت کر رہے تھے تو اسے قومیت کی منزل پر ٹھہر کر سانس لینا چاہئے تھا۔ مگر اس میں بین الاقوامی عدل کے تصورات محفوظ کر لینے چاہئیں ۔ اگر وہ اپنی ماضی کی تاریخ کو پڑھ پڑھ کر اسی لکیر کو پیٹتی رہے گی تو برباد ہو جائے گی ۔

اگر ہندوستان کے لوگ اس حکمت کو سمجھ لیتے تو جب یورپ کے استبدادی (Desplic) بین الاقوامی نظامات ٹوٹنے کے بعد قومی نظامات پیدا ہوئے ، جو اب پھر بین الاقوامیت کی طرف آ رہے ہیں تو ہندوستان میں (اور اس کے بعد ایشیاء میں بھی) بین الاقوامی نظام شکست کے بعد قومی طرز کی حکومتیں پیدا ہو جاتیں ۔

ہندوستان میں بھی حضرت امام الہندؒ کے اصول پر یورپ کے متوازی ، مگر اس سے بہتر اور صالح بین الاقوامی نظام پیدا ہو چکا ہوتا لیکن اس حکیم کی آواز پر کان نہ دھرنے کا نتیجہ یہ نکلا کہ یہاں ایک غیر ملکی حکومت قائم ہوگئی ، جس کی وجہ سے ہندوستان کی ترقی تقریباً دو صدی پیچھے چلی گئی ۔

یورپ میں حکمیاتی ایجادات اور صنعتی ترقی کے نتیجے کے طور پر جو انقلاب آیا اس سے ایک وسیع پیمانے پر سرمایہ پرستی پیدا ہوگئی اور دوسری طرف مذہب کو سیاست سے الگ کر کے محض ایک پرائیوٹ چیز بنا دیا گیا اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ یورپ کی سیاست خصوصاً بین الاقوامی سیاست کسی ضابطہء اخلاق کی پابند نہ رہی جس کی وجہ سے وہ ہر قسم کی غداری اور عہد شکنی کا ہم معنی بن کر رہ گئی اس کا انجام یہ ہے کہ وہاں مصلح پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا ۔

حضرت امام الحکمت کا فلسفہ سرمایہ پرستی (Capitatatary) کے استیصال کو انسانیت کی سب سے بڑی ضرورت قرار دیتا ہے اور اس کی جگہ ایک ایسا عادلانہ نظام پیش کرتا ہے ، جس پر دنیا ایک مرتبہ عمل کر کے اطمینان کا سانس لے چکی ہے یہ وہ نظام ہے جس کے قیام کے لئے حضرت امام ولی اللہ کی جماعت

کوشش کر رہی ہے۔ اگر امام ولی اللہ کا یہ فکر ہندوستان میں قبول کرلیا جاتا جیسے یورپ آج جس ارتفاق اعلیٰ کا مالک ہے ہندوستان اس سے بہتر ترقی کا مالک ہوتا، مگر افسوس ہے کہ ہندوستان کے سوچنے والے طبقہ نے حضرت امام ولی اللہ کے اس فکر کی قدر نہ کی اور صرف بادشاہت کے زندہ کرنے کے خواب دیکھتے رہے اور یہ نہ سمجھے کہ جس منزل سے انسانیت گر چکی ہے، اس کی طرف وہ واپس نہیں لوٹ سکتی۔ زیادہ افسوس اس بات کا ہے کہ اب بھی اہل فکر اس فکر کی طرف جلدی متوجہ نہیں ہو رہی ہے اور نہ یہ سوچتے کہ قرآن حکیم بادشاہتوں کے ساتھ نہیں چل سکتا اب صرف یہ ہوسکتا ہے کہ قرآن کریم کی انسانیت بخش حکمت عوام تک پہنچائی جائے اور وہ اسے اپنا، کو اپنے انتخاب سے کسی قسم کی جمہوریت پیدا کر لیں۔

میرے خیال میں یہ ناممکن ہے کہ انسانیت چلتی رہے اور اس کے وہ اصول و قوانین جو قرآن حکیم میں منضبط ہے غائب ہو جائے اگر دنیا جو چلنا ہے تو قرآن حکیم کو ایک حاکم کی حیثیت سے اوپر لانا ہوگا۔ اور اسے اوپر لانے کی وہی شکل ہوگی جو حضرت امام ولی اللہ نے تجویز فرمائی ہے کہ قرآن حکیم کو نصب العین بنا کر ایک جماعت اس کی خاطر اپنا سب کچھ قربان کرنے کو تیار ہو جائے اس انقلاب کا نقطہ آغاز پاکستان میں ایک ایسی حکومت کا قیام ہے جو بین الاقوامی منزل کو اپنے سامنے رکھے، جو قرآن حکیم کی تعلیم کی بلند ترین عملی صورت ہے یہی وہ راستہ ہے جس پر چل کر پہلے عربوں نے، پھر ایرانیوں اور ترکوں نے ترقی کی۔ اسی راہ پر پاکستان کو گامزن ہونا ہوگا اسی حقیقت کو ہمارے اہل فکر جتنی جلدی سمجھ لیں اتنا ہی اچھا ہے۔

نام نہاد عالم اسلام کی بین الاقوامی سیاست نے آج کل یورپ کے استیلا کی وجہ سے ہمارے لئے صرف یہی ایک صورت باقی رہنے دی ہے اب ہمارے لئے اس سے سواء کوئی راستہ کھلا نہیں۔

ادھر ایک غیر ملکی سیاست نے اس پر مستبدانہ قبضہ کر کے نہ صرف اس کے بین الاقوامی تعلقات منقطع کر دیئے ہیں بلکہ اس کی طاقت دوسری قوموں کو یورپی امپیریلزم (Imperialism) کا غلام بنانے میں استعمال کر کے اس کی بین الاقوامی شہرت کو نہایت خراب کر دیا ہے۔

اب اس کا ایک ہی علاج ہے اور وہ یہ کہ ہم سب سے پہلے خود اپنے گھر کے مالک بنیں اس کی خاطر اپنا جان و مال قربان کریں اور ان قربانیوں سے یہاں بلند پایہ، صالح، انسانیت پر بنی حکومت قائم کریں، جس کا سنگ بنیاد یہ ہو کہ پاکستان کی تمام اقوام کے ساتھ یکساں انصاف کریں اور ان کو ارتفاقاتِ معاشیہ میں پورا پورا حصہ دیں جب ہم یہ کر لیں گے تو پاکستان سے باہر کے بین الاقوامی مجلسوں میں ہماری عزت ہوگی یہ عزت کا مقام حاصل کرنے کیلئے ہمیں حجتہ اسلام، امام ولی اللہ دہلویؒ کا وہ پروگرام قبول کر لینا چاہئے، جس کی تفصیل گذشتہ صفحات میں دی گئی ہے یہی وہ پروگرام ہے، جسے یورپ سمجھ سکتا ہے اور اسی پر کاربند ہو کر ہم پاکستان کی تمام اقوام کو مطمئن کر سکتے ہیں۔

واللہ المؤفق

☆ ☆ ☆